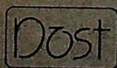
سندھ ساگر

اور قیامِ پاکستان

اعتزاز احسن



سندھ ساگر

اور قیامِ پاکستان

تصنیف

اعتزاز احسن

ترجمہ

مستنصر جاوید

دوست پبلی کیشنز ۔ اسلام آباد

ضابطہ

ISBN No: 969-496-101-7

کتاب	:	سندھ ساگر اور قیام پاکستان
مصنف	:	اعتزاز احسن
مترجم	:	مستنصر جاوید
موسم اشاعت	:	۱۹۹۹ء
سرورق	:	شبیر حسین
مطبع	:	ورڈ میٹ
قیمت	:	300.00 روپے

دوست پبلی کیشنز 8۔اے خیابان سہروردی، پوسٹ بکس نمبر 2958، اسلام آباد

پاران ایم ایچ پنھور انسٹیٹیوٹ آف سنڌ اسٹڈیز، ڄامشورو۔

اپنے والدین

محمد احسن (علیگ) اور رشیدہ احسن

کے نام

جن سے میں نے اوائل عمری میں ہی

مادر وطن سے عقیدت اور ہم وطنوں سے محبت

کا سبق سیکھا

حرف سپاس

آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے 'انڈس ساگا' The Indus Saga شائع کی تو کئی اہل اور باصلاحیت دانشور دوستوں کی طرف سے مجھے اس تصنیف کے اردو ترجمے کی پیشکش ہوئی۔ ایک مرحلے پر تو مارکیٹ میں اس کتاب کی پذیرائی کے پیش نظر (کہ اب تک انگریزی میں اس کے پانچ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں) آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے اس کام کو خود کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

لیکن مجھے ایک ایسے ہنر مند کی تلاش تھی کہ جس سے نظریاتی ہم آہنگی بھی ہو' وہ ترجمے کو تخلیق کی اپنائیت بھی دے اور اسے دونوں زبانوں پر یکساں دسترس بھی ہو۔

مجھے مستنصر جاوید ہی ایسے دوست نظر آئے۔ لہذا میں نے خود ان سے 'انڈس ساگا' کو اردو میں منتقل کرنے کی فرمائش کی۔ اور 'سندھ ساگر' کی صورت میں نتیجہ قارئین کے سامنے ہے۔

میں ذاتی طور پر مستنصر جاوید کا ممنون ہوں کہ ترجمے کا یہ کام انتہائی لگن اور اپنائیت سے کرتے ہوئے نہ صرف وہ اردو میں میرا مدعا من و عن پیش کرنے میں کامیاب رہے بلکہ اس کتاب کو حقیقتاً انہوں نے اپنی کتاب ہی بنا لیا۔ میں اس کاوش کے لئے تہ دل سے ان کا سپاس گزار ہوں۔

میں دوست پبلی کیشنز کے آصف محمود کا بھی شکر گزار ہوں جن کی محنت اور غیر معمولی توجہ کے بغیر اس کتاب کی تکمیل ممکن نہ تھی۔

اعتزاز احسن

ترتیب

دو دنیائیں

1600ء سے 1857ء تک

فہرست تصاویر و نقشہ جات

اظہار تشکر

سب سے پہلے تو میں بجا طور پر معترف ہوں کہ میری بیوی بشریٰ نے میرے لئے "انڈس ساگا" The Indus Saga کی تکمیل کو ممکن بنایا۔

میں ان تمام دوستوں اور بہی خواہوں کا شکر گزار بھی ہوں کہ فرداً فرداً جن کا ذکر یہاں ممکن نہیں لیکن وادی سندھ کے سیاسی کلچر کی تاریخ رقم کرتے ہوئے ان کے بصیرت افروز مشوروں نے قدم قدم پر میری راہنمائی کی۔

میں اس کتاب کے لئے محترمہ صبیحہ عسکری' میاں اعجاز الحسن' فقیر سید اعجاز الدین' محترمہ عامرہ سعید' محترمہ زہرہ مہدی اور محترمہ سائرہ شاہ کے تعاون کا بطور خاص سپاس گزار ہوں۔

مجھے اعتراف ہے کہ تجزیئے اور اخذ کردہ نتائج کے حوالے سے اس کتاب کی ہر خامی اور کوتاہی کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے۔

پیش لفظ

فکر پریشاں

ملتان کی اس جیل کو نیو سنٹرل جیل کہنا سراسر زیادتی ہے۔ یقیناً یہ کبھی نئی رہی ہو گی لیکن اس واقعے کو سرزد ہوئے بھی 80 برس سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ اب تو اس کی دیواریں پلستر سے عاری اور شکستہ ہیں اور ان دیواروں کے ان گنت شگاف چوہوں' چمگادڑوں اور بھڑوں کے مسکن ہیں جن کی باغ و بہار صحبت سے فرار کا صرف ایک ذریعہ ہے کہ آپ کی قسمت یاوری کرے اور یہاں آپ کو کتابیں میسر آجائیں اور اگر کہیں اتفاق سے اس ماحول میں کاغذ اور قلم بھی حاصل ہو جائے تو گویا سونے پر سہاگہ ہے۔

میں اس جیل میں 6 مہینے تک قید رہا ہوں اور اس دوران مجھے اپنے سامان تعیش یعنی کاغذ، قلم اور کتاب کے علاوہ صرف اپنے پریشان کن خیالات کی صحبت حاصل تھی۔

میں سوچتا تھا کیا پاکستان واقعی اتنا کمزور ہے جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے؟ کیا اس کا وجود برقرار رہے گا؟ کیا اسے ایک قدرتی ریاست کہا جا سکتا ہے؟ کیا ہندوستان واقعی اتنا اٹوٹ اور پائیدار ہے جیسا کہ اس کے نظریہ ساز ہمیشہ سے دعویٰ کرتے آئے ہیں؟ کیا میرا وطن پاکستان اور اس کے باسی کسی روز دوبارہ ہندوستان کا حصہ بن جائیں گے؟

ایسے کتنے ہی سوال ہیں جو ہمارے دلوں اور ہمارے ذہنوں میں شک اور وسوسے کی بنیاد ہیں لیکن ہم عصر تجزیہ نگاروں کی تحریریں' ان میں سے کسی کا بھی کوئی تسلی بخش جواب فراہم نہیں کرتیں۔

زائرنگ Ziring نے پاکستان کے بارے میں اپنی ایک کتاب کو بڑا خیال افروز عنوان دیا تھا۔ "پاکستان : دی اینگما آف پولیٹیکل ڈیویلپمنٹ" Pakistan : The Enigma of Political Development

اس کتاب کے آخری باب میں اس نے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے ؛

"تمام موجود ریاستوں نے اپنے گرد انفرادی تشخص کا ایک فرضی ہالہ تشکیل دے رکھا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے وہ اپنا ایک الگ وجود رکھتی ہیں اس لئے یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ ایسا تو ہونا ہی تھا اور ہمیشہ ایسا ہی رہے گا جب کہ تاریخ بہر حال ایسے مفروضوں کو چیلنج کرتی رہتی ہے۔"

زائرنگ مزید لکھتا ہے کہ ؛

"اس یقین کی صحت سے قطع نظر، سچ تو یہی ہے کہ پاکستانی سرحدوں کے ایک بڑے حصہ پر ہمیشہ خطرات منڈلاتے رہے ہیں۔ اس کے ہمسائے جارحانہ عزائم رکھتے ہیں اور یہ خوف ہمہ وقت دامن گیر رہتا ہے کہ بیرونی سازشیں ملک کی فطری کمزوریوں کو نشانہ بنانے کے درپے ہیں۔" زائرنگ اپنے تجزیئے کو سمیٹتے ہوئے کہتا ہے کہ " ایک آزاد اور خود مختار ملک کی حیثیت سے پاکستان کا وجود ختم بھی ہو سکتا ہے۔"

طارق علی نے بھی اپنی کتاب "کیا پاکستان قائم رہ سکتا ہے ؟" میں یہی سوال اٹھایا ہے لیکن وہ پوری طرح اس کا جواب دینے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

چند سال پہلے عالمی بینک کے ڈائریکٹر شاہد جاوید برکی نے بھی بڑے مبہم سے انداز میں لکھا تھا کہ "صرف آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ کیا پاکستان اپنی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھا سکا یا پھر اپنے مسائل کی بھینٹ چڑھ گیا۔" اور اس سوال کی وضاحت میں کہ "پاکستان کا مستقبل کیا ہے ؟" شاہد جاوید کا کہنا ہے" اصل بات یہ نہیں کہ اس سوال کے جواب میں بہت سی متضاد باتیں کہی جارہی ہیں بلکہ اہمیت اس بات کی ہے کہ آخر یہ سوال اٹھایا ہی کیوں گیا ؟"

پاکستان میں قیام پذیر قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد کے طاہر امین نے بھی اپنی اسی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا اور شاید یہ پنجابی اشرافیہ کی تشویش ہے کہ ؛

"بنگلہ دیش کا آسیب ایک روگ کی طرح پاکستان کے حکمران طبقوں کے اعصاب پر سوار ہے' وہ مسلسل اس خوف کا شکار ہیں کہ سرحد' سندھ اور بلوچستان میں لسانی اور قوم پرستی کی تحریکیں بھی کہیں بنگلہ دیشی تحریک کے راستے پر نہ چل نکلیں۔"

ناپائیداری کا یہ روگ ہمارے اندر اس طرح سرایت کر گیا ہے کہ سیاسی لیڈر اور کارکن آئے دن ایک دوسرے پر الزامات کی بوچھاڑ کرتے رہتے ہیں کہ ان کے مخالفین ملک کو توڑنے کی سازش میں شریک ہیں اور اس میں کسی توقف کے بغیر منتخب وزراء ' معزز گورنروں حتیٰ کہ صدر اور وزیراعظم

تک کا نام شامل کر لیا جاتا ہے۔ ہر کوئی دوسرے کو ملکی سلامتی کے لئے خطرہ قرار دیتا ہے۔ ہر روز وطن اور اس کے جھنڈے سے مبینہ غداری کی فہرستیں جاری کی جاتی ہیں۔ شاید ہی کسی اور ملک کے سیاستدان آپس میں اتنے بیہودہ اور لچر الزامات کا تبادلہ کرتے ہوں۔ یہ روگ خالصتاً پاکستانی ہے اور تجزیہ نگاروں سے لے کر سیاسی مفکرین، سیاسی راہنما اور انتظامیہ تک سبھی اس سحر کے اسیر ہیں۔

لیکن پاکستانی مفکرین اور سیاستدانوں کے ان موہوم اندیشوں سے کہیں زیادہ مجھے ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم جواہر لعل نہرو کا وہ رویہ متاثر کرتا ہے جب وہ انتہائی اعتماد اور فخر کے ساتھ اپنے ملک کی اٹوٹ ایکتا کا پرچار کرتے ہیں۔ نہرو کا تعلق سیاستدانوں کی اس کم یاب نسل سے تھا جو محض زبانی الفاظ پر تکیہ نہیں کرتے بلکہ تحریر میں بھی ان کی حیثیت مسلم ہے اور عالمی تاریخ کی اہم تحریکوں پر بھی ان کی نظر گہری تھی۔ ان کی کتاب ''گلمپسز آف ورلڈ ہسٹری'' Glimpses of World History سے ان کی وسعت نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ انہوں نے یونان کی شہری ریاستوں، قدیم ہندوستان کی دیہی جمہوریاؤں، پارتھی اور ساسانی سلطنتوں اور تہذیبوں کے اتار چڑھاؤ، یورپی شہروں کے عروج، آمریتوں کے خلاف عوامی جدوجہد، عالمی سمندروں میں آبی راستوں کی دریافت اور ملاکا کی ملائشی سلطنتوں، سولہویں اور سترھویں صدی کے یورپ میں شخصی حکومتوں کے قیام، مشین کی ایجاد، آئرلینڈ کی جدوجہد آزادی، خوفناک کساد بازاری اور عالمی بحران جیسے مختلف النوع موضوعات کا بڑی مہارت اور علمیت کے ساتھ تجزیہ کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ گاندھی کے مقابلے میں نہرو یقیناً ہندوستان کا بڑا نظریہ دان تھا۔

شمال مغرب میں درہ خیبر اور دور افتادہ جنوب میں کنیا کماری اور راس کمورن Cape Comorin تک اپنی مسافتوں کا احوال پنڈت نہرو نے اس طرح بیان کیا ہے ؛

''اگرچہ ہندوستان کے لوگوں میں بظاہر بہت تنوع اور رنگا رنگی پائی جاتی ہے لیکن اس کے باوجود ہر جگہ اس ایکتا کی گہری چھاپ ہے جو صدیوں سے ہمیں اکٹھا رکھے ہوئے ہے۔ اس حقیقت سے قطع نظر کہ ہمارے سیاسی حالات کیا تھے اور ہم پر کیسی کیسی بدنصیبیوں کا سایہ رہا۔ ہندوستان کی وحدت اب میرے لئے محض ایک دانشورانہ سوچ نہیں بلکہ ایک بھرپور جذباتی کیفیت ہے جس نے مجھے اپنی زلف گرہ گیر کا اسیر کر لیا ہے اور میرے نزدیک یہ ناگزیر وحدت اتنی اٹوٹ ہے کہ کوئی سیاسی تقسیم اور کوئی آفت یا تباہ کاری اس کو ختم نہیں کر سکتی۔''

نصف صدی سے بھی زیادہ عرصے تک کسی طرف سے بھی نہرو کے دلائل کو رد کرنے کی کوئی مربوط کوشش نہیں ہوئی تھی بلکہ مجھے تو اکثر پاکستانی مورخین بھی اس وقت پنڈت نہرو کے استدلالی

فریب کا شکار نظر آتے ہیں جب وہ مملکت پاکستان کی ناپائیداری پر یقین کر لیتے ہیں یا اس کی بنیادیں جمل پسندی کے قالب میں ڈھلی ہوئی محسوس کرتے ہیں۔

یہاں پھر کئی تشنہ سوال ابھرتے ہیں۔

کیا ہندوستان کی مائل بہ مرکز کشش کوئی مافوق الفطرت قوت ہے جو وادی سندھ کو دوبارہ خود میں ضم کر لے گی ؟ یا سندھ کی وادی (پاکستان) کا وجود اساسی طور پر ہندوستان سے ماوراء ہے ؟ اور کیا اس علاقے میں اپنی کوئی مرکز گریز قوت نہیں ہے ؟

نہرو نے اپنی کتاب ''دی ڈسکوری آف انڈیا'' The Discovery of India احمد نگر قلعے کی جیل میں لکھی تھی۔ میں نے پاکستان کی تلاش نو کا سفر نیو سنٹرل جیل ملتان سے شروع کیا اور آنے والے سالوں میں یہ سفر ساہیوال، فیصل آباد اور میانوالی جیلوں میں جاری رہا۔

میں جب ماضی بعید کی طرف یادوں کے سفر پہ نکلا تو مجھ پر یہ راز کھلا کہ چھ ہزار سال کی معلوم تاریخ میں سے ساڑھے پانچ ہزار سال تک پاکستان ایک علیحدہ اکائی کے طور پر قائم رہا ہے۔ اس دوران وادی سندھ شاذونادر ہی ہندوستان کا حصہ رہی تھی۔ اس انکشاف نے مجھے اپنے بارے میں ایک نئی آگہی دی کہ میں ایک شاندار تسلسل کا حصہ ہوں۔ 1946 میں جب تحریک پاکستان کے دوران میری والدہ مجھے اپنے بازوؤں میں سمیٹے ہوئے میری پہلی مختصر سی قید میں لے گئیں تو ان کی جدوجہد دراصل اس چیز کے حصول کے لئے تھی جو ہمیشہ سے میری تھی اور میری اس پہلی گرفتاری سے بہت پہلے جب میرے والد اور دادا گرفتار ہوئے تھے تو میری طرح وہ بھی اسی ورثے کی جستجو میں تھے جو کہ ہمارا اپنا تھا۔

''دو خطے'' میری اس کتاب کے پہلے حصے کا عنوان ہے اور اس میں وادی سندھ اور ہند کی تفریق کا جائزہ بڑی حد تک جغرافیائی عوامل کی بنیاد پر لیا گیا ہے۔ ''دو دنیائیں'' کتاب کا دوسرا حصہ ہے جو وادی سندھ کے باسیوں (اور ان کے ساتھ باقی ہندوستان کے لوگوں) اور برطانوی حکمرانوں کے اختلافات کے تقابلی جائزے پر مشتمل ہے۔ کتاب کے تیسرے حصے کو ''دو قومیں'' کا عنوان دیا گیا ہے اور اس میں وادی سندھ اور ہند پر مشتمل برصغیر میں بسنے والے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان ناگزیر تفریق کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ اس طرح ہر تفریق کی ماہیت کا تعین کرنے کے لئے وادی سندھ کے اصل باشندوں کا کھوج لگانے کی کوشش کی گئی ہے اور یہی اس کتاب کا بنیادی مقصد بھی ہے کہ سندھ واسی یعنی پاکستانی شہری کو دریافت کیا جائے اور اس کی اصلیت کا تعین کیا جائے۔ یہ کتاب قبل از تاریخ سے 1947 تک کے عرصے پر محیط ہے۔

ملک میں ایک مہذب معاشرے کے قیام اور جمہوریت سے محبت کی خاطر مجھے جیل جانا پڑا۔ میری طرح اور بھی بے شمار لوگوں نے جابر حکمرانوں اور ان کے سربر آوردہ حاشیوں کے ظلم اور عدم برداشت کے خلاف احتجاج کیا۔ ان دنوں جیل کی کال کوٹھری کے علاوہ کوئی اور آبرومندانہ متبادل بھی نہیں تھا۔ کوئی بھی شخص جسے دیوار زنداں کے دوسری طرف کی کٹھن زندگی کا تجربہ نہیں وہ اندازہ کر ہی نہیں سکتا کہ پاکستان سمیت دنیا کے دوسرے ممالک خاص طور پر اسلام کے پیغام سے فیضیاب ممالک میں ایک بہتر، تعصب سے پاک، متحمل اور روشن خیال معاشرے کے لئے تڑپ اور وابستگی کی اہمیت کتنی ہے۔

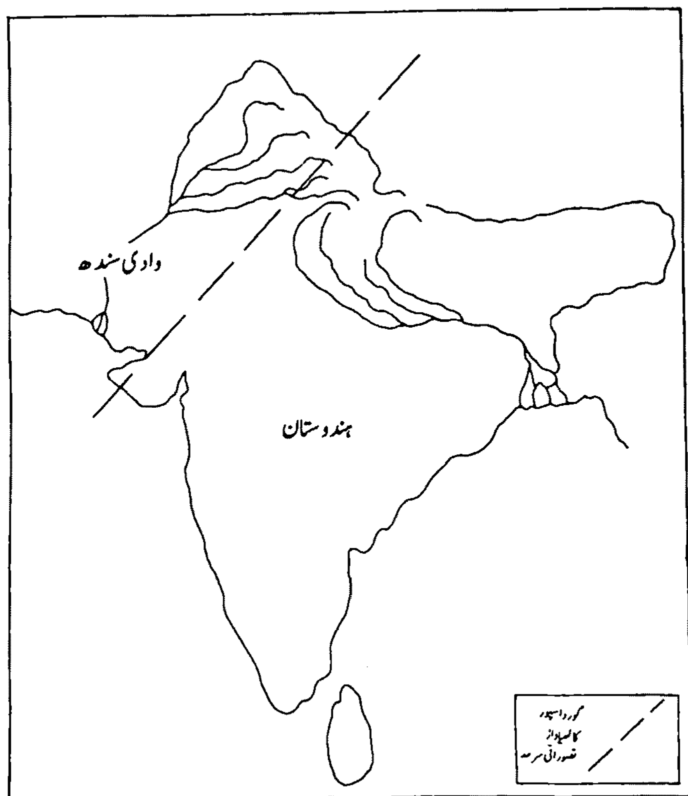
میری تو دعا یہی ہے کہ اس سرزمین پر آئندہ کبھی وہ وقت نہ آئے جب سیاسی کارکنوں یا کسی بھی شخص کے لئے صرف جیل ہی واحد آبرومندانہ متبادل رہ جائے۔ میں نے اس خطے کی تاریخ کا کھوج لگانے میں جو ناتواں سی کوشش کی ہے وہ دراصل اس حقیقت کو سامنے لانے کی سعی ہے کہ جو تہذیب' سندھ واسی (پاکستانی) کا ورثہ ہے وہ کسی شہنشاہ اکبر کا تحفہ نہیں اور نہ ہی کسی بنیاد پرست علم دشمن کا ترکہ ہے۔ یہ زمین خسرو' حسین' باہو' بلھے' وارث' لطیف' خوشحال' اقبال اور فیض کی محبت بھری شعری روایات کی سرزمین ہے اور اس تہذیب کو رسالو' جاسرت' سارنگ' ارجن' دلا' شاہ عنائت' چاکر' خوشحال' احمد کھرل اور بھگت سنگھ کی شجاعت اور مزاحمت کی داستانوں نے سنوارا ہے۔

جو کوئی بھی ہمارے سورماؤں جیسی زندگی جیا اور جس نے ان کی طرح موت کو گلے لگایا اور جو کوئی بھی ہماری شاعری کے آگے دل ہار بیٹھا اسے وادی سندھ کے لوگوں نے ٹوٹ کر چاہا۔ ہو سکتا ہے اس راستے پر چل کے اس نے بہت سے دشمن بھی بنائے ہوں' خون کے پیاسے دشمن۔ لیکن ایسا شخص تو پھر اپنی موت کے بعد بھی زندہ رہا' اس طرح یہ کتاب داستان ہے ان تمام میدانوں کی جہاں ہمارے سورماؤں کا خون بہا اور جیل کی ان تمام کال کوٹھریوں کی جہاں انہوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام گزارے اور سمجھوتہ کرنے کی بجائے سولیوں کو چوم لیا۔

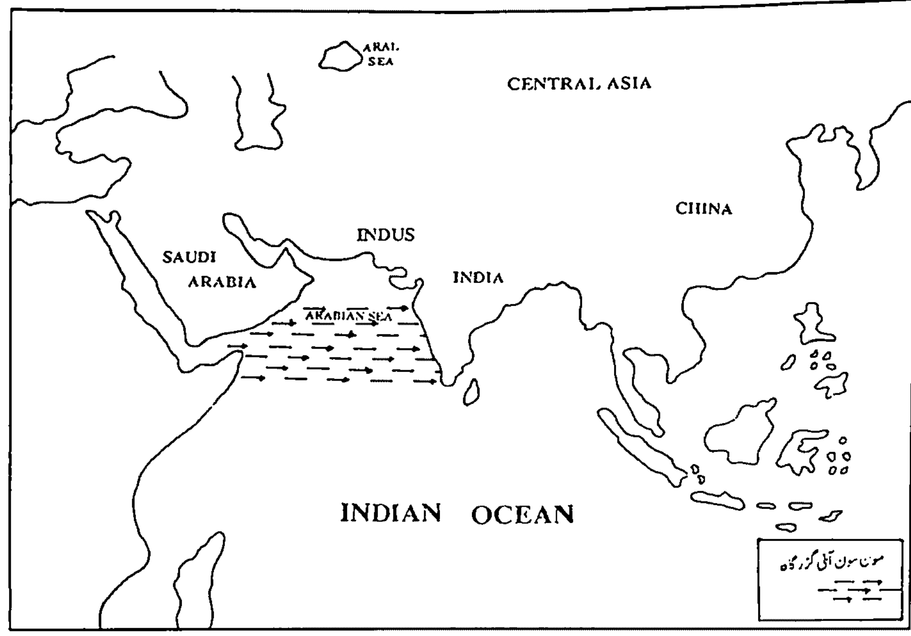
حصہ اول

دو خطّے

2000 قبل مسیح سے 1800 عیسوی تک



تاریخی فاصل آب



قدیم عرب تجارتی راستہ

دو خطے

2000 قبل مسیح سے 1800 عیسوی تک

تعارف : پاکستانی تشخص کی تلاش

تشخص اور نسب کے حوالے سے کیا پاکستانی عرب ہیں یا ہندی؟ ہر دو سے منسوب یا دونوں سے ماورا؟ کیا ان کا نسب کلیتاً وسطی ایشیائی ہے یا انہوں نے فارس سے اثرات قبول کئے؟ پاکستانی ان فرنگیوں سے کس قدر مختلف ہیں جو ان پر تقریباً ایک سو سال تک حکومت کرتے رہے؟ کیا پاکستانیوں کی اپنی کوئی واضح انفرادیت اور ثقافت بھی ہے؟ اگر ہے تو ان کا یہ امتیاز کب سے قائم ہے؟ کیا یہ علیحدہ تشخص تقسیم ہند کے وقت 1947 میں تخلیق ہوا یا پہلے سے موجود تھا؟ کیا علیحدگی کے اس نظریئے نے 1940 میں قرار داد لاہور کے ساتھ جنم لیا' یا تقسیم کی بنیاد پہلے سے موجود تھی؟ کیا جنگ آزادی جسے انگریز نے عظیم غدر قرار دیا تھا' تقسیم ہند کی بنیاد بنی یا تقسیم کا باعث اس علاقے کے پہلے مسلمان حکمران اور صوفیا تھے؟ یا کہیں تقسیم کی جڑیں اس سے بھی پہلے زمانہ قبل از تاریخ میں جاری و ساری تو نہیں تھیں؟ کیا وادی سندھ (موجودہ پاکستان) علیحدگی کی فطری خواہش اور اپنی شناخت کی جستجو سے یکسر بیگانہ تھی؟ اور کیا پاک و ہند تفریق کا ماخذ اساسی ہونے کی بجائے محض سطحی ہے؟

پاک ہند تفریق تو بہر حال موجود ہے اور یہ غیر مرئی نہیں بلکہ ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ ایک ایسی حقیقت جو پاکستان کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے البتہ پاکستان کی بنیاد کے بارے میں سوالات بہت ہیں۔ لیکن یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ دوسری بہت سی قوموں کو بھی ایسے سوالات کا سامنا رہا ہے اور ان میں سے اکثر نے مدلل اور معروضی انداز میں ان کا جواب دینے کی کوشش بھی کی ہے لیکن ہم ابھی

تک اس تلاش میں سر گرداں ہیں کہ فی الحقیقت پاکستانیت آخر ہے کیا؟

یہ سوال ہر اس ذہن کو پریشان کرتا ہے جو آج کے پاکستان میں دلچسپی رکھتا ہے۔ اس پاکستان میں جو آج موجود ہے اور اقوام عالم کا ایک اہم رکن ہے۔

اور میری یہ کتاب انہی سوالوں کا جواب تلاش کرنے کی کوشش ہے۔ یہ اس ابہام کو دور کرنے کی کوشش بھی ہے جو پاکستانیت کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہے اور جسے 'سوچنے والوں کی اکثریت نے "پاکستان کی شناخت کے بحران" Identity Crisis سے موسوم کیا ہے۔

اگر یہ کتاب اس سوال کا حتمی اور تسلی بخش جواب مہیا نہیں کرتی تو بھی یہ کوئی بڑا المیہ نہیں ہوگا۔ المیہ تو یہ ہے کہ غیر متعصب اور واضح سوچ کے حامل افراد نے شاید ہی کبھی یہ سوال کرنے کی جرات کی ہو۔ اور جواب ڈھونڈنے کی کوشش کرنے والوں کی تعداد تو اور بھی کم ہے جبکہ ہم پاکستانیوں نے تو آدھی صدی کوئی سوال کئے بغیر ہی گزار دی۔ ہمارے یہاں سوال کرنا قابل مذمت ہے کیونکہ حکم کے بندوں کو سوال کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔

سوالات پہ قدغن لگا کر منافقوں اور بہروپیوں نے آزادی سلب کر لی ہے۔ چیلنج کرنے والوں کیلئے قید و بند اور موت کی سزائیں ہیں۔ زبردستی لاگو کئے گئے اس کلچر میں سوال کرنے والے حساس ذہن کو قدم قدم پہ خطرات کا سامنا ہے لیکن یہ جبر سوالات کو ختم نہیں کر سکا۔ جیسے حرارت اور دھوپ کی مناسب مقدار سے گلیشئر پگھلنے لگتا ہے اسی طرح جرات مندانہ اور چبھتے ہوئے سوال حقیقت کو آشکار کر دیتے ہیں۔ میں نے بھی اس کتاب میں کچھ بنیادی سوال اٹھائے ہیں اور ان کے جواب تلاش کرنے کی جستجو کی ہے۔

جب میں نے اس پر خطر کام کرنے کی ٹھانی تو میرا واسطہ ایسے مبہم تہذیبی رجحانات سے پڑا جن کی وضاحت عہد حاضر کے تجزیوں میں نہیں ملتی۔ ان رجحانات کی کوئی وضاحت اگر موجود ہے بھی تو اس کی بنیاد محض روایات اور قصے کہانیاں ہیں جن پر لوگ بے سوچے سمجھے اعتبار کر لیتے ہیں لہٰذا میں نے ایسی روایات کی نشاندھی اور ان کے ماخذ کا تعین کرنے کی بھی کوشش کی ہے' مقصد یہی ہے کہ قومی شناخت کی اس بنیاد کو ڈھونڈ نکالا جائے جو روایات اور جہل پسندی کی برف تلے کہیں دفن ہے۔

ایک قدیم تصور

اس دیومالائی دور میں جب انسان اپنے آپ کو خداؤں' سورماؤں اور دیوتاؤں کے قریب سمجھتا تھا۔ جب پہاڑ متحرک لگتے تھے' جب جنگل اور دریاؤں کی دیویاں سرگوشیاں کرتی تھیں۔ موجودہ دہلی

اور اس کے گرد و نواح کے علاقے کورک شیتر سلطنت کا حصہ تھے اور یہ کوروؤں کا دیس تھا۔

کورو دور آہن Iron Age کے باسی تھے۔ تانبے اور کانسی کے برعکس لوہا نہ تو آسانی سے ٹوٹتا تھا اور نہ ہی اس کی رسد محدود تھی۔ لوہے کا بھاری پھل زمین میں گہرائی تک اتر جاتا تھا للذا کوروؤں کا ہل زیادہ کار آمد اور موثر ثابت ہوا۔ لوہے کے اوزار درختوں اور جنگلوں کو آسانی سے صاف کر ڈالتے تھے۔ دور آہن نے زرعی پیداوار میں زبردست اضافہ کر دیا تھا اور اس طرح ماضی کے مقابلے میں ایک زیادہ دولتمند حکمران طبقے کی بنیاد پڑ گئی تھی۔

کورو حکمران خوشحال اور ان کا تخت حکمرانی جاہ طلبوں کے لئے باعث کشش تھا یہاں اقتدار کی جنگیں روزمرہ کا معمول تھیں۔ ایسی ہی ایک جنگ ' تخت کے دو دعویداروں پانڈو اور دھرت راشٹر کے درمیان لڑی گئی۔

پانڈو کے پانچ بیٹے تھے اور دھرت راشٹر کے ایک سو۔ لیکن پانڈو کے بیٹے زیادہ جری تھے۔ جلاوطنی کی صعوبتوں نے انہیں مقدر کا سکندر بنا دیا تھا۔ ان کی زندگی سفر سے عبارت تھی آج اگر وہ ایک شاہی دربار میں تھے تو کل کسی دوسرے میں۔

پانڈو اور دھرت راشٹر کے بیٹوں میں بالآخر ایک خوں ریز جنگ ہوئی۔ فریقین اپنی پوری قوت سے مقابلے میں آئے اور کورک شیتر کا میدان ایک خونچکاں منظر میں بدل گیا۔ قدیم دیومالائی تاریخ اس سے زیادہ خونی جنگ سے ناآشنا تھی۔ نہ صرف برصغیر کے تمام بادشاہوں نے اس جنگ میں حصہ لیا بلکہ دور افتادہ باختر اور چین بھی کسی ایک یا دوسرے فریق کے ہمرکاب تھے۔ اٹھارہ دنوں کی شدید لڑائی کے بعد پانڈو سرخرو ہوئے اور وہ اب وادی سندھ اور ہندوستان کے حکمران تھے۔

یہ حقیقت شاید کم اہمیت کی حامل نہ ہو کہ اس وسیع و عریض برصغیر میں کورک شیتر کا میدان پانی پت ' سرہند اور اس کے آس پاس کے علاقوں پر مشتمل تھا۔ زمین کی یہ چھوٹی سی بیش قیمت پٹی ان بے شمار تاریخی جنگوں کا میدان کارزار رہی ہے جن کے نتیجے میں پورے برصغیر کی قسمت کے فیصلے ہوئے۔

ایک اور حقیقت تو اس سے بھی کہیں زیادہ اہم ہے۔ زمانہ قبل از تاریخ کی اس عظیم خانہ جنگی کو بیان کرتے ہوئے دیومالائی مہابھارت میں نہ صرف برصغیر کی ایکتا پہ کامل یقین کا اظہار ملتا ہے بلکہ پہاڑوں کے عظیم سلسلوں سے پرے چین اور باختر کی سرزمینوں کو بھی برصغیر کے قدرتی اور اٹوٹ سرحدی علاقے قرار دیا گیا ہے۔ گویا یورپ کے برابر اس وسیع و عریض برصغیر کے ایک ' اور اٹوٹ ہونے کا تصور بہت قدیم اور دیومالائی تاریخ کا حصہ ہے۔

نقشے پر بھی اگر نظر ڈالی جائے تو برصغیر ہند براعظمی پیمانے پر بظاہر ایک اچھوتی وحدت دکھائی دیتا

ہے۔ جیسے ایک گندھی ہوئی اکائی۔ ایک غیر معمولی طور پر ناقابل تسخیر قلعہ جس کی شمالی اور شمال مغربی سرحدوں کے محافظ بلند پر شکوہ پہاڑ ہیں اور جنوب میں بحر ہند ایک وسیع اور گہری بین البراعظمی خلیج بنا کر اسے اپنی پناہ میں لئے ہوئے ہے۔

شمال اور جنوب میں پامیر سے کیپ کو مورن تک اور مغرب تا مشرق گوادر سے آسام اور بحیرہ عرب سے خلیج بنگال تک ' برصغیر پاک و ہند کو مورخ اور جغرافیہ دان ہمیشہ سے ایک ہی اکائی تصور کرتے رہے ہیں۔ اور "تاریخ ہند" سے ان کی مراد ہمیشہ ہمالیہ اور بحر ہند کے درمیان پھیلے ہوئے اس تمام جغرافیائی خطے کی تاریخ رہی ہے جو بنیادی طور پر دو بڑے دریاؤں کے طاس پر محیط ہے یعنی سندھ اور گنگا۔ ان کے اپنے اپنے زرخیز و شاداب میدان اور ڈیلٹائی دلدل ہیں۔ اس کے علاوہ جنگل اور جنگلی حیات سے بھری بڑی سطح مرتفع بھی ہے اور جنوبی جزیرہ نما بھی جہاں پہاڑیاں ' ساحلی میدان اور تند و طوفانی ندیوں پر مشتمل نکاسی آب کا فطری نظام قائم ہے۔

آج کے ہندو بنیاد پرستوں کی طرح غیر منقسم ہندوستان کے کانگرسی راہنماؤں کا بھی یہ مقبول استدلال تھا کہ برصغیر کو فطرت نے ایک جزیرے جیسی وحدت سے نوازا ہے۔ پامیر کی وسطی اور شمالی چوٹیوں سے مشرق اور جنوب مغرب کی جانب نمودار ہونے والے دو عظیم پہاڑی سلسلے پر ہیبت قدرتی رکاوٹیں فراہم کرتے ہیں۔ طبعی اور جغرافیائی حوالے سے بظاہر یونہی لگتا ہے کہ برصغیر کی نہ ختم ہونے والی سطح مرتفع اور بارشوں سے لبریز ساحلی علاقے ' سنگلاخ خیبر سے بمبئی اور گوا کے ساحلی گھاٹوں تک اور قلات کی پہاڑیوں سے سندربن کے مرطوب جنگلات تک یہ خطہ زمین ایک وسیع و عریض پناہ گاہ ہے ' ایک مکمل قدرتی اور ناقابل تقسیم اکائی ہے۔

اور یہ اسی جغرافیائی وحدت کا سراب ہی تو تھا کہ نہرو جیسا ماہر تجزیہ نگار بھی برصغیر کی یکتائیت کے تصور کی وضاحت میں رومانس کی حدوں کو بھی پار کر گیا۔

ہندوستان کی وحدت کے حق میں دیئے جانے والے دلائل عام طور پر آٹھویں صدی کے شنکر اچاریہ اور انیسویں صدی کے ویوک نند کی تعلیمات پر مبنی ہوتے ہیں۔ خود نہرو کو بھی شنکر اچاریہ کے ان روحانی سفروں سے انگیخت ملتی ہے جو اس معروف سنیاسی راہنما نے اس وسیع خطے کے چاروں کھونٹ میں خانقاہیں قائم کرنے کی غرض سے کئے تھے۔ ان میں سے شمالی خانقاہ ہمالیہ میں بدری ناتھ کے مقام پر ' جنوبی خانقاہ میسور میں سرین گری ' مشرقی خانقاہ پوری کے ساحل اور مغربی خانقاہ کاٹھیاواڑ میں دوارکا کے مقام پر قائم کی گئی۔ یہ چاروں خانقاہیں حقیقتاً یا حکایتاً اس راہب کی بے پناہ توانائی کا ثبوت ہیں۔ اس سنیاسی راہب کی انتھک محنت نہرو کو غالباً یہ سراب دکھا گئی کہ ان چاروں دور افتادہ مقامات

کے درمیان کی تمام سرزمینیں ایک ہی "وحدت" کا حصہ ہیں۔
ویوک نند نے بھی بے شمار سفر کئے وہ نہایت سادہ زبان بولتا تھا اور اس کا پیغام بھی بہت واضح تھا۔ وہ لکھتا ہے "میں ایک سوشلسٹ ہوں' اس لئے نہیں کہ میں اسے کامل نظام سمجھتا ہوں بلکہ اس لئے کہ نہ ہونے سے تو آدھی روٹی بہتر ہے" اس نے مصر' چین' جاپان اور امریکہ تک کی یاترا کی اور جب وہ امریکہ میں تھا تو وہاں اسے "طوفانی ہندو" کے لقب سے نوازا گیا۔ ویوک نند کا انتقال 1902 میں صرف 39 سال کی عمر میں ہوا لیکن ان چند سالوں میں اس نے برصغیر کے کونے کونے میں تبلیغ کی۔ وہ ہندوستان کا ذکر بہت ہی پیار سے کرتا ہے۔ اس مفروضے کے ساتھ کہ سارا برصغیر اکائی کی شکل میں متحد ہے۔ اس نے خاص طور پر ان ہندی مفکرین پر انمٹ نقوش چھوڑے جن میں سے اکثر دانشوروں نے آنے والے فیصلہ کن برسوں میں انڈین نیشنل کانگریس کی رہنمائی کرنا تھی۔
شنکر اچاریہ اور ویوک نند کے افکار سے اخذ کردہ دلائل میں اس اٹل حقیقت کا شائبہ تک نہیں ملتا کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی سندھ اور ہند کو مربوط کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ شنکر کی مشہور زمانہ چاروں خانقاہوں میں سے ایک بھی وادی سندھ میں نہیں ہے۔ لہٰذا یہ دلیل کہ خانقاہوں کے قیام کا مقصد پورے برصغیر کی یکتائیت کو مسلمہ قرار دینا تھا' خود اپنی نفی ہے تاآنکہ اس کا اطلاق صرف وادی گنگا اور جزیرہ نما ہند تک محدود ہو۔ اور ویوک نند کے بارے میں تو اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ اس کی موت کے چند ہی دہائیوں بعد گویا تاریخ کی انتھک قوتوں کی مقناطیسیت کے زیر اثر' وادی سندھ کی مرکز گریز کشش نے برصغیر کو تقسیم کر کے پاکستان تخلیق کر دیا۔

شیر کا دہانہ

دریائے سندھ اس کرہ ارض کے انتہائی طاقتور دریاؤں میں سے ایک ہے۔ یہ چھوٹے سے جھرنے کی صورت میں تبت کے جس دور افتادہ علاقے سے جنم لیتا ہے اس سنگلاخ اور دشوار گزار مقام کو "شیر کا دہانہ" کہا جاتا ہے۔ اپنے منبع کے قریب یہ نوزائیدہ اور تیز و تند دریا ہمالیہ اور قراقرم کے پر ہیبت پہاڑوں میں سے ایک تنگ اور عمیق گھاٹی تراشتے ہوئے گزرتا ہے۔ میدانوں میں اتر کر سندھ دھیما پڑ جاتا ہے اور سرحد' پنجاب' بلوچستان اور سندھ میں چکراتا اور بل کھاتا ہوا سمندر کی راہ لیتا ہے۔ اس سفر کے دوران پنجاب کے پانچ اہم دریا' جہلم' چناب' راوی' بیاس اور ستلج مختلف مقامات پر اس سے آکر ملتے ہیں۔
میری یہ کتاب "سندھ ساگر" اسی طاقتور دریا اور اس کے معاون دریاؤں کے ساتھ ساتھ بسنے

والوں کی کہانی ہے۔ "سندھ ساگر" میں اس سرزمین کو اپنے سیاق و سباق کے حوالے سے کہیں انڈس اور کہیں وادی سندھ سے موسوم کیا گیا ہے۔ ان اصطلاحات کا مقصد علاقے کی جغرافیائی حدود کا تعین بھی ہے اور اسے باقی ماندہ برصغیر یعنی ہندوستان سے ممیز کرنا بھی۔ یہاں انڈس سے مراد وہ علاقہ ہے جو دراصل موجودہ پاکستان یا اس کے بہت بڑے رقبے پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں جہاں انڈس کا ذکر بطور دریا ہوا ہے تو وہاں اسے انڈس کے بجائے دریائے سندھ کہا گیا ہے۔ وادی سندھ یا انڈس کے رہنے والوں کو سندھ واسی اور اس علاقے کی ثقافت کو وادی سندھ کی ثقافت سے موسوم کیا گیا ہے لیکن یہ اصطلاح وہاں استعمال نہیں کی گئی جہاں پورے پاکستان کا احاطہ کرنا بنیادی مقصد رہا ہے۔

وادی سندھ (پاکستان) کا ثقافتی ورثہ بہت شاندار اور بھرپور ہے۔ یہ ہر لحاظ سے ایک علیحدہ اور منفرد قوم کا ممتاز ورثہ ہے۔ لہٰذا اس بات کا قطعاً خدشہ نہیں کہ کوئی اور ملک اس ریاست کو تباہ کردے یا اسے خود میں ضم کرلے۔

حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ چھ ہزار سالوں کے دوران وادی سندھ نے کم و بیش ساڑھے پانچ ہزار سال تک ہند سے الگ خود مختار حیثیت برقرار رکھی ہے۔ صرف موریا' مغل اور فرنگیوں کی "عظیم سلطنتوں" کے دوران یہ دونوں خطے ایک واحد مملکت کے طور پر اکٹھے ہوئے لیکن ان سلطنتوں کا مجموعی دورانیہ بھی پانچ سو سال سے زیادہ نہیں تھا۔ باقی تمام عرصہ یعنی زمانہ قبل از تاریخ سے انیسویں صدی تک ' انڈس پاکستان رہا ہے اور 1947 کا واقعہ محض اس حقیقت کی تجدید تھا جس نے وادی سندھ کے مختلف حصوں یعنی سرحد ' پنجاب ' سندھ ' بلوچستان اور کشمیر کو پھر سے اسی بنیادی وفاق کی مانند متحد کردیا جو ہزاروں سال سے اس علاقے کی قدرتی ترجیح رہا ہے۔ "مہاجر" جو 1947 میں ہند سے وادی سندھ میں آئے دراصل اسی دھرتی کے بیٹے اور بیٹیاں ہیں جو اب مادر وطن کی جانب لوٹ آئے تھے۔ برصغیر میں اسلام کی آمد سے بہت پہلے انڈس یا وادی سندھ کا ایک علیحدہ تشخص تھا۔ یہ محض تفریق کی ایسی دراڑ نہیں تھی جسے 1937 سے 1947 کی دس سالہ قلیل مدت میں ایک قوم نے اپنے لئے تخلیق کرلیا تھا 'اگرچہ بعض ہندوستانیوں کا یہی خیال ہے۔

جغرافیائی اعتبار سے بھی برصغیر ہمیشہ سے کم از کم دو واضح خطوں میں منقسم رہا ہے۔ ایک "ہند" جو گنگا کے میدانوں اور جزیرہ نمائے ہند پر مشتمل تھا اور دوسرا "وادی سندھ" جو دریائے سندھ اور اس کے معاون دریاؤں کے طاس پر محیط تھا۔ اصل حقیقت بھی یہی ہے کہ یہ دونوں علاقے یعنی ہند اور سندھ شاید ہی صحیح معنوں میں کبھی ایک ہوئے ہوں۔ سندھ ' ستلج ' بیاس ' راوی ' چناب اور جہلم کے طاس پر مشتمل انڈس یا وادی سندھ صدیوں سے سیاسی اور معاشی اعتبار سے ایک مکمل اور خود مختار اکائی

رہی ہے۔ جب کہ آریاؤں کی آمد کے بعد تو وادی سندھ کو اور کسی بھی دریائی نظام ' جزیرہ نما ' میدانی علاقے ' صحرا (ہندی یا عرب) کی نسبت آکسس Oxus (آمو دریا) اور جسار ٹیس Jaxartes (سر دریا) کے ساتھ زیادہ قربت حاصل رہی۔

سندھ اور ہند

برصغیر کی وحدت پر موجودہ اعتقاد بنیادی طور پر دیو مالائی کہانیوں کی من مانی توضیحات کا پیدا کردہ ہے۔ حالیہ وقتوں میں برطانوی راج کی توسیع پسندانہ اور مربوط گرفت نے بھی اس یقین کو تقویت بخشی۔ برصغیر کی "ایکتا" کے اس تصور کو جسے برطانوی راج کے محفوظ اور مضبوط دور حکومت نے رواج دیا تھا' ہندی تاریخ دانوں نے بڑی بے صبری اور وادی سندھ کے تاریخ دانوں اور سیاسی مفکرین نے بغیر پوچھ گچھ کے اپنا لیا۔ ہندیوں کے نزدیک یہ بالکل فطری اور ناگزیر فیصلہ تھا لیکن وادی سندھ کے وہ محققین بھی اس عظیم تحریک کی روح اور اس کی تاریخی ' سیاسی اور سماجی بنیادوں کا محض جزوی احاطہ کر پائے جو مسلمانوں کی علیحدہ قومیت کے نظریئے (دو قومی نظریئے) کے عقلی دلائل کی کھوج اور قیام پاکستان کیلئے کوشاں رہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ گزشتہ دو صدیوں کے دوران دنیا کافی سکڑ گئی ہے۔ پہلے دخانی جہاز ' ریلوے انجن ' ٹیلی گراف ' اس کے بعد ہوائی جہاز ' ریڈیو ' ٹی وی ' ٹیلی فون اور اب سیٹلائٹ نے ثقافتوں کے ادغام و انضمام کیلئے راہ ہموار کی۔ ابتدائی دور کی بیشتر ایجادات کا زمانہ وہی ہے جب برصغیر انگریز راج کی متحد رکھنے والی سیاسی گرفت کا اسیر تھا اور تقسیم سے سو سال پہلے کے زمانے میں بظاہر وادی سندھ اور ہندوستان ایک وحدت کی شکل میں یک جان دکھائی دیتے تھے۔

لیکن در حقیقت یوں نہ تھا کیونکہ ان تمام ازلی اساسی محرکات نے اپنی خو نہیں بدلی تھی جو ایک ثقافت ' ایک نظام سیاست اور ایک معاشرہ تشکیل دیتے ہیں۔ وادی سندھ فی الحقیقت ہند کا حصہ کبھی نہیں رہی۔ اس میں شک نہیں کہ دونوں تہذیبوں نے ایک جیسے بہت سے خواص اپنا لئے تھے۔ ان میں سے چند اہم تھے اور باقی محض سطحی اور بس ' اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ ہاں ' البتہ وادی سندھ کی ہر ایسی خاصیت کے قلب میں ایک بے قرار مرکز گریز قوت یقیناً مصروف کار رہی۔

ایکتا کے تصور کے اسیر ہو کر پاکستانی اور ہندی تاریخ دانوں نے ہمیشہ وادی سندھ کی تاریخ کو مکمل طور پر برصغیر کی تاریخ سے منسلک کئے رکھا۔ انہوں نے پارتھیا ' باختر ' خیرہ آرال کے اطراف یا فارس میں ہونے والی کہیں زیادہ دور رس تبدیلیوں کو نظر انداز کر کے پاکستان کا ناطہ وسطی ہند ' دکن اور

جنوب کی سیاست سے جوڑنے کو ترجیح دی۔ آج تک تاریخ دان وادی سندھ کی رنگارنگ اور متنوع تاریخ کو "ہندی" تاریخ کا جزولاینفک گردانتے ہیں۔ اسی لئے جب صرف وادی سندھ کی تاریخ پر بات ہوتی ہے تب بھی وہ اس خطے کی سیاست کے بجائے ہندی سلسلہ شاہی کی حکومتوں اور ان کے رسوخ کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں جب کہ وسطی ایشیا اور فارس کے براہ راست اثر انداز ہونے والے واقعات اور تبدیلیوں کو اہمیت کم دی جاتی ہے۔

اکثر پاکستانی تاریخ دان تو وادی سندھ اور ہندوستان کے مابین اس قدرتی اور تاریخی تفریق سے ہم آہنگ، 1947 کی تقسیم برصغیر کی اہمیت کا صحیح ادراک نہ کر سکے۔ بہت سے پاکستانی محققین اور مصنفین نے تقسیم کو جواز مہیا کرنے اور ہند سے متعلق ہر چیز سے اجتناب کے جوش میں پاکستان کی ثقافتی بنیادوں کو اس خطے سے قطعی طور پر غیر متعلق علاقوں سے جوڑ دیا۔ اور ایسا تقسیم کے عمل کی قدیم طبعی بنیادوں کو خاطر میں لائے بغیر کیا گیا۔ اس طرح ہند کو مسترد کرنے کی کوشش میں انہوں نے وادی سندھ کو ہی مسترد کر دیا۔ اس انداز فکر نے انہیں نادانستہ لیکن بہت ہی واضح طور پر وادی سندھ کی ثقافت کے ان پہلوؤں کی نشان دہی سے باز رکھا جو ہندی ثقافت کے ساتھ مشترک تھے اور جن کا اعتراف کئے بغیر یہ ممکن نہیں کہ ہم وادی سندھ (پاکستان) کے موجودہ معاشرے کے ایک اہم جزو یعنی "مہاجر" کے اس جائز فخر کو سمجھ سکیں جو وہ اپنی جائے پیدائش آگرہ، لکھنؤ یا الٰہ آباد سے تعلق کے باعث محسوس کرتا ہے۔ لیکن اپنے زمینی تعلق سے منحرف پاکستانی اشرافیہ کا خیال تھا کہ پاکستان کے قیام کا جواز اسی صورت میں برقرار رہ سکتا ہے اگر پاکستانی تشخص کو ہندی ثقافت سے مکمل طور پر علیحدہ اور مختلف ثابت کر دیا جائے۔

اس فکر کے پیچھے غالباً یہ خوف ہے کہ وادی سندھ اور ہندوستان کے درمیان کسی بھی قدر مشترک کا پایا جانا، پاکستان کے منطقی جواز کی تکذیب کا باعث ہوگا اس لئے پاکستانی محققین کے لئے علاقائی قربتوں کو نظر انداز کر کے اپنی جغرافیائی حدود سے باہر کے لوگوں کے ساتھ ثقافتی اقدار کی مماثلت ایک اہم ضرورت بن گئی۔ اور خطے سے کہیں باہر پاکستانی شناخت کی تلاش میں ہمارے مورخ اور نظریہ دان "عرب عنصر" کے اسیر ہو گئے۔

مسلم علیحدگی کے فلسفے کا تعلق وادی سندھ کے لوگوں پر مشرق وسطیٰ کے عرب رسوخ سے منسوب کر کے "تشخص کی تبدیلی" Personality Switch کا ایک نظریہ پیش کیا گیا۔ اس طرح پاکستانی فرد کی ایک شناخت سے علیحدگی اور دوسری شناخت میں تحلیل ہونے کے نظریے پر بہت زور دیا جاتا ہے اور پھر اسی شدت سے اس نظریے کے واحد اور ناقابل تردید حقیقت ہونے کا پرچار بھی کیا جاتا

ہے لیکن یہ دونوں باتیں محض جزوی طور پر درست ہیں کیونکہ پاکستانی تشخص کی ساخت کے صدیوں پہ محیط عمل میں نہ تو کبھی مکمل ثقافتی انقطاع اور نہ ہی کوئی مکمل ثقافتی ادغام عمل میں آیا البتہ ان مفروضوں نے "مقامی" (جو کہ "تشخص کی تبدیلی" کے نظریے کا شکار ہے) اور "مہاجر" (جو ہمیشہ اپنی ہندی جائے پیدائش کو یاد کرتا ہے اور اسی ماحول میں زندہ بھی ہے) کے درمیان تصادم کرا دیا۔

"تبدیلی تشخص" کا یہ تصور یعنی سندھ واسی کا ایک غیر علاقائی روپ دھار لینا کسی حد تک تاریخی حقائق کے خلاف ہے کیونکہ سندھ واسی کا عربوں کے ساتھ باہمی ربط تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔ آریاؤں کی آمد سے آج تک کی طویل مدت میں ساری وادی سندھ میں سے صرف صوبہ سندھ کا عربوں کے ساتھ براہ راست سیاسی رابطہ ہوا ' اور وہ بھی نہایت مختصر مدت کیلئے۔ یعنی 711 سے 854 تک ' محض 144 سال۔

وادی سندھ سے اتنے مختصر براہ راست رابطے کے باوجود عرب مصنف اتنے زیرک تھے کہ وہ وادی سندھ کے ہندوستان سے ممیز اور مختلف ہونے کا ادراک دے گئے۔ ان کے نزدیک اس ضمن میں شک وشبے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ انہوں نے ہمیشہ دونوں سرزمینوں کو ایک دوسرے سے الگ سمجھا۔ وہ ہمیشہ اور بڑے تواتر سے وادی سندھ کو "السندھ" اور انڈیا یا ہندوستان کو "الہند" کے نام سے موسوم کرتے رہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جب میں کہتا ہوں کہ تاریخی حوالے سے وادی سندھ اور عربوں کے درمیان روابط محدود تھے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وادی سندھ اور اسلام کے درمیان یہ روابط غیر اہم تھے۔ اس کے برعکس مسلمان فاتحین ' سلاطین اور صوفیا کے ذریعے اسلام کا پیغام کئی صدیوں سے مسلسل وادی سندھ تک پہنچ رہا تھا حتیٰ کہ بارھویں صدی تک اسلام وادی سندھ کا غالب مذہب بن چکا تھا لیکن محمد بن قاسم کے علاوہ یہاں آنے والے منگول ' افغان ' ترک یا ایرانی حملہ آوروں ' عسکری بادشاہوں اور صوفی راہبوں کا براہ راست تعلق زیادہ تر وسطی ایشیا اور فارس سے تھا۔ جزیرہ نمائے عرب سے نہیں۔ چند اتفاقیہ اور عارضی روابط کے علاوہ سندھ واسیوں اور عربوں کے درمیان مشترکہ ثقافتی اقدار کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے۔

یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ نسلی ' گروہی ' لسانی اور سب سے بڑھ کر ثقافتی اعتبار سے پاکستانی عوام ' اسلام سے اپنی بے پناہ عقیدت کے باوجود عربوں کے بجائے وسطی ایشیائی اور ایرانیوں کے زیادہ قریب ہیں۔ صحیرہ عرب اور مون سون ہوائیں وادی سندھ اور جزیرہ نمائے عرب کو علیحدہ اور دونوں کے درمیان تمدنی فاصلے کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

مون سون ہوائیں بحیرہ عرب کو جن سمتوں میں عبور کرتی ہیں وہ عربوں کو دریائے سندھ کے دہانے کی طرف لے جانے کی بجائے جزیرہ نمائے ہند کی طرف لے جاتی تھیں۔ جب کہ محمد بن قاسم کی آمد ایک ہنگامی سیاسی ضرورت کا منطقی نتیجہ تھی۔ اس کا مشن ایک سیاسی نوعیت کی ہنگامی صورت حال میں وقوع پذیر ہوا تھا۔ ورنہ ہندوستان کے ساحلی علاقوں کے برعکس نہ تو عرب تاجروں اور نہ ہی عرب فوجوں کا رجحان وادی سندھ کی جانب تھا۔

اس حقیقت کو شاذ ہی معروضی اور غیر جذباتی انداز میں سمجھنے کی سعی کی گئی ہے اور ہمیشہ فرضی دلائل کے ذریعے وادی سندھ کا اٹوٹ تعلق یا تو ہند سے اور یا پھر ثقافتی اعتبار سے قدرے دور دراز سرزمینوں سے جوڑنے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ ایک نے اگر ماضی کو مسخ کیا تو دوسری حال کو سرگرداں کئے ہوئے ہے۔

پاکستان کی زخمی روح

پاکستان کا ہمیشہ سے ایک وجود تھا اور اس کا ہمیشہ سے ایک تشخص ہے لیکن یہ تشخص غیر منطقی توضیحات، علم دشمن منافقت اور دوغلے پن کی دھند میں کھویا رہا۔ یہ تشخص آج فرقہ واریت، لسانیت اور علاقائیت کی عدم برداشت اور برادرکشی کی چیرہ دستیوں سے چھلنی، کرپشن اور ظاہری نمود و نمائش کے زہر سے گھائل اور حکمرانوں کی موقعہ پرستی اور بے اصولی کے ہاتھوں یرغمال ہے۔ لیکن ہمارا تشخص ایک ایسا رنگارنگ اور جھلملاتا کپڑا ہے جس میں بہت سے مختلف اور نیارے دھاگوں سے بنت ہوئی ہے اور جو ہمیشہ امن و آشتی کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ و ہم وجود رہے ہیں کہ ہر ایک تار، بنت کی مضبوطی اور قدر میں اضافے کا باعث ہے۔

وقت آ گیا ہے کہ فرقہ واریت، لسانیت اور علاقائیت کے فشار، موقعہ پرستی اور نمود و نمائش کی پھیلائی گئی زہریلی دھول کو اس جھلملاتے کپڑے پر سے جھٹک دیا جائے تاکہ اس کی اصل تابندگی قوم کے بیٹوں اور بیٹیوں پہ آشکار ہو سکے اور اپنی قوم کی باطنی قوت پر ان کا اعتماد بحال ہو۔

یہ وقت ہے اس روح اور اس سے منسلک خواب کو پھر سے دریافت کرنے اور اصل شکل میں بحال کرنے کا۔ یہ وقت ہے پاکستان کو ایک روادار، ترقی پسند اور جدید مسلم ریاست کے طور پر کھوج نکالنے اور اقوام عالم میں اس کا جائز مقام دلوانے کا۔ پاکستان کی گم گشتہ روح کی تلاش کا یہی مقصد ہے۔

میں نے کوشش کی ہے کہ اپنے دلائل کی حمایت میں بے لاگ شواہد پیش کروں، اس لئے میری حیثیت نہ تو حریف مقابل کی ہے اور نہ ہی ایک اطاعت گزار جی حضوریئے کی۔ میرا خیال ہے کہ

میں نے اس کتاب میں استدلال کی راہ اپنائی ہے۔ یہ کوشش ہے اس 'روگ ناپائیداری' سے نبٹنے کی جو ہمارے لئے سوہان روح بھی بنا ہے اور ایک عذاب مسلسل بھی۔ لوگ ایک غیر منطقی خوف کے سائے میں زندہ ہیں جیسے کوئی اور ملک یا طاقت ہم پر غلبہ حاصل کر کے ہمیں اپنے اندر مدغم کر لے گی۔ یہ کتاب اس قوم میں اعتماد پیدا کرنے کی ایک نحیف سی کوشش ہے جو حالیہ پچاس سال سے اپنا حقیقی اور گذشتہ چھ ہزار سال سے ایک تاریخی وجود رکھتے ہوئے بھی اس اعتماد سے عاری ہے۔

اور اس کاوش کا بنیادی مقصد بھی صرف یہ ہے کہ کہ پاکستانی فرد کو یہ باور کرایا جائے کہ اس کا ملک قدیم، مضبوط اور ناقابل شکست بنیادوں پر قائم ہے۔ شاید یہ کتاب 'ہند کے ان جنگجو' عناصر کو اپنی رائے بدلنے پر مائل کر سکے جو پاکستان کو تاریخ کی غلطی سمجھتے ہیں۔

ہندوپاک تفریق کی جڑیں تاریخ کی گہرائیوں سے پھوٹتی ہیں۔ اس تفریق کو اختلاف یا فساد کی جڑ نہیں بلکہ ایک تاریخی حقیقت کے طور پر تسلیم کیا جانا چاہئے۔ مجھے امید ہے کہ ایک فریق کا اعتماد اور دوسرے کی حقیقت سے آگہی نئے اور دائمی تعلقات کی بنیاد بنے گی اور برصغیر کی دو عظیم تہذیبوں کے درمیان مخاصمت کا خاتمہ ہوگا۔

اپنی بنیادوں کی مضبوطی پر یقین رکھنے والے پاکستانی اور برصغیر کی تاریخ کی عقلی توضیح کرنے والے ہندی کو اپنے اپنے ماخذ کے بہتر ادراک کے ساتھ آگے آنا چاہئے۔ اسی صورت میں یہاں دائمی امن قائم ہو سکتا ہے کہ جدید دنیا کے دو غریب ترین اور گنجان آباد ممالک کی ترقی کیلئے امن ہی شرط اولین ہے۔

ماضی اور مستقبل کے درمیان ایک پُل

میں اس عنوان کے تحت جو کہنا چاہتا ہوں یہ غالباً ثقافتی تاریخ کے زمرے میں آتا ہے لیکن میرے خیال میں زیادہ بہتر یہی ہے کہ اسے "سیاسی کلچر" کی تاریخ کہا جائے۔ بہر حال یہ زمرہ بندی اس بحث کیلئے چنداں ضروری نہیں کیونکہ میرا اصل مقصد قدرے محدود ہے۔

میں نے سبھی تو نہیں صرف چند ثقافتی رجحانات کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ یہاں تحقیق کی غایت ہی اس ترجیحی فکر کا جواز ہے کیونکہ یہ مطالعہ زیادہ تر سیاسی و اقتصادی کلچر کے رجحانات پر مرکوز ہے۔ لہٰذا جب میں کسی نکتے کی وضاحت میں شاعری کا حوالہ دیتا ہوں تو میں دیگر فنون لطیفہ مثلاً رقص، موسیقی یا مصوری کا، ان کے تاریخی تناظر میں جائزہ نہیں لیتا۔ دوسری بات یہ کہ میں نے ہر اہم تاریخی واقعے یا حقیقت کا تجزیہ کرنا ضروری نہیں سمجھا بلکہ میں نے انہی چند عناصر کا انتخاب کیا جو میرے خیال

میں آج کے سندھ واسی (پاکستانی شہری) کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ مقصد یہی ہے کہ وہ اپنی واضح شناخت (اگر کوئی ہے) کو ڈھونڈ نکالے اور اگر ممکن ہو تو اس شناخت کو تاریخی حقائق کی مضبوط بنیادوں پر استوار کر سکے۔

یہاں ایک اور وضاحت بھی ناگزیر ہے کہ حقائق کا ماخذ اگرچہ بنیادی طور پر وادی سندھ کا کلچر ہی ہے لیکن اس خطے سے پرے کے بہت سے سیاسی اور اقتصادی حقائق بھی اس تحقیق سے متعلق ہیں۔ لہٰذا جہاں تک یہ بیرونی حقائق سندھ واسی کے تشخص پر روشنی ڈالتے ہیں' اس حد تک ان کا مطالعہ میری اس کتاب کے موضوع سے باہر نہیں۔

مجھے مورخ ہونے کا دعویٰ نہیں' میں تو خود کو محض ایک تاریخ نویس بھی نہیں کہہ سکتا۔ لیکن میرا یقین ہے کہ میں اور میرے ہم عصر' ماضی اور مستقبل کے درمیان ایک پل کے مانند ہیں۔ ماضی' (خاص طور پر جدوجہد آزادی کی تفصیلات کی شکل میں جو کچھ ہمیں والدین سے ورثے میں ملا) اسے اگلی نسل تک پہنچایا جانا ضروری ہے۔ وہ نسل جو آج اپنے ماضی کی پہچان کے عمل سے گزر رہی ہے۔ امید کی جانی چاہئے کہ یہ نسل اس ورثے کو ماضی کے تعصبات سے آلودہ کئے بغیر' ایک مستحکم اور قدیم ریاست کے پراعتماد باشندوں کے انداز میں آئندہ نسلوں تک پہنچائے گی۔

مورخین شاید اپنے شعبے میں میری مداخلت پر برافروختہ ہوں۔ ان کا اعتراض برحق لیکن جو قدیم تہذیبیں آج کے ٹھوس اور قائم ودائم پاکستان کے وجود میں جھلکتی ہیں' ان کی بنیادوں کا کھوج لگانے کیلئے یہ خطرہ تو مجھے مول لینا ہی پڑتا تھا۔

میں قصے' کہانیوں' روایات' گیتوں اور رسومات کے ذریعے پاکستان کی دریافت نو پہ گامزن ہوا ہوں۔ اور ہر قصہ' کہانی' روایت' گیت اور رسم' انتہائی قدیم سے نسبتاً جدید تک اور ماقبل از اسلام سے بعد از اسلام تک' مجھے یقین دلاتی ہے کہ دریائے سندھ اور اس کے معاون دریاؤں کی زمینوں پر ہمیشہ سے ایسی آزاد ریاست یا خطہ موجود رہا ہے جو ہند سے بالکل الگ تھا۔

تاریخ کی ان قدیم شاہراہوں پر اس سفر کے دوران میں اس خطے کی تاریخ کے بہت ہی مسحور کن اور پرکشش ادوار سے گزرا۔ گو مجھے علمیت یا تاریخ بیانی کی مہارت کا دعویٰ نہیں لیکن اس کے باوجود میں قاری کو اس سفر میں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔

اس کتاب میں شامل چند موضوعات میرے انگریزی مضامین کے اس مختصر سلسلے میں شامل تھے جو میں نے 1993ء میں شائع کرائے۔ ان مضامین کی پذیرائی نے مجھے خاصہ حوصلہ دیا۔ حالانکہ کچھ تنقید بھی ہوئی جو ناگزیر تھی۔ مضامین کے اس سلسلے کو سمیٹتے ہوئے میں نے ان سب کا شکریہ ادا کیا تھا

جنھوں نے میری حوصلہ افزائی کی اور انہیں یقین دلایا تھا کہ اپنی دیگر مصروفیات کے ساتھ ساتھ میں اس سرزمین کے اسرار کو آشکار کرنے کی جدوجہد جاری رکھوں گا جس زمین نے مجھے جنم دیا اور جس سے مجھے والہانہ پیار ہے۔ یعنی پرشکوہ سندھ اور اس کے عظیم معاون دریاؤں کی سرزمین 'پاکستان۔

جو لوگ میرے اخذ کردہ بعض نتائج پہ برہم ہیں جیسے مجھے اصرار ہے کہ ہر قسم کی بنیاد پرستی کا کلچر وادی سندھ کیلئے اجنبی ہے۔ ان سے میں کہنا چاہوں گا کہ میرا ہرگز یہ دعویٰ نہیں کہ میں نے وادی سندھ کی تاریخ پر آخری فیصلہ صادر کر دیا ہے۔ میرے تاثرات کی تردید میں سہی 'شاید میری تحریر انہیں اپنا تجزیہ پیش کرنے پر مائل کر سکے۔ تحقیق کے اس شعبے میں 'جدھر کم ہی لوگ رخ کرتے ہیں' میں ان کی نگارشات کا منتظر رہوں گا۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی میرے لئے باعث طمانیت ہوگی اگر میری اس کوشش کے نتیجے میں ہمارے ماضی کے حوالے سے تحقیق کا ایسا سلسلہ شروع ہو جائے جہاں مجھ سے بہتر اہل علم اور تاریخ کے طالب علم اس کام کو آگے بڑھا سکیں۔

عام طور پر ہم اپنے ماضی کو اپنے حال کے آئینے میں دیکھتے ہیں۔ ہمارا ماضی در حقیقت اب ہمارے حال میں ضم ہو چکا ہے۔ کسی بھی حال کا وجود اپنے ماضی کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ کتاب ہمارے ماضی سے متعلق ہے۔ حد سے بڑھی ہوئی بنیاد پرستانہ جہل پسندی اور عصر حاضر کے بہت سے بے لچک تعصبات ہمارے ماضی کے تجزیئے کو آلودہ بلکہ شکستہ کر سکتے ہیں اور میں نے اس روایت سے پہلو تہی کی دانستہ کوشش کی ہے۔ میں اسے اپنی کامیابی سمجھوں گا اگر دوسرے لوگ اس مقام سے شروع کریں جس سے آگے جانا میری استعداد اور صلاحیتوں سے ماورا تھا۔

میں یہاں ایک اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ یہ کتاب تحریر کرتے ہوئے 'سراسر اپنی مجبوریوں کے باعث، میری توجہ کا بڑا مرکز پنجاب رہا ہے حالانکہ میں نے کئی جگہ وادی سندھ کے دوسرے علاقوں یعنی سندھ 'بلوچستان 'سرحد اور کشمیر کے واقعات سے بھی استفادہ کیا ہے لیکن میری خواہش ہے کہ ان علاقوں سے تعلق رکھنے والے اہل علم اس تحقیق کو آگے بڑھائیں اور میرے اخذ کردہ نتائج کو مضبوط تر جواز مہیا کریں۔

موضوعاتی انداز فکر

عموماً سیاسی تاریخ کے واقعات کا بیان یک رخی دھارے کی مانند ہوتا ہے۔ ہر واقعہ اپنے نقطہ آغاز سے کم و بیش ایک خط مستقیم میں انجام کی جانب بڑھتا ہے۔ اسی طرح عظیم مغلیہ خاندان کی کہانی

بھی بابر سے شروع ہو کر 1707ء میں اورنگزیب کی موت پر ختم ہو جاتی ہے۔ پھر ایک نیا سلسلہ، سلاطین کا ایک نیا دور، محلاتی سازشوں، فوجی مہم جوئی، فتوحات، شاہی شادیوں، بخشش اور فرامین کی ایک نئی لہر، ایک نئی تاجپوشی سے ایک اور موت تک جاری رہتی ہے۔

لیکن کسی قوم کے ثقافتی سفر کی داستان اس طرح نہیں ہوتی۔ ثقافتی تاریخ کی اصل جاننے کیلئے ہمیں کوسمبی کی طرح سوال پوچھنا اور اس کا جواب ڈھونڈنا پڑتا ہے کہ "تاریخ ہے کیا؟"

اگر تاریخ محض خبط عظمت کا شکار ہونے والے مشہور ناموں کے تسلسل اور مرعوب کن جنگوں ہی کا نام ہے تو ہندی تاریخ کی تالیف ایک مشکل کام ہوگا لیکن اگر کسی بادشاہ کا نام جاننے کی نسبت یہ معلوم کرنا زیادہ اہم ہے کہ اس کی قوم کے پاس ہل تھا یا نہیں، تب یقیناً ہندوستان ایک تاریخ ہے۔"

اس وضاحت کے بعد کوسمبی قدیم ہند کی ثقافت اور تہذیب کے تاریخی خاکے کی یوں تعریف کرتا ہے کہ، "ذرائع پیداوار اور پیداواری رشتوں میں بتدریج ہونے والی تبدیلیوں کو تاریخ وار پیش کرنے کا نام تاریخ ہے۔ اس تعریف کا فائدہ یہ ہے کہ تاریخ کو سلسلہ وار تاریخی واقعات سے ہٹ کر بھی لکھا جا سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی قوم کے طرز حیات کے اہم پہلوؤں کو بیان کرتے ہوئے ثقافت کو انسانی نسب و نسل (رسم ورواج) کے ماہر کی حیثیت سے پرکھنا بھی ضروری ہے۔"

ایک آدھ استثناء کے ساتھ، مندرجہ بالا تعریف "سندھ ساگر" کے بیشتر حصوں پر لاگو ہوتی ہے کہ ثقافتی تاریخ کا ترتیب وار ہونا ضروری نہیں۔ ثقافت کا نہ تو کوئی مخصوص نقطہ آغاز ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی نقطہ انجام۔ یہ ایک غیر شکستہ تسلسل کا نام ہے۔ کچھ عوامل کے اثرات کئی نسلوں کے بعد ظاہر ہونا شروع ہوتے ہیں۔ کچھ عوامل خوابیدہ رہتے ہیں اور ان کا اندازہ صرف اس وقت ہوتا ہے جب بعد کے واقعات سے حالات میں تبدیلیاں رونما ہو جاتی ہیں۔

کسی قوم کی ثقافتی تاریخ کو حتمی طور پر بیان کرنے کا دعوی نہیں کیا جا سکتا۔ جب مختلف عوامل برسرپیکار ہوتے ہیں یا جب مفادات کا باہمی ٹکراؤ جاری ہوتا ہے یا مختلف رجحانات آپس میں شیر و شکر ہو رہے ہوتے ہیں تو ہر ایک کا ردعمل مختلف ہوتا ہے۔

تجزیہ نگار بھی ان کی توضیح کرنے میں ایک جیسی بصیرت کا مظاہرہ نہیں کرپاتے۔ لہٰذا ثقافتی تاریخ کی مختلف بلکہ متضاد اور متحارب تاویلات کی گنجائش ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ لیکن جب کوئی بھی کسی قوم کی ثقافتی تاریخ لکھنے کا بیڑا اٹھاتا ہے تو وہ دراصل ایک مخصوص عہد اور ہم عصر فرد کے ہر جزو ترکیبی کو دریافت کرنے کی راہ پر گامزن ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ فرد کو اس کے زمان و مکان کے حوالے سے تشکیل دینے میں کوشاں رہتا ہے۔ ایسا کرتے ہوئے مورخ کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اس

عہد کے انسان کے جبلی یا شعوری خصائل، جذبات، رد عمل، عادات، خوف اور خوشی کے میلانات کا پتہ لگائے۔ اس کی بنیادوں کو ڈھونڈ نکالنے میں مورخ اسے ایک فرد کی حیثیت سے شناخت کرنا چاہتا ہے۔ فرد، جو دوسری تمام اقوام سے الگ تھلگ صرف اپنی قوم کا ایک جزو ہو کر اور صرف اپنے زمانے میں زندگی گزار رہا ہوتا ہے۔

بالعموم یہ تحقیق ایک ترتیب دار سلسلہ ہوتی ہے لیکن زیادہ سختی سے اس اصول پر کاربند نہیں ہوا جا سکتا۔ تحقیق کا انداز موضوعاتی ہوتا ہے۔ کئی ابواب اور ان کے بعض حصے زمانے کے اعتبار سے متراکب ہوتے ہیں۔ لیکن ایسا صرف زمانے کے حوالے سے تو ہو سکتا ہے، صرف اسی ایک حوالے سے موضوع یا تاریخی واقعات جو کسی تصور یا نتیجے کی وضاحت کرتے ہوں، آپس میں متراکب نہیں ہوتے۔

خود فریبی کا مہین لبادہ

یہ کتاب پڑھتے ہوئے آپ کو بآسانی اندازہ ہو جائے گا کہ میں نے تاریخی واقعات کو جس تناظر میں پرکھنے کی کوشش کی ہے وہ حوالہ کسی بادشاہ یا شہنشاہ کا نہیں کہ میں اکبر اعظم کے ساتھ کھڑا ہو کر شاہی قلعے کی فصیل سے نیچے والوں کو دیکھ رہا ہوں تا بلکہ میں تو نیچے رعایا کے ساتھ ' اوپر فصیل پہ کھڑے اکبر اعظم کو دیکھ رہا ہوں۔ میں گلی میں کھڑے لوگوں ' شہریوں اور دہقانوں میں گھل مل جاتا ہوں۔ اور یہاں سے مجھے نہیں لگتا کہ شہنشاہ مکمل طور پہ محفوظ ہے۔ میں لوگوں کی سرگوشیاں سنتا ہوں ' میں ان کی بددلی محسوس کر سکتا ہوں اور یہیں میری ملاقات عبداللہ بھٹی سے ہوتی ہے۔ وہی مشہور باغی ' دلا بھٹی۔

وادی سندھ (پاکستان) کی تاریخ بیان کرنے کا میرا اپنا انداز ہے۔ یہ مزاحمت کرنے والے دلیر اور جری مردوں اور عورتوں کی کہانی ہے۔ میں ان لوگوں کو راجہ رسالو کی طرح آسیبوں اور عفریتوں سے لڑتے دیکھتا ہوں۔ پھر میں ان بظاہر عام شہریوں کو شیخا اور جسرت گکھڑ کے ہمرکاب قہر عالم اور فتح مجسم تیمور کے خلاف برسرپیکار دیکھتا ہوں۔ میں ان بے مایہ لوگوں کو سارنگ ' ارجن ' دلا بھٹی ' شاہ عنایت ' چاکر خان ' خوشحال خان ' احمد کھرل اور بھگت سنگھ کے جھنڈوں تلے جمع ہوتے دیکھتا ہوں۔

یہ سب لوگ اجنبی مہم جوؤں ' حملہ آوروں اور شاہی فوجوں کے خلاف لڑنے کیلئے جمع ہوئے تھے۔ اس کے باوجود تاریخ کی مستند اور سرکاری کتابوں میں ان کا کوئی ذکر نہیں یا اگر ہے تو نہ ہونے کے برابر۔ ان کی کہانیاں ' ان فرضی قصوں سے مطابقت نہیں رکھتیں جو ہم نے صرف اپنی تشفی کے لئے خود گھڑ رکھے ہیں۔

میں یہ اخذ کرنے پر مجبور ہوں کہ وادی سندھ کے اکثر مورخ بھی ہندی مسلمانوں کے تاریخ دانوں کی طرح اسی غیر منطقی رویئے کا شکار ہیں جس کا ذکر ایم مجیب نے اپنی شاندار تخلیق ''دی انڈین مسلم'' The Indian Muslim میں کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ''اپنے بارے میں ہندی مسلمانوں کی رائے یا تو مدح ذات پر مبنی ہے یا خود ترسی پر۔ وہ یا تو اپنے آپ کو مذہبی سچائی اور سیاسی بصیرت کا مجسم شاہکار سمجھتے ہیں یا توازن کے اتنے ہی فقدان کے ساتھ اپنے آپ کو مطعون کرتے ہیں کہ وہ ایسی قوم ہیں جو کسی طرح بھی ان اسلاف کے وارث کہلانے کے حقدار نہیں جنہوں نے ساری دنیا میں خدا کا پیغام پھیلایا اور سماجی و سیاسی انصاف کی ارفع مثالیں قائم کیں۔ یہ دونوں انتہا پسندانہ موقف، گمراہ کن ہیں۔ حقائق سے اس طرح آنکھیں چرانا ہمیں تاریخی شعور اور ہمعصر سماج کی اس فہم سے دور لے جاتا ہے جو صحت مند معاشرتی ارتقاء کے لئے ناگزیر ہے اسی طرح، فیصلے صادر کرنے والوں کی ایک اور نسل بھی ہے جس نے کم و بیش گزشتہ ایک صدی سے موازنے اور تقابل کا ایک انتہائی معذرت خواہانہ رویہ اپنا رکھا ہے۔ وہ مغرب کے طرز زندگی، طور اطوار اور ہندو رسم و رواج کی خامیوں کو خوب اچھالتے ہیں تاکہ یہ کہا جا سکے کہ مسلمان خواہ جتنے بھی برے سہی، ان سے زیادہ برے لوگ بھی روئے ارض پر موجود ہیں۔'' یہاں میں کہنا چاہوں گا کہ جب تک ہم اپنے بارے میں معروضیت کے ساتھ لکھنے اور پڑھنے پر آمادہ نہیں ہو جاتے ہم اسی طرح اپنی شناخت کے بارے میں تذبذب اور اپنی خوبیوں اور خامیوں کے بارے میں جہل پسندانہ وضاحتوں کا شکار رہیں گے۔

ایک صاحب بصیرت پاکستانی مورخ کے کے عزیز نے کیا خوب کہا ہے کہ ''حکومتوں کی طرح عوام کو مورخ بھی ویسے ہی ملتے ہیں جن کے وہ مستحق ہوتے ہیں''۔ ان کا یہ افسوس بجا ہے کہ ''اگر 12 کروڑ کے ملک میں صرف پانچ یا چھ مورخ لکھتے اور چھپتے ہوں تو عوام میں اور یہاں کے مورخین میں کوئی نہ کوئی خرابی تو ہے۔'' کیا یہ بھی ہمارے مورخین کی اسی خود ترحمی کی ایک اور مثال نہیں جس کی نشاندہی ایم مجیب کر چکے ہیں؟ میرے خیال میں نہیں کیونکہ عزیز نے اپنے تجزیوں کو تاریخی حقائق اور حوالوں سے مزین کیا ہے۔ دیدہ بینا رکھنے والے اسی تاریخ دان نے اپنی ایک اور تحریر میں حکمران طبقے کی اس تحریف کو بے نقاب کیا ہے جو اس نے قلمبند تاریخ میں کی ہے اور یہ مسخ شدہ تاریخ آج ہمارے سکولوں اور اعلیٰ تعلیمی اداروں میں پڑھائی جا رہی ہے۔ ہماری تاریخ کو جس طرح مسخ بلکہ قتل کیا گیا ہے۔ تجزیئے میں شامل متن کے اصل حوالوں سے اس کی بھرپور وضاحت ہوتی ہے اور یہ سب کچھ ایک حساس قاری کو خوفزدہ کرنے کیلئے کافی ہے۔

ایک ایسی حکمران اشرافیہ جو اپنے اقتدار کو مضبوط بنانے کے لئے غیروں سے سازباز کر کے اپنے

عوام کے حقوق غصب کرتی ہے۔ اس کے پاؤں زمین پر نہیں ہوتے۔ خوف ہمیشہ اس کے اعصاب پر سوار رہتا ہے اور اگر کوئی ان کی پالیسی پر ذرا سی تنقید کرتا ہے تو اسے زبردستی خاموش کرا دیا جاتا ہے۔

ایسے معاشرے میں سوالات کو شک کی نظر سے دیکھا اور انہیں ممنوع قرار دے دیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ سوال ان بنیادوں کو کمزور کر سکتے ہیں جنہیں حکمران طبقہ سلطنت پر اپنے تسلط کا جواز قرار دیتا ہے۔ اور جب ایسا کلچر اپنا لیا جائے جہاں پوچھنے اور سوال کرنے پر قدغن ہو تو پھر مذہبی بنیاد پرستی کا غلبہ ناگزیر ہو جاتا ہے کیونکہ حکمرانوں کو یہ خوف دامن گیر ہوتا ہے کہ اگر اسی طرح سوالات پوچھے جاتے رہے تو ان کے جواب کہیں ایسے نتائج تک نہ لے جائیں کہ وہ فی زمانہ تخلیق پاکستان کے سلسلے میں دی جانے والی اپنی من پسند تاویلات کا منطقی جواز ہی فراہم نہ کر سکیں۔ فکر میں ایسی تبدیلی مملکت پر افسر شاہی اور بنیاد پرستی کی جابرانہ گرفت کو متزلزل اور بے جواز کر سکتی ہے۔ جبکہ نظریے کی یہی تبدیلی مملکت کو مستحکم بناتی ہے۔

اگر سچ کو ڈھونڈ نکالا جائے تو جہل پسندانہ نظریات مسترد کئے جا سکتے ہیں۔ اور ایک بار یہ نظریات مسترد ہو جائیں تو حکومتی اکابرین اور ان کے بنیاد پرست اتحادی اپنے مہین لبادے سے بھی محروم ہو کر بالکل عریاں ہو جاتے ہیں کیونکہ حکمرانوں اور بادشاہوں نے تو من گھڑت خرافات اور خود فریبی کے سوا کچھ نہیں پہن رکھا ہوتا۔

جس نسل نے قیام پاکستان کے لئے کامیاب جدوجہد کی تھی اس کے بیشتر افراد اس جہان فانی سے کوچ کر چکے ہیں۔ ان میں سے اکثر افراد اپنی زندگی میں خود بھی اسی کلچر کے اسیر ہو گئے جو تجزیے اور جستجو کا دشمن تھا اور قائداعظم کی وفات کے بعد انہوں نے خود ہی تاریخ کی من پسند توضیحات کو اندھا دھند قبول کرنے کی بنیاد رکھی۔ انہی نے ہمیں ہمارے سورماؤں سے الگ تھلگ کر دیا لیکن وہ بنیادی سوال اور ہمارے سورما زندہ رہے۔ انہیں زندہ ہی رہنا تھا۔

بدنصیب ہے وہ قوم جو اپنے ہیرو اور سورماؤں کو بھلا دیتی ہے۔ ہمیں ان کو پھر سے دریافت کرنا ہو گا۔ ان کی بازیابی تک ہماری سیاست کے وجود میں بہت سی سرطانی اساطیر کے ذیرے رہیں گے اور بہت سے ناپسندیدہ اور سرکش اختلافات اور انتشار پسند رجحانات ہمیں دھڑے بندیوں میں تقسیم کرتے رہیں گے۔

بے نام حد فاصل

میری دانست میں وادی سندھ کو وسطی ایشیا سے الگ کرنے والے عظیم سلسلہ کوہ کی نسبت وہ غیر

محسوس سی سرحد جو اس وادی کو ہند سے الگ کرتی ہے، کہیں زیادہ اہم اور فیصلہ کن ہے۔ یہ خط تقسیم مشرقی پنجاب میں گورداسپور سے لے کر کاٹھیاواڑ (جزیرہ عرب) تک ایک غیر محسوس ابھار کی شکل میں موجود ہے۔ سردست اسے "گورداسپور۔کاٹھیاواڑ خط متارکہ" کہہ لیتے ہیں۔ یہ کم وبیش اسی خط تقسیم کے ساتھ ساتھ چلتی ہے جو اب وادی سندھ یعنی پاکستان اور ہندوستان کے درمیان مستقل سرحد ہے گویا اس سرحد کو ہمیشہ سے تاریخ کی پشت پناہی حاصل تھی اور تاریخ نے ہی اسے سند جواز بھی فراہم کی۔

زمین کی یہ خاموش پٹی، جو صحرائے راجستھان سے ہو کر گزرتی ہے، وادی سندھ کو ہند (یعنی وادی گنگا اور جنوبی جزیرہ نما ہند) سے الگ کرتی ہے۔ دریائے سندھ اور گنگا کے قدرتی آبی نظاموں کے درمیان یہی وہ غیر محسوس خلیج ہے جو دو سرزمینوں، دو قوموں اور دو تہذیبوں، سندھ اور ہند کے درمیان ایک واضح تفریق کی بنیاد ہے۔ اسی خط کے شمال میں وہ مقام ہے جہاں دریائے گنگا، دریائے ستلج (دریائے سندھ کا انتہائی جنوبی معاون دریا) کے نزدیک ترین ہوتا ہے۔ لیکن جس طرح دو طرفہ ڈھلوانی چھتوں کا پانی متضاد سمتوں میں بہتا ہے۔ بالکل اسی طرح یہ دونوں دریا ایک دوسرے سے گریز کرتے ہوئے (جیسے اپنی اپنی تہذیبوں کے تشخص کو برقرار رکھنا چاہتے ہوں) بہت دور متضاد سمتوں میں اپنے اپنے سمندروں میں اتر جاتے ہیں۔

دریائے سندھ، چین اور وسطی ایشیا کی سرحدوں پر فلک پوش پہاڑوں میں شمال مغرب کی جانب گرجتا، دندناتا اور جنوب کی طرف ہٹتا ہوا میدانوں میں وارد ہوتا ہے۔ عظیم الشان پہاڑوں کی ترائی میں پھیلے وسیع میدانوں میں یہ دریا سست پڑ جاتا ہے اور پنجند کے مقام پر اپنے معاون دریاؤں کو سمیٹتا بڑی شان سے جھومتا جھامتا ہوا بحیرہ عرب میں جا شامل ہوتا ہے۔

دوسری طرف گنگا کوہ ہمالیہ سے جنوبی میدانوں میں اترتا ہے اور مشرق کی جانب گھوم کر جمنا کو اپنے پہلو میں سمیٹتے ہوئے بھرپور برہم پتر سے مل کر ایک وسیع ڈیلٹائی دلدل بنا کے خلیج بنگال میں جا گرتا ہے۔ ان دونوں دریاؤں کے ماخذ صرف سو میل کے فاصلے پر ہیں لیکن ان کی گذرگاہیں انہیں مخالف سمتوں میں ایک دوسرے سے تقریباً 1500 میل دور واقع ڈیلٹاؤں تک لے جاتی ہیں۔

جمنا اور سندھ ان دو عظیم دریاؤں کے کنارے پروان چڑھنے والی تہذیبوں کی بھی یہی کہانی ہے۔ تاریخ کی چند ساعتوں میں یہ ایک دوسرے کے قریب آتی ہیں، ایک دوسرے کا جائزہ لیتی ہیں اور پھر اپنے اپنے جداگانہ اور متقابل راستوں پہ رواں رہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وادی سندھ، ہندوستان سے ہمیشہ ایک الگ اور آزاد خطہ رہا ہے۔

یہاں ایک بات اہم ہے کہ دونوں تہذیبوں کو سیاسی اعتبار سے یکجا کرنے کی قابل ذکر کوشش اسی

اہم فاصل آب میں پروان چڑھی۔ یہ فاصل آب مشرقی پنجاب ہے۔ دو دریاؤں اور دو تہذیبوں کے درمیان ایک حد فاصل، ایک خط متارکہ۔

ملکیت کے مختلف انداز

تاریخی اعتبار سے وادی سندھ کے علیحدہ تشخص کی تصدیق کسی ایک دور میں وادی سندھ اور ہند کے مختلف علاقوں کے ذرائع پیداوار اور پیداواری روابط کی ترقی اور تنوع کے تقابلی جائزے سے ہو سکتی ہے لیکن اس سے پہلے پیداواری روابط اور ان کی ملکیت کے تصور کی تھوڑی سی وضاحت ضروری ہے۔

انسان دوسری پسماندہ مخلوقات سے اس لئے ممتاز ہے کہ وہ ایسی اشیاء بھی بنا سکتا ہے جن کے لئے قدرت نے اسے مخصوص جسمانی ساخت عطا نہیں کی۔ وگرنہ دیگر جاندار مخلوقات صرف وہ مخصوص شے بنا سکتی ہیں جن کے لئے قدرتی طور پر ان کے جسم موزوں ہیں۔ دوسرے یہ کہ انسان صرف اپنے لئے نہیں بلکہ اپنی آئندہ نسلوں کے لئے بھی اشیا پیدا کرتا اور وجود میں لاتا ہے۔ پھر انسان کی اضافی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ فطرت میں پائی جانے والی بے شمار چیزوں میں ترمیم کرنے اور ان کی قدر و قیمت اور کارگزاری میں اضافہ کرنے پر بھی قادر ہے۔ کوئی اور جاندار ایسی اہلیت نہیں رکھتا۔

یوں تو انسان قبل از تاریخ ہی سے روزمرہ استعمال کے برتن اور اوزار بنانے لگا تھا لیکن گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ وہ فطرت کے بعد دوسرا بڑا صناع بن گیا اور پھر اپنی اہلیت اور امکانات کے بارے میں آگہی اس کی نت نئی ضروریات کو تشکیل دینے لگی۔ وہ جیسے جیسے تخلیق کرتا گیا اس کی خواہشات میں بھی اسی حساب سے اضافہ ہوتا چلا گیا۔ لیکن معاشرے کا کوئی بھی فرد اپنی بنیادی ذاتی ضرورت سے زائد پیداوار صرف اسی وقت حاصل کر سکتا ہے جب اس اضافی پیداوار کے حصول کے لئے وہ دوسرے افراد کے ساتھ مل کر نئی اور زیادہ تعداد میں اشیاء بنانے کی استعداد حاصل کرتا ہے۔ جو کام ایک فرد نہیں کر سکتا وہ پیداوار بہت سے افراد باہمی تعاون سے حاصل کر سکتے ہیں۔ صنعت یا زراعت میں فاضل پیداوار کا حصول لوگوں کی اجتماعی کاوش اور اجناس و مصنوعات کے باہمی تبادلے کے بغیر ممکن نہیں۔

پیداوار کے اسی عمل اور اشیاء کے باہمی تبادلے کے نتیجے میں 'پیداواری رشتے' پروان چڑھتے ہیں خواہ انہیں قوت کے زور پر ہی روبہ عمل لایا گیا ہو۔ پیداواری رشتوں کی بنیاد ملکیت اور ذرائع پیداوار کے باہمی تعلق پر ہے۔ جن کے پاس زیادہ آلات اور ذرائع پیداوار کی کثرت ہوتی ہے، انہیں کم آلات اور کم ذرائع پیداوار رکھنے والوں پر معاشی برتری حاصل ہو جاتی ہے اور اس کے نتیجے میں جائیداد اور ملکیت کے تصور کو دوام حاصل ہوتا ہے اور معاشرے میں طبقات پیدا ہوتے ہیں۔

ملکیت کے اس دوام کی بدولت تاریخ میں پیداواری رشتوں کی تین مختلف شکلیں وجود میں آئیں یہی وہ سماجی تعلقات تھے جو بالترتیب ' غلام کی ملکیت ' زمین کی ملکیت اور سرمائے کی ملکیت کی صورت میں تشکیل پائے اور جن سے پیداوار اور سماجی تنظیم کے حوالے سے انسانی تاریخ کے ان تین بنیادی یعنی غلام داری ' جاگیرداری اور سرمایہ داری سماج نے جنم لیا۔ پیداواری رشتوں اور معاشرتی روابط کے حوالے سے ایسے طویل عبوری دور بھی آئے جب نئے اور پرانے ' ختم ہونے اور ابھرنے والے دونوں نظاموں کی خصوصیات ایک ہی نظام میں یکجا ہو گئیں۔

اگر وادی سندھ اور وادی گنگا یا تمام عرب دنیا میں پیداواری رشتوں کی تدریجی ترقی اور سماج کا جائزہ لیا جائے تو بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔ وادی سندھ کے پیداواری سماج کی ایران اور وسطی ایشیا کے ساتھ ہمیشہ سے بہت قریبی نسبت رہی ہے۔ وادی سندھ کے پیداواری رشتے ایران اور وسطی ایشیا سے اثر قبول کرتے اور ان پہ اثر انداز ہوتے رہے ہیں۔ اس کے مقابلے میں وادی گنگا اور ہند کا جنوبی جزیرہ نما کم و بیش ہمیشہ ہی ایک قطعی مختلف زمان و مکان کے اسیر رہے۔ جبکہ عرب کے خانہ بدوشانہ اور قبل از زراعت کے قبائلی معاشرتی نظام کی وادی سندھ کے پیداواری رشتوں سے مطابقت تو نہ ہونے کے برابر تھی۔

وادی سندھ کی پوری تاریخ میں اس کے طرز معاشرت ' معاشی سرگرمیوں ' سیاسی تحریکوں ' ثقافت ' مذاہب اور رسم و رواج کا متذکرہ علاقوں کے زندگی کرنے کے انداز ' ثقافت اور مذہبی اطوار کے تقابلی جائزے سے اس وادی کی امتیازی اور قطعی مختلف حیثیت کی تصدیق کی جاسکتی ہے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ ہمیں اپنی شناخت اور قومیت کے بارے میں مدافعانہ رویہ اور بدیسی شناخت کی جہل پسندانہ خواہش ترک کر دینی چاہئے۔ مجھے امید ہے کہ اس طرح سندھ واسی (آج کے پاکستانی) کا اپنی شہریت کے بارے میں احساس تفاخر حال ہو گا۔

وادی سندھ کی ایک بھرپور تاریخ رہی ہے اور ایک شاندار ماضی ہے جو اس علاقے کی کسی اور قوم اور عوام کو نصیب نہیں ہوا۔ شاید یہ معلوم حقائق ہندی اکابرین کو وادی سندھ کے ایک اور لازمی جزو کشمیر کے بارے میں ' تاریخی حوالے سے ' ایک معقول انداز فکر اپنانے پر آمادہ کر سکیں۔

تاریخ کے ہر دور میں وادی سندھ کا وجود ایک آزاد خطے کی حیثیت سے برقرار رہا ہے۔ کبھی متحد اور کبھی اندرونی طور پہ منقسم۔ شاید اس خطے کی خود مختاری اس مورخ کی نظر سے تو مخفی رہ جائے جو شاہی درباروں اور بادشاہوں کی مہم جوئی کی ایک سیدھی سادی سیاسی تاریخ رقم کرتا ہے لیکن ''ثقافتی تاریخ'' کے اس طالب علم سے جو اس علاقے کے اساسی میلانات اور ان کی وجوہات کا مطالعہ کرتا ہے '

یہ حقیقت چھپی نہیں رہ سکتی۔ ایسے ہی طالب علم کے سامنے کئی غیر روایتی وضاحتیں آشکار ہوتی ہیں اور انہی سے اختلاف رائے بھی جنم لیتا ہے۔ لیکن اختلاف رائے بالعموم بے بصارت وابستگی سے بہتر ہے اور تشخیص نو اور تعین نو کا موقع فراہم کرتا ہے۔

سوچنے پرکھنے اور ہر دم سوال کرنے کا یہ انداز خواہ کیسے ہی اختلاف رائے کو جنم دے بہر حال غیر سائنسی 'اہانت آمیز اور بے بنیاد قصے کہانیوں کی گرفت کو ڈھیلا کر دیتا ہے 'ذہنوں کو آزاد کرتا ہے اور تاریخ کو ان خرافاتی آلودگیوں سے بچانے میں مدد فراہم کرتا ہے جن میں ذہن بے بصارت تقلید کے باعث جکڑے رہتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ اسی اختلاف رائے میں قوموں کی خود اعتمادی اور ترقی کا راز پنہاں ہے۔

سوال اور داستانیں

وادی سندھ کے بیشتر مورخین محض قصے کہانیوں اور مفروضوں کے تانے بانے میں گم نظر آتے ہیں۔ یہ ان کی اپنی اختراع ہیں یا پھر کسی اور نے گھڑ رکھے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان مورخین نے انہیں بلا تحقیق قبول کر لیا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی کہانی یا مفروضہ تجزیے کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا۔ ان غیر منطقی داستانوں سے پیچھا چھڑائے بغیر سندھ واسی کو سمجھنا ممکن نہیں ہوگا اور اگر بالفرض ان سے پیچھا چھڑانے کی کوشش نہ کی گئی تو اس دنیا کے منی شنکر آئروں کے تحقیر آمیز طنز کا سلسلہ جاری رہے گا کہ "پاکستانی قومیت کا تصور ہمیشہ کی طرح آج بھی بعید از حقیقت اور محض ایک لایعنی اختراع ہے۔"

غیر ملکی اور مقامی حکمرانوں کی ملی بھگت اور ان کی عیارانہ سازشوں نے ان غیر منطقی مفروضوں کی بناء پر سندھ واسی کے بارے میں کئی بے بنیاد تاثرات کو ہوا دی مثلاً یہ کہ وادی سندھ نے کبھی حملہ آوروں کے خلاف مزاحمت نہیں کی۔ کہ یہاں کا معاشرہ شدت سے بنیاد پرستانہ تھا۔ کہ وسطی ایشیا سے آنے والے مہم جو بڑے ہی بے لوث تھے اور برصغیر کے مسلمان ان کے حملوں کی تباہ کاریوں سے ہمیشہ اور مکمل طور پر نہ صرف محفوظ رہے بلکہ ان کے حملوں کا خیر مقدم کرتے رہے۔

آیئے ذرا سب سے پہلے ہم اس قبول عام مفروضے کو لیتے ہیں کہ وادی سندھ نے ہر حملہ آور کے سامنے خوشی سے ہتھیار ڈال دیئے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا۔

یہ حقیقت ہے کہ وسطی ایشیا کے مہم جوؤں کو جتنی بھی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا وہ زیادہ تر وادی سندھ تک ہی محدود تھی۔ آریاؤں کو یہاں جو مزاحمت درپیش رہی اس کی تصدیق تو ہندو مت کی مقدس تحریروں سے بھی ہوتی ہے۔ یونانیوں کو اسی علاقے میں روکا اور واپس جانے پر مجبور کر دیا گیا۔ تیمور کا

مقابلہ جسرت اور شیخا گکھڑ نے کیا۔ بابر نے بار بار ہند پر قبضے کی کوششیں کیں اور تین مرتبہ تو وادی سندھ میں ہزیمت اٹھانے کے بعد اسے پسپا ہونا پڑا۔ اس کے برعکس عموی سطح پر البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ پانی پت تک پہنچتے ہی پوری کی پوری سلطنت ہند' فاتح کے قدموں میں ہوتی تھی۔ عبداللہ بھٹی نے پنجاب' خوشحال خان نے سرحد اور شاہ عنایت نے سندھ میں سالہا سال تک مغلوں کی قوت کا بھرپور مقابلہ کیا۔ اٹھارویں صدی کے پنجابی شعراء کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ فارس کے طاقتور نادر شاہ کو وادی سندھ میں کیسی شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

اس کے علاوہ بھی وادی سندھ میں کئی بغاوتیں ہوئیں اور کئی ہیرو سامنے آئے۔ وادی سندھ کے لوگوں نے مشرق کی جانب سے انگریز کی پھیلتی ہوئی سامراجی قوت کے ہاتھوں شکست کھانے سے پہلے کئی خونی جنگیں لڑیں۔ یہاں کی زیرزمین مزاحمتی سرگرمیوں نے بالآخر اس سامراجی تسلط کے حوصلے پست کر دیئے اور راج کے خاتمے میں تو اس مزاحمت نے بہت ہی قابل ذکر کردار ادا کیا۔

جن مفروضوں کے تحت سندھ واسی کو مجہول اور اطاعت گزار قرار دیا جاتا ہے اگر انہیں تاریخی حقائق کی روشنی میں پرکھا جائے تو یہ زیب داستاں کے سوا کچھ نہیں۔ بدقسمتی سے وادی سندھ کی تاریخ پر منظور شدہ نصابی کتابوں میں ایسے حقائق دستیاب ہی نہیں جو مفروضوں کو پرکھنے کیلئے ضروری ہیں۔ بالعموم حقائق کو چھپا کر محض ایسی داستانوں کا پرچار کیا جاتا ہے جو حکمرانوں اور اکابرین کے مفادات کو تحفظ دیں۔

بہرحال یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ داستانیں اور قصے کہانیاں بھی اتنے ہی اہم ہوتے ہیں جتنا کہ حقائق۔ حتیٰ کہ وہ فرضی کہانیاں بھی جو حکمران طبقے اپنے مفادات کی خاطر مرتب کر لیتے ہیں۔ ایسی بہت سی داستانوں اور تصورات کو گزشتہ ڈیڑھ سو سال کے دوران پروان چڑھایا گیا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مفروضوں اور حقائق کو ان داستانوں میں سے چھان پھٹک کر اس طرح علیحدہ کر لیا جائے جیسے بھوسے کو اناج سے الگ کیا جاتا ہے۔

ایسے بہت سے مفروضے جو وادی سندھ کی اشرافیہ نے اپنے اردگرد یا اپنے بارے میں گھڑ رکھے ہیں ہماری عظیم قوم کی تحقیر کا باعث ہیں۔ یہ کہانیاں سیاست اور معیشت پر حکمران طبقے کی خود غرضانہ گرفت کو مضبوط بنانے کیلئے وضع کی گئیں۔ یہ خرافات دریائے سندھ اور اس کے معاون دریاؤں کی سرزمین کے اصل سورماؤں یعنی ہیروز کی توہین ہے۔ اپنے موجودہ موقع پرستانہ کردار کو حق بجانب قرار دینے کیلئے وادی سندھ کی اشرافیہ نے اس سرزمین کے سورماؤں کو یکسر مسترد کر کے ان کی جگہ غیروں کو اپنا لیا ہے۔ مقصد یہی ہے کہ موجودہ سماجی اور سیاسی خرافات کی توثیق کی جا سکے کہ یہی کامیابی

کی اخلاقیات ہے۔

وادی سندھ کی تاریخ کو مسخ کرنے میں ان حالات نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے کہ جب 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریزوں نے اکابرین کا ایک نیا گروہ تخلیق دیا۔ جب برطانوی حکومت کے وفاداروں کو زمین کے بڑے بڑے قطعات الاٹ کئے گئے۔ جب ان کے بیٹوں کو شاہی محکموں میں ملازمتیں دی گئیں۔ جب ایک نئی فوجی اور غیر فوجی افسر شاہی کو وجود میں لایا گیا اور بے چون و چرا فرمانبرداری اور اطاعت کو اس کی سرشت بنادیا گیا تو ان کے ذہنوں میں یہ بھی ثبت کر دیا گیا کہ نافرمانی اور تذبذب خطرناک ہیں اور پھر انہی سے اس نظریئے کی تشہیر بھی کرائی گئی۔ یہی وہ لوگ تھے جن کے ہاتھوں میں معاشی اور ریاستی قوت تھی اور جو غیر ملکی آقاؤں کے غلام تھے۔ یہ ان کے اپنے مفاد میں تھا کہ جو کوئی بھی جارحیت کے خلاف اٹھے اسے ذلیل ورسوا کیا جائے۔ نئے اکابرین کی خوشنودی کیلئے نئی تاریخ لکھی گئی۔ اور نئی تاریخ لکھنے کیلئے عوام کو وہ زبان سیکھنے سے روک دیا گیا جس زبان میں ان کی تاریخ رقم تھی۔ وادی سندھ میں مقامی زبانوں کے بجائے اردو اور انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا۔

اور یوں بظاہر پڑھے لکھے طبقے کو بھی اس کی مقامی زبانوں سے محروم کر دیا گیا۔ ذریعہ تعلیم کے اردو اور انگریزی ہونے کے باعث مقامی زبانیں سیکھنے کی ضرورت ہی نہ رہی۔ پنجاب میں یہ غفلت زیادہ نمایاں رہی۔ البتہ پٹھان، سندھی اور بلوچ کی صورت حال قدرے بہتر تھی۔ اب یہی دیکھ لیں کہ پنجاب کی کم از کم چار نسلوں کی معلومات اپنے ایک ہیرو کے بارے میں انتہائی مبہم اور "دلا بھٹی" نام کی ایک افسانوی فلم سے ماخوذ ہیں۔ وہ پنجابی کے لوک جنگجو سورماؤں جیسے سارنگ، سید، دلاور، احمد خان کھرل اور بھگت سنگھ کے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتے اور نہ ہی انہیں اپنے پیشرو سندھ واسی کے اعتقادات اور دیوتاؤں کے بارے میں کچھ علم ہے۔ اندر اور ویداؤں، کرشن اور مہابھارت سے یوں احتراز کیا جاتا ہے جیسے ان سے ہمارے نوجوانوں کے ذہن پراگندہ ہو جائیں گے، جیسے ان نظریات کے سامنے اسلامی عقیدہ کمزور پڑ جانے کا اندیشہ ہو حالانکہ صدیوں کی ہم سفری میں بھی یہ نظریات اسلام پر غالب نہیں آسکے۔ یہ دیوتا اور عقائد، خواہ اسلامی ذہن کیلئے کتنے ہی ناقابل یقین کیوں نہ ہوں بہر حال ایسے حقائق ہیں جو وادی سندھ کی تاریخ کا حصہ ہیں۔ اس سرزمین میں، جو دریائے سندھ کے مشرقی معاون دریاؤں سے صرف چند میل کے فاصلے سے شروع ہوتی ہے، کروڑوں لوگ، اکثر سیدھے سادے امن پسند لوگ، ان نام نہاد حقائق پر اسی طرح یقین رکھتے ہیں جیسے وادی سندھ کے لوگ اپنے اسلامی عقیدے کی سچائیوں پر استقامت سے قائم ہیں۔

اپنی تاریخ سے انقطاع دراصل اپنے وجود کے ایک حصے کی تکذیب ہے۔ دوسروں کے عقائد کو

سمجھنے سے انکار ' جیو اور جینے دو کے فلسفے سے انکار ہے۔

پنجابی زبان و ادب میں پنجاب کے بہت سے تاریخی واقعات 'کھرل' کھیے 'گکھڑ' گوندل 'وڑائچ' بھٹی اور دوسرے قبائل کی مزاحمت کے بارے میں موجود ہیں لیکن سکول جانے والے بہت کم بچے اپنے اجداد کی جانبازی اور ان کے کارناموں سے واقف ہیں۔ مثال کے طور پر نجابت کے اشعار بڑے دلگداز انداز میں ان جنگوں کا احوال بیان کرتے ہیں جو فارس کے نادر شاہ کو دلی تک پہنچنے کیلئے وادی سندھ میں لڑنا پڑیں۔ یہ اشعار وادی سندھ کی مزاحمت کے دلیرانہ اور بلند حوصلہ واقعات بیان کرتے ہیں لیکن نجابت کی بھرپور شاعری پاکستان کے کسی بھی سکول کے نصاب کا حصہ نہیں حتیٰ کہ پنجاب میں بھی نہیں۔ اپنے عہد کی یہ رزمیہ داستانیں ہی ان واقعات کی مستند تفاصیل ہیں۔ اگر یہ ادبی فن پارے وادی سندھ (پاکستان) کی تاریخ کے نصاب کا حصہ ہوتے یا اگر صرف پنجابی زبان پنجاب کے سکولوں میں ایک لازمی مضمون کے طور پر پڑھائی جارہی ہوتی تو کوئی بھی اس خرافات پر یقین نہ کرتا کہ سندھ واسی اتنے بزدل لوگ تھے جو ہر حملہ آور کا خیر مقدم کر کے انہیں دہلی تک کے سفر کی سہولتوں سے نوازتے تھے۔

اسی طرح کے نپے تلے حربوں سے قومیت کا گلہ گھونٹ کر اور بڑے سوچے سمجھے حربوں سے عوام کو مقامی زبانوں سے بیگانہ کر کے وادی سندھ کے قدیم سورماؤں کو دفن کر دیا گیا۔

جب بھی تاریخ کو ان مفروضوں سے پاک کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو چند اہم سوال پیدا ہوتے ہیں۔ کیا سندھ واسی کشادہ دل ' غیر متعصب اور آزاد خیال ہے یا بنیاد پرست ؟ کیا اس سرزمین نے فرد اور مملکت کے مابین تعلقات کے مسائل طے کر لئے تھے ؟ اگر ایسا ہوا تو کیونکر ؟ اگر نہیں تو کیوں نہیں ؟ وادی سندھ کے اس قدیم معاشرے میں عورت کی حیثیت کیا تھی ؟

ایسے ہی بہت سے سوال ہیں جن کے جواب تلاش کئے جائیں تو ہمیں وادی سندھ کے تمدن اور سندھ واسی کے تشخص کو ڈھونڈ نکالنے میں مدد مل سکتی ہے۔ سوال و جواب کے اسی انداز کو اپنا کر اور لخت لخت جوڑ کے سندھ واسی کے اصل کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ جس سے وادی سندھ کی اس قوت محرکہ کو سمجھنے میں بھی یقیناً مدد ملے گی جو سندھ واسی کو ہند سے الگ رہنے پر اکساتی رہی اور جو دور جدید کے پاکستان کی معروضی بنیاد ہے۔

سندھ واسی کے تشخص کی نو دریافت میں یہ ضروری ہے کہ اسے محض اس کی اپنی صفات کے حوالے سے نہ دیکھا جائے۔ اس ضمن میں یہ بیان کرنا بھی ناگزیر ہے کہ وہ دوسروں سے کیسے مختلف ہے۔ سندھ واسیوں کی مشترکہ صفات اور خدوخال انہیں اسی صورت میں ایک الگ قوم کا درجہ دے سکتے ہیں

جب وہ دوسرے لوگوں کی صفات اور خدوخال سے مختلف ہوں گے۔ یا کم از کم ان لوگوں سے مختلف جن کے ساتھ وادی سندھ کے افراد کا باہمی میل جول رہا ہے۔

سندھ واسی کے حال (پاکستانی) کی نو دریافت میں محض وادی سندھ کے جغرافیائی امتیاز کی نشاندہی پر اکتفا نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اس امر کی نشاندہی بھی ضروری ہے کہ یہ سندھ واسی اس یورپی حکمران سے کس طرح مختلف ہے جس کی حکمرانی کو اس نے مسترد کر دیا تھا یا پھر اس نے برصغیر میں ہندو جاتی کے ساتھ مل کر رہنا کیوں قبول نہیں کیا تھا؟ کہ اسی طرح پاکستانی اور پاکستان کی دریافت اور شناخت ممکن ہے۔ اور یہی میری کوشش بھی ہے۔

پاٹلی پتر سے پاکستان تک

پرانے وقتوں میں پاٹلی پتر ایک بڑا اور خوشحال شہر تھا۔ یہ گنگا کے کناروں کے ساتھ ساتھ لگ بھگ نو میل تک پھیلا ہوا تھا۔ اب اسی جگہ پر پٹنہ شہر آباد ہے۔ یہاں قریب ہی نالندہ کی مشہور درسگاہ تھی جہاں معلوم دنیا کے دور دراز علاقوں سے طلبا اور عالم کھنچے آتے تھے۔ مہاتما بدھ بھی اسی علاقے میں درس دیتا تھا۔ پاٹلی پتر سے ہی موریہ بادشاہ اشوک ' مابعد کی اورنگ زیب اور انگریز کی سلطنتوں جیسی ایک وسیع مملکت پر حکمرانی کرتا تھا۔ وادی سندھ اور ہند کا ہر حصہ اس کی عملداری میں تھا۔ اشوک نے اپنے فرامین نسل در نسل قائم رکھنے کیلئے پتھروں اور چٹانوں پر کندہ کرائے۔ یہ انمٹ تحریریں ہند کے انتہائی جنوبی سرے سے لے کر شمال میں کوہ سلیمان سے پرے ہندوکش تک موجود ہیں۔

اشوک کا دور برصغیر کی یکتائیت پر یقین رکھنے والوں کے دلائل میں کچھ وزن پیدا کرتا ہے۔ لیکن پاٹلی پتر سے پاکستان تک ' صدیوں کے اس سفر میں وادی سندھ نے ایک غیر معمولی انفرادیت اور امتیاز برقرار رکھا۔ یہ وادی اپنے آغاز ہی سے ایک قدرتی ریاست ہے جس کی جڑیں زمانہ قبل از تاریخ میں پیوست ہیں۔ نہ تو اس وادی نے کسی اتفاقی حادثے یا واقعاتی جبر کے نتیجے میں جنم لیا اور نہ ہی یہ غیر ملکی حکمرانوں کی 'تقسیم کرو اور حکومت کرو' کی پالیسی کے تحت وجود میں آئی کیونکہ تاریخ کی بے یقینیوں اور جغرافیائی سیاست کی حکمت عملی اور تضادات سے قطع نظر پاکستان ہمیشہ سے موجود رہا ہے اور ہمیشہ موجود رہے گا۔

1

قبل از تاریخ کے پروہت

پختہ اینٹ کا رواج

وادی سندھ اور شمالی ہندوستان میں وسطی ایشیا کے تارکین وطن کی وسیع پیمانے پر آمد صدیوں تک جاری رہی۔ آریاؤں کی یلغار غالباً اس سلسلے کی پہلی لہر تھی لیکن آریاؤں کی آمد سے پہلے ہی پانچ لاکھ مربع میل پر پھیلی وادی سندھ کی تہذیب ایک انتہائی ترقی یافتہ اور متمدن نظام کے روپ میں ڈھلنے کے بعد اپنی عظمت کے جلو میں ریت کے وسیع ٹیلوں تلے دفن ہو چکی تھی۔ موہنجوڈارو اور ہڑپہ کے کھنڈرات اس تہذیب کے ترقی یافتہ ہونے کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ ان قدیم شہروں میں گھر کشادہ تھے' کپاس سے کپڑا بننے کا رواج عام تھا' شہری سہولتیں بے شمار تھیں۔ اجتماعی عوامی غسل خانے اور گندے پانی کی نکاسی کا بہترین انتظام تھا۔

وادی سندھ کے لوگ کئی اعتبار سے اپنی ہمعصر تہذیبوں (ایران' مصر اور عراق) سے بہت آگے تھے۔ ان کے بنائے ہوئے مینڈھے' کتے اور دوسرے جانوروں کے خوبصورت ماڈل اور چھوٹے مجسموں کی بناوت اور تراش خراش میں ان کے تمدن کی پختگی اور نفاست آج بھی زندہ ہے۔

یہ حقیقت بہت اہم ہے کہ موہنجوڈارو اور ہڑپہ کے اپنے مغربی ہمعصروں کے ساتھ یقینی تجارتی روابط تھے۔ وادی سندھ کی مصنوعات دجلہ اور فرات کی منڈیوں میں فروخت ہوتی تھیں۔ شہری آبادی کے متمول تاجر طبقے نے رابطوں کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے تجارت کو خوب ترقی دی جس کے نتیجے میں مصنوعات کے ساتھ ساتھ ثقافتی اقدار کا بھی تبادلہ ہوا۔ مصنوعات کی برآمد کے علاوہ سرمایے کے فن پارے اور عراق سے حمام کے استعمال کی چیزیں درآمد بھی ہوتی تھیں اور سندھ کے دستکار ان اشیا کی

نقول بھی تیار کرتے تھے۔ عراق کے آثار قدیمہ سے دریافت ہونے والی سندھی مہروں اور دستکاریوں کے نمونوں سے پتہ چلتا ہے کہ زمانہ قبل از تاریخ میں بھی میسوپوٹیمیا Mesopotamia کے شہروں میں سندھی تاجروں کے بہت سے معروف مراکز موجود تھے۔

تجارتی راستہ دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ بحیرہ عرب تک اور پھر خلیج فارس سے ہوتے ہوئے میسوپوٹیمیا تک جاتا تھا۔ اگرچہ بحری جہاز ساحل کے قرب وجوار ہی میں رہتے لیکن راستے کی تلاش کا انداز بڑا اختراع پسندانہ تھا۔ اس زمانے میں جب جہاز ران ساحل کو آنکھوں سے اوجھل نہیں کرتے تھے۔ اگر جہاز ساحل سے دور بھٹک جاتا تو ایسی صورت میں ملاح ایک کوّے کو آزاد کر کے اس کا پیچھا کرتے جو ساحل تک پہنچنے کیلئے مختصر ترین فاصلہ اختیار کرتا تھا۔

شہر کی موجودگی معاشرے میں طبقاتی نظام کے وجود کی علامت ہے۔ زمانہ قدیم کی شہری تہذیبوں کی بنیاد دیہاتی علاقوں کی زراعت پر تھی۔ شہری اکابرین کیلئے دیہی آبادی اپنی ضرورت سے زائد اجناس اگاتی تھی۔ کچھ لوگ فاضل خوراک پیدا کرنے میں جتے رہتے ہیں اس فاضل پیداوار کو ایک زیادہ منظم اقلیت غصب کر کے نسبتاً زیادہ سہولتوں والی شہری آبادیوں کی بنیاد رکھتی ہے۔ وادی سندھ کے شہر ایک ایسے طبقاتی معاشرے کے ارتقا کے مظہر ہیں جہاں دیہاتی علاقوں پر شہری اکابرین کی حکومت رہی ہے۔

یہاں معاشرہ پہلے پہل کیسے وجود میں آیا؟ اس کی تدریجی ترقی کیلئے قوت محرکہ کہاں سے آئی؟ کس مادی پیش رفت نے وادی سندھ میں خاصے بڑے اور خوشحال شہری مراکز کو رواج دیا؟ ان لوگوں کو اپنی پیشرو نسلوں پر ٹیکنالوجی کے لحاظ سے کیا بالادستی حاصل تھی؟ اس بارے میں محض قیاس آرائی ہی کی جا سکتی ہے۔

سیلابی مٹی سے ڈھکے ہموار میدانوں میں جہاں پتھر ناپید ہوں' پختہ اینٹ کی ایجاد یقیناً ایک فیصلہ کن صنعتی پیش رفت ثابت ہوئی ہو گی اور اس سے سیلابوں کی روک تھام میں بھی یقیناً بہت مدد ملی ہو گی۔ بصورت دیگر دوسرے عوامل کی نسبت موسمی سیلاب' دریا کے کناروں پر یا ان کے نزدیک بستیوں کے قیام اور ان کے شہروں میں ڈھلنے کے عمل میں بڑی رکاوٹ بن سکتے تھے۔

موہنجوڈارو اینٹ کی ایک خاص بات اس کا سائز ہے۔ 28x14x7 سینٹی میٹر کی یہ اینٹ سائز اور تناسب کے لحاظ سے تقریباً آج کی معیاری اینٹ کے برابر ہے۔ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وادی سندھ کے باسی اس مخصوص سائز کی افادیت سے آگاہ تھے۔ اس پیائش کی اینٹ آدمی کے ہاتھ میں باآسانی سما جاتی ہے اور وہ ایک ہاتھ میں اینٹ اور دوسرے میں اوزار تھام سکتا ہے اور چونکہ گزشتہ کئی ہزار سالوں

کے دوران انسانی ہاتھ میں بہت معمولی سی تبدیلی آئی ہے لہٰذا اینٹ کے سائز میں بھی کوئی کمی بیشی نہیں ہوئی لیکن اس انتہائی موزوں سائز کی شناخت و دریافت اس قدیم زمانے کے محنت کشوں اور مستری مزدوروں نے ہی کی۔

پروہت یا حکمران

وادی سندھ کی تہذیب کا زوال، کئی عوامل سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ان میں دریائے سندھ اور راوی کی گزرگاہوں میں تبدیلی، مون سون ہواؤں میں تغیر و تبدل اور وحشی قبائل کے حملوں کے باعث مغربی ایشیا کی تہذیبوں سے تجارتی روابط کا انقطاع شامل ہے۔ یہ زوال کسی سنگین اندرونی بحران کا نتیجہ بھی ہو سکتا ہے جیسے غلام داری نظام اپنی سودمند معاشی حد سے تجاوز کر گیا ہو یا پھر انتہائی ترقی یافتہ اور منظم شہری آبادیوں کے ہاتھوں دیہی بستیوں کے حد سے بڑھتے ہوئے استحصال نے بالآخر اپنی تہذیب کی زرعی بنیاد کو ہی تباہ کر ڈالا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ حملہ آور قوموں نے وادی سندھ کے شہروں کو تاراج، معیشت کو تباہ اور آبادی کا قتل عام کیا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ یہ تہذیب قدرتی آفات جیسے زلزلے، سیم تھور یا صحرائے راجستھان کے پھیلاؤ کی بھینٹ چڑھ گئی ہو۔ اس ضمن میں فطرت کے بے شمار اور بے رحمانہ حوالوں کی شاید کوئی انتہا نہ ہو۔

آفت کی اصل ماہیت اور اس کے حملے کی شدت سے قطع نظر کسی تہذیب کو پہنچنے والے نقصان کی حد اس تہذیب کے مقابلہ کرنے یا حملے کو پسپا کرنے کی باطنی صلاحیت پر ہوتی ہے۔ اگر یہ خود اندر سے گل سڑ چکی ہو تو خطرے کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہ باطنی سرطان ہی تہذیب کے انحطاط کی بنیادی وجہ ہوتا ہے۔ خارجی واقعات زوال کے عمل میں صرف تیزی لاتے ہیں اور پھر حالات و عوامل کا ایسا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو بالآخر تہذیب کی تباہی پہ ختم ہوتا ہے۔ جیسے ہوا کا ایک تیز جھونکا صحتمند درخت کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا مگر ایک سوکھے درخت کو گرا دیتا ہے۔

گویا اصل کام یہ ہے کہ وادی سندھ کی تہذیب کے اندرونی آزار کا پتہ چلایا جائے۔ یہیں سے اس کے انحطاط اور بربادی کے اصل سبب کا سراغ مل سکتا ہے۔ شاید یہ بہت ہی اہم وجہ مندرجہ ذیل حقائق سے اخذ کی جا سکے جنہیں عمومی طور پہ درست تسلیم کیا جا چکا ہے۔

1۔ 1925ء میں اپنی دریافت تک، وادی سندھ میں مدفون شہروں کے کوئی ظاہری آثار نہیں تھے۔ یہ شہر اپنے عروج پر پہنچے اور پھر اپنے پیچھے کوئی نشان یا سراغ چھوڑے بغیر غائب ہو گئے۔ ان شہروں کے معدوم ہونے اور اس علاقے میں چھوٹے چھوٹے شہروں کا ایک نیا

سلسلہ شروع ہونے کے درمیان کم وبیش پانچ چھ سو برس کا وقفہ ہے اور یہ آج سے تقریباً تین ہزار سال پہلے کی بات ہے۔

2۔ موہنجوڈارو اور ہڑپہ کی ہم عصر تہذیبوں میں، بکھری ہوئی چھوٹی چھوٹی آبادیوں کے سوا زیادہ نمایاں اور بڑے شہروں کی بہتات دیکھنے میں نہیں آتی۔ دریائے سندھ کے اس وسیع اور نہ ختم ہونے والے طاس میں غالباً دو ہی نمایاں شہر تھے۔ ہڑپہ اور موہنجوڈارو۔ شہروں کے ایک وسیع سلسلے کی عدم موجودگی ترقی کے بارے میں ایک آرام طلب بے اعتنائی کی غماز ہے۔

3۔ وادی سندھ کے شہروں میں کسی مرکزی محل یا قلعے کی موجودگی کے شواہد نہیں ملتے، اگرچہ ہڑپہ کے گرد معمولی سی حصار بندی کے آثار ہیں۔ ان کھنڈرات میں، فراعین کی بالادستی اور جلال کے مظہر اہرام مصر کی طرز پر، بادشاہوں کے وقار کی عظیم الشان یادگاریں بھی نہیں ملیں۔ لیکن یہاں خوبصورت اور کشادہ حویلیوں کی کمی نہیں جن سے ایک متمول اور تاجر حکمران طبقے کی موجودگی کا عندیہ ملتا ہے۔ ایک مرکزی محل کی عدم موجودگی اور تاجروں کے رئیسانہ طرز زندگی سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں واجبی سے ٹیکس عائد تھے اور معاشرہ کسی واحد مرکزی حاکمیت کے جبر سے آزاد تھا۔ یہ تمام حقائق نسل در نسل بادشاہت کے عدم وجود کی علامت ہیں۔

4 - اہم حقیقت یہ ہے کہ شہروں کی خوشحالی، آب پاشی کے کسی قابل ذکر نظام کی مرہون منت نہیں تھی۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ دریائے نیل اور دجلہ و فرات کے علاقے میں رائج گہری کھدائی کرنے والا بھاری ہل ابھی وادی سندھ میں متعارف نہیں ہوا تھا۔ گویا یہاں کے شہروں میں ابھی نئی ٹیکنالوجی کو اختیار اور جذب کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوئی تھی۔

اگرچہ ہڑپہ تہذیب کے شہر ایک ہزار سال سے ذرا زیادہ وقت نکال گئے لیکن یہ معاشرہ مسلسل جمود کا شکار رہا۔ یہ شہر بڑی اعلیٰ منصوبہ بندی سے تیار کی گئی بستیوں کی صورت میں نمودار ہوئے لیکن اپنے قیام کے پورے عرصے کے دوران ترقی اور ندرت سے عاری رہے۔ بعد میں تعمیر ہونے والی عمارات اور مکانات ہوبہو پرانی عمارات کی بنیادوں پر اٹھائے گئے۔ وادی سندھ کی تہذیب کے تمام عرصے پر ایک پراسرار تسلسل کا غلبہ ہے۔ یہاں کوئی توسیع نہیں ہوئی اور کوئی جدت دیکھنے میں نہیں آئی اور پھر اچانک تمام شہر، بغیر کوئی نشان چھوڑے غائب ہو گئے۔ کوسمبی لکھتا ہے "میسوپوٹیمیا میں وادی سندھ کو غالباً میلوحا کے نام سے جانا جاتا تھا لیکن 1750 قبل از مسیح کے بعد میلوحا کا ذکر بالکل ختم

ہو گیا"۔

یہاں ایک ناگزیر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ جمود تن آسانی اور قدامت پسندی کا نتیجہ تھا یا اس کی وجوہات بہت بنیادی نوعیت کی تھیں؟ اس کا ممکنہ جواب تکلیف دہ حد تک آج کی دنیا سے متعلق ہے۔ یہ دنیا جسے تشدد آمیز بنیاد پرستی اور جہل پسندی جیسے آزار کا سامنا ہے۔ ان شہروں کے آثار قدیمہ میں دو بڑے ٹیلے 'یعنی دونوں جڑواں شہروں میں ایک بڑا ٹیلہ اور اس کے بالکل قریب ایک عظیم حمام یقیناً کسی خاص اہمیت کے حامل ہیں اور شاید اسی میں کہیں جواب کا سراغ مل جائے۔

مندر سے مشابہ قلعہ نما ٹیلے شہروں پہ پروہتوں کے راہبانہ کنٹرول کی نشاندہی کرتے ہیں کیونکہ ہر گھر میں ایک بہترین حمام ہوتا تھا' لہٰذا عظیم حمام محض نہانے کی غرض سے نہیں بنایا گیا ہوگا۔ دریائے سندھ کا تازہ پانی موہنجوڈارو کے قریب سے ہی گزرتا تھا اور دریا میں نہانا بر صغیر میں ہمیشہ سے صحت افزا سمجھا جاتا رہا ہے (اگرچہ وادی سندھ کی نسبت ہندوستان میں زیادہ)۔ لہٰذا عظیم حمام (بشمول اپنے ملحقہ کمروں اور زینوں کے ذریعے جڑی ہوئی مختلف منزلوں کے) چشمہ جیسی مذہبی رسومات کے مرکز کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ ان کی بناوٹ میں جس عرق ریزی سے کام لیا گیا ہے اس سے معاشرے میں پادری' راہب یا پروہت کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

پروہت کی اس اہمیت کی تصدیق اناج کے گوداموں کے محل وقوع سے بھی ہوتی ہے جو قلعہ نما ٹیلے یعنی مندر اور پروہت کے لئے مخصوص عمارتوں کے قریب واقع ہیں۔ گویا فاضل غلہ پروہت ہی اکٹھا کر کے تقسیم کرتا تھا۔

یہ سب آثار ثابت کرتے ہیں کہ وادی سندھ کے شہروں پر بادشاہوں کے بجائے پروہتوں کی حکومت تھی۔ ملوکیت کے بجائے مذہبی عقیدے کا غلبہ تھا۔ بنیادی پیداکاروں سے فاضل غلہ اور مصنوعات ہتھیاروں کے زور پر نہیں بلکہ مذہب سے عقیدت کی بنیاد پر حاصل کی جاتی تھیں۔ پیداکار تلوار کے بجائے کسی غیبی طاقت کے ڈر سے اپنی فاضل پیداوار ریاست کے حوالے کرتے تھے۔ لہٰذا تشدد کا عنصر محدود تھا۔ کوسمبی لکھتا ہے "موہنجوڈارو میں پائے جانے والے ہتھیار یہاں کے نفیس اوزاروں کے مقابلے میں بہت کمزور ہیں۔ نیزہ بغیر کمانی (پسلی) کے ہے۔ وار کے پہلے ہی مرحلے پر نیزے کی انی ٹیڑھی میڑھی ہو جاتی ہوگی۔ یہاں تلواریں بالکل ناپید ہیں"۔

پروہت اور راہب قدامت پسند اور ترقی و تبدیلی کے مخالف تھے۔ اسی راہبانہ بنیاد پرستی اور مذہبی عقیدہ واریت کا وادی سندھ کے شہروں پر راج تھا۔ ایسے دور میں نئی راہوں کی تلاش یا ٹیکنالوجی اور ایجادات سے لگاؤ ناممکن تھا۔ کسان نے بھاری ہل قبول نہیں کیا اور نہ ہی فاضل پیداوار کو نہروں یا اسی

طرح کے دوسرے اور اجتماعی منصوبوں کے لئے استعمال کیا گیا۔ ترقی اور جدت قابل مذمت ٹھہرے کیونکہ ان میں جہالت کی گرفت کو کمزور کرنے کی فطری صلاحیت ہوتی ہے۔ رقبے میں کوئی توسیع نہیں ہوئی اور نہ ہی پیداوار میں اضافہ ہوا۔ ترقی یافتہ شہری تہذیب جمود کا شکار ہو گئی۔ شہر نظام آبپاشی سے محروم تھے اور دریاؤں کے راستوں کی تبدیلی انہیں تباہ کر سکتی تھی۔ لیکن بیسویں صدی کے ماہرین آثار قدیمہ اگر اس تہذیب کو دریافت نہ کر پاتے تو شاید آج بھی اس عظیم اور بھرپور تہذیب کا کوئی بین ثبوت یا اہم سراغ موجود نہ ہوتا جو قدامت پرست پروہتوں کے کٹر، رجعت پسندانہ اور کمزور ماد دینے والے مذہبی عقیدوں کی بھینٹ چڑھ کے 'دریائے سندھ کی ریت کے بے پناہ بوجھ تلے کہیں دفن ہو گئی۔

بنیاد پرستی مسترد

یوں لگتا ہے سندھ واسیوں نے جلد ہی سبق سیکھ لیا تھا اور یہ سبق انہیں اپنے انتہائی اولین ماضی کے ان مردہ شہروں سے حاصل ہوا تھا جن کے بارے میں ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے یعنی بیسویں صدی کے آغاز تک کوئی کچھ نہیں جانتا تھا اور نہ ہی ان شہروں سے کسی کا کوئی قابل شناخت تعلق ما تھا۔ اس کے باوجود بنیاد پرستی اس خطے کے لوگوں میں کبھی قبول عام کی سند حاصل نہیں کر سکی کیونکہ وادی سندھ نے اسے بہت پہلے ریت کے ٹیلوں کے نیچے گہرا دفن کر دیا تھا۔ یہاں کے لوگ تو آج بھی بنیاد پرستی کو تواتر کے ساتھ مسترد کر رہے ہیں اور 1946 سے آج تک ہونے والے تمام انتخابات اس حقیقت کے روشن گواہ ہیں۔ یہ اعداد و شمار اس حقیقت کا متواتر اور ناقابل تردید ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ سندھ واسی (آج کا پاکستانی) ایک بے تعصب، روادار اور متحمل مزاج کا حامل انسان ہے جو بنیاد پرستانہ مذہبی سیاست سے فطرتاً کتراتا ہے۔

2

شہسوار کی آمد

آریائی مادر سری نظام

آریاؤں کی آمد سے پہلے وادی سندھ کے شہر جب کانسی کے زمانے Bronze Age کی تابانی میں اپنے عروج کی جانب گامزن تھے ' تو باقی ماندہ برصغیر میں اکا دکا آبادیاں تھیں جہاں لوگ ابھی پتھر کے عہد Stone Age میں جی رہے تھے اور چھوٹے چھوٹے قبیلوں میں بٹ کر خوراک کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے۔

زمانہ قبل از تاریخ میں وادی سندھ واضح طور پر معاشی ترقی اور باہمی روابط کے حوالے سے ہندوستان کی نسبت وسط ایشیا کے زیادہ قریب تھی۔ ہڑپہ کی تہذیب کے ناپید ہونے کے چند سو سال بعد تک وادی سندھ ویران اور سنسان پڑی رہی۔ لیکن زرخیز زمین ' جسے سیلابی مٹی ہر سال نیا شباب دیتی تھی ' زیادہ عرصے تک بے کاشت نہیں رہ سکتی تھی۔ فاضل پیداوار دینے کی اہلیت نے بالآخر وسیع علاقے میں بکھری ایک اور شہری تہذیب کو جنم دیا۔ وادی سندھ کے کسان کی اضافی پیداوار نے ایک بار پھر شہروں کی کفالت کی۔

یہی وہ وقت تھا جب آریا وادی سندھ میں آنا شروع ہوئے۔

آریاؤں کے بارے میں ہماری معلومات نامکمل تو ہیں لیکن بہت محدود نہیں رہیں۔ زبان اور رگ وید کے حوالوں سے اتنے شواہد جمع ہو چکے ہیں کہ ہم آریاؤں کی برصغیر میں آمد کو محض فسانہ طرازی قرار دینے کے نظریے کو یکسر مسترد کر سکتے ہیں۔

اگرچہ آریا کے جد امجد کی اصل سرزمین کے بارے میں بحث ابھی جاری ہے (جس کی نشاندہی باختر' اناطولیہ' وسطی ایشیا حتیٰ کہ وادی ڈینیوب تک میں کی جاتی ہے) لیکن چند حقائق کے بارے میں محققین بڑی حد تک متفق ہیں۔ آریاؤں کے اجداد کی نشانیاں ایشیائی اقوام کے علاوہ یونانی ' لاطینی سیلٹ' جرمن لیٹ (Lett) اور سلاوی قوموں میں بھی پائی جاتی ہیں۔

چار سے پانچ ہزار سال پہلے آریا قوم کا ایک بڑا حصہ وسطی ایشیا میں آمو دریا The Oxus سر دریا The Jaxartes ارل اور بحیرہ کیسپئن کے قرب و جوار میں آباد ہوگیا۔ شاید طویل خشک سالی کے باعث پیداواری ذرائع پر بڑھتی ہوئی آبادی کے دباؤ نے انہیں ہجرت پر مجبور کر دیا۔ اور یہ قوم ہندی اور ایرانی آریاؤں میں تقسیم ہو کر آج کے پاکستانی اور ایرانی علاقوں کی طرف ہجرت کر گئی۔ یہ ہجرت صرف ایک ہی بار نہیں ہوئی بلکہ نقل مکانی کا یہ سلسلہ 1500 قبل مسیح سے کئی صدیوں بعد تک جاری رہا اور انہی آریاؤں نے ہند اور سندھ کے مابین امتیاز کو دوام بخشا۔

ہند اور سندھ میں آریاؤں کی آمد سے پہلے قدیم اور اصل دراوڑی قبائل آباد تھے۔ ان کا ارتقا یکساں نہیں تھا۔ قدیم ذرائع آمدورفت ' ناقابل عبور جنگلات ' ناسازگار صحراؤں ' دریاؤں اور پہاڑی سلسلوں کے باعث خوراک کے متلاشی یہ بکھرے ہوئے قبائل ارتقا کے مختلف مراحل میں تھے۔

وادی سندھ کے شہروں میں جہاں وسائل کا انحصار زراعت اور معاشرے کی بنیاد شہری اکائی پر تھی۔ زندگی کا معیار خاصا ترقی یافتہ تھا اور معاشرہ پروہت کی سربراہی میں پدرانہ نظام مراتب Patriarchal Hierarchy میں ڈھل چکا تھا۔ لیکن شمالی ہند میں بہت سے قبائل ابھی تک مادر سرانہ سماج Matriarchal System کے ابتدائی دور میں تھے۔ خانہ بدوش ' جنگلوں میں رہ کر خوراک تلاش کرنے والے لوگ شہری آبادی ' زرعی دیہات ' پدرانہ اور مادر سرانہ معاشرے ' وادی سندھ کے وسیع میدانوں ' چراگاہوں اور جنگلات میں بیک وقت موجود تھے۔

آریاؤں نے وادی سندھ کی ثقافتوں کے تنوع کو تباہ کر دیا۔ خوراک کی تلاش میں سرگرداں بہت سے قبائل آریاؤں کے حملے سے جانبر نہ ہو سکے۔ بہتوں نے کئی صدیوں تک مزاحمت کی لیکن انہیں نکال باہر کیا گیا۔ ہتھیار ڈالنے کے بجائے انہوں نے بتدریج جنوب کی طرف ہجرت کرنے کو ترجیح دی۔

مزاحمت کرنے والے مقامی قبائل نے حملہ آوروں کی ثقافت پر بہت گہرے اور مستقل نوعیت کے نقوش چھوڑے۔ مقامی قبائل کی مختلف مذہبی رسومات اور ریت و رواج کی آج کے دور تک موجودگی ان زبردست اثرات کی غماز ہے جو مادر سرانہ مقامی آبادی نے پدرانہ نظام کے تابع آریاؤں پر چھوڑے۔

طاقتور آریا حملہ آور اپنی پسند کی دلہن کا انتخاب کرنے اور اسے اٹھالے جانے پر قادر تھے لیکن انہیں ہمیشہ مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ مادر سرانہ معاشرے کی مزاحمت آج بھی شادی کی رسومات میں یاد رکھی جاتی ہے۔ دلہن کی بہنیں دولہا کے جوتے چھپادیتی ہیں اور نقد رقم کی ادائیگی پر جوتے واپس کئے جاتے ہیں جس کے بعد ہی وہ دلہن کو لے جاسکتا ہے۔ جوتی چھپا کر دولہا (مرد) کو دلہن (عورت) کے روبرو بے بس و لاچار ہونا پڑتا ہے۔ اس رسم کے ڈانڈے قدیم مادری نظام کے معاشی حالات و سیاسی واقعات سے ملتے ہیں۔ اگرچہ گزشتہ کئی صدیوں میں عورت کا سماجی رتبہ کم ہوا ہے لیکن جہیز کی نمود و نمائش کی معیوب رسم کے ذریعے دلہن کی برتری ثابت کی جاتی اور اسے برات میں شامل تمام مہمانوں کے علم میں لایا جاتا ہے۔

مادری شجرہ نسب اور مادر سرانہ مقامی ثقافت کی جھلک آج بھی وادی سندھ کے ادب اور محاروں میں جھلکتی ہے۔ شاہ حسین اسی ''ماں ملکہ'' کے سامنے گریہ کناں ہے۔

مائے نی میں کینوں آکھاں

درد وچھوڑے دا حال نیں

(اے ماں، میں محبوب سے جدائی کے درد کا حال کسے سناؤں)

ماں سے درخواست کا یہی جذباتی انداز اور یہی قدیم پکار ہے جسے آج کے پنجابی شاعر افضل احسن رندھاوا نے اپنی شاعری میں کس عمدگی سے سمویا ہے۔

میں دریاواں دا ہانی ساں

ترنے پے گئے کھال نی مائے

(اے ماں، میں تو دریاؤں میں تیرنے کا عادی تھا لیکن مجھے چھوٹے چھوٹے نالوں میں تیرنا پڑ گیا۔)

اونے پھٹ مرے جثے تے

جنے تیرے وال نی مائے

(اے ماں، میرے بدن پر اتنے زخم ہیں جتنے تیرے سر پر بال)

ہن نہ ددھ پیائیں پورا

وڈے ہون نہ بال نی مائے

(اے ماں، آج کے بعد نوزائیدہ بچے کو دودھ نہ پلانا اور اسے بھوک سے مر جانے دینا)

آریاؤں کی سواری

کانسیBronze کی دریافت اور ساخت کے باعث کچھ اہم نوعیت کی پیش رفت ہوئی۔ کانسی کے ہتھیار ' پتھر کے دور کے ہتھیاروں سے ہلکے لیکن معیار میں بہتر تھے۔ یہ ماضی میں بنائے گئے تانبے Copper کے ہتھیاروں کے مقابلے میں بھی زیادہ سخت ' پائیدار اور مضبوط تھے۔ کانسی (بھرت) بنانے کیلئے ٹین ناگزیر تھا لیکن اس کے ذخائر محدود تھے اس لئے کانسی کی رسد بھی محدود تھی لہٰذا یہ محض ایک مختصر سی اقلیت کے قبضے میں ہوتا تھا۔ اور اس طرح کانسی ' معاشرے کو طبقوں میں بانٹنے کا سبب ثابت ہوئی۔

مہم جو حضرات منافع بخش ٹین کے ذخائر کی تلاش میں دور دراز علاقوں تک گئے اور ذخائر پر دسترس کے لئے ان کے درمیان جنگیں بھی ہوئیں۔ وادی سندھ میں اولین آریاؤں کا مقابلہ کرنے والی فوجیں بھی کانسی کے دور کی فوجیں تھیں۔ اور کئی لحاظ سے مزاحمت کرنے والے سندھ واسی حملہ آوروں سے برتر تھے۔ وہ بہر حال ایک اعلیٰ شہری ثقافت کے علمبردار تھے۔

آریاؤں کی وادی سندھ میں آمد سے بہت پہلے ہڑپہ تہذیب تو ناپید ہو چکی تھی۔ اس کی جگہ ایک زرعی تہذیب نے لی تھی جو تمام وادی سندھ میں پھیلی ہوئی تھی۔ چند شہر بھی تھے لیکن وہ ہڑپہ اور موہنجوڈارو جیسے بڑے نہیں تھے۔ بہت بڑے شہری مراکز کا دور تو لوہے کی دریافت کے بعد آنے والا تھا۔

یہ درست ہے کہ وادی سندھ میں ماضی اور حال کے شہروں (جو قدامت پرست پروہتوں کے زیر تسلط تھے) کا تنظیمی ڈھانچہ ان آریاؤں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں تھا جو ہڑپہ کے جڑواں دارالحکومتوں کے ناپید ہو جانے کے بعد تباہی سے بچ جانے والے چھوٹے چھوٹے شہروں پہ موج در موج حملہ آور ہوئے لیکن آریاؤں کو آسانی سے فتح حاصل نہیں ہوئی۔

رگ وید سے ہمیں بہت سی لڑائیوں کا پتہ چلتا ہے۔ ان میں سے ایک "دس بادشاہوں کی جنگ" تھی۔

اس جنگ کی اصل وجہ وادی سندھ کا مخصوص نظام آبپاشی تھا۔ یہ نظام دریا کے رستے میں بنائے گئے چھوٹے چھوٹے بند اور پشتوں پر مبنی تھا جن سے ٹکرا کے پانی کا رخ بدل جاتا تھا اور وہ دریا کنارے کی زمینوں پر پھیل کر انہیں سیراب کر جاتا تھا۔ مگر یہ گیلی اور خنک زمین آریاؤں کے گھوڑوں کے لئے جان لیوا ثابت ہوتی تھی۔ لہٰذا آریاؤں کے دس بادشاہ متحد ہو کر دریائے پوروشنی (موجودہ راوی) پر بنائے گئے پشتوں اور ٹھوکروں کو مسمار کرنے اور گویا دریا کا رخ تبدیل کرنے کیلئے حملہ آور ہوئے۔

ظاہر ہے جس تہذیب پہ حملہ ہوا وہ زیادہ تر زرعی تھی اور اس کا انحصار سراسر اسی سیلابی پانی کے ذریعے آب پاشی پر تھا جو اس زمانے میں ''بند اور پشتوں'' کے ذریعے کی جاتی تھی۔ پشتے حملہ آوروں کیلئے رکاوٹ بنتے تھے اور گیلی زمین اور کیچڑ میں آریاؤں کی اہم سواری 'گھوڑے کی سبک حرکت سست ہو جاتی تھی۔

اسی حوالے سے ہمیں وید کے دیوتا اندر کا بھی پتہ چلتا ہے جو ''دریاؤں کو آزاد'' کرنے کا کمال دکھاتا تھا۔ اپنے آفاقی عصا کے استعمال سے اس نے پنجاب کے عظیم ''دریاؤں کی توانائی کو آزاد کیا''۔ اس سے مراد ایسے بند اور پشتوں کی تباہی سے ہے جو وادی سندھ کے لوگوں نے سیلابی پانی اپنے کھیتوں تک لے جانے اور برسات کے پانی کو عارضی ذخیروں میں جمع کرنے کیلئے بنا رکھے تھے۔

وادی سندھ کی تہذیب کے کلیدی اثاثوں پر یہ حملہ یقیناً شدید مزاحمت اور جنگ و جدل کا باعث بنا ہوگا۔ مقامی باشندے پورو بہادری میں یکتا تھے لیکن تقدیر ان کے ساتھ نہیں تھی۔ ایک طویل اور خونی جنگ کے بعد نئے تارکین وطن فتح یاب ہوئے۔ پھر جیسے دریاؤں کے رخ ہی مڑ گئے 'بند اور پشتے توڑ دیئے گئے' دیوتا اندر نے دریاؤں کو ''آزاد'' کر دیا اور سیراب زمینیں بنجر ہو گئیں۔

یہ کیسا حیران کن اتفاق ہے کہ حالیہ زمانوں میں بھی انہی دریاؤں کے رخ اس وقت موڑ دیئے گئے جب 1959ء میں وادی سندھ کے پانیوں کی تقسیم کا معاہدہ ہوا۔ قبل از تاریخ سے لے کر آج تک اسی ''سانحے'' پر شاعر نے کہا ہے کہ :

موڑ کر دریا کو دشمن لے گیا اپنی طرف
اور میری سرزمیں پہ داغ دریا رہ گیا

''دس بادشاہوں کی جنگ'' سے ثابت ہوتا ہے کہ آلات حرب کے حوالے سے حملہ آور آریاؤں کو اپنے مقامی حریفوں پر کچھ ایسی برتری حاصل نہ تھی۔ دونوں کے پاس ایک ہی جیسے ہتھیار تھے۔ اصل برتری کہیں اور تھی۔

پہلی بات تو یہ کہ وادی سندھ میں اگرچہ جمود کا شکار شہری آبادی نابود نہیں ہوئی تھی لیکن انحطاط اور زوال کا شکار ہو چکی تھی اور سہل پسند پروہتوں کی حکمرانی میں ایک ایسے معاشرے کے لئے ناممکن تھا کہ وہ تازہ دم وحشی حملہ آوروں کی بے پناہ قوت کا مقابلہ کر سکتا۔ پروہتوں کی قدامت پسندی اور کٹر مذہب پرستی نے بہت پہلے ہی ہڑپہ کے کفن دفن کا بندوبست کر دیا تھا۔ وادی سندھ کی یہ دوسری تہذیب تھی جس کی تباہی کو اندھے عقائد اور بنیاد پرستی کے زہر نے یقینی بنا دیا تھا۔

دوسری اہم بات آریاؤں کی سواری 'یعنی گھوڑے نے پوری وادی سندھ میں ان کی بالادستی قائم

کی اور یہ سواری وسطی ایشیائی تھی جسے یہاں غیر معمولی طور پر برتری حاصل تھی۔

موسم کے لحاظ سے وادی سندھ اور ہند گھوڑے کیلئے کبھی آرام دہ مسکن نہیں رہے۔ بعد کے زمانوں میں بھی آریا' موریہ 'باختری 'گپتا' راجپوت 'ترک 'منگول اور برطانوی گھڑ سوار فوجوں کا انحصار مکمل طور پہ در آمدی گھوڑوں پر تھا۔

جنگی چالوں اور حکمت عملی میں گھڑ سوار آریاؤں کی سرعت بے نظیر تھی۔ لہٰذا انہیں جنگ میں واضح برتری حاصل ہوئی حتیٰ کہ بگھی میں جتے ہوئے گھوڑے بھی جس سرعت سے حملہ آور آریائی سواروں کو لاتے اور لے جاتے تھے ' ست رو بیل اور ہاتھیوں کی سرزمین' وادی سندھ میں ایسی رفتار ناقابل تصور تھی۔ آریاؤں نے بے ڈھب اور دقیانوسی بگھی کے آگے گھوڑے جوت لئے تھے اور وہ مقامی بیل گاڑی سے صرف بھاری سامان کی ترسیل کا کام لیتے تھے۔ بیل گاڑی اپنے دشمن پر ایسی رفتار سے اور اس غیر متوقع انداز میں حملہ آور نہیں ہو سکتی تھی جس طرح کہ گھڑ سواروں کا دستہ۔ اسی کارکردگی کے پیش نظر رگ وید میں گھوڑے کی تعریف میں جس طرح زمین آسمان کے قلابے ملائے گئے ہیں' اس پر قطعی حیرانی نہیں ہوتی۔

خانہ بدوش آریاؤں کو اپنے طرز زندگی کے باعث کئی اور فوائد بھی حاصل تھے۔ انہیں مویشیوں کی شکل میں خوراک کے متحرک ذخائر میسر تھے۔ کیونکہ ان کے ہاں بیل و گائے کے گوشت کو ابھی تک ممنوع قرار نہیں دیا گیا تھا البتہ مال مویشی کی بہت اہمیت تھی اور بیماری اور موت کے خلاف ان کی حفاظت کی جاتی تھی۔ لیکن آریا کے لئے تو ہمیشہ گھوڑا ہی اس کا سب سے قیمتی اور باعث افتخار سرمایہ رہا۔ ابتدا میں تو وادی سندھ کی زراعت اور نتیجتاً اس کی شہری تہذیب کو تباہ کرنے میں اس جانور کی افادیت نظر آئی۔ جب ویدی دیوتا اندرا اپنے آفاقی عصا سے "دریاؤں کو آزاد" کرنے کا کارنامہ سرانجام دے رہا تھا' تو اس وقت دراصل وہ آریا کی محبوب ترین ملکیت 'گھوڑے کیلئے ایک بہت ہی مفید کارنامہ سرانجام دے رہا تھا۔ اس علاقے کو گھوڑے کے لئے سازگار بنانا تھا تو پھر فاضل پانی ذخیرہ کرنے والے بند تباہ کرنا بہت ضروری تھا اور آریاؤں نے یہی کیا۔

اس کارنامے کو اندر سے اس لئے منسوب کیا گیا کیونکہ وادی سندھ کے شہروں کی زرعی بنیاد تباہ کرنے کی حکمت عملی کو مذہبی جواز فراہم کرنا بے حد ضروری تھا۔ اس کے بغیر تباہی کا اتنا بڑا اور وسیع تر عمل ممکن نہ تھا۔ اندر کے "عمل" سے وادی سندھ کے شہر ایک بار پھر تباہ ہوئے۔ وہ ایک بار پھر ناپید ہو گئے۔ آریاؤں کی آمد اور ہڑپہ تہذیب کے خاتمے کے بعد ایک ہزار سال تک راعیانہ (گلہ بانی Pastoral) طرز حیات وادی سندھ پر دوبارہ غالب آگیا۔ پاکستان کئی صدیوں کے لئے ایک وسیع چراگاہ بن چکا تھا۔

لوہا اور شاہراہ جمنا

سندھ اور اس کے معاون دریا پہاڑی گھاٹیوں سے نمودار ہو کر جب پنجاب اور سندھ کے وسیع و عریض اور اکتادینے کی حد تک ہموار میدانوں میں پہنچتے ہیں تو اپنے مزاج کے بے رحمانہ تلون کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ سال کے بیشتر حصے میں تو یہ دریا (اپنی وسیع گزرگاہ سے جو بعض مقامات پر کئی میل چوڑی ہوتی ہے اور انتہائی زرخیز بھی) معصومانہ سست روی کے ساتھ نرم ریت کے وسیع و عریض سلسلوں میں سے سانپ کی طرح بل کھاتے ہوئے گزرتے رہتے ہیں لیکن گرمیوں کے آخری دو مہینوں میں جب برف پگھلتی ہے اور مون سون کی بارشیں مسلسل اور موسلادھار ہوتی ہیں تو جیسے یہ دریا یکدم انگڑائی لے کر بیدار ہو جاتے ہیں اور پھر بپھرے ہوئے سمندروں کے مانند بحیرہ عرب کی طرف بڑھتے ہیں۔ تب یہ اپنے راستے کی ہر شے کو ساتھ بہالے جاتے ہیں۔ اس وقت دریا کا پاٹ جیسے اس ختم نہ ہونے والے ہموار میدان جتنا چوڑا ہو جاتا ہے جہاں سے کہ دریا گزر رہا ہوتا ہے۔ تاریخ ایسی ان گنت تہذیبوں اور بستیوں کا حساب دینے سے قاصر ہے جو ان بپھرے ہوئے دریاؤں کے بھینٹ چڑھ گئیں۔

ایک بار تباہ ہونے کے بعد شہری تہذیبوں کا پھر سے بحال ہونا آسان نہیں تھا۔ وادی سندھ میں دھاتوں کی کمیابی اور دریائی گزرگاہوں کا مسلسل تبدیل ہوتے رہنا مستقل بستیوں کی تعمیر میں بڑی رکاوٹ بنا۔ معاشرہ چھوٹی چھوٹی قبائلی اکائیوں کی شکل میں ترتیب پاتا رہا جن میں ذات پات یا طبقوں کی بہت معمولی یا پھر کوئی تمیز نہیں تھی۔ قلیل مقدار میں سہی لیکن کانسی کی فراہمی کے باوجود مستقل آبادیوں کی مکمل تباہی نے اولین طبقاتی نظام کو بھی حذف کر دیا۔

مویشیوں کے چرانے میں زیادہ لوگوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ خانہ بدوش چرواہوں کے ہاں افرادی قوت کا اتنا فقدان ممکن نہ تھا کہ حکمران طبقے کی ضروریات پوری کرنے کیلئے غلاموں کے ایک مجبور طبقے کی ضرورت پڑتی۔ لہٰذا ابھی تک غلامی کا تصور بھی موجود نہیں تھا۔ جوا، بگھیوں کی دوڑ، رقص و سرود، پہلوانی اور مکہ بازی کے مقابلے آریاؤں کی پسندیدہ تفریحات تھیں۔ نشہ آور مشروبات، بالخصوص سوم کا استعمال عام تھا۔

اگر آریا وادی سندھ تک محدود رہ گئے ہوتے تو ہندی تہذیب اتنی جلدی کانسی کے دور سے نکل کر زندگی کے ایک ایسے برتر درجے پر فائز نہ ہو سکتی جس کا انحصار لوہے کو ڈھالنے اور اسے استعمال کرنے پر تھا۔ سب سے پہلے حتیوں Hittites نے لوہے کو پگھلایا تھا مگر برصغیر پاک و ہند میں اس کے استعمال سے بہت پہلے یہ نئی دھات ایشیا کی کئی اقوام کے تصرف میں آ چکی تھی۔

ہندوستان میں لوہے کے ذخائر وادی سندھ سے بہت دور مشرق میں صوبہ بہار کے علاقے میں

واقع وادی جمنا کے دشوار گزار جنگلات میں پوشیدہ تھے۔ وادی سندھ یہاں سے بہت دور تھی لہٰذا تاریخ کے اس ارفع دور یعنی دور آہن Iron Age تک پہنچنے کے لئے وادی سندھ کا وادی جمنا سے منسلک ہونا ضروری تھا تاکہ بہار سے رابطہ ممکن ہو سکے۔ یہ کارنامہ عظیم موریہ شہنشاہ اشوک کے دور میں انجام پانا تھا لیکن اشوک اعظم سے پہلے 'ابھی بہت سی بنیادی تبدیلیاں ہونا باقی تھیں۔

موج در موج آنے والے نئے اور زیادہ طاقتور آریاؤں نے پہلے سے آباد آریاؤں اور مقامی باشندوں کو وادی سندھ سے وادی جمنا میں دھکیل دیا۔ اگرچہ اس وادی کے جنگلات بہت دشوار گزار تھے لیکن کوئی اور متبادل بھی تو نہیں تھا۔ راجستھان کا صحرا بہت زیادہ سرد مہر اور حوصلہ شکن تھا اور جنگل کے مقابلے میں کہیں زیادہ دشوار گزار بھی۔ در حقیقت 'اپنے جنگلات سے ڈھکے اطراف کے باوجود ' دریائے جمنا خود ایک قدرتی آبی گزرگاہ تھی 'ایک ایسی گزرگاہ جو افراد اور سازوسامان کی ترسیل کی سہولت مہیا کرتی تھی۔ یہی ''شاہراہ جمنا'' مشرق میں واقع لوہے کے ذخائر تک رسائی کا ذریعہ تھی۔ جو آریاؤں کو براہ راست بہار میں لوہے کے ذخائر تک لے گئی لیکن یہاں تک پہنچتے پہنچتے آریاؤں کے طرز زندگی میں چند اہم تبدیلیاں بھی رونما ہوئیں۔

دریائے جمنا کے ساتھ ساتھ اس مسلسل اور انتھک پیش رفت نے بیشمار نو آبادیوں کو جنم دیا۔ نئی آبادیوں کے قیام کے لئے جنگل کاٹنے ضروری تھے اور جنگلات کی صفائی کے لئے مزید افرادی قوت کی ضرورت تھی۔ کانسی کے ہتھیاروں نے حجری دور Stone Age کے مقامی دشت نشینوں کو آسانی سے زیر کر لیا۔ مطیع ہونے کے بعد یہی لوگ شودر کہلائے۔ یہ سب سے ادنیٰ ذات تھی جس کا کام حکمرانوں کیلئے اضافی پیداوار مہیا کرنا تھا اور یہیں وادی سندھ کا دلکش اور طبقات سے عاری معاشرہ تمام ہوا اور ماضی کے زمان و مکان میں مقید ایک بھولی بسری داستان بن گیا۔

3

لوہا، کرشن اور مہا تمابدھ
قبائلی سماج انجام کو پہنچا

آگ، قربانی، ذات پات کی ترویج اور صوبہ بہار

آریاؤں کا وادی سندھ سے وادی گنگا تک پہنچنا تاریخ کی ایک عظیم جست تھی۔ اس کے بعد وہ اپنی نوآبادیوں کو مشرق کی جانب پھیلانے میں ست روی کا شکار رہے۔ وادی جمنا کو نوآبادی ماننے میں صدیاں بیت گئیں کیونکہ بہاز اپنے لوہے کے ذخائر سمیت بہت دور مشرق میں تھا لہٰذا لوہا ابھی آریاؤں کے استعمال میں نہیں آیا تھا لیکن پھر بھی اس دور میں بہت اہم پیش رفت ہوئی۔

کانسی کے اوزار جلد ٹوٹ جاتے تھے اور وادی جمنا میں پہلے پہل آریاؤں کو اپنے راستے کے جنگلات صاف کرنے میں دقت پیش آتی تھی۔ لہٰذا جنگل صاف کرنے کیلئے انہیں آگ لگادی جاتی تھی۔ لیکن جنگل کی آگ محض جنگل ہی کو بھسم نہیں کرتی تھی' آگ لگانے والے بھی اس کی بھینٹ چڑھ جاتے تھے۔ اس لئے یہ تعجب کی بات نہیں کہ آریائی دیوتاؤں میں دوسرے دیوتاؤں کی نسبت آگ کے ہیبت ناک دیوتا ''اگنی'' کو ایک ممتاز مقام حاصل ہو گیا۔

معاشرے میں طبقات کے ظہور کے ساتھ ذاتوں کی توثیق اور انہیں ان کے متعین مقام تک محدود رکھنے کے فلسفے کا نمودار ہونا ناگزیر تھا۔ جنگل میں شاہراہ جمنا کا راستہ صاف کرنے کیلئے شودر بے حد ضروری تھے۔ انہیں اقتدار اعلیٰ کے ظالمانہ جبر یا کٹر مذہبی عقیدے کے رسم ورواج کے ذریعے مطیع رکھا جا سکتا تھا۔

ایک ایسے فطرتی ماحول میں جو انسان اور حیوان ' آریا اور شودر ' سب کیلئے یکساں طور پہ نامساعد تھا اگر بے پناہ تشدد کیا جاتا تو افرادی قوت میں کمی کا اندیشہ تھا۔ مذہبی عقیدے اور رسوم کے ذریعے دھیمے لیکن دھمکی آمیز طریقے سے انسانی جان کے ضیاع کا تدارک کیا گیا اور اس کے ساتھ ہی شودر کو اس کا اصل مقام بھی باور کرا دیا گیا۔ قربانی کی رسم گویا اس بات کا اعلان تھا کہ حکمران طبقہ تشدد کرنے اور اذیت دینے کی صلاحیت اور طاقت رکھتا ہے۔ گھوڑے ' بیل اور انسان کی قربانی بظاہر دیوتاؤں اور بدروحوں کو خوش کرنے کیلئے دی جاتی تھی لیکن اس کا بنیادی مقصد زندگی اور موت پر حکمرانوں کے ہمہ گیر اختیار کی توثیق کرنا تھا۔

" یجن " یا قربانی ہندی آریاؤں کے سماجی ڈھانچے کی بنیاد قرار پائی جو ذات پات کے تابع سماجی نظام کیلئے ایک مسلسل یاد دہانی اور حکمران طبقے کی مسلمہ بالادستی کا واضح پیغام تھا۔ جیسے جیسے یہ رواج اہمیت حاصل کرتا گیا اس میں پیچیدگیاں بھی بڑھتی گئیں اور اس کے نتیجے میں ایک نئی ذات برہمن کا وجود میں آنا ایک فطری عمل تھا۔ آغاز میں جو بات محض مذہبی رسم و رواج کا ایک نمائشی پہلو تھی ' جلد ہی توہم اور کٹر مذہبی عقائد کا سرچشمہ بن گئی۔

ذات پات کی دو انتہائی حدود (برہمن اور شودر) کے درمیان ابھی مزید دو ذاتوں نے نمودار ہو کر استحکام پکڑنا اور توہمی رسم و رواج اور مذہبی عقائد کے حوالے سے اپنا علیحدہ تشخص قائم کرنا تھا۔ کھشتری کو مملکت کا نظام چلانے اور جنگیں لڑنے کی ذمہ داری سنبھالنا تھی اور ویش نے تجارت سے منافع کمانا اور مملکت کو محصولات ادا کرنا تھے۔

جمنا کی راہ گزر ' آریاؤں کو بہار میں لوہے کے ذخائر تک لے آئی تھی اور یہ واقعہ پورے برصغیر کی تاریخ میں تبدیلی کا ایک انتہائی اہم موڑ ثابت ہوا۔

انیسویں صدی میں برقی پیغام رسانی اور ریل کی آمد تک لوہے کے ذخائر کی دریافت اور اس کا استعمال ہی وہ پیش رفت تھی جس نے تمام برصغیر کو بطور ایک خطے کے متاثر کیا۔ مشرق میں لوہے کے ذخائر تک رسائی اور ان کے زیر استعمال آنے کے بعد واقعات اور تبدیلی کی لہریں مشرق سے آنا شروع ہوئیں۔ مشرق جو ایک بہتر دھات سے آراستہ تھا اب سلطنت کا محور ٹھہرا کہ مشرق ہی ان تبدیلیوں اور معاشرے پر ان کے اثرات کا ماخذ تھا جو لوہے کی دریافت اور انسانی زندگی میں اس کی اہمیت کے نتیجے میں رونما ہونے والے تھے۔

لوہے کے اوزار، نجی ملکیت کا آغاز

کانسی کی جائے لوہے کا استعمال اس دور کی سب سے اہم پیش رفت تھی۔ خام لوہے کو پگھلا کے باآسانی آلائشوں سے پاک کیا جاسکتا تھا۔ کانسی نسبتاً ناپید اور لوہے کی بہتات تھی پھر یہ مضبوط و پائیدار بھی تھا۔

لوہے کی مصنوعات کی وسیع پیمانے پر تیاری نے آریاؤں کو بہت سی قوی اور موثر پیداواری قوتوں کے ارتقا میں مدد دی۔ لوہے کی کلہاڑی نے جنگلوں کی کٹائی کو آسان بنا دیا اور زراعت کے لئے زیادہ زمین دستیاب ہونے لگی۔ لوہے کے بھاری ہل نے قابل کاشت اراضی میں گہری کھدائی کی جس سے فصلیں اور پودے زیادہ بھرپور اور تناور ہوئے۔ لوہے کی درانتی نے ایک حد تک غلے کے ضیاع کو کم اور بڑے پیمانے پر فصلوں کی کٹائی کو ممکن بنایا۔ اس کے تیز دندانوں کے باعث غلے کے دانے کٹائی کے دوران کھیت میں کم جھڑتے اور زیادہ فصل حاصل ہوتی۔

وہی جنگجو خانہ بدوش آریا جو وادی سندھ کی زراعت کو تاراج کرنے کا باعث ہوئے اب خود اسے اختیار کرنے پر آمادہ ہو چکے تھے۔ پیشے کی اس اہم تبدیلی نے فاضل معاشی پیداوار کا راستہ ہموار کیا جس سے پجاری اور ریاستی اشرافیہ سیاسی اعتبار سے مضبوط ہوئی اور اب حکمران طبقات مختلف اقسام کے بہت سے تباہ کن ہتھیاروں سے بھی لیس تھے۔

لوہے کے ساتھ نقل و حمل اور ترسیل کی بہتر سہولت بھی آئی۔ بیل گاڑی اب لوہے کے نئے دھرے Axle پر بنائی جاتی تھی اور اب شکستگی کے خدشے سے بے نیاز ہو کر اس کے ذریعے طویل فاصلوں تک سفر کیا جاسکتا تھا۔ لہٰذا لوہے نے آریائی تہذیب بالخصوص تاجر طبقے اور اس کی اجناس کی پہنچ دور دراز علاقوں تک ممکن بنا دی۔ اس طرح اس نئی دھات نے ایک ابھرتی ہوئی تاجر برادری یعنی ویش کو استحکام بخشا۔ تاجر طبقہ ہمیشہ رہنے کیلئے وجود میں آچکا تھا۔

برصغیر پاک و ہند میں بیل، نقل و حمل کے لئے سب سے اہم جانور تھا۔ گھوڑا' تو ظاہر ہے یہاں کا جانور نہیں تھا۔ شودر کے علاوہ بیل ہی مشقت کا دوسرا بڑا ذریعہ تھا۔ اس لئے تاجر اور کسان دونوں کیلئے بیل یکساں طور پہ اہم تھا۔ اگرچہ یہ برہمن ہی تھا جو قربانی کے پراسرار قصے گھڑتا تھا مگر اہمیت کے پیش نظر بیل (اور اسی وجہ سے گائے) کی حفاظت اور پرورش لازم ٹھہری اور اسے قربانی کی رسم سے مستثنیٰ قرار دیا جانا ضروری ہو گیا۔ دیوتاؤں کو خوش کرنے کیلئے تو کچھ اور طریقے بھی ڈھونڈے جا سکتے تھے۔ کیونکہ اب یہ جانور دیوتاؤں کو خوش کرنے کیلئے قربانی کی بھینٹ نہیں چڑھایا جاسکتا تھا اس لئے گائے کی حفاظت کو یقینی بنانے کیلئے اسے دیوتا کا درجہ دینا ضروری ہو گیا۔ اور یوں اسے دیوتاؤں کی عبادت گاہ میں ایک اہم مقام تفویض کر کے گائے کی قربانی پر سختی سے پابندی عائد کر دی گئی۔ بعد میں

یہی پابندی مستحکم ہو کر راسخ عقیدے اور مذہب کی شکل اختیار کر گئی۔ اور اس کے بعد بیل گاڑی قدیم اور قرون وسطی کے ہند کا مستقل نشان بن چکی تھی۔

لوہے کے اوزاروں کی آسان دستیابی' بہتر کار کردگی اور پائیداری کے باعث آریاؤں نے نئے اور دشوار گزار علاقوں کو زیر کاشت لانا شروع کیا۔ آبپاشی کے نئے منصوبے وضع کئے گئے اور نت نئی دستکاریوں سے بہرہ مند ہوا جانے لگا۔ یہ نئی اور برتر تہذیب ان علاقوں تک بھی پھیل گئی جو ہنوز نامعلوم تھے۔ بکھرے ہوئے الگ تھلگ قبائل بھی زیر نگیں آنے لگے جو ابھی تک اپنے اپنے مخصوص اور متعین علاقوں میں محدود تھے۔ اس طرح مملکت کی قوت کا تصور ابھرا جو ایک بڑے خطے اور اس میں بسنے والوں کو مطیع بنا کے بہت زیادہ فاضل پیداوار پہ قبضہ جما سکتی تھی۔ لوہے نے اس جارحانہ توسیع پسندی کی اعانت کی اور تصادم اور جنگی حکمت عملی کے ابتدائی دور کا آغاز ہوا۔

لوہا ذات پات کے رائج الوقت نظام پر بھی اثر انداز ہوا۔ جہاں ایک طرف اس نے انسان کے لئے دھرتی ماتا کے خزانوں کے منہ کھول دیئے اور فاضل پیداوار میں بے تحاشا اضافہ کیا۔ وہاں اس کے ذریعے زائد از ضرورت پیدا کرنے والا ہی زیادہ ظلم کا شکار بھی ہوا۔ یہ فرد جو پہلے ہی طبقاتی نظام کی سب سے نچلی سطح پر تھا' اب اس کا سماجی رتبہ اور بھی کم ہو گیا اور وہ محض خاک نشیں ہو کر رہ گیا۔ شودر کی حیثیت اب صرف ایک مشین یا جانور کی سی تھی۔ نہ تو وہ کوئی شہری حقوق رکھتا تھا اور نہ ہی اسے کوئی سہولت اور تحفظ حاصل تھا۔

ہندوستان کا مخصوص طبقاتی نظام جیسے جیسے جڑ پکڑ تا گیا اور اس کی شکل واضح ہوتی گئی' شودر استحصال اور بدحالی کی دلدل میں گہرا دھنستا چلا گیا۔ اس نظام کو مذہب' کٹر عقائد اور وقت کے ظالمانہ معاشی نظام نے تقدیس ودیعت کی تھی۔ برہمن کی حیثیت مذہبی پیشوا کی تھی۔ جو کبھی اقتدار کے اعلیٰ ترین درجے پر اور کبھی کھشتری (عسکری بادشاہ) کے ماتحت ہوا۔ ویش تاجر تھا جس کی اہمیت وقت کے تقاضوں کے مطابق بدلتی رہتی تھی لیکن وہ اکثر سیاسی و سماجی تبدیلیوں کا محرک بنا۔ سب سے ادنیٰ درجے پر شودر تھا۔ ایک غلام جس کی حیثیت خانہ زاد غلام سے قدرے بہتر تھی لیکن برہمن کے عقیدے کے مطابق وہ اچھوت اور نیچ تھا۔

آگے چل کر ذات پات کے اس نظام کو اپنے تیکھے نقوش نمایاں کرنے کے بعد برصغیر کے تمام زرعی اور تجارتی علاقوں تک پھیل جانا تھا۔ انتہائی کٹر اور بے لوچ اور ایک ایسے آزار کے مانند جو پورے سیاسی و سماجی ڈھانچے کو لاغر کر کے رکھ دے۔ معاشرتی ارتقا کا یہ ابتدائی دور زائد از ضرورت یا فاضل زرعی پیداوار حاصل کرنے' اسے بروئے کار لانے اور تجارت کو فروغ دینے کی روزافزوں صلاحیت کا دور تھا۔

ظاہر ہے پیداوار میں اضافے کے دو ناگزیر ذرائع لوہے کے اوزار اور شودر تھے۔ پیداوار بڑھانے کی فطری اہلیت میں اضافے کے ساتھ اس پیداوار کو پہلے کے مقابلے میں زیادہ تناسب سے وصول کرنے کی ترغیب میں بھی اضافہ ہوا۔ یہی ترغیب بعد میں ذاتی ملکیت کے تصور کی شکل میں ڈھلی۔

جس شے کو اجتماعی یا مشترکہ سمجھا جاتا تھا اب اسے افراد کی ملکیت قرار دیئے جانے کا آغاز ہوا۔ زمین اور دوسری اشیاء پر فرد کی ملکیت کا حق تسلیم کیا جانے لگا۔ ذاتی ملکیت کے قوانین اور ضابطے وضع ہونے لگے لیکن ذاتی ملکیت کے نظام نے ہی بڑے اختلافات اور زیادہ بڑی جنگوں کو ہوا دی۔

اندر کی پسپائی

دور آہن کے آغاز میں کشتری (عسکری بادشاہ) تو جنگوں میں الجھا ہوا تھا جب کہ ویش (تاجر) ابھی تجارتی راستوں اور منڈیوں کو مستحکم کرنے میں مصروف تھا۔ عبوری دور کے اس الجھاؤ کا برہمن (پروہت) نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

برہمن کا بنیادی فریضہ تو قربانی کی رسومات کی انجام دہی تھا۔ مگر سماج اور اشرافیہ پر اپنی گرفت مضبوط بنانے کے لئے وہ مذہبی رسومات کو بتدریج پیچیدہ کرتا چلا گیا اور اس نے ان رسومات کی ادائیگی کو بلاشرکت غیرے اپنی تحویل میں لے لیا۔ رسومات کو مذہبی عقیدے کا درجہ دے دیا گیا۔ اطاعت ہی نجات کا واحد ذریعہ بنی اور انحراف کی صورت میں نافرمان کو سخت ترین سزائیں ملنے لگیں۔

مویشیوں کی نجی ملکیت کے فروغ اور برہمن کی جانب سے رسومات کو پیچیدہ بنانے کے باعث گائے کی قربانی اور اس کا گوشت کھانے کی پابندی کو مزید استحکام ملا۔ اس رواج نے بالآخر گائے کو معبود کے درجے پر فائز کر دیا۔ مذہبی توہمات نے رسومات کے علامتی تشخص کو تقویت دی جیسا کہ ہڑپہ کے شہروں میں بھی ہوا تھا اس طرح طبقاتی درجہ بندی کو استحکام حاصل ہوا جس سے معاشرے کو یکجا اور اکثریتی آبادی یعنی شودر کو محکوم بنائے رکھنے میں مدد ملی۔

لوہے کے ہتھیار کانسی سے مضبوط 'دیرپا' کہیں بہتر اور بہتات میں تھے۔ یوں لوہا جنگوں کے حوالے سے معاشی تباہ کاریوں کا باعث بھی ہوا۔ ان جنگوں کے احوال لکھے گئے اور بعد میں بڑے شوق سے گائے بھی جاتے رہے۔ کروک شتر کی لڑائی ہند کے رزم نامے مہابھارت کا مرکزی خیال بن گئی۔

رامائن اور مہابھارت دو مشہور ترین رزمیہ نظمیں ہیں۔ ہند کی مروجہ ثقافت اور مذہبی طور طریقوں کے بارے میں یہ نظمیں ہماری معلومات کا اہم ترین ذریعہ ہیں۔ اس بارے میں تو یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کب لکھی گئیں لیکن بالعموم یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ شاعروں کی کئی نسلیں ان نظموں

کی تخلیق میں مصروف رہیں۔

شاید مہابھارت کا سب سے زیادہ اہم اور اس کے پیروکاروں کیلئے اس کا سب سے جذبات انگیز حصہ بھگوت گیتا ہے۔ یہ نظم 700 اشعار پہ مشتمل ہے۔ جو راجہ ارجن اور دیوتا کرشن کے درمیان ایک مکالے سے شروع ہوتی ہے یہ مکالمہ جنگ کے آغاز سے پہلے کا ہے۔ دیوتا' دل شکستہ شہزادے کی دلجوئی کرتا ہے جو کروک شتر کے میدان میں جنگ کی صف آرائی کے بعد اس لئے دل ہار بیٹھا ہے کہ اس نے اپنے چچا کو دشمن کی صفوں میں دیکھ لیا ہے اور وہ اپنے ہی خون کے قتل سے ہاتھ نہیں رنگنا چاہتا۔ مگر کرشن اسے ہر حالت میں ایک ''نیک مقصد'' کی خاطر جنگ کرنے کیلئے آمادہ کر لیتا ہے۔

رامائن اور مہابھارت کی ان نظموں سے رگ وید کا تقابل دلچسپ معلومات فراہم کرتا ہے۔ رگ وید میں ان دونوں بعد کی نظموں سے ایک مختلف سماج کی عکاسی ہوتی ہے۔ رگ وید کے موضوعات کا تعلق زیادہ تر کانسی دور کے قبائل اور مویشی پالنے والے خانہ بدوشوں سے تھا اور ان میں وسطی ایشیا کا گہرا تاثر ملتا ہے۔ اس کے مقابلے میں رامائین اور مہابھارت کی رزمیہ نظموں پر نہ صرف دور آہن کا اثر غالب ہے بلکہ یہ ذات پات' زائد از ضرورت یا فاضل پیداوار دینے والے شودر' قربانی کے برہمنی تصور' جمنا اور وادی گنگا سے بھی متعلق ہیں۔ رگ وید وادی سندھ کی قدیم مذہبی کتاب ہے جبکہ مہا بھارت ہندوستان میں تخلیق کی گئی۔ کئی اعتبار سے یہ دو مخالف پن دھارے تھے۔ اور بہت حوالوں سے یہ وادی سندھ اور ہند کے مابین تفریق کی نمائندہ ہیں۔

رامائن اور مہابھارت کی رزمیہ داستانیں ایک نئے دور کا آغاز بھی ہیں۔ اندر کی جگہ دیوتا کرشن کے آنے سے آریاؤں کے گلہ بانی طرز زندگی کے زرعی معاشرے میں ڈھلنے کی تصدیق بھی ہوتی ہے۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں رگ وید کا دیوتا اندر وہ تھا جس نے وادی سندھ کی زراعت کو تباہ کیا۔ اندر اور اگنی کو آگ کی قربان گاہ پہ یاد کیا جاتا تھا جہاں باربرداری کے جانوروں کو قربان کیا جاتا۔ اس زمانے میں کانسی کے اوزار اور ہتھیار استعمال ہوتے تھے۔ کانسی کے اوزار زمین کا سینہ چیرنے میں زیادہ مدد نہیں دے سکتے تھے۔ لہٰذا زراعت سے فاضل پیداوار حاصل کرنا مشکل تھا اور معاشرہ گلہ بانی کے گرد ہی گھومتا تھا یہ وادی سندھ اور ویدوں کا معاشرہ تھا۔

لوہے کے بھاری ہل نے زراعت کے پھیلاؤ میں مدد دی۔ اس کے ساتھ ہی ہل کو کھینچنے کیلئے انسانی استعداد سے زیادہ قوت اور جسمانی توانائی کی بھی ضرورت پڑی' جیسے ہی انسان نے اپنی ضرورت کیلئے حیوانات کا استعمال شروع کیا یا دوسرے لفظوں میں جیسے ہی زراعت زائد از ضرورت پیداوار کی بنیادی صنعت بنی' مویشیوں کی اہمیت بڑھ گئی۔ قربانی کے قبائلی تصورات بدل گئے اور ہندو دیوتاؤں کی

عبادت گاہوں میں اب کرشن، اس سماجی نظام کے دیوتا کی حیثیت سے براجمان ہوا جس کی بنیاد زراعت پر تھی۔ اور یہ معاشرہ 'رامائن، مہابھارت اور انڈیا کا معاشرہ تھا۔

ہمہ صفت منچلا دیوتا

قدیم کو جدید میں ڈھلنے، گلہ بانی کی جگہ زرعی معاشرے کے وجود میں آنے اور اس کے شمالی ہند تک پھیلنے میں کئی صدیاں بیت گئیں۔ یہ تبدیلی جہاں بھی آئی اگرچہ بھرپور، دوررس اور انمٹ تھی لیکن یہ تغیر تصادم کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ کسانوں اور کم ترقی یافتہ مفتوحہ علاقوں سے زائد پیداوار کے حصول کے لئے بے شمار جنگیں لڑی گئیں۔

اس جبری وصولی سے محکوموں کی زبوں حالی اور بدبختی میں اضافہ ہوا۔ برہمن کی بالادستی بے لچک، سخت گیر اور ظالمانہ تھی۔ اس کے خلاف ردعمل فطری بھی تھا اور اس کا مسترد کیا جانا بھی ناگزیر تھا۔ گائے کی بڑھتی ہوئی مذہبی اہمیت، ماورائے قبیلہ ذات پات کی افزائش اور پیداواری رشتوں میں رونما ہونے والی تبدیلیاں، ایک نئے اور ہمہ گیر سیاسی، سماجی اور ثقافتی نظام کی متقاضی تھیں۔ برہمنی نظام کے بے لچک اور جابرانہ تسلط کا مقابلہ کرنے اور اسے رد کرنے کی ضرورت تھی۔ جین اور بدھ دو ایسے روحانی مسلک تھے جنہوں نے ہندومت سے ہی جنم لیا تھا مگر ان کا مذہبی فلسفہ اور موریہ بادشاہوں کی ہمہ گیر سلطنت دراصل برہمن شاہی کے خلاف ردعمل تھا کرشن دیوتا کا عروج، اس سلسلے کی غالباً سب سے اہم اور جامع پیش رفت تھی۔

کرشن ایک ہمہ صفت دیوتا سمجھا جاتا تھا۔ اس کے بارے میں کہا گیا کہ وہ مردوں کی تمامتر اور اکثر عورتوں کی ہر مراد پوری کرنے پر قادر ہے۔ اسے ایک مقدس نونہال کا روپ دیا گیا، ایک شریر کمسن گڈریا جو تمام گوپیوں کا محبوب بھی ہے اور ان گنت دیویوں کا شوہر بھی۔ بھرپور قوت مردمی رکھنے والا یہ دیوتا آزادانہ جنسی اختلاط کا دلدادہ بھی ہے لیکن اس کے باوجود صرف رادھا کے ساتھ روحانی ملاپ میں مخلص بھی۔ یہ اس کے راہبانہ تیاگ کی علامت ہے۔ ایک طرف تو کرشن دائمی امن کی تجسیم ہے اور دوسری طرف وہ اپنے چچا کومس کو قتل کر دینے سے بھی نہیں چوکتا۔ یہاں تک کہ وہ کسی دوسرے کی قربان گاہ آتش پر انتہائی بے رحمی اور سفاکی سے معزز مہمان سیسوپال کا سر بھی قلم کر دیتا ہے۔ جب وہ بیک وقت ایک بہادر سپہ سالار اور معمولی رتھ بان ہوتا ہے تو مجسم اخلاق بن جاتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ ایسی ہر اخلاقی قدر کی نفی بھی کر جاتا ہے جس میں شائستگی، انصاف یا بہادری کا شائبہ بھی ہو۔
اس کی شخصیت میں جیسی خصوصیات بھی سمو دی گئی ہوں لیکن تیزی سے تغیر پذیر اس معاشرے

میں ہند کے اعلیٰ ترین دیوتا کی حیثیت سے کرشن کی پذیرائی کے سامنے سب کچھ ہیچ تھا۔ اور جب برصغیر کے بیشتر علاقوں میں کرشن کو دیوتا مان لیا گیا اور اندر کی جگہ اس کی پوجا کی جانے لگی تو یہ آفاقی قدر شناسی دو بڑے رجحانات کی غماز تھی۔

ایک تو یہ کہ کرشن کی متعدد شادیوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں کے قبائل میں رائج قدیم ' مادری شجرے پر مبنی خاندانی نظام آریاؤں کے پدری خاندانی نظام میں تحلیل ہو رہا تھا۔ یہ ایک جدید اور متحد کرنے والی ثقافت میں لاتعداد مقامی دیویوں کی پوجا کرنے والے قبائل کا مصلحت آمیز ادغام تھا۔ ان دنوں ہر قبیلے کی الگ دیوی ہوا کرتی تھی۔ جس کا دائرہ اثر بھی قبیلے کے زیر تسلط علاقے تک محدود ہوتا تھا لیکن چونکہ فولاد سے بنے ہتھیاروں اور اوزاروں کی بدولت لاتعداد قبائل کے زیر انتظام چھوٹے چھوٹے علاقوں کو ایک وسیع تر سلطنت میں ضم کرنے اور اس کے نتیجے میں قبائلی نظام کے منتشر ہونے کا آغاز ہو چکا تھا۔ اسلئے کرشن پوجا اور کرشن کی ہر مفتوح قبیلے کی دیوی سے شادی نے سلطنت کی توسیع کے عمل میں بھرپور اعانت کی۔

کرشن کی ایک اعلیٰ ترین دیوتا کے طور پر پذیرائی جس دوسرے رجحان کی نشان دہی کرتی ہے وہ تاجر کے لئے پہلے سے زیادہ سفری سہولتوں کی دستیابی اور زیادہ بڑی منڈیوں تک اس کی دسترس تھی اس طرح زرعی اجناس اور دیہی دستکاریوں کی کھپت بھی زیادہ ہو گئی لہٰذا اب شودر کو مطیع بنائے رکھنے میں زیادہ فائدہ تھا۔ اس دوران ذاتی جاگیر میں اضافے کے رجحان کی حوصلہ افزائی بھی ہوئی اور یوں طبقاتی (ذات پات) معاشرت اور جائداد کی بنیاد پر باہمی روابط مضبوط و مستحکم ہوتے چلے گئے۔

لوہے کے روزمرہ استعمال اور اس کے نتیجے میں جنگلوں کی کٹائی میں آسانی کے باعث برہمن کھشتری اتحاد کو اب زیادہ فاضل پیداوار دستیاب تھی جب کہ ویش کو تجارت کرنے اور خرچ کرنے کے لئے زیادہ سرمایہ حاصل ہو گیا تھا۔ دیہی زرعی معیشت نے ایک بار پھر شہروں کی کفالت کا آغاز کیا اور جمنا کے طاس میں کئی اہم شہری مراکز پروان چڑھے۔ اندر پراستھ (دہلی) ہستنا پور ' کوسمبی اور کاشی (بنارس) کے شہر اسی دور میں آباد ہوئے اور یہ ان چند قدیم شہروں میں سے ہیں جو آج تک مسلسل قائم ودائم چلے آرہے ہیں۔ یہی وہ شہر ہیں جو مختلف ہم عصر تہذیبوں کا سنگم بنے اور جہاں تہذیبیں ایک دوسرے میں مدغم ہوتی رہیں۔ یہیں مشرق کی طرف رواں اور خالص ویدروایات کے حامل آریاؤں کا جنگلوں میں خوراک کے متلاشی ناگاؤں سے ملاپ ہوتا رہا اور کاشتکاروں اور مویشی بانوں کی نئی نسلیں پروان چڑھتی رہیں۔ یہ لوگ ایک طرف تو وادی جمنا کے جنگلات کو صاف کر کے لوہے کے ہل اور اس سے ملتے جلتے نت نئے اوزاروں کی مدد سے نئی زمینیں زیر کاشت لا رہے تھے اور دوسری طرف وہ لوہے

کے دھروں Axles والی بیل گاڑیوں پر دور دراز کے علاقوں سے تجارت میں معروف ہو گئے تھے۔

تہذیبوں کے اختلاط میں بد نظمی' اختلاف اور تصادم جنم لیا ہی کرتے ہیں جنہیں مٹانے کے لئے بھگوت گیتا کے اشلوکوں اور تیاگی فراریت پسندی سے آگے کسی اور نظریئے کی ضرورت تھی۔

قبل مسیح کے ایک ہزار سال کا دور عظیم تبدیلیوں کا دور تھا۔ جیسا کہ ہمارے علم میں ہے کہ لوہے کے ساتھ نئی فنی مہارت آئی جس کی بنیاد پر زیادہ بار آور زرعی معاشرے کا قیام ممکن ہوا۔ زیادہ استعداد رکھنے والے ذرائع آمد و رفت اور جنگلات کی کٹائی کی بہتر اہلیت میسر آئی۔ اس طرح کچھ لوگ امیر تر ہوئے اور بہت سے محکوم ٹھہرے۔ باقاعدہ زراعت قبیلے کی ضرورت سے کہیں زیادہ پیداوار کے حصول کا ذریعہ بنی۔ زراعت کو اپنانے والے قبائل کو اب اپنی ضرورت سے زائد پیداوار میسر تھی۔ اور ان کے تاجر اس فاضل پیداوار کو اپنی حدوں سے آگے دوسرے قبائل تک لے جانے لگے۔

اس آمد و رفت اور خرید و فروخت نے پورے معاشرے کا بنیادی ڈھانچہ ہی تبدیل کر کے رکھ دیا اور ایسی دوررس تبدیلیاں آئیں' قبائل کے لئے جس کا تصور بھی ناممکن تھا۔ دیوتا بدل گئے۔ اندر کی جگہ کرشن اوتار ہوا' قربانی کے مسلک کو انتہائی سختی سے محدود کر دیا گیا۔ کچھ عرصے کے لئے وادی سندھ اور گنگا کی تہذیبوں کو باہم یکجا ہونے کے مواقع میسر آئے جس کے نتیجے میں وادی سندھ پر بہت گہرے اور دوررس اثرات مرتب ہوئے۔

مہاتما بدھ

خام لوہے کے ذخائر، وادی سندھ سے دور، مشرق میں اڑیسہ اور بہار کے نواح میں دریافت ہوئے تھے۔ اس لئے آریا بھی قدرتی طور پر اسی طرف کھنچتے چلے گئے۔ لوہے سے بنائے گئے اوزاروں اور ہتھیاروں کے استعمال کا آغاز ہوا تو آنے والے وقتوں میں تبدیلی کی ایسی تمام لہریں اور وہ تمام مذاہب جو قبائلی نظام زندگی، گلہ بانی اور خوراک کی تلاش کے خانہ بدوشانہ طرز حیات کو ترک کر کے زراعت کو اپنانے کا باعث بنے، ان سب کا آغاز اسی مشرق سے ہوا جہاں لوہے کے ذخائر تھے۔ اسی طرح قبل مسیح میں ہندوستان کی پہلی عظیم سلطنت نے بھی اسی خطے سے جنم لیا۔

زرعی پیداوار کی تجارتی پیمانے پر ترسیل' زرعی معاشروں کے فروغ کا باعث بنی۔ ارتقاء کا یہ عمل قبائلی طرز زندگی کے اختتام سے مطلق العنان بادشاہتوں کے وجود میں آنے تک جاری رہا۔ یہ ارتقائی مدارج' فاضل پیداوار کی بڑے پیمانے پر دستیابی اور اس کا انتظام و انصرام کرنے والے تاجر طبقات کے تعاون سے طے پاتے رہے اور یہی سلسلہ آگے چل کر جاگیردارانہ نظام میں ڈھلتا چلا گیا۔

مہاتما بدھ (486-560 ق م) سے موریا سلطنت کے آخری دور (180 ق م) تک ' چار صدیوں کے دوران ہند نے زراعت کے بہت سے مختلف انداز اور اسالیب کو فروغ پاتے اور زرعی معاشرتی روابط کے ابتدائی ڈھانچے کو وجود میں آتے دیکھا۔

گوتم بدھ ان مفکرین میں سے تھا جنہوں نے شمال مشرقی ہند سے اٹھنے والی تبدیلی کی اس لہر کو سب سے پہلے محسوس کیا۔

گوتم بدھ کے دور کا جائزہ لیتے ہوئے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ دور آہن اب تک افراد کو پائیدار اور موثر اوزاروں سے مزین کر چکا تھا اور ان افراد کے چھوٹے چھوٹے گروہ صاف اور ہموار زمینیں حاصل کرنے میں مصروف ہو چکے تھے۔ جنگلات میں جگہ جگہ مختصر آبادیاں وجود میں آچکی تھیں۔ بڑے شہری مراکز سے دور یہ لوگ لوہے کے پھل والے بھاری ہل سے اچھی خاصی فاضل پیداوار حاصل کر لیتے تھے۔ فاضل پیداوار کو شہروں تک پہنچانا بھی ایک منافع بخش سودا تھا۔ فاضل پیداوار کی اس فراہمی سے ضروریات میں بھی اضافہ ہوا۔ یہ ضروریات اور ان کے نتیجے میں جاری ہونے والا ساجی عمل ایک اور بڑی تبدیلی کا پیش خیمہ بن رہے تھے۔

ضرورت کی اس نئی قدر کے نتیجے میں دو طبقے سرگرم عمل ہوئے۔ انہوں نے اپنی متعینہ حدود سے تجاوز کیا اور پہلے سے موجود لیکن بے لچک قبائلی نظام سے ان کا یہ انحراف قبیلے کی گرفت کمزور کرنے کا باعث بنا۔

ان میں ایک تو لوہے کی کلہاڑی سے آراستہ جنگل کا وہ پہل کار کسان تھا جس نے اپنے قبیلے کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ اور وہ ایک آزاد فرد بن گیا تھا۔ زرعی زمین کا ایک ٹکڑا اس کی اپنی ملکیت بن گیا جسے جنگل کی کٹائی کر کے خود اسی نے قابل کاشت بنایا تھا۔

دوسرا منحرف وہ تاجر تھا جسے اپنے قبیلے کی حدود سے باہر نکل کر دوسرے قبائل اور آبادیوں تک رسائی حاصل کرنا پڑتی تھی اور اس مہم جوئی میں ہی اس کا مفاد تھا۔

جمود کے شکار ' اپنے علاقے میں محدود اور ٹکڑوں میں بٹے ہوئے قبائلی نظام کو اس دو طرفہ حملے کا سامنا تھا۔

اس نئی تہذیب کی حدود کو وسعت ملی تو تسلسل سے بڑھتی ہوئی فاضل پیداوار کی طلب میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ لوہے کے آلات نے خوابوں ' خواہشات اور امکانات کو حقیقت کے روپ میں ڈھال دیا۔ جنگلوں کو صاف کرنے والے مہم جو کسان اور بلند حوصلہ تاجر نے بہت کچھ ممکن کر دکھایا تھا۔ لیکن معاشی ترقی کے اس عمل کو جاری رکھنے کے لئے اس ساجی محرک کو مستقل حیثیت دینا ضروری تھا جو

اس ترقی کا جواز بنا۔ وہ کارنامہ جو شاید کسی مہم جویا تقلید سے گریز کی جرات کے نتیجے میں بس یونہی انجام پا گیا تھا' اسے اب معاشرتی اصولوں کے تحت ایک قابل قبول اور منفعت بخش سرگرمی قرار دینا لازمی تھا۔

اب سے پہلے تمام املاک قبیلے کی مشترکہ ملکیت ہوتی تھیں لیکن کاشتکار اور تاجر کی حوصلہ افزائی کے لئے ماورائے قبیلہ کوئی نظام وضع کرنے کی ضرورت آن پڑی تھی تاکہ اول الذکر وافر فاضل پیداوار مہیا کرتا رہے اور تاجر اس فاضل پیداوار کو یکجا کرنے کے وسائل کو توسیع دے سکے۔ یہ حوصلہ افزائی نجی ملکیت کے حق کی صورت میں سامنے آئی۔ حوصلہ مند اور ہمت کار اب اپنی زمین' اس سے حاصل ہونے والی پیداوار اور اپنے مویشیوں کے خود مالک بنا دیئے گئے۔

قبیلے کو اب ایک بہت بڑا چیلنج در پیش تھا۔ اس اولین نج کاری نے قبیلے کے رسم ورواج اور قبائلی اقدار کی پوری عمارت کو گھمبیر خطرات سے دوچار کر دیا تھا۔ پالتو اور زراعت میں استعمال ہونے والے جانوروں کی قدر و قیمت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ قربانی کی رسم کو اب ختم ہونا ہی تھا۔ ہندو مذہبی ضابطوں کے مطابق گائے کے ذبیحہ اور اس کے گوشت پر مکمل پابندی بر قرار تھی۔

گوتم بدھ جیسے حساس اور باشعور شخص کو ایک ایسے معاشرے کا سامنا تھا جو آفاقی نوعیت کی تبدیلیوں کی زد میں تھا لیکن گوتم کے پاس برہمنیت کو مسترد کرنے کا اپنا الگ جواز تھا۔ گوتم نے کھشتریوں کے ایک جمہوری قبیلے شاکیہ میں جنم لیا جہاں بادشاہ ایک مخصوص حلقے سے باری باری منتخب کئے جاتے تھے۔ گوتم نے اگر ایک طرف اپنے معاشرے میں ہنگامی تبدیلیوں کی ضرورت اور ابھرتے ہوئے پیداواری رشتوں کے درمیان تضاد اور تفریق کو محسوس کر لیا تھا تو دوسری طرف اسے برہمن کی کٹر مذہب پرستی کا بھی پوری طرح ادراک تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ افراد کے درمیان باہمی میل جول اور تجارت پر سخت قبائلی پابندیاں دقیانوسی ہو چکی ہیں اور جانوروں خاص طور پر بیل کی یجن (قربانی) نا قابل تلافی اور توانائی کے بنیادی ذریعے کا صریحاً ایک غیر مقبول ضیاع ہے۔

گوتم بدھ بہت ہی ذکی الحس شخص تھا۔ معاشرے کی دورخی کو زیادہ عرصے تک برداشت کرنا اس کے بس سے باہر تھا۔ اپنے سماج کے داخلی تضادات کا اسے مکمل ادراک تھا۔ دوسرے لوگوں کے لئے اس حقیقت کا شعور ابھی دور کی بات تھی لیکن اس کے باوجود اپنے معاشرے کو ان حالات سے نکالنے کا اسے کوئی راستہ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ اسے خود کو اپنے ماحول سے فوری اور مکمل طور پر الگ ہو جانا چاہئے تاکہ نئے سرے سے پورے غور و فکر کے ساتھ حالات کا جائزہ لیا جا سکے۔

گوتم اتنے شدید کرب کا شکار تھا کہ ایک رات اپنی جواں سال بیوی اور کمسن بچے کو سوتا چھوڑ کے اکیلا ہی نیپالی پہاڑوں کے دامن میں پھیلے گھنے جنگلوں کی طرف نکل کھڑا ہوا۔ گوتم کی عمر اس وقت

صرف 29 سال تھی۔

گوتم بدھ نے چھ سال کا طویل عرصہ مسلسل غور و فکر میں گزارا لیکن مسئلے کا حل اس سے گریزاں رہا۔ سچ کی تلاش میں اس نے اپنے آپ کو بہت اذیتیں دیں۔ اس نے دنیا کی تمام نعمتیں خود پر حرام کر لیں حتیٰ کہ کھانا بھی چھوڑ دیا۔ بھوکا رہ کے وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا۔ اس کی چلہ کشی جاری رہی لیکن وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ تب ایک روز پیپل کے پیڑ تلے مراقبے کے دوران اچانک اسے یوں لگا جیسے اصل حقیقت اس پر منکشف ہو گئی ہو۔

گوتم نے یہ جان لیا تھا کہ جس روشنی کی اسے تلاش ہے وہ رائج الوقت مذہبی عقیدے میں نہیں مل سکتی۔ اور حقیقت بھی یہی تھی کہ رائج نظریات کے تانوں بانوں میں سماجی تضادات کا حل موجود نہیں تھا۔ موجود نظریات کا اطلاق بدلتے زمانوں اور تغیر پذیر معاشرتی نظام پر ناممکن تھا۔ نیا دور ' نئی ضرورتوں کے مطابق کسی نئے عقیدے اور نئے فلسفے کی تلاش میں تھا۔ قبائلی عقائد کو اسی طرح یکسر موقوف کرنا ضروری تھا جیسے کوئی اپنا بوسیدہ لباس مسترد کرتا ہے۔ ایک قطعی نئی سمت اختیار کرنا ناگزیر تھا۔ مذہب ' عقیدے ' فلسفے اور فکر کو ایک نئی کروٹ کی ضرورت تھی۔ انہیں بہر حال اس نئے معاشرتی نظام کے ہمرکاب ہونا تھا جس کا آغاز نئی دھات لوہے کی دریافت سے ہو چکا تھا۔

لوہا ' نت نئی تبدیلیاں لا رہا تھا۔ نئے طبقات اور نئے معاشرتی ڈھانچے ترتیب پا رہے تھے جو ایک نئے فلسفے اور ایک نئے مذہب کے طلبگار تھے۔ بدھ مت نے اسی اشد ضرورت پر لبیک کہتے ہوئے عقیدے کا وہ عظیم ڈھانچہ تشکیل دیا تھا جو اب تک رونما ہونے والی تبدیلیوں کو سند جواز عطا کر سکے۔

گوتم بدھ نے آٹھ ارفع اصول وضع کئے جو بدھ مت کے اساسی فلسفے کی صریحی بنیاد بنے۔ یہ اصول ہیں: راست بصیرت ' راست نصب العین ' راست گفتگو ' راست عمل ' راست معاش ' راست سوچ ' راست آگہی اور راست گیان دھیان (فکر و تدبر)۔ اس طرح نئے اخلاقی معیار اور نئے ملکیتی ضابطے وجود میں آئے۔ یہ خوفناک برہمنی رسم و رواج پر فیصلہ کن وار تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ یہ نیا فلسفہ ' قدیم لور اپنے عہد سے مطابقت نہ رکھنے والی ہر چیز کا استرداد تھا۔ مثلاً راست عمل سے مراد یہی تھی کہ قتل اور زنا کو غیر قانونی قرار دیا جائے۔ اس طرح برہمنی اور اس کے رد عمل میں ابھرنے والے تنتر اور شیوائی مذہبی عقائد کے ساتھ ساتھ رقص اور اجتماعی زناکاری بھی قابل مذمت ٹھہرے۔ راست معاش کے ضمن میں قربانی کے لئے مویشیوں کی تجارت اور شراب کی فروخت ممنوع قرار پائی۔ ان دونوں صورتوں میں بدھ مت کی تعلیمات برہمنی قدامت پرستی اور تنتری بے راہ روی کے مابین ایک درمیانی راستہ تھا۔

جہل پسندانہ عقائد اور بہیمانہ رسومات سے تقویت پا کر برہمنی پیشوا بے راہ رو ہو چکے تھے۔ وہ ہر

معاشرتی برائی کے سوداگر تھے اور اپنے مذہبی منصب کے برتے پر دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہے تھے۔ ابھرتے ہوئے نئے نظام اور نئی قدروں کے حوالے سے یہ صریحاً ظلم تھا کیونکہ نجی ملکیت کے حق کو اب تسلیم کیا جانے لگا تھا۔

برہمن پروہتوں نے دھونس' دھاندلی اور جبر سے بے پناہ نجی جائیداد حاصل کرلی تھی۔ مندر ان کی طاقت اور ان کے اثر و رسوخ کا مرکز تھے۔ اس کے مقابلے میں بدھ بھکشوؤں کو انتہائی قلیل اور اشد ضروریات زندگی اپنے پاس رکھنے کی اجازت تھی تاکہ انہیں قبولیت عام حاصل ہو۔ ایک کاسہ گدائی' پانی کے لئے ایک برتن' سادہ کپڑے کے تین ٹکڑے' تیل کا دیا' ایک سوئی تھوڑا سا دھاگا اور ایک عصاء ان کی کل کائنات تھا۔ کھانا وہ لوگوں سے مانگ کر کھاتے تھے۔ بھکشو' بطور استاد سفر کرتے اور سفر کے دوران بدھ تعلیمات کا پرچار کرتے جاتے۔ ان کے نظریات بالواسطہ زراعت و تجارت کے فروغ کا باعث بنے۔

اس وقت وادی گنگا کے دو عظیم بادشاہ' مگدھ میں بم بسر اور کوسالہ کا پاسینادی' گوتم بدھ کی ہر طرح اور تاحیات سرپرستی کرنے کو تیار تھے لیکن گوتم بدھ اس کے باوجود مزید 45 برس تک نگر نگر پیدل گھومتا رہا۔ اس کی شہرت اور اس کا اثر و رسوخ اس کی زندگی میں ہی ہر طرف پھیل تو گیا مگر قدامت پرست قوتیں ابھی اتنی غیر موثر نہیں ہوئی تھیں۔

جن حالات میں گوتم بدھ کی موت واقع ہوئی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نجی زندگی کے حوالے سے یہ ایک ناکام شخص کی موت تھی۔ ایک چھوٹے سے گمنام گاؤں میں اس کا انتقال ہوا اور اس وقت گوتم کے ساتھ اس کا صرف ایک شاگرد تھا۔ اس کے قبیلے ''شاکیہ'' کو تہ تیغ کیا جاچکا تھا' اس کے دونوں شاہی سرپرست انتہائی ناگفتہ بہ حالات میں موت کو گلے لگا چکے تھے۔ اس کے ہونہار شاگرد سری پت اور موگالان پہلے ہی نروان پا چکے تھے لیکن ایسے نامساعد حالات کے باوجود گوتم کا فلسفہ مسلسل پروان چڑھتا رہا کیونکہ یہ تیزی سے ارتقاء پذیر معاشرے کی ضروریات کے عین مطابق تھا۔

زراعت کے فروغ اور برہمن کی سفاکانہ مخالفت' دونوں نے بدھ مت کی قبولیت کو تیز تر کیا حتیٰ کہ مہاتما بدھ کی موت کے ڈھائی سو سال بعد' شہنشاہ اشوک اعظم کی مشفقانہ اور انسان دوست حکومت کے دوران یہ مذہب پورے برصغیر میں پھیل چکا تھا۔ اس عظیم اور ذہین بادشاہ نے بدھ مت کے راہنما اصولوں اور نو دریافت دھات' لوہے کے زور پر حکمرانی کی۔

اگرچہ اشوک کی حکمرانی میں برصغیر ایک مکمل اکائی کی صورت میں یکجا ہوا لیکن اس عظیم سلطنت کے قیام سے پہلے ابھی مزید اہم واقعات رونما ہونا تھے خاص طور پر وادی سندھ (پاکستان) میں جہاں لوہے کی رسد محدود تھی۔

4

پورس: وادی سندھ کا نقطۂ نظر

کرشن کا نیا حلیف

جدید اور انتہائی اہم دھات یعنی لوہے کی رسد کے حوالے سے بھی وادی سندھ کا تجربہ ہند سے مختلف تھا۔ وادی سندھ میں لوہا اس بہتات میں دستیاب نہیں تھا جیسا کہ ہند میں۔ یہ دھات وادی سندھ سے بہت دور مشرق میں بہار کے خطے سے یہاں پہنچتی تھی۔ وادی سندھ میں اس دھات کے نسبتاً کمیاب ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں ہتھیاروں کی تیاری بھی محدود رہی لہٰذا سماج کو ہتھیاروں کی قوت کے بجائے کٹر مذہبی عقائد کی بنیاد پر متحد رکھا گیا۔ اس لئے یہاں حکومتی سرپرستی میں بے لچک اور سخت گیر مذہبی عقائد اور نظریات کا ایسا نظام روبہ عمل لایا گیا جو اس خطے کے لاتعداد اور مختلف النوع قبائل کو ایک ہی معاشرے کی لڑی میں پروئے رکھے۔ بہر حال وادی سندھ بھی قبائلی نظام کو خیرباد کہنے میں ہند سے پیچھے نہیں تھی۔

یہ حقیقت تو ہمارے علم میں ہے کہ پہلے پہل آریاؤں نے کس طرح وادی سندھ کی زراعت کو تاراج کیا تھا۔ اور اس مقصد کے لئے اپنی دیومالا کے بڑے دیوتا "اندر" کے ہاتھوں میں دریاؤں کے بند توڑنے کی طاقت دی تھی۔ ہمیں اس بات کا بھی اندازہ ہے کہ زراعت کے بغیر وادی سندھ کی بقاء زیادہ عرصے تک ممکن نہیں تھی۔ اسلئے جب آریا یہاں آباد ہو گئے تو انہوں نے بھی بالآخر زراعت کو اپنا لیا اور پھر یہاں بھی زراعت اور خاندان کے دیوتا کرشن نے اندر کی جگہ لی جس نے قبائلی نظام کو اکھاڑ پھینکا لیکن اس مقابلے میں کرشن کو لوہے کی اعانت حاصل نہیں تھی جیسا کہ ہند میں ہوا تھا۔

وادی سندھ میں لوہے کی جائے مقدونیہ کا ایک نوادر دکرشن کا اتحادی بنا۔

ہند کے قبائل اور ان کا گلہ بانی طرز حیات کرشن اور لوہے نے تباہ کیا۔ وادی سندھ میں یہی کام یونان کے طاقتور فاتح سکندر اور کرشن کی وجہ سے ممکن ہوا۔

اس تمام عرصے کے دوران وادی سندھ کو ہند پر فوقیت حاصل رہی تھی سوائے موریا عہد کے جب لوہے کے بل بوتے پر مشرق نے اسے اپنا محکوم بنایا۔ شاید مشرق کی افواج کے لئے یہ کبھی ممکن نہ ہوتا اگر سندھ واسی اس سے پہلے ہی اپنے بیشتر وسائل اور توانائیاں مقدونیہ کے حملہ آوروں سے لڑنے میں ضائع نہ کر چکے ہوتے۔

زرخیز و شاداب مگر پراسرار سرزمیں

یونانی جب حملہ آور ہوئے تو وادی سندھ ایران کی ہخامنشی سلطنت کی عملداری میں تھی اور اسی تعلق سے وسطی ایشیا کے سیاسی اور ثقافتی سماج کا حصہ بھی۔ داراول نے 513 قبل مسیح میں اس وادی کو عظیم سائرس کی سلطنت میں شامل کر لیا اور وادی سندھ کا ہند سے تعلق ٹوٹ گیا۔

جب ہند خوراک کے متلاشی دشت نوردوں اور بن باسیوں کے دور سے گزر رہا تھا' تو اسی زمانے میں زیادہ ترقی یافتہ وادی سندھ کا جھکاؤ مغربی ایشیا، فارس اور بابل و نینوا کی خوشحال اور غلام داری سماج پر مبنی منڈیوں کی طرف ہو گیا۔ وادی سندھ اس وقت ایک متمول اور زیادہ پیداواری ملک تھا۔ اس سے خراج بھی زیادہ حاصل ہوتا تھا اور بھرتی کے فوجی بھی لڑنے کے لئے یہاں سے فارس بھیجے جاتے تھے۔

ہیروڈوٹس لکھتا ہے کہ وادی سندھ کی نظامت نے فارس کے آریائی تخت شاہی کو 360 ٹیلنٹ وزنی طلائی دھول کا خطیر مالیتی خراج ادا کیا۔ اس کے علاوہ سلطنت کو ترقی یافتہ صنعتی اعانت بھی یہیں سے حاصل ہوئی۔ فردوسی نے اپنے شاہنامے میں سکندر کی فارس پر لشکر کشی کے ضمن میں لکھا ہے کہ دارا کی فوج کے لئے ہند (جس سے اس کی مراد دراصل وادی سندھ ہی تھی) کو بڑی عجلت میں تلواریں اور دوسرے ہتھیار فراہم کرنے کے لئے کہا گیا۔ یہاں تلوار کے لئے استعمال ہونے والے لفظ ''موہند'' کا لفظی مطلب بھی یہی ہے کہ 'جو ہند سے آئے'۔

یونانیوں کے نزدیک وادی سندھ ایرانی سلطنت کی انتہائی پراسرار اور سب سے خوشحال نظامت تھی اور سلطنت کے تمام صوبوں سے زیادہ منافع بخش بھی۔ یہاں دو خوفناک طویل دانت اور لمبی سونڈ رکھنے والے محیر العقول وحشی درندے (ہاتھی) پائے جاتے تھے۔ اس وادی کے عظیم دریا مون سون اور گرمیوں کے دوران ٹھاٹھیں مارتے سمندر دکھائی پڑتے تھے۔ یونانیوں نے سن رکھا تھا کہ یہاں ''اون'' پودوں

پر اگتی اور چھوٹے شگوفوں سے پھولوں کی شکل میں پھوٹ نکلتی ہے۔ یہاں کے نر سل (بانس) دیو ہیکل ہیں اور یہاں پیدا ہونے والے سفید دانے (چینی) شہد سے زیادہ میٹھے ہیں۔ زرخیز سیلابی مٹی کے ہموار میدانوں سے ایک سال میں دو فصلیں حاصل کی جاتی ہیں جبکہ یونان میں صرف ایک فصل حاصل ہوتی ہے۔

ان حالات میں یہ قطعی حیران کن نہیں لگتا کہ یونان کے جواں سال سکندر نے 331 قبل مسیح میں فارس کے شہنشاہ دارا سوم کو شکست دینے کے بعد وادی سندھ کی شہرت سے مغلوب ہوکر، سلطنت فارس کی اس دور دراز اور متمول نظامت پر چڑھائی کی۔ سکندر کا اس خطے میں آنا بھی ان بے شمار مظاہر میں سے ایک تھا جس نے وادی سندھ کو مغربی ایران کے باشندوں سے مربوط کئے رکھا۔

مصاحبانہ داستاں طرازی

سکندر کی مہم جوئی بڑی طوفانی تھی۔ بس یوں ہوا کہ ایک ہم آہنگ و مربوط کارروائی اور ایک پرجوش ہلے میں سکندر نے فارس پر قبضہ کر لیا۔ اس نے گجمیلا کے مقام پر دارا سوم کی ہخامنشی سلطنت کو تہ وبالا کر کے رکھ دیا۔ پھر تخت جمشید پر قبضہ کیا، اسے نذر آتش کیا اور آگے روانہ ہو گیا۔

سکندر نے سوات کے علاقے میں عظیم دریائے سندھ کو عبور کیا، ٹیکسلا پہنچا۔ یہاں کے امبھی نامی حکمران نے رضاکارانہ طور پر ہتھیار ڈال دیئے۔ امبھی کی دلیل بڑی سادہ تھی۔ "یہاں ایک نہیں دو بادشاہوں کے لئے بھی دولت کے انبار ہیں تو پھر لڑنے کا فائدہ" اور یہ کہتے ہوئے اس نے سکندر کو خراج ادا کر دیا۔

اب سکندر دریائے جہلم کی طرف بڑھا جسے یونانی ہائیڈسپس Hydaspes کہتے تھے اور یہی وہ علاقہ تھا جہاں اسے شدید اور خوفناک مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ ایسی مزاحمت جو اس سے پہلے اسے اپنی کسی مہم جوئی کے دوران پیش نہیں آئی تھی۔ یہاں مقدونیہ کے سکندر کا مدمقابل پنجابی شہزادہ پورس تھا۔

راجہ پورس ایک بڑی راجدھانی کا حکمران تھا۔ اس کا دارالحکومت آج کے ضلع گجرات میں منڈی بہاؤالدین کے آس پاس جہلم دریا کے کنارے کہیں تھا۔ تحصیل پھالیہ، مقدونوی حملہ آور کے گھوڑے بوسی فیلس Buce Phalus سے منسوب ہے۔ قریبی گاؤں لاکھنے وال کے نزدیک ایک بہت بڑے ٹیلے کے بارے میں مقامی لوگوں کا دعوئی ہے کہ یہی پورس کا صدر مقام تھا۔ اس جگہ کھدائی کے دوران کچھ ایسے آثار بھی دریافت ہوئے ہیں۔ اگر اس ٹیلے پر کھڑے ہو کر پاؤں زور سے زمین پر ماریں تو اس کی

دھمک حیران کن فاصلے تک پہنچتی ہے اور یہیں سے اس متروک راستے کے آثار بھی نظر آتے ہیں جہاں سے یقیناً کبھی دریا گزرتا ہوگا اور شہر کے گرداگرد نیم دائرے کی شکل میں ایک قدرتی رکاوٹ کا کام دیتا ہوگا۔

سکندر کا درباری وقائع نگار اریان Arrian یونانی فوجوں کے ہمراہ تھا۔ اس نے یہاں کئی روز تک جاری رہنے والی جنگ کا احوال بیان کیا ہے۔ اپنے مبالغہ آمیز انداز میں وہ اس جنگ کے آخری مرحلے اور آخری دن کے بارے میں لکھتا ہے کہ "تیس ہزار پیادہ اور چار ہزار شہ سواروں نے اس میں حصہ لیا۔ تین سو بگھیاں اور دو سو ہاتھی اس کے علاوہ تھے۔" اریان کا دعویٰ ہے کہ "پورس کے بیس ہزار پیادہ اور تین ہزار گھڑ سوار اس معرکے میں ہلاک ہوئے'۔ سوچنے کی بات ہے کہ جنگ کے فیصلہ کن مرحلے میں صرف چند گھنٹوں کے دوران اگر تمام یونانی فوجیوں کو اتنی بڑی تعداد میں محض غیر مزاحم بھیڑوں کو ہلاک کرنا ہوتا تب بھی یہ ایک ناممکن کام تھا کیونکہ ان کے پاس جدید دور کا آتشیں اسلحہ تو نہیں تھا کہ اس مختصر وقت میں دشمن کی اتنی بڑی تعداد کو تہ تیغ کیا جاسکتا۔ اس لئے اریان کا بیان قطعی طور پر ناقابل یقین اور لغو نظر آتا ہے۔

اریان کے بیان کردہ شواہد اور اس کی طرف سے سکندر کو فاتح قرار دینا ہم تک صرف یونان کے قدیمی حوالوں کے ذریعے پہنچا ہے۔ دریائے جہلم پر لڑی گئی اس جنگ کی تفصیلات بھی صرف یونانی ذرائع سے حاصل ہوتی ہیں۔ اس تصادم کے بارے میں اس دور کی کوئی جامع مقامی دستاویز موجود نہیں۔

یونانی ذرائع کے مطابق اس جنگ کے آخری مرحلے کی کہانی وہی ہے کہ سکندر دریا کو غیر متوقع طور پر عبور کرکے ایک شاطرانہ چال کے ذریعے پورس کو شکست دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ہلکے پھلکے ہتھیاروں سے لیس مقدونیہ کے گھڑ سوار' ہاتھیوں کے جلو میں مقابلے پر آنے والی سست رو فوج کی صفوں میں محشر برپا کردیتے ہیں۔ ہاتھی گھبرا کے پلٹتے ہیں اور اپنی ہی پیادہ فوج کو روند ڈالتے ہیں۔ خوبصورت اور دراز قامت پورس زخمی ہو کر گرفتار ہوتا ہے۔ اس کے جسم پر نو (۹) گہرے زخم ہیں اور وہ بمشکل کھڑا ہو پا رہا ہے لیکن جب فاتح اس سے پوچھتا ہے کہ وہ کس سلوک کی توقع رکھتا ہے تو پورس بہادرانہ شان سے جواب دیتا ہے "وہی جو میرا حق ہے۔ وہ سلوک جو ایک بادشاہ کو دوسرے بادشاہ سے روا رکھنا چاہئے" اور سکندر اس کی دلیری سے متاثر ہو کر پورس کی سلطنت اسے واگذار کردیتا ہے۔

معرکہ جہلم کی تعبیر نو

جنگ کا یہ احوال اریان نے رقم کیا جو سکندر کا ذاتی ملازم تھا۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایک

درباری وقائع نگار کو بیان کردہ احوال کی صحت کا قابل اعتماد ذریعہ قرار دیا جا سکتا ہے؟ ممتاز تاریخ دان ڈاکٹر بدھ پرکاش نے بھی اس سلسلے میں یہی بنیادی سوال اٹھایا ہے۔ یونانی وقائع نگاروں جسٹن Justin ' پلوٹارک Plutarch ' ڈیوڈوروس Diodoros ' کرٹیس Curtius اور اریان Arrian کے بیان کردہ احوال کی عدم مطابقت کا جائزہ لینے کے بعد بدھ پرکاش نے لکھا ہے کہ سکندر اور پورس کے درمیان ہونے والی جنگ کے آخری مرحلے کے بارے میں یونانی مصنفین کے بیانات انتشار اور تضاد سے پر ہیں۔ صرف ایک حقیقت بڑی واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ دونوں حریفوں نے بڑے آبرومندانہ انداز میں صلح کی اور ایک دوسرے کے حلیف بن گئے۔ ان مصنفین کی متفقہ رائے کہ پورس کو نہ صرف اس کی سلطنت لوٹا دی گئی بلکہ سکندر کے دوسرے ہندی مفتوحہ علاقے بھی پورس کی عملداری میں دے دیئے گئے۔ اس حقیقت کی واضح نشاندہی ہے کہ جنگ میں کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے سے قبل ہی دونوں حریفوں کے درمیان برابری کی سطح پر مذاکرات ہوئے۔

ایک اور فاضلانہ تجزیئے میں ڈاکٹر پرکاش نے لکھا ہے کہ خود اریان کے بیان کردہ حقائق سے ہی یہ اندازہ لگانے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی کہ پورس کے ساتھ مذاکرات شروع کرنے میں خود سکندر نے پہل کی اور اس مقصد کے لئے یکے بعد دیگرے بڑے تسلسل کے ساتھ ایلچی بھیجے گئے لیکن سکندر کے ساتھ معاملہ کرنے میں پورس بہت متامل تھا اور اس نے بار بار سکندر کی پیشکش کو مسترد کر کے اس کے قاصد اور ایلچیوں کو واپس بھیج دیا۔ آخر کار پورس ایک پرانے دوست کے اصرار پر سکندر سے ملاقات پر آمادہ ہوا اور مذاکرات کے دوران اس نے اپنی عزت اور مرتبے کا خاص طور پر خیال رکھا۔ ان امن مذاکرات کے نتیجے میں پورس کی سلطنت کو مزید وسعت ملی۔ سکندر نے اپنے مفتوحہ علاقوں کا بہت بڑا حصہ پورس کے حوالے کر دیا تھا۔

توقع یہی ہے کہ کبھی کوئی تجربہ کار مورخ یا وقائع نگار معرکہ جہلم کے بارے میں لکھی گئی داستانوں کے تسلیم شدہ حقائق یا شک وشبے سے بالاتر واقعات کی بنیاد پر اس جنگ کے نتائج کے از سر نو تعین کا بیڑا اٹھائے گا۔ اس سلسلے میں تین حقائق تو ایسے ہیں جنہیں قبول عام کی سند حاصل ہے۔

اول یہ کہ سکندر کو شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تھا اور دوسری حقیقت یہ ہے کہ سکندر جنگ کے بعد اپنے متعین راستے سے دائیں جانب ہٹ کر پورس کی سلطنت کے ساتھ ساتھ جنوب میں پنجاب کے پانچ دریاؤں کے سنگم یعنی پنجند اور ملتان کی طرف روانہ ہو گیا۔ (اگرچہ اریان نے برملا اس حقیقت کا اعتراف نہیں کیا ہے لیکن جب وہ سکندر کے چناب عبور کرنے کا ذکر کرتا ہے تو اس سے متذکرہ نتیجہ آسانی سے اخذ کیا جا سکتا ہے) اور تیسری اہم بات یہ کہ جنگ کے بعد بھی پورس کی سلطنت

قائم تھی اور وہی اس کا حکمران تھا بلکہ سکندر نے مزید کچھ علاقہ بھی پورس کے حوالے کر دیا تھا۔
معرکہ جہلم کے بارے میں جو کچھ اور جہاں بھی لکھا گیا ہے ان میں یہ حقائق بہر حال مشترک ہیں۔
ایک درباری مورخ سے اپنے آقا کی فتح کے ڈھنڈورے کے علاوہ کچھ اور لکھنے کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ ایریان نے جنگ کے بعد پورس کے اپنے تخت حکمرانی پر برقرار رہنے کو اپنے آقا سکندر کا تحفہ ثابت کیا ہے لیکن کیا اسے ایک معقول استدلال قرار دیا جاسکتا ہے؟ کیا اس بات کا زیادہ امکان نہیں کہ مبینہ طور پر قیدی بنائے جانے کے باوجود پورس کو کہیں کوئی غیر معمولی برتری ضرور حاصل تھی۔ اور پھر یہ بھی کہ اس جنگ کے بعد سکندر کو اپنی پیش قدمی کی سمت بدلنا پڑی۔ بھلا اتنی فتوحات حاصل کرنے والے یونانی فاتح کو ایسی کیا مجبوری پیش آگئی تھی کہ وہ اپنا رخ بھی یکدم موڑ لیتا اور اپنے مفتوحہ علاقے بھی پورس کے حوالے کر دیتا؟
زیادہ تر یونانی ذرائع، جہلم کو عبور کر کے سکندر کی چناب تک پیش قدمی کا ذکر تو کرتے ہیں لیکن کوئی بھی دونوں دریاؤں کو پار کرنے کے صحیح مقام کا تذکرہ نہیں کرتا۔ اگر یہ طے پا جائے کہ اس نے دونوں دریاؤں کو میدان جنگ سے کہیں دور جنوب میں جاکر عبور کیا تھا تو یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ سکندر پورس کی سلطنت میں شامل علاقوں سے کترا کے گزر جانا چاہتا تھا۔ اگر یوں ہوا تھا تو آخر کیوں؟ اور پھر تاریخ میں ایسی کسی جنگ کے بعد کبھی فاتح بادشاہ نے متحارب دشمن کو مفتوحہ ریاست بخشی ہے؟ بادشاہ تو بادشاہوں کا نام و نشان مٹا دیتے ہیں۔
ایریان کے مطابق یونانی افواج کے دریا عبور کرنے کا مقام میدان جنگ سے کئی سو میل دور جنوب میں کہیں تھا اور وہ دریائے سندھ سے اتصال کے مقام پر چناب کی چوڑائی تقریباً چار میل بیان کرتا ہے لیکن یہ جہلم اور راوی کے چناب میں شامل ہونے کے بعد کی چوڑائی ہے اور اگر سکندر نے چناب کو کسی ایسے مقام سے عبور کیا تھا جہاں جہلم، راوی اور سندھ کا اتصال ہو چکا تھا تو ظاہر ہے کہ سکندر نے جہلم کو میدان جنگ کے قریب عبور نہیں کیا تھا بلکہ اس مقام سے سینکڑوں میل جنوب کی جانب سفر طے کرنے کے بعد کہیں جاکر دریائے جہلم کو عبور کرنے کی ہمت کی، تو ایسی صورت حال میں کیا واقعی وہ جنگ جیت چکا تھا؟
ایریان کے دعوے کا دریاؤں کے محل وقوع کے اعتبار سے جائزہ لیا جائے تو بآسانی یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ معرکہ جہلم کے بعد سکندر نے ایکدم جنوب کا رخ کیا اور وہ پورس کی حدود سلطنت سے کترا کے گزرا۔ ملتان پہنچنے تک وہ راستے میں کہیں بھی مشرق کی سمت نہیں مڑا۔ جہلم اور چناب کے سنگم کے بعد دریا عبور کر کے وہ مشرقی کنارے پر گیا۔ اسی لئے کو سمبی یہ اصرار کرنے میں حق بجانب ہے کہ

"پورس سے جنگ ذہین جرنیل کے لئے آخری تلخ تجربہ ثابت ہوئی۔ سکندر کتنا بھی جاہ طلب سہی لیکن اس کے بغاوت پر آمادہ سپاہیوں کا دل جنگ سے بھر گیا تھا۔ ہمالیہ پر اگنے والے چیڑھ کے درختوں سے ایک بحری بیڑا اٹھایا گیا اور یونانی فوج 'وادی سندھ کی بھولی بسری تہذیب کی قدیم تجارتی گزرگاہ یعنی دریائے سندھ کے راستے اس خطے کو خیرباد کہہ گئی۔"

جہلم کے داہنے کنارے پر جنوب کی طرف سفر کرتے ہوئے سکندر کی افواج کو پورس کے آدمیوں نے یقیناً اور مسلسل ہراساں کیا ہوگا کہ حوصلہ ہار کے بالآخر وہ بغاوت پر اتر آئے اور ہند میں مشرق کی جانب مزید آگے بڑھنے کے بجائے بیاس کے کناروں سے انہوں نے واپسی کی ٹھان لی۔ دوسرے لفظوں میں اگر سکندر اور پورس کے مابین معرکہ جہلم نتیجہ خیز ثابت نہیں بھی ہوا تھا تب بھی حملہ آور فوج اس قدر شدید دباؤ میں آچکی تھی کہ بالآخر اسے وادی سندھ سے پسپائی اختیار کرنا پڑی۔

گویا 'ایریان کا متبادل نظریہ جو یہاں پیش کیا گیا ہے' اسے مختصر لفظوں میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ پورس کے مقابلے میں پسپائی کے بعد سکندر جنوب میں ملتان کی جانب روانہ ہوا اور پھر وہاں سے تندخو دریاؤں کے عظیم سنگم (پنجند) سے ستلج اور بیاس تک پہنچا۔ اس طرح سکندر نے دراصل راوی اور جہلم کے درمیان پھیلی ہوئی پورس کی حدود سلطنت میں سے گزرنے سے احتراز کیا۔ فاتح پورس تھا جو بدستور اپنے تخت اور اپنی سلطنت پر قابض رہا جب کہ سکندر ملتان کی طرف جاتے ہوئے وادی سندھ کے خطرناک بانس کی کمان سے نکلے ہوئے ایک تیر سے زخمی ہوا' اس کی فوج کے سپاہیوں نے خوفزدہ اور دل شکستہ ہو کر بغاوت کر دی' سکندر کو مجبوراً واپسی کا سفر اختیار کرنا پڑا۔ بحری بیڑا تیار ہوا اور سکندر اپنی افواج کے ہمراہ وادی سندھ کے قدیم آبی راستے سے واپس روانہ ہو گیا۔

یہاں سکندر کے حملے کے ایک اور پہلو کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ وادی سندھ میں یونانی درباری مورخین کے نقطہ نظر کی اندھی تقلید ہی مقدونیہ کے سکندر کا چھوڑا ہوا نقش نہیں۔ اس کی شخصیت کا تاثر اتنا بھرپور تھا کہ اس خطے کے مسلمان اپنے بیٹوں کا نام سکندر رکھنے لگے حالانکہ اسلام کی آمد سے قبل پورس کا نام بھی وادی سندھ میں مقبول تھا۔ دونوں نام سکندر اور پورس قبل از اسلام کے نام ہیں۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اس مقامی ہیرو کا نام' جس نے فیصلہ کن انداز میں فاتح سکندر کا راستہ روکا تھا' صرف اس ادبی محاورے میں باقی رہ گیا جس میں ان ہاتھیوں کی بدحواسی کا ذکر ہے جس کے باعث پورس کو مبینہ شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ کوئی بھی اپنے بیٹے کا نام وطن کے اس عظیم سپوت کے نام پر نہیں رکھتا۔ کیا سندھ واسی کی طرف سے اپنے سورماؤں کو رد کرنے کی یہ ایک اور مثال نہیں ؟

5

موریائی توسیع پسندی اور پہلی ہمہ گیر سلطنت

گرم چاول کے پیالے سے ماخوذ حربی حکمت عملی

جب سکندر وادی سندھ سے واپسی کے سفر پر گامزن تھا۔ تو مشرقی ہند کی ایک ریاست مگدھ کے دو جلاوطن سپوت بالائی وادی سندھ کے سب سے شاندار شہر میں پناہ لئے ہوئے تھے۔ ٹیکسلا علم وادب کا گہوارہ اور معروف تجارتی مرکز تھا۔ چندر گپت اور اس کا انتہائی قریبی دوست اور مشیر کوتلیا (جسے چانکیہ بھی کہا جاتا ہے) اپنی جلاوطنی کے دوران اس شہر میں حربی اور ریاستی امور کے بارے میں گراں قدر علم اور بیش قیمت معلومات سے فیضیاب ہو رہے تھے۔

کوتلیا ایک ذہین و فطین شخص تھا۔ ایک ایسا شخص جسے آگے چل کر امور سلطنت کے موضوع پر اپنی مشہور زمانہ کتاب تصنیف کرنا تھی۔ اس کے ادراک اور اس کی ذکاوت کا اندازہ گوریلا جنگ کے ان اصولوں سے ہوتا ہے جو اس نے محض اپنے مشاہدے کی بنیاد پر وضع کئے تھے اور صدیاں گزر جانے کے باوجود جن کی اہمیت اور قدروقیمت میں آج بھی کوئی کمی نہیں آئی۔

ایک دن جلاوطن کوتلیا مایوس و دل شکستہ بیٹھا تھا کہ اس نے قریب ہی کسی عورت کی آواز سنی۔ وہ اپنے بیٹے کو سرزنش کر رہی تھی جو اچانک تکلیف سے بلبلا اٹھا تھا۔ اصل میں بھوک سے نڈھال بچے نے بے خبری میں گرم پلیٹ کے درمیان سے چاول کھانے کی کوشش کی اور انگلیاں جلا بیٹھا۔ اور اب ماں بچے کو نصیحت کر رہی تھی کہ کھانے کا آغاز ہمیشہ پلیٹ کے کنارے سے کرنا چاہئے کیونکہ درمیان کی نسبت کناروں پر چاول زیادہ گرم نہیں ہوتے۔

بس وہ دن جاتا ہے کہ دونوں جلاوطن دوست ''چاول کے پیالے سے ماخوذ حکمت عملی'' پر عمل پیرا ہو گئے۔ اس کے بعد ہر مہم جوئی میں کامیابی ان کے ہمرکاب رہی حتیٰ کہ وہ عظیم موریا سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ انہوں نے عجلت میں یا سیدھا سامنے آ کر وار کرنے سے ہمیشہ گریز کیا۔ پہلے وہ دشمن کے ایسے دستوں کو اپنے ناگہانی حملوں سے ہراساں اور پریشان کرتے جو اپنے مرکز سے دور تعینات ہوتے اور پھر ایک ایک کر کے ان پر غلبہ حاصل کر لیا جاتا۔ اس طرح وہ بتدریج لیکن یقینی انداز میں دشمن کے مرکز پر آخری حملہ کر کے کامیابی سے ہمکنار ہوتے۔ شاید ایسی ریاست پر قبضہ جمانے کا یہی بہترین موقعہ تھا جو لوہے کے ذخائر سے مالا مال تھی اور شاید برصغیر ہند میں ایک ہمہ گیر، متحد اور عظیم سلطنت کی تشکیل کے لئے حالات سازگار ہو چکے تھے۔

برصغیر کے مشرقی شہر بہار میں لوہے کے ذخائر کی بہتات قبائلی نظام کے تحلیل ہونے کی رفتار کو تیز تر کر چکی تھی اس کا منطقی نتیجہ یہی تھا کہ ایک مطلق العنان اور ہمہ گیر بادشاہت وجود میں آئے۔ معاشرے میں ابھرنے والے نئے طبقات، پابندیوں سے آزاد کسان اور تاجر، زمین پر ملکیت کے حقوق اور پیداوار کی حفاظت ترسیل کی ضمانت دینے والی کسی مرکزی قوت کے منتظر تھے۔ منڈی میں لائی جانے والی فاضل پیداوار کا حجم، سلامتی کی ضمانت کے ساتھ مشروط تھا اور یہ ضمانت ایک ایسی ریاست ہی فراہم کر سکتی تھی جو مضبوط اور طاقتور ہو۔

خود مختار کسان اور تاجر، ریاست کے لئے جو آمرانہ کردار چاہتے تھے اس کے نتیجے میں قبائلی نظام کے تار و پور کو ابھی اور بکھرنا تھا۔ کبھی ختم نہ ہونے والے ایک گنجلک سلسلے کا آغاز ہونے کو تھا۔ فاضل پیداوار کا ایک بڑا حصہ جو ریاست حاصل کرتی تھی اسے ریاست کی انتظامی مشینری کو مزید طاقتور بنانے کے لئے استعمال کیا جانا تھا تاکہ ریاست مزید فاضل پیداوار ہتھیانے کے قابل ہو سکے۔ یہ تاریخ کی وہ آکاس بیل تھی جو اپنے وجود سے زندگی پاتی ہے اور جسے بتدریج بڑھتے اور پھیلتے ہی جانا تھا۔

مگدھ اور کوسالا، مشرق میں دو ایسی ریاستیں تھیں جو اس سازگار تبدیلی سے بھرپور فائدہ اٹھانے کا آغاز کر چکی تھیں۔ ان دونوں میں سے مگدھ کو واضح برتری حاصل تھی حالانکہ کوسالا کا محل وقوع زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ یہ تجارتی گزرگاہوں کے دہانے پر واقع تھا اور گنگا اس کی عملداری میں تھا لیکن مگدھ لوہے کے ذخائر سے مالا مال تھا اور یہ بہت ہی فیصلہ کن برتری تھی۔

گویا مگدھ کے مقدر میں لکھا جا چکا تھا کہ وہاں ایک مثالی اور ہمہ گیر شہنشاہیت قائم ہو جو پورے برصغیر میں جاگیردارانہ پیداواری رشتوں کے فروغ کا باعث بنے۔ اس ابھرتی ہوئی عظیم ریاست نے شکست و ریخت کے شکار بے شمار قبائل کو نئی دھات یعنی لوہے کی مدد سے نہ صرف اپنا مطیع بنایا بلکہ انہیں

تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ اس طرح کچھ عرصے کے لئے تو اس سلطنت نے برصغیر پاک و ہند کے تمام علاقوں کو اپنی آہنی گرفت تلے یکجا کر لیا۔

بدھ مت: تاجر کا حلیف اور برہمنیت پر غالب

چندر گپت نے چاول کے پیالے سے ماخوذ حکمت عملی کا جو سبق پنجاب کی ایک ان پڑھ دیہاتی عورت سے سیکھا تھا۔ 323 ق م میں سکندر کی موت کے بعد اسی سبق پر عمل پیرا ہو کر اس نے پہلے تو بچے کھچے یونانی دستوں کو ہندوستان سے نکال باہر کیا اور ٹیکسلا پر قابض ہو گیا۔ ایک سال بعد وہ اور کوٹلیا وادی سندھ میں اپنے مقبوضہ علاقوں سے وقتی طور پر دستبردار ہو کر اور اپنی جلاوطنی کے احکامات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مگدھ واپس پہنچ گئے۔ یہاں انہوں نے اپنی وضع کردہ حکمت عملی کو بھرپور انداز میں بروئے کار لا کر بالآخر دارالحکومت پاٹلی پتر پر قبضہ کر کے موریا سلطنت کی بنیاد رکھی۔ حکومت کرنے کے جدید اصولوں سے آشنائی' خام لوہے کے ذخائر اور لوہے کے ہتھیاروں کی بہتات کے نتیجے میں سلطنت کی حدود مغرب میں وادی سندھ کی طرف پھیلنے لگیں جہاں چندر گپت کو اپنے پرانے مقبوضہ علاقے واپس حاصل کرنا تھے۔

جب موریا ریاست اپنے لوہے کے ہتھیاروں سے لیس ہو کر وادی سندھ (پاکستان) کی جانب بڑھ رہی تھی تو اس وقت وادی سندھ تھکن سے نڈھال تھی۔ سکندر کی لشکر کشی نے اس کی تمام تر معاشی اور معاشرتی توانائیوں کو نچوڑ لیا تھا۔ روائتی ہراول ریاست ہونے کے ناطے وادی سندھ نے ہند کو یونانی شورش سے تو بچا لیا تھا لیکن اس عمل نے خود اسے بے حال کر دیا تھا۔ پسپا ہوتے ہوئے یونانی وادی سندھ کے جنوبی حصوں سے صحت مند مردوں کی ایک بڑی تعداد کو غلام بنا کر اپنے ساتھ لے جا چکے تھے۔ مویشیوں کی تعداد میں بھی بہت کمی آئی تھی۔ زرعی' قبائلی اور گلہ بانی کا طرز حیات بے پناہ دباؤ کا شکار تھا۔

ادھر موریا کے تیروں کی انی لوہے کی تھی' وہ لوہے کے مضبوط ہتھیاروں سے لیس تھے جن میں تلواریں' ڈھال اور زرہ بکتر بے شمار تھے۔ وادی سندھ میں مشرق سے آنے والے ان حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کی سکت باقی نہیں رہ گئی تھی۔

سکندر کی سلطنت کے مشرقی حصے میں سیلوکس نکاتر Seleucus Nikator اس کا جانشین تھا۔ چندر گپت 303 ق م میں اس علاقے پر حملہ آور ہوا' سیلوکس کو شکست ہوئی اور موریا دوبارہ ٹیکسلا پر قابض ہو گئے۔ اسی سال ہونے والے ایک معاہدے کے تحت سیلوکس کی بیٹی پاٹلی پتر کے دربار میں

بیاہ کر لائی گئی اور اس طرح موریا سلطنت کی بالادستی کو پوری طرح تسلیم کر لیا گیا۔ اسی سال سلیوکس نے مشہور یونانی عالم میگا ستھنیز Megasthenes کو موریا دربار میں سفیر مقرر کیا۔ یونانی ہم وطنوں کے ساتھ میگا ستھنیز کی خط و کتابت مورخین کے لئے اس دور کے تاریخی واقعات کا سر چشمہ ہے۔

چندر گپت کے بیٹے اور اشوک اعظم کے باپ مدد سر نے فتوحات میں اضافہ جاری رکھا اور جلد ہی وادی سندھ سے اگلے علاقوں پر بھی موریا قابض ہو گئے اور افغانستان کا بہت بڑا حصہ بھی ان کے زیر نگیں آگیا۔ اب یہ سلطنت کم و بیش پورے برصغیر پر محیط تھی۔ اشوک اعظم جب حکمران ہوا تو اسے مزید فتوحات کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے صرف سلطنت کو مستحکم بنانا تھا۔

سلطنت کے استحکام اور عدم تشدد کے نظریئے کی طرف اشوک کا جھکاؤ' ان دونوں کے مابین ایک بڑا قریبی تعلق بنتا ہے۔ خطہ بہار میں لوہے کے وافر ذخائر اور شمال مغربی علاقوں سے حاصل ہونے والی فاضل زرعی پیداوار نے موریا سلطنت کے استحکام کو آسان بنا دیا تھا۔ اگر مقامی ذرائع سے فاضل پیداوار اور وافر آمدنی کا حصول ممکن ہو تو فوج کو غیر ملکی مہمات پر بھیجنے کے بجائے زیادہ بہتر یہی تھا کہ اسے ریاست کے لئے فاضل پیداوار کے حصول کی ذمہ داری سونپ دی جائے لہٰذا غیر ملکی مہمات اور جنگوں سے اجتناب اور تشدد سے احتراز سماجی مجبوری بن گیا۔

عدم تشدد کا مسلک نئے سماجی نظام کی ناگزیر ضرورت بن چکا تھا۔ پرانے نظام کے تشدد پر مبنی ضابطے مکمل طور پر ختم ہوتے تو نیا نظام جڑ پکڑ سکتا تھا۔

برہمنی ضابطے اور مذہبی رسومات پرانے نظام کی تجسیم تھے جو قربانی کی شکل میں تشدد کو لازم ٹھہراتے اور قبیلے کی حدود سے باہر سفر کرنے کی ممانعت کرتے تھے۔ اس طرح تاجر کی نقل و حرکت محدود ہو جاتی اور فاضل پیداوار کا حصول ممکن نہیں رہتا تھا۔ اس لئے ان رسومات اور ضابطوں کا مسترد کیا جانا ضروری تھا اور قبیلے کی ملکیت کا قدیم تصور متروک ہونا تھا۔

نجی ملکیت کے نئے نظریئے کو مذہب اور سماجی تحفظات کے خلاف سند جواز کی ضرورت تھی۔ تجارت اور زراعت میں ہر طرف خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ گوتم بدھ کے آٹھ پرتی عقدے کی جزئیات لوگوں تک پہنچ چکی تھیں۔ اب نئے عقیدے کی ترویج صرف شاہی سرپرستی کی منتظر تھی۔

یوں تو اشوک کو وراثت میں پورا برصغیر ملا تھا لیکن مگدھ کی فوجوں کو سلطنت کے صرف ایک کونے میں مزاحمت کا سامنا تھا۔ تاجروں کے لئے اس علاقے پر موریا بالادستی ضروری تھی کیونکہ جنوب کی طرف جانے والے تمام بری اور بحری راستے اسی علاقے سے ہو کر گزرتے تھے۔ گویا اشوک کے لئے کالنگا (یا آج کے اڑیسہ) پر قبضہ کرنے کا وقت آگیا تھا۔

کالنگا کی جنگ بڑی خونریز تھی جس میں کالنگا کے ایک لاکھ افراد ہلاک ہوئے اور اس سے کہیں زیادہ بڑی تعداد کو ملک بدر کر دیا گیا۔ خونریزی کے ان واقعات سے اشوک کو دلی صدمہ پہنچا۔ اس نے تشدد کا راستہ ترک کر کے بدھ مت اختیار کر لیا۔ اب یہی ویش (تاجر) کا مذہب ٹھہرا۔

بدھ مت کی رواداری نے تاجر کو اس قابل بنا دیا کہ وہ ذات پات اور قبیلوں کی سخت گیر اور ناقابل عبور بر ہمنی حد بندیوں کو توڑ کر وسیع منڈیوں اور زیادہ منفعت بخش علاقوں تک پہنچ سکیں لیکن جیسے جیسے تاجرانہ سرگرمیوں کو وسعت ملتی گئی ایک بڑی اور طاقتور ریاستی انتظامیہ کی ضرورت بھی شدید تر ہوتی گئی جو تجارت کو مزید سہولتیں، تحفظ اور وسعت فراہم کر سکے۔

ابتدا میں تو بدھ مت نے ان تمام قوتوں اور ایسی تمام تحاریک کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی کی جو موریا سلطنت کے قیام میں معاون ثابت ہوئیں۔ لیکن اب کردار بدلے گئے۔ اب سلطنت شاہی اس مذہب کی سرپرست بن گئی تھی اور ریاست کے تعاون سے بدھ مت نہ صرف برصغیر کے کونے کونے میں پھیل گیا بلکہ ملکی حدود سے باہر بھی اسے پذیرائی حاصل ہونے لگی۔

بدھ مت محض نظریاتی اعتبار سے ہی تاجر کا معاون نہیں تھا بلکہ تجارت کے فروغ میں عملی طور پر شریک بھی تھا۔ بدھ بھکشوؤں نے تمام تجارتی راستوں پر مناسب فاصلہ رکھتے ہوئے خانقاہیں اور آرام گاہیں بھی تعمیر کر لی تھیں جو بدھ مت کے زوال کے بہت عرصہ بعد تک آباد رہیں۔ اشوک کے ایک ہزار سال بعد، گپتا عہد کے آخری دور کے فرمانروا ہرش وردھن کے زمانے میں ایک چینی عالم ہیون سانگ Hsuan Tsang نالندہ کی درسگاہ میں تعلیم حاصل کرنے آیا تھا۔ اپنے طویل سفر کے دوران اس نے تاشقند، سمرقند اور بلخ سے ہمالیہ کی ترائیوں میں دور دور تک پھیلی ہوئی انہی ان گنت بدھ خانقاہوں میں قیام کیا جنہیں ہر لحاظ سے اشوک کا دیرپا تمدنی ورثہ ہی قرار دیا جائے گا۔

غلام داری سماج، گلڈ اور کوتلیائی ریاست

ابتدائی موریا سلطنت کی ریاستی انتظامیہ بھی مبتدی اور خام نہیں تھی۔ یہ ایک اعلیٰ پائے کا نفیس نظام تھا۔ اشوک کے زمانے تک پہنچ کر بھی ریاستی حکمت عملی اور عمومی انتظام و انصرام کوتلیا ہی کے وضع کردہ اصولوں کے مطابق طے پا رہا تھا وہی کوتلیا جس نے مگدھ کی فتح اور پہلی موریا ریاست کے قیام میں نہ صرف اپنے دوست چندرگپت کی بے پناہ معاونت و مشاورت کی بلکہ اسی دوران وہ ایک زیادہ اہم اور دوررس کارنامہ سرانجام دینے میں بھی شب و روز مصروف رہا۔ یہ ارتھ شاستر کی تخلیق تھی۔ ایک نہایت جامع اور مستند کتاب جو کوتلیا کے قریب ترین ہمعصر افلاطون کی "دی ریپبلک"

The Republic سے کسی صورت کمتر نہیں۔

ارتھ شاستر میں فن حکمرانی کے اصول و ضوابط بیان کئے گئے ہیں' ریاستی حکمت عملی اور مقاصد کار کا تعین کیا گیا ہے' حکمرانی کے طریق کار پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ انتظامیہ اور ٹیکسوں کے لئے بنیادی اصول وضع کرتے ہوئے عوامی بہبود کے کاموں مثلاً سڑکوں اور آب پاشی کے منصوبوں کی تعمیر اور جنگلوں کی کٹائی کی ذمہ داری حکومت پر ڈالی گئی ہے۔ ارتھ شاستر کے مطابق تجارتی گذرگاہوں پر امن و سلامتی کو یقینی بنانا بھی حکومتی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ یہ اور ایسے بہت سے دوسرے اقدامات قبائلی نظام کے لئے یقیناً ضرب گراں ثابت ہوئے۔

اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے اور تاجروں کی بھلائی کے مزید اقدامات کے لئے حکومت کو ایک بڑی اور اہل فوج کی ضرورت تھی۔ حالانکہ اشوک تشدد اور فوجی مہم جوئی سے تائب ہو چکا تھا اس کے باوجود زمانہ امن میں بھی اس کی فوج 6 لاکھ پیادوں پر مشتمل ہوا کرتی تھی۔ تیس ہزار سوار اور نو ہزار ہاتھی اس کے علاوہ تھے۔

عوامی بہبود کے منصوبوں پر عملدرآمد اور فوج پر اٹھنے والے اخراجات کے لئے آمدنی اور پیداوار کے وسیع ذرائع درکار تھے۔ کان کنی اور زراعت نے اگر سلطنت کی تشکیل میں مدد دی تھی تو ہنر مندی اور صنعت نے اس کے قیام کو دوام بخشا۔ سڑکوں اور شاہراہوں پر تحفظ نے تجارت کو فروغ دیا۔ ریاست خود ڈھلائی اور جہاز سازی جیسے بڑے منصوبوں میں شریک کار بنی۔ ان منصوبوں سے ریاست کو براہ راست آمدنی حاصل ہونے لگی۔ اس کے علاوہ بھی ہر طرح کی صنعت اور تجارت پر محصول عائد تھا۔

یونانی سفیر میگا ستھنیز کے مطابق موریا ریاست کی ساری اراضی بادشاہ کی ملکیت ہوتی تھی۔ لیکن یہاں وہ کسی غلط فہمی کا شکار لگتا ہے کیونکہ ایسا نہیں تھا۔ اراضی کی فروخت میں حق شفع کو قانونی طور پر تسلیم کئے جانے کے شواہد ملتے ہیں جس سے نجی ملکیت کا وجود ثابت ہوتا ہے اور ان دنوں نجی املاک پر غلاموں سے مشقت لی جاتی تھی۔

غلام داری کا آغاز تو ویدک دور میں ہو چکا تھا لیکن اب یہ پھلتے پھلتے ایک مسلمہ اور ٹھوس ادارے کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ برصغیر کی تین ہمہ گیر ریاستوں میں سے پہلی یعنی موریا سلطنت کی بنیاد اسی غلام داری نظام پر تھی۔ غلاموں کو اس دور میں داس اور داسی کہا جاتا تھا اور ان کی حیثیت جانوروں کے مانند تھی۔ انہیں قطعاً کوئی انسانی حقوق حاصل نہیں تھے۔ آقا' ان کی موت اور زندگی پر قادر تھا۔ داسیاں ہر لمحے جنسی تشدد کے خطرے سے دوچار تھیں۔ غلامی کی زنجیریں توڑنا ممکن نہیں تھا۔ اکثر غلام شودر

تھے جب کہ بے شمار شودر غلام تو نہیں تھے البتہ غلاموں سے ذرا بہتر درجہ رکھتے تھے۔ قدیم اور قرون وسطیٰ کا یہ "سنہری دور" بھی دراصل ہندو سندھ کی تاریخ کا سیاہ ترین دور تھا۔

غلام داری سماج کی ذلت اور اتھاہ تاریکیوں کے باوجود کم از کم ایک حوالے سے ہندوستان ایک ایسی حیران کن ترقی پسندی کا مظہر تھا جو قدیم اور ازمنۂ وسطیٰ میں بھی دنیا کے کسی دوسرے حصے میں ناپید تھی۔ یہاں روزگار اور پیشہ ورانہ سطح پر ہنرمندوں کی ملک گیر انجمنیں قائم تھیں۔ ٹیکس ادا کرنے کی ذمہ داری، زیادہ منافع کمانے کے امکانات، تجارتی سہولیات، غلاموں کی دستیابی اور خوشحال منڈیوں تک رسائی کے باعث وسیع پیمانے پر پیداوار کی رسد اور طلب موجود تھی جو اہل حرفت اور صنعتکاروں کے لئے گلڈ Guild کی طرز پر منظم ہونے کا جواز بنی۔

ان تنظیموں نے دستکار کو انفرادی سطح پر تحفظ بھی فراہم کیا اور اسے اپنے ہی علاقے کے دوسرے دستکاروں کے ساتھ غیر ضروری مسابقت سے بھی بچایا۔ مصنوعات کو بڑی منڈیوں تک پہنچانے میں بھی یہ تنظیمیں ہنرمندوں سے تعاون کرتی تھیں جس سے تھوک پیداوار کے فوائد کا حصول ممکن ہوا۔ تاجروں کے لئے بھی اس تنظیم کے ساتھ سودا کرنا زیادہ سہل تھا کیونکہ اس طرح نہ صرف معاہدے کے مطابق رسد اور طے شدہ معیار کی ضمانت مل سکتی تھی بلکہ معاہدے کی خلاف ورزی پر ہرجانے کی ادائیگی بھی ممکن تھی۔ ریاست بھی گلڈ کے ذریعے ٹیکسوں کی وصولی، مصنوعات کی تجارتی پیمانے پر تیاری اور ان کے معیار کی نگرانی کا کام لیتی تھی۔ سماجی معیشت کے استحکام میں بھی ان تنظیموں نے خاطر خواہ خدمات انجام دیں کیونکہ گلڈ یا پیشہ ورانہ تنظیمیں اپنی متعلقہ ذات کے نوجوانوں کو روزگار فراہم کرنے میں بھرپور دلچسپی رکھتی تھیں۔

وقت گزرنے کے ساتھ معاشرہ گنجلک ہونے لگا۔ اشیاء کی طلب بڑھی تو رسد میں اضافہ ہوا اس طرح جب پیداواری عمل میں مہارت کا حصول ناگزیر ہو گیا تو شعبہ جاتی تخصیص عمل میں آئی، جس نے مختلف النوع قبائل (یاد رہے کہ کرشن کی سولہ ہزار بیویاں بیان کی جاتی ہیں) کا نئے تشکیل پاتے ہوئے سماج میں جذب ہونا ممکن بنا دیا۔ اس صورت حال نے بے شمار ذیلی ذاتوں کو جنم دیا جب ذاتوں کے یہ تانے بانے پیشہ ورانہ تنظیموں یا گلڈ کے ذریعے باہم منسلک ہوتے گئے تو یہی تنظیمیں مطلوبہ افرادی قوت کی فراہمی کا مستقل ذریعہ ثابت ہوئیں۔ پھر گلڈ اور تاجر کا دائرہ کار بتدریج بڑھتے بڑھتے وادی سندھ بلکہ اس سے بھی آگے تک پھیل گیا۔

داخلی طور پر موریا سلطنت چار صوبوں میں منقسم تھی۔ ہر صوبہ ضلعوں میں بٹا ہوا تھا اور ضلع بہت سے دیہاتوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ گاؤں بنیادی انتظامی اور پیداواری اکائی تھا۔ ہر لحاظ سے خود کفیل، اپنی

ذات میں ایک مکمل اکائی۔ جو نہ صرف اپنی گذر بسر اور شہروں میں بسنے والوں کی خوراک بلکہ منڈی کی تجارتی ضروریات کے لئے بھی اضافی پیداوار مہیا کرنے کی قدرت رکھتا تھا۔ منڈی کا اتار چڑھاؤ' طلب و رسد کے بنیادی اصولوں کے تابع تھا۔ گاؤں کی خود مختاری کے تحفظ کو خاص طور پر اہمیت دی جاتی تھی یہاں تک کہ کوئی سپاہی شاہی اجازت نامے کے بغیر گاؤں میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔

اس زمانے میں وادی سندھ کا گاؤں ایک طاقتور اور زندگی سے معمور اکائی تھا لیکن چند صدیوں کے سفر میں 'ریاست کے مرکزی اختیار میں زوال اور گلڈ نظام کی ناتوانی کے ساتھ ہر گاؤں بتدریج ایک جزیرے میں تبدیل ہوتا چلا گیا۔ اس طرح مکمل طور پر خارجی ماحول سے کٹ جانے کے بعد یہ تو ہونا ہی تھا کہ گاؤں اپنی خود کفالت ' داخلیت پسندی اور ذات پات کے دم گھونٹ دینے والے نظام کے ہاتھوں مفلوج ہو کر رہ جاتا۔

ذات پات 'گلڈ ' دیہاتی اور شہری مراکز کے اس وسیع تر نظام کو چلانے اور انہیں باہم مربوط رکھنے کے لئے ایک طاقتور اور موثر انتظامی ڈھانچے کی ضرورت تھی۔ ارتھ شاستر میں اس کے لئے بہت زیادہ مائل بہ مرکز افسر شاہی نظام تجویز کیا گیا تھا جس میں بادشاہ کی حیثیت مرکزی تھی اور وہی کلیدی محرک بھی تھا۔ ریاست کے محکموں اور ان کی ذمہ داریوں کی فہرست طویل تھی جس میں دوسرے بہت سے شعبوں کے علاوہ بحری جہاز 'گائے ' ہاتھی ' جاسوس ' طوائف اور شہروں سے متعلق الگ الگ محکمے شامل تھے۔

موریا سلطنت کے بارے میں ایک آخری تبصرہ کو سمبی کے الفاظ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ یہ ایک ایسی ریاست تھی جسے آج کا جدید ذہن پوری طرح سمجھنے سے قاصر ہے کیونکہ بظاہر اس ریاست کا عمل دخل زندگی کے ہر شعبے میں تھا۔ کو سمبی لکھتا ہے :

> " آج ہمیں یہ کوتلیائی ریاست کتنی مرعوب کن اور شاندار لگتی ہے کہ ایک طرف حکومت نے جنگلات اور ٹیلے صاف کر کے نئی زمینوں کے حصول کی ذمہ داری بھی سنبھال رکھی ہے اور دوسری طرف اراضی کی سب سے بڑی مالک و منتظم بھی وہی ہے۔ بھاری صنعتوں کے اکثریتی حصص بھی اس کے پاس ہیں اور اشیائے صرف پیدا کرنے والا کلیدی ادارے کا کردار بھی وہی ادا کر رہی ہے۔ اگرچہ ریاست کا نظم و نسق چلانے کے لئے بطور خاص کسی حکمران طبقے کو وجود میں نہیں لایا گیا تھا پھر بھی ریاستی انتظامیہ میں اوپری اور نچلی سطح کی افسر شاہی کا بڑا حصہ ایسے اہل افراد پر مشتمل تھا جو صحیح معنوں میں

حکمران طبقے کی تعریف پر پورا اترتے تھے۔ 300 سال قبل مسیح کی اس موریا ریاست میں باقاعدہ فوج کی تعداد 5 لاکھ تھی۔ بے شمار جاسوس اور خفیہ فوج کے اہلکار اس کے علاوہ تھے۔ فوج کے افسران سبھی ذاتوں اور مختلف نسل و نسب سے تعلق رکھتے تھے۔ یہی وہ مختلف عناصر تھے جو ایک نئی سلطنت کے استحکام کا باعث ہوئے۔"

لیکن اگر ہم اس دور کے ہمعصر میلانات کے اساسی محرکات کو ڈھونڈھ نکالنے کی کوشش کریں تو برصغیر کی جدید ریاستوں کے بارے میں حمزہ علوی کے تبصرے سے اختلاف کرنا بہت مشکل ہوگا اور شاید ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں کہ کیا واقعی وہ قدیم ریاست اتنی ہی مرعوب کن اور شاندار تھی۔

"میں نے پہلے بھی کسی موقع پر حد سے زیادہ طاقتور ریاست یا ہمہ مقتدر ریاست Over Developed State کے ایک روگ کا حوالہ دیا تھا کہ ریاستی اختیار اور ضابطے کس طرح مقتدر طبقوں کی مخصوص ضروریات کی حد سے تجاوز کر جاتے ہیں لیکن جن ثانوی سرمایہ دارانہ معیشتوں کے بل پر یہ ریاست قائم ہوتی ہے۔ ان کے وسیع تر مفادات اور منضبط کارکردگی کے لئے یہ تجاوز ضروری ہوتا ہے۔"

یہ بات واضح ہے کہ حد سے زیادہ طاقتور ریاست یا ہمہ مقتدر ریاست کا یہ روگ صرف دور جدید کا خاصہ نہیں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ایک روگ سے کہیں بڑھ کر یہ کوئی عمیق البنیاد تہذیبی خصلت ہے جس کا ماخذ تاریخ کے کسی انتہائی اولین دور میں پوشیدہ ہے۔ البتہ حالیہ دور میں جدید ٹیکنالوجی کی عالمی برتری ' انفارمیشن سپر ہائی وے کے قیام اور نجکاری پر گہرے اصرار کی بدولت پہلی بار ایک الگ تھلگ اور حد سے بڑھی ہوئی مقتدر اور طاقتور ریاست کے تصور کو گزند پہنچنے کا احتمال ہوا ہے۔

اشوک کی موت 232 قبل مسیح میں ہوئی اور اس کا وضع کردہ نظام جس کی بنیاد اعلیٰ اخلاقی اقدار پر تھی اس کی موت کے بعد صرف 50 سال تک قائم رہ سکا۔

6

آمو دریا اور وادی سندھ

باختر اور ساکا نسلیں

انگریزوں سے پہلے یہ اعزاز صرف موریا سلطنت کو حاصل ہوا کہ وہ مشرق میں گنگا کی دور افتادہ زریں وادیوں سے اپنے ریاستی اقتدار کا آغاز کر کے شمال مغرب میں واقع سندھ کے طاس پر حکمرانی کر سکے لیکن دوران حکومت ہی موریا کو یہ احساس بھی ہو گیا کہ وادی سندھ کا ایک علیحدہ تشخص اور اپنی جداگانہ اہمیت ہے۔ وہ جان گئے تھے کہ ہندوستان کا حصہ ہونے کے بجائے یہ خطہ ایک قطعی آزاد حیثیت رکھتا ہے۔ موریا کو یہ بھی یقین تھا کہ جب تک پنجاب میں کوئی دشمن حکومت برسر اقتدار نہ ہو ' جمنا کی راجدھانی کو فوج کی ضرورت نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ انہیں اس حقیقت کا بھی ادراک تھا کہ جب تک وادی سندھ موریا سلطنت کا حصہ اور بیرونی حملے کے خطرے سے دوچار ہے۔ یہاں ایک چوکس فوج اور ایک 'یا ایک سے زیادہ مقامی کمانداروں کی ضرورت ہے۔ اور یہ اسی حکمت عملی کی ابتدائی شکل تھی جسے دو ہزار سال بعد برطانیہ نے اپنی "فارورڈ پالیسی" کے طور پر اپنایا تھا۔

لیکن اس ابتدائی اور شاندار حکمت عملی کے باوجود اشوک کی سلطنت اس کی موت کے فوراً بعد سکڑنا شروع ہوئی اور کچھ ہی عرصے میں یہ حکومت پھر وادی جمنا تک محدود ہو کر رہ گئی۔ باختری یونانیوں نے تقریباً 180 ق م میں وادی سندھ پر قبضہ کیا اور ایک بار پھر آمو دریا سے وادی سندھ تک ان کی اقلیم میں شامل تھے۔

باختر ' دریائے آمو کے دونوں اطراف پر پھیلا ہوا ایک وسیع علاقہ ہے جو آج کے ازبکستان '

تاجکستان اور شمالی افغانستان پر مشتمل ہے۔ جب سکندر کی فوجیں ان علاقوں سے گزری تھیں تو بہت سے یونانی سپاہی یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ یونانیوں کی انہی باقیات نے وسطی ایشیا میں ایک نئی ریاست کی بنیاد رکھی بعد ازاں جب انہوں نے وادی سندھ پر بھی قبضہ کر لیا اور یہاں ایک دیرپا اور مستحکم حکومت قائم کرنے میں کامیاب رہے تو اس علاقے کی ثقافت پر بھی ان کے گہرے نقوش مرتب ہوئے۔

وادی سندھ میں یکے بعد دیگرے قائم ہونے والی باختری یونانی ریاستوں کے درمیان ایک اہم قدر مشترک تھی کہ ایسی ہر حکومت نے آمو دریا اور وادی سندھ کو ایک ہی سیاسی نظام کے تابع رکھا۔ اگر کہیں یہ بادشاہتیں یا ریاستیں وادی سندھ سے باہر جنوب میں ہندوستان کی طرف وسعت اختیار کرتیں تو آج شاید ہندی تشخص کا ایک پہلو بھی ایسا نہ ہوتا جو اسے وادی سندھ سے ممیز کر سکتا۔ آمو دریا اور وادی سندھ کے درمیان براہ راست تعلق اور رابطے کا ایک طویل سلسلہ ہے جو کئی صدیوں بلکہ یوں کہا جائے تو زیادہ مناسب ہو گا کہ ہزار سال کے ایک بڑے حصے پر محیط ہے۔

اگر وسطی ایشیائی ریاستوں کے اس مسلسل دور اقتدار کو نظر میں رکھا جائے تو ہم شمال مغربی ہمسایوں کے ساتھ وادی سندھ کی ثقافتی، نسلی اور لسانی قرابت داری کا صحیح ادراک کر سکتے ہیں جب کہ وادی گنگا کے ساتھ اس نوعیت کا اساسی اور تاریخی تعلق کہیں دکھائی نہیں دیتا اور نہ ہی وادی سندھ اور مشرق وسطی کی عرب ریاستوں کے درمیان کوئی لسانی یا نسلی قدر مشترک موجود ہے۔ البتہ تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ وسطی ایشیا کے ایرانی افغان علاقے اور وادی سندھ ہمیشہ ایک دوسرے کے لئے بے پناہ کشش محسوس کرتے رہے۔

سیلوکس کی شکست وادی سندھ پر مقدونیہ کے براہ راست اقتدار کا خاتمہ تھی لیکن اس شکست سے وادی سندھ اور وسطی ایشیا پر سکندر کی فوج کے یونانیوں کا اثر نفوذ ختم نہیں ہو گیا تھا۔ وہ دریائے سندھ کے کناروں پر آباد ہو چکے تھے اور انہوں نے سکندر کی پیش قدمی کے انتہائی مقام سے آگے جنوب کی طرف جانے کی نہ کبھی کوشش کی اور نہ ہی اس کے لئے کبھی کوئی کشش محسوس کی۔ یہ صرف وادی سندھ ہی میں ہوا کہ ہند اور یونانی ثقافتیں یکجان ہو کر ایک بھرپور اور رنگارنگ تہذیب میں ڈھل گئیں۔ آج کے غزنی اور پنجاب کے درمیان واقع علاقوں پر مشتمل ایک ایسی سلطنت کی بنیاد پڑی کہ جہاں یونانی اور بدھ آرٹ کا امتزاج ہوا اور گندھارا کی بھرپور اور توانا ثقافت نے جنم لیا۔

انڈو یونانی بادشاہ ڈیمیٹریس ثانی کے عہد میں باختریوں کی حدود سلطنت دریائے سندھ کے ڈیلٹائی علاقوں اور وہاں سے ساحل کے ساتھ ساتھ رن آف کچھ تک وسعت اختیار کر گئیں۔ بعد ازاں مینڈر نے وادی سوات، ہزارہ اور پنجاب کو فتح کر کے باختری سلطنت کو مزید استحکام بخشا۔

باقی ماندہ ہندوستان کے مقابلے میں وادی سندھ پر مختلف النوع بیرونی ثقافتوں کے ساتھ دیرپا اور مضبوط رابطوں کے اثرات واضح طور پر جھلکتے ہیں جس کی نمایاں مثال گندھارا آرٹ ہے جو کشان عہد میں اپنے بام عروج پر پہنچا لیکن جس پر سکندر کے دور سے پہلی صدی عیسوی تک کے درمیانی عرصے کے یونانی فنون کی گہری چھاپ ہے۔ باختر ریاستوں کے فنون نے بھی ہندی یونانی ثقافتی امتزاج سے جنم لینے والے آرٹ سے جلا پائی۔ آرٹ کے ان نمونوں کا بنیادی خیال تو بدھ اثرات کے تابع ہوتا تھا لیکن جسمانی ساخت اور شکل و شباہت میں یہ مجسمے خوبصورتی کے یونانی دیوتا' اپالو سے قریب تر تھے۔

فن و ثقافت سے قطع نظر اور بھی کئی حوالوں سے یہ "مقامی یونانی" سکندر کی مختصر فوج کشی کے پیدا کردہ اثرات میں نمایاں اضافے کا باعث بنے۔ انہوں نے وادی سندھ میں جاگیر دارانہ سماج کے فروغ کی بڑی حد تک مزاحمت کی۔ یوں لگتا ہے کہ کچھ عرصے کے لئے ہی سہی' اس دوران ایک مخلوط لیکن کلیتاً وادی سندھ کا معاشرہ قائم ہو گیا تھا جس کا انحصار اپنے ہی علاقے کی زراعت پر تھا جس کی بنیاد کاشتکار زمیندار روابط کے بجائے غلام اور آقا کے تعلق پر تھی۔

اس خطے میں جاگیر دارانہ نظام کی آبیاری صرف اسی وقت ممکن ہو سکی جب بہت بعد میں گپت سلطنت نے وادی سندھ کو جامع اور دیرپا امن مہیا کیا' جو یقیناً جاگیر دارانہ سماج کی ناگزیر ضرورت ہے۔

برصغیر کے مشرق بعید میں لوہا بہ افراط موجود تو تھا لیکن ابھی یہ وادی سندھ کی بنیادی دھات نہیں تھا۔ اعلیٰ درجے کی فنی مہارت کے باوجود لوہے کی کمیابی یہاں زراعت کے فروغ میں رکاوٹ بنی رہی۔ اسی میں ایک اور عنصر یونانی معاشرے کا بھی شامل ہو گیا جس کی بنیاد غلام داری سماج پر تھی۔ اس طرح وادی سندھ میں جاگیر داری کے بجائے ایسے غلام داری سماج کو فروغ ملا جس کی بنیاد پدر سرانہ غلامی پر تھی۔ وادی سندھ میں اس سماج کے عروج کا زمانہ وہی ہے جو عیسوی عہد کے آغاز کا ہے۔ اس کے بعد لیکن بتدریج یہاں جاگیر دارانہ نظام نے اپنی جگہ بنائی جس کے اثرات شمالی ہند سے بڑے نامحسوس انداز میں یہاں گھر کر رہے تھے۔

باختر ریاستوں نے وادی سندھ کو اپنی سلطنت میں ضم کر کے نہ صرف ایک مخلوط نظام دیا بلکہ دریائے سندھ کو آبی راستے اور تجارتی گذرگاہ کے طور پر استعمال کرتے ہوئے اس خطے کو ایسی جداگانہ اکائی میں بدل دیا جس کا ہندوستان سے کوئی تعلق نہ رہا لیکن پھر اقتدار ان کے ہاتھ سے بھی جاتا رہا' باختر پر کوہ قاف کے خانہ بدوشوں کے ایک سیتانی قبیلے کے حملے کے نتیجے میں انڈو یونانی بادشاہتوں کے زوال کا آغاز بھی ہو گیا۔

سیتانی (ساکا) وسطی ایشیا کے گیاہستانوں میں اپنے دوسرے ہم وطنوں کی طرح گلہ بانی کی زندگی

گزار رہے تھے۔ یہ ایک ابتدائی قبائلی سماج تھا۔ دوسری صدی قبل مسیح کے دوران وسطی ایشیا کے طول و عرض میں ہونے والی بعض بڑی اہم تبدیلیوں کا سلسلہ وادی سندھ پر ان کی یلغار کا باعث بنا۔ طاقتور اور جنگجو ہنز Huns کے دباؤ نے پہلے تو انہیں دریائے آمو کے ساتھ ساتھ بحیرہ آرل تک اور بعد ازاں جنوب مشرق کی جانب وادی کابل اور سلیمان سلسلہ ہائے کوہ کے راستے وادی سندھ کے میدانوں میں دھکیل دیا۔ یہاں گلہ بانی کے بجائے انہیں زرعی طرز زندگی اختیار کرنا پڑا جس کے نتیجے میں سیتانیوں (ساکاؤں) کے برادری اور قبائلی روابط کے نظام میں شکست و ریخت کے عمل کا آغاز ہوا۔

ابتدا میں تو سیتانیوں نے گلہ بانی کے خانہ بدوشانہ طرز زندگی کو رواج دینا چاہا لیکن جب وہ یہاں کی مقامی آبادی سے گھل مل گئے تو انہوں نے بھی زراعت کو اپنالیا جس کے نتیجے میں ان کی قبائلی اور خانہ بدوشانہ خود انحصاری بتدریج ختم ہوتی چلی گئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لیکن پہلی صدی قبل مسیح کے وسط تک سیتانی (ساکا) باختریوں کو بالائی سندھ سے مکمل طور بے دخل کر چکے تھے۔ گندھارا کے تمام علاقے پر ان کی حکمرانی تھی۔ موگا ان کا بادشاہ اور ٹیکسلا دارالخلافہ تھا۔ اس دور میں پوری وادی سندھ کو سیتان یا سیتھیا کہا جانے لگا جس کے بارے میں بعض اوقات خیال کیا جاتا ہے کہ یہ لفظ اسم سندھ کا ماخذ ہو سکتا ہے۔

سیتانی اپنے نئے وطن پر زیادہ عرصے تک قابض نہ رہ سکے۔ وسطی ایشیا (جس کو ماوراالنہر بھی کہا جاتا ہے) کی چراگاہوں میں بپا شورش اب آزار کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ جس کی وجہ آبادی کا دباؤ بھی ہو سکتا ہے اور خشک سالی کا میعادی عذاب بھی لیکن وسطی ایشیا کے ان قبائل کی بقاء مسلسل متحرک رہنے میں تھی۔ اور مسلح جارحیت اس کا ناگزیر نتیجہ تھی۔

کچھ اسی طرح کے حالات سے دوچار ایک قبیلہ یوچی بھی تھا۔ نسلی اعتبار سے یہ لوگ چینی تھے۔ اور وسطی ایشیا میں یہ مسلسل سیتانیوں کے تعاقب میں رہتے تھے۔ اسی قبیلے کی ایک شاخ کشان کہلاتی تھی۔

کشان اور اہل فارس

کشانوں نے سیتانیوں کو سندھ طاس کے شمالی علاقوں سے نکال باہر کیا۔ بے گھر سیتانی دریائے سندھ کے پر پیچ راستے کے ساتھ ساتھ ساحل سمندر تک پہنچے اور وہاں سے کاٹھیاواڑ کی طرف نکل گئے۔ کشانوں کی حکمرانی میں یہاں ایک شاندار اور مضبوط سلطنت کی بنیاد رکھی گئی جس کے استحکام کی بدولت وادی سندھ میں جاگیرداری سماج کے بتدریج فروغ کے راستے استوار ہوئے۔

کئی اعتبار سے کشانوں نے وادی سندھ کے لئے وہی کچھ کیا جو موریا نے وادی گنگا کے لئے کیا تھا۔

کشان حکمرانوں نے پہلے تو قبل از زرعی سے زرعی سماج کی جانب تبدیلی کو مستحکم بنایا اور پھر جاگیردانہ پیداواری رشتے متعارف کرانے کے عمل کا آغاز کیا۔ انہوں نے آمو دریا اور وادی سندھ کو بھی ایک سلطنت کی شکل میں متحد کیا کیونکہ دونوں خطے جغرافیائی اعتبار سے ایک دوسرے کے ساتھ منسلک تھے۔

کشان دیومالا اپنی اہمیت کے حوالے سے دلچسپ اور معنی خیز ہے۔ اس عہد کے سکوں پر ان کے دیوتاؤں کی شبیہیں ملتی ہیں جو تین مختلف مذاہب 'یونانی' ایرانی اور ہندی دیومالاؤں کی ترجمانی کرتی ہیں۔ کشان سلطنت کے قیام کے پس منظر میں ان کی مذہبی رواداری کا بڑا ہاتھ تھا۔ ان سے پہلے غیر متحمل گروہ در دانہ وار آئے 'اپنے سامنے آنے والے ہر کس و ناکس کو تاراج کیا' پھر خود بھی نیست و نابود ہو گئے۔ اور یہ تمام عمل چند دہائیوں میں مکمل ہوتا رہا۔ تحمل اور رواداری نے کشان حکمرانوں کو اپنے مخالفین کی قوت برداشت کر کے اسے تحلیل کرنے اور ایک مضبوط 'پائیدار اور وسیع سلطنت قائم کرنے میں بہت مدد دی۔

اپنے دیوتاؤں کی صف میں ہندو دیوتا شیو کو شامل کر لینے کے باوجود کشان مذہب پر بدھ مت کی چھاپ گہری تھی۔ اس کے بعد ایرانی زرتشتی یا پارسی مذہب کو اہمیت دی جاتی تھی۔ کشان خاندان کے سب سے عظیم فرمانروا کنشک (144-78ء) نے پارسی مذہب کی بہت سی رسومات و عقائد کو اپنے مذہب میں شامل کرنے کی اجازت دی تھی۔ اور یہ سب کچھ پرانے معمول کے مطابق تھا۔ کشان سلطنت بھی ماضی کی طرح مختلف تہذیبوں کا سنگم بن رہی تھی اور وادی سندھ نے ایسے مناظر تو پہلے بھی کئی بار دیکھ رکھے تھے۔

کشان سلطنت مشرق میں بنارس تک پھیلی ہوئی تھی اور متھرا میں کشان بادشاہ اکثر رہائش پذیر ہوتے تھے۔ اس سلطنت کے بارے میں قرین قیاس یہی ہے کہ قدیم دنیا کی یہ سب سے عظیم سلطنت تھی جس کا گرمائی دارالخلافہ افغانستان اور موسم سرما کا صدر مقام پشاور کے نزدیک ''پرش پار'' تھا۔ اس سلطنت نے وسطی ایشیا اور وادی سندھ 'دونوں کے مخصوص مزاج اور کردار کو برقرار رکھا۔ کشان فرمانرواؤں نے ہی غالباً سب سے پہلے شہنشاہ کا لقب اختیار کیا۔ انہوں نے باختری بادشاہوں کے متعارف کردہ گندھارا آرٹ اور اس کی عمدہ ترین اصناف مجسمہ سازی اور پتھروں پر کندہ کاری کو مزید فروغ دیا۔

وسطی ایشیائیوں نے وادی سندھ اور ہند میں سلے ہوئے کپڑے کی افادیت اور فیشن کو متعارف کرایا۔ ان سے پہلے برصغیر میں لباس 'ان سلے کپڑے کے مختلف ٹکڑوں پر مشتمل ہوتا تھا جنہیں بدن پر

لپیٹ لیا جاتا۔ مرد لنگوٹ اور پٹکا یا چادر استعمال کرتے تھے۔ عورتیں دو چادریں یا ساری (ساڑھی کی ابتدائی شکل) باندھ لیتی تھیں۔ کشن گھڑ سوار تھے انہوں نے اس خطے میں چمڑے کے مضبوط بوٹوں کو رواج دیا۔ یہاں اس سے پہلے لکڑی کی کھڑاؤں استعمال ہوتی تھی جس کے تسمے گھاس' لچکدار شاخوں یا رسی سے بنائے جاتے تھے۔ جانوروں کے ذبحہ پر پابندی ہونے کی وجہ سے یہاں چمڑا نایاب تھا۔ کشان لباس شلوار نما لمبی ڈھیلی پتلونیں' چست قمیضیں اور بھاری لمبے بوٹ گھڑ سواری کے لئے موزوں پہناوا تھا۔ اس لباس کو یہاں اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ یہ فیشن بن گیا' کیا بادشاہ اور کیا سپاہی یا عوام' ہر کوئی یہی لباس پہنے پھرتا تھا۔

اگرچہ کشان وادی سندھ اور آمو دریا کو انتہائی مضبوط بندھنوں میں جکڑ چکے تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے خود کو وسطی ایشیا کی سیاست اور وہاں کے معاملات میں بہت زیادہ الجھائے رکھا۔ کنشک کی موت بھی غالباً وسطی ایشیا ہی میں کسی جنگ کے دوران ہوئی تھی۔ گمان یہی ہے کہ کشمیر اور کاشغر کو مطیع بنانے کے بعد کنشک نے وادی سندھ اور چین کے درمیان اس عظیم تجارتی راستے کی طرف توجہ مرکوز کی جسے بعد میں مارکوپولو کے سفر اور سفرناموں کے حوالے سے شہرت ملی اور جو آج شاہراہ ریشم کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ دنیا بھر میں سب سے پہلے اس تجارتی راستے کے استعمال کا سہرا ' کنشک کے سر ہی باندھا جاتا ہے۔

کنشک کی موت کے ساتھ ہی کشان سلطنت کے زوال کا آغاز ہو گیا۔ شاید وہ اب بھی حملہ آور ساسانیوں کا مقابلہ کر لیتے لیکن آخری دور کے کشان فرمانرواؤں کی بنیاد پرستانہ ہٹ دھرمی اور سن 167 عیسوی کے خوفناک طاعون کے باعث یہ ممکن نہ ہو سکا۔

ساسانی اردشیر 226 عیسوی میں ایران کے پارتھیوں کا تختہ الٹ چکا تھا جب اس کے بیٹے نے پشاور اور ٹیکسلا پر قبضہ کر لیا تو کشان' بادشاہت سلطنت فارس کی طفیلی ریاست بن کر رہ گئی۔ بعد میں دارا کے جانشینوں نے وادی سندھ کو مغرب سے منسلک کر کے اسے باقاعدہ اپنی باج گذار ریاست بنا لیا۔

وادی سندھ کے اہم ترین شہر ٹیکسلا کے کھنڈرات سے اندازہ ہوتا ہے کہ سیاسی مرکز ثقل وادی سندھ سے باہر کوہ ہندوکش کے پار منتقل ہونے کے باوجود یہ شہر بدستور تجارتی سرگرمیوں کا مرکز بنا رہا۔ یہ حقیقت ہے کہ اس خطے کی تاریخ میں ٹیکسلا کسی بھی اور شہر کے مقابلے میں کہیں زیادہ طویل عرصے تک نمایاں ترین شہر کی حیثیت سے برقرار رہا۔

روائت تو یہی کہتی ہے کہ ٹیکسلا کی بنیاد فارس کے بادشاہ دارا اول نے رکھی تھی۔ اس کے باوجود اس شہر نے فارس کا اثر زیادہ قبول نہیں کیا۔ ٹیکسلا بین الاقوامی تجارتی راستوں کے سنگم پر واقع تھا۔

موریاؤں نے پاٹلی پتر سے ٹیکسلا اور اس سے بھی آگے تک ایک سڑک تعمیر کی تھی۔ شاہراہ ریشم نے اس شہر کو جنوبی چین سے منسلک کر دیا۔ دوسری طرف دریائے سندھ کو بھی اب جنوب مغربی ساحلوں تک ایک بڑی آبی شاہراہ کی حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔

جب روم اور پارتھیا کے درمیان ایک طویل قضیہ اٹھ کھڑا ہوا اور خشکی کے راستے مغرب اور چین کے درمیان تجارت میں رخنہ پڑا تو ایک متبادل راستے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ایسے میں دریائے سندھ ہی ایک واحد متبادل تھا۔ اس طرح ٹیکسلا دیکھتے ہی دیکھتے ایک اہم ترین بین الاقوامی منڈی کی صورت میں ابھر آیا جہاں سے تجارتی ساز و سامان دریائے سندھ کے راستے اس کی خلیجی بندرگاہ باربریکم Barbaricum تک جاتا تھا۔

ٹیکسلا نے اپنا علمی امتیاز بھی برقرار رکھا۔ موریا دور میں نالندہ کے بعد یہ ہندوستان کی سب سے نمایاں درسگاہ تھی۔ موریا عہد کے بعد اس شہر کو درس و تدریس اور علمی کارناموں کی وجہ سے شہرت ملی۔ یہاں سے فارغ التحصیل ہونے والوں کا شمار ذہین و فطین اور کامیاب ترین افراد میں ہوتا تھا جن میں دور قدیم کے ممتاز ترین اہل دانش شامل تھے۔ چوتھی صدی قبل مسیح کا مشہور ماہر تعلیم پانینی 'ارتھ شاستر کا مصنف کوتلیا اور ہندی طب کا بہت بڑا ماہر چرک' ٹیکسلا کی مشہور عالم درسگار کے تعلیم یافتہ تھے۔ گویا

ٹیکسا شیلا کے مندر سے جتنے لڑکے نکلے تھے
چین سے آگے جانا تھا سو' تڑکے تڑکے نکلے تھے

گپت ریاست میں گاؤں، گلڈ اور ذات پات

اگرچہ موریا دور میں وادی سندھ پر وادی گنگا کا تسلط رہا لیکن باختری عہد میں جب موریا کی گرفت ڈھیل پڑ گئی تو وادی سندھ نے بھی دوبارہ اپنے آبائی وفاق سے ناطہ جوڑ لیا۔ یہ الحاق کسی رخنہ اندازی کے بغیر پانچ سو سال سے زیادہ عرصے تک جاری رہا۔ یہ دورانیہ موریا' مغل اور برطانوی تسلط کی مجموعی مدت سے بھی زیادہ ہے۔ پھر کشان سلطنت کے زوال کے بعد گپت خاندان نے ایک مختصر سی مدت کے لئے وادی سندھ کو ایک بار پھر وادی گنگا سے ملحق کر دیا۔

جمنا کی طرف جھکاؤ میں اس اعلیٰ ترقی یافتہ تہذیب کی کشش بھی شامل تھی جو جمنا کے مشرقی میدانوں میں فروغ پا چکی تھی۔ وہ زمانہ وسطی اور جنوبی ہندوستان میں نسبتاً امن و سکون کا زمانہ تھا جب کہ وادی سندھ پر پے در پے سکندر' سلیوکس' موریا' باختری' سیتانی اور کشان حملہ آور ہو رہے تھے۔

وادی جمنا میں یہ سکون واضح طور پر اس علیحدگی کا ماحصل تھا جو اس دوران ہندوستان کو میسر رہی۔ امن و سکون کے اس ماحول اور وادی سندھ سے علیحدگی کے باعث ہندوستان فلسفے اور سائنس کے فروغ کی طرف توجہ دینے کے قابل ہوا۔

اس مرحلے پر یہ ضروری محسوس ہوتا ہے کہ وادی سندھ کے موضوع سے تھوڑا سا انحراف کرتے ہوئے ہندوستان میں ہونے والی ہمعصر تبدیلیوں کا جائزہ لیں۔

یہی زمانہ تھا جب ہندوستان میں جدید الجبرے اور ریاضی کی مبادیات بتدریج تشکیل پا رہی تھیں جسے بعد میں عربوں نے اپنا کر 'بام عروج تک پہنچایا۔ صفر جیسا انتہائی اہم اور بنیادی نوعیت کا تصور تشکیل پا چکا تھا۔ اعداد کی بوسیدہ رومن اور یونانی علامات جن کے باعث ضرب اور تقسیم کے سادہ سوال بھی محال تھے ' ہندوستانی سائنسدانوں کے راستے کی رکاوٹ نہ بن سکے۔ تمام اعداد کے محض دس علامتوں کے ذریعے اظہار کی فہیم اختراع دنیا کے لئے ہندوستان کا تحفہ تھی۔ گنتی کے اس ہندی نظام نے ریاضی کی تمام ترخفتہ توانائیوں کو بیدار کر دیا۔ کسر ' منفی اور مثبت کی علامات ' اعشاریہ اور اس کی مقامی قدر ' مربع اور مکعب جذر جیسے تمام ممکنات زیرک ہندوستانی ذہن کی فوری پہنچ میں تھے۔ اس لئے یہ قطعی حیران کن نہیں کہ عرب بھی اپنے اعداد کو ''ہندسے '' یعنی ہندوستان سے اخذ کردہ کہتے ہیں۔

قصبوں اور خود کفیل اور خود مختار دیہاتوں میں ہنر مندوں اور دستکاروں کی انجمنیں یا گلڈ ہی وہ بنیادی ڈھانچہ تھا جس نے ان تاریخ ساز کامیابیوں کو ممکن بنایا۔ گاؤں اور گلڈ انہی دو نے ہندوستان کی زیادہ تر آبادی کو باقاعدہ منظم کیا۔ ابھی یہ دونوں ادارے اس زوال پذیری ' زبوں حالی اور فرسودگی کا شکار نہیں ہوئے تھے جس نے بعد کے زمانوں میں انہیں مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔ لیکن جس عہد کا ہم جائزہ لے رہے ہیں اس دور میں تو گاؤں اور گلڈ دونوں انتہائی ولولہ انگیز اور فعال تھے۔

ان دونوں اداروں نے زرعی اور صنعتی پیداوار کی وسیع پیمانے پر دور دور تک ترسیل کو ممکن بنایا اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے اراکین اور اپنے مکینوں کے تحفظ کو بھی یقینی بنایا۔ اس مرحلے پر نچلی ذاتوں پر ظالمانہ پابندیوں کے باوجود ' ذات پات کا سخت گیر نظام بھی ایک مثبت سماجی قوت کے طور پر سامنے آیا۔ لہٰذا جب گلڈ نے ٹیکسوں کی موثر وصولی میں ریاست کی معاونت کی تو ذات پات کا نظام مخصوص افرادی قوت مہیا کرتا رہا۔ سازوسامان ' اسلحہ اور جوانوں کی مسلسل اور یقینی فراہمی کے نتیجے میں مسلح اور طاقتور فوج رکھنا ممکن ہوا جس کے جواب میں فوج نے بھی نئے علاقوں کو فتح کر کے تاجر کو زیادہ بڑی اور خوشحال منڈیوں تک رسائی دلائی۔

یہ وہ ماحول تھا جسے ''برہمن کشتری گٹھ جوڑ'' نے اپنی قوت اور اثر و رسوخ میں اضافے کے لئے

استعمال کیا۔

چندر گپت 320 عیسوی میں وسطی ہندوستان کا غیر متنازعہ حکمران بن چکا تھا۔ سلطنت کے مشرقی صوبے مگدھ میں لوہا وافر تھا جس کے باعث اس کی فوجیں آہنی اسلحہ سے پوری طرح لیس تھیں۔ انہی افواج کے بل پر چندر گپت نے ہندوستان کو ایک اور شاہی سلسلہ دیا جس کا دارالخلافہ بھی وہی پاٹلی پتر تھا جو کبھی عظیم شہنشاہ اشوک کا دارالحکومت رہ چکا تھا۔

گپت خوشحال جاگیردار تھے۔ چندر گپت اول نے سوچ سمجھ کر ایک شادی رچائی جو اس کے لئے مفید ثابت ہوئی اور یوں گپتا اقتدار کی داغ بیل پڑی۔ جلد ہی یہ وسعت پذیر اقتدار بادشاہت کا روپ اختیار کر گیا جسے چندر کے بیٹے سمندر گپت کی جاہ طلبی نے مزید وسعت دی اس کی پرجوش مہم جوئی کی بدولت مشرقی ساحلی علاقے تو براہ راست گپتا عملداری میں آگئے جب کہ متضاد اطراف میں واقع سری لنکا' نیپال' بنگال اور پنجاب جیسے دور دراز خطے سمندر گپت کے دربار پاٹلی پتر میں خراج ادا کرنے پر مجبور کر دیئے گئے۔

گپت متمول' ذہین اور شجاع تھے۔ شاہی خاندان کی جانب سے فنون کی سرپرستی نے سمندر کے بیٹے چندر گپت ثانی کی توسیع پسندانہ مہم جوئی کو بھی تقویت بخشی۔ اس دلیر بادشاہ نے 375 سے 415 عیسوی تک' پورے چالیس سال حکومت کی اور "وکرماجیت" یعنی شجاعت کے سورج کا لقب اختیار کیا۔ چندر گپت ثانی کے اس چالیس سالہ عہد حکومت میں گپتا سلطنت نے سیاست اور ثقافت کے میدانوں میں شاندار کارنامے سرانجام دیئے۔

وکرماجیت نے اپنے زمیوں کو امن اور خوشحالی دی اور کاشتکاروں سے لگان کی وصولی کا ایک مناسب نظام وضع کیا اگرچہ اس نظام کی کارکردگی زیادہ موثر نہیں تھی۔ چینی سیاح فاہیان بھی وکرماجیت کے دربار میں آیا اور مشہور تمثیل نگار کالیداس بھی اس کے دربار کی زینت بڑھانے والوں میں سے تھا۔ وہی کالیداس جو شہرہ آفاق تمثیل' شکنتلا کا خالق تھا۔

شکنتلا کی کہانی' بے مثال حسن کی حامل ایک دیہاتی لڑکی کی کہانی ہے بادشاہ جس سے بے وفائی کرتا ہے اور ٹھکرائے جانے کے بعد وہ شہزادے کو جنم دیتی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ بادشاہ ایک روز اپنی حقیقی اولاد اور تخت کے وارث کو پہچان لیتا ہے۔ یہ تخلیق اپنے انداز تحریر کے اعتبار سے نازک انسانی محسوسات کی تصویر کشی کا عظیم شاہکار ہے اور اس کے مکالموں میں آفاقی سچائیوں کا برملا اظہار ملتا ہے۔

شاہی خاندانوں میں شادیوں کے ذریعے سیاسی اتحاد' گپتا خاندان کی خصوصی حکمت عملی تھی۔

اب ایک اور سیاسی شادی دو کاٹک خاندان میں کی گئی جو آندھرا خاندان کی جگہ مغربی دکن کے نئے حکمران تھے۔ اس کے علاوہ بھی کئی اور سیاسی شادیوں کے ذریعے سلطنت کے سرحدی علاقوں میں امن وسکون کو یقینی بنادیا گیا۔ گپتا خاندان نے تقریباً تین سو برس تک بہت ہی رعایا پرور اور منصفانہ انداز میں حکومت کی۔ اور ہند پر حکومت کرنے کے ساتھ ساتھ وادی سندھ سے بھی خراج وصول کرتے رہے تاآنکہ سفید فام ھن وادی سندھ پر حملہ آور ہوئے اور انہوں نے تھوڑے عرصے کے لئے اس خطے کو ایک بار پھر وسطی ایشیا کا حصہ بنالیا۔ گپتا عہد 'اقتدار اعلیٰ کے قائم کردہ امن کا ایک اور طویل دورانیہ تھا۔ اسی لئے گپتا راج کو عام طور پر ہندوستان کا سنہری زمانہ کہا جاتا ہے۔

زرعی آلات اور آہنی ہتھیاروں سے لیس موریا سلطنت نے قبائلی نظام کی پر شکوہ عمارت پر ابتدائی ضربیں لگائی تھیں جس سے قبائلی سماج میں دراڑیں پڑنے کے عمل کا آغاز ہوا۔ اس کے ساتھ ہی زراعت اور تجارت کو سرکاری سطح پر فروغ دینے کا ابتدائی سلسلہ بھی موریا عہد میں شروع ہو گیا تھا لیکن گپتا ریاست نے وادی جمنا کے انحطاط پذیر قبائلی نظام پر فیصلہ کن وار کیا جس کے نتیجے میں ہندو ذات پات کے ہمہ گیر اور وسعت پذیر نظام کو مکمل فتح حاصل ہوئی۔ اس سلسلے میں تاجر نے ایک بار پھر سب سے اہم کردار ادا کیا تھا اور تاجر ہی کو اس نئے نظام اور نئی تبدیلی کا سب سے زیادہ فائدہ بھی پہنچا۔

چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹے ہوئے اور آپس میں برسرپیکار قبائل ہی تجارت کے فروغ کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھے کہ وہ تجارتی مال کی آزادانہ رسد کو جگہ جگہ ناممکن بنادیتے۔ اس کے برعکس ذات پات کا نظام لوہے کے ہتھیاروں سے لیس فوج کے ساتھ ساتھ سارے ہندوستان میں پھیلتا گیا مختلف قبائل اس میں ضم ہوتے رہے اور تجارت کے راستے کی رکاوٹیں ختم ہوتی گئیں۔ ذات پات کے نظام کے موثر ہونے سے تاجر کے لئے کسی حد تک خصوصی افرادی قوت کا حصول بھی ممکن ہو گیا۔

مگر ذات پات کی درجہ بندی اور انتہائی طاقتور حکومتی انتظامیہ کی موجودگی نے کسان کو انتہائی حقیر اور اس کی حیثیت کو خانہ زاد غلام کے درجے تک گھٹا دیا۔ شاید اسی لئے بعض اوقات یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ گپتا عہد ایک غلام داری سماج تھا حالانکہ ایسا نہیں تھا یا گپتا عہد کم از کم دور کانسی کے مصری اور عراقی غلام داری سماج جیسا نہیں تھا۔ فی الواقع اور جیسا کہ ہمیں آگے چل کر اندازہ ہو گا کہ گپتا ریاست برصغیر میں جاگیردارانہ نظام کے فروغ میں بہت مددگار ثابت ہوئی البتہ گپتا سلطنت کی بالادستی اتنی ہمہ گیر تھی کہ پاٹلی پتر کی حکومت جنوب اور انتہائی مشرق میں واقع ایسی کئی ریاستوں سے خراج وصول کرتی تھی جہاں غلام داری سماج قائم تھا۔

لاغری، تنہائی اور برہمنیت کی جیت

ہمیں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ یہاں تاجر نے بھرپور موقعہ پرستانہ کردار کا مظاہرہ کیا اگرچہ اپنے سیاق و سباق کے حوالے سے ایسا تاریخ کی جبریت کے تحت ہوا کیونکہ جب تاجر علاقائی دیوتاؤں کی ضرر رسانی، مقامی محصولات اور نت نئی قبائلی رسومات کے حصار کو گرانا چاہتا تھا تو اس نے برہمنیت کے خلاف بدھ مت کا ساتھ دیا کیونکہ اسے ایک مربوط اور وسیع منڈی کی تلاش تھی۔

تبدیلی کی ان صدیوں میں تاجر کو بدھ تعلیمات کی آفاقیت اور سماجی مساوات، انسانی بنیادوں پر سفاکانہ رسوم کا استرداد اور مقامی دیوتاؤں کے بھینٹ چڑھائے جانے کی دہشت ناک رسم کی نفی جیسے نظریات نے اپنی طرف متوجہ کیا، کیونکہ اسے سخت گیر، گروہی درجہ بندی کے شکار، بے لچک اور غیر متحمل سماج کے بجائے ایک خیر اندیش، انسانی مساوات کے قائل بامروت اور بردبار معاشرے کی ضرورت تھی۔ لیکن نئے نظام کے قدم جماتے ہی طبقاتی درجہ بندی کا ایک نیا ڈھانچہ مستحکم ہو کر سامنے آیا جس سے ہم آہنگ ہو کر نہ صرف تاجر نے فوراً اسے اپنا لیا بلکہ وہ اس نئے نظام کو مضبوط بنانے اور اسے اپنے مفادات کے لئے استعمال بھی کرنے لگا۔ ذات پات کے اس نظام کو تاجر نے پیداواری عمل اور تجارت میں جوت دیا اور اسی کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ گویا بدھ مت کی حمایت سے دستکش ہو کر وہ برہمنیت کی طرف راغب ہو گیا۔

لیکن صدیوں پر محیط اس تاریخی تناظر میں، برہمنیت اور دیہی نظام پہ تکیہ کر کے اس بار تاجر غلط گھوڑے پر شرط لگا بیٹھا تھا۔

اگر ایک طرف تاجر (ویش) فاضل پیداوار کے حصول میں سرگرم اور اپنے اس عمل سے گپتا سلطنت کو تقویت پہنچارہا تھا تو دوسری طرف وہ قوتیں جنہیں موریا حکومت نے تخلیق دینے میں مدد فراہم کی تھی وہ جمود اور فرسودگی کا شکار تھیں۔ گاؤں جو کبھی زندگی سے بھرپور اور ایک چھوٹی سی خود مختار جمہوریہ ہوتا تھا، موریائی زوال کے بعد گذشتہ کئی صدیوں سے خود اپنی سابقہ قابل تحسین خود انحصاری کے ہاتھوں انحطاط پذیر تھا کیونکہ اس خود انحصاری نے ہی اسے خود پسند تنہائی کے حصار میں جکڑ دیا تھا۔ قبائلی رسومات کے قدیم حصار کی جگہ یہ جدید حصار بھی تجارت کے راستے میں رکاوٹ تھا۔

ہندی گاؤں کے خود تخلیق کردہ دفاعی حصار کو توڑنے میں گپتا سلطنت نے جزوی طور پر تاجر کی اعانت کی۔ مگر سلطنت کو محصولات کے علاوہ غیر فوجی اور عسکری افرادی قوت تو ذات پات کے اس نظام ہی کے ذریعے میسر تھی۔ لہٰذا سلطنت بالآخر گاؤں کی سادہ سی تنظیم میں بڑی حد تک ایک نیا، انتہائی پیچیدہ اور مخصوص مہارتوں پر مبنی ذات پات کا نظام رائج کرنے میں پوری طرح کامیاب رہی لیکن یہ

نظام جس پر کبھی تاجر نے سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا وقت گزرنے کے ساتھ اسی کی آہنی گرفت نے گاؤں کے فطری طور پر جامد معاشرے کو دم گھونٹ دینے والے چنگل میں جکڑ لیا جس کے نتیجے میں دیہات 'نڈھال ہو کر فرسودگی کا شکار ہو گئے۔

یہ ہندوستان کے دیہات کے زوال کا آغاز تھا یہی زوال بعد ازاں یورپ کی سامراجی توسیع پسندی اور فتح کا دعوت نامہ ثابت ہوا۔

یورپی سامراج کے ہاتھوں برصغیر کی حتمی ہزیمت کا بیج اس کے لاغر ہوتے ہوئے دیہات میں بویا جا چکا تھا۔ گپتا عہد میں یہ دیہات ذات پات کے آزار ' تنہائی کے حصار اور بدھ مت پر برہمنت کے غلبے کی زد میں آ گئے تھے۔ ان تمام تبدیلیوں کو گپتا سلطنت کی بھرپور تائید اور حمایت حاصل رہی۔

لیکن گپتا سامراج کے اثرات اس کے تمام زیر تسلط اور باجگزار علاقوں پر یکساں نہیں تھے۔ گپتا فرمانروائی میں لاتعداد ریاستیں تھیں اور ان میں سے ہر ایک کا علیحدہ بادشاہ یا راجہ تھا۔ اس لحاظ سے بھی وادی سندھ 'ہندوستان سے قطعی مختلف تھی۔

بادشاہتیں زیادہ تر وادی جمنا اور برصغیر کے جنوبی علاقوں میں تھیں جب کہ وادی سندھ مختلف جمہوریاؤں میں تقسیم تھی۔ بادشاہتوں کا زیادہ انحصار ذات پات کے نظام پر تھا جبکہ جمہوریائیں نو آباد علاقوں کے خود مختار دیہات اور دم توڑتے ہوئے قبائلی نظام پر مشتمل تھیں۔ جمہوری راجہ کو منتخب کیا جاتا تھا گو راجہ کے انتخاب کا طریقہ کار ہر جمہوریہ میں مختلف ہوتا تھا۔ جمہوریاؤں کی نسبت بادشاہتوں میں برہمنیت کا غلبہ زیادہ تھا۔

بدھ مت کا خاتمہ بھی جمہوریاؤں کی نسبت بادشاہتوں میں بہت پہلے ہو گیا۔ اس طرح بدھ مت کا رواج ہندوستان کی نسبت وادی سندھ میں بہت عرصے تک رہا۔ اگر اٹھارویں صدی کی طوائف الملوکی اور پھر انگریز کا وادی سندھ کے لئے مخصوص نظام حائل نہ ہوتے (جیسا کہ ہم دیکھیں گے) تو سندھ واسی 'ہندوستانیوں سے زیادہ جمہوریت پسند تھے۔ البتہ گائے کی اہمیت 'قدر و قیمت کے پیمانے کی حیثیت سے ہر علاقے میں برقرار رہی۔

جیسے جیسے ذات پات کے نظام اور برہمنیت کے غلبہ حاصل کرنے اور وسعت اختیار کرنے کی تگ و دو میں اضافہ ہوتا گیا' بادشاہتیں جمہوریاؤں پر اور برہمنیت بدھ مت پر غالب آتی گئی اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب بدھ مت کو اپنی جنم بھومی سے بے دخل ہونا پڑا۔

مون سون نے عربوں کو وادی سندھ سے دور رکھا

اس کے علاوہ بھی یہاں دو اور تاریخی حقائق کا مختصر سا جائزہ لینا مناسب ہو گا جن کا سرسری ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے۔ ایک تو برصغیر کے جنوب میں خود رو اور مادرا تبدیلیوں کا رونما ہونا' اور دوسرے وادی سندھ پر عربوں کے تاریخی اثرات یا تعلق کی عدم موجودگی۔

اس تمام عرصے کے دوران جنوبی اور وسطی ہندوستان شمال میں ہونے والی تبدیلیوں سے تقریباً لاتعلق ہی رہا ہے ان خطوں کے لئے وادی سندھ میں رونما ہونے والے واقعات کی نہ تو کوئی اہمیت تھی اور نہ ہی انہوں نے اس سے کوئی اثر قبول کیا۔ پہلی صدی عیسوی میں موریا سلطنت کا زوال ہوا اور جنوب میں آندھر برسر اقتدار آئے۔ موریا سلطنت میں آندھرا خاندان چند انتظامی عہدوں پر فائز رہ چکا تھا۔ آندھرا ریاست جو پہلی صدی عیسوی میں ایک شاندار سلطنت کے طور پر ابھری تھی دوسری صدی عیسوی میں اس کے زوال کا آغاز ہو گیا اور اس دوران وادی سندھ میں رونما ہونے والے واقعات سے یہ ریاست قطعی لاتعلق رہی۔

آج کے بمبئی کے نزدیک واقع بھر وچ کی بندرگاہ ہی روم کے ساتھ جنوبی ہندوستان کا اہم رابطہ تھا۔ سمندر اور اس اہم بندرگاہ کے ہوتے ہوئے وادی جمنا اور جنوبی ہندوستان وادی سندھ کو مکمل طور پر نظر انداز کر سکتے تھے کیونکہ ان کے نزدیک وادی سندھ وسطی ایشیا سے منسلک ایک اجنبی سرزمین تھی۔ اس باہمی خلوت پسندی یا استرداد کو مون سون اور خلیجی دلدلوں نے بھی تقویت پہنچائی۔

یہاں ہم وادی سندھ کے عرب دنیا سے تعلقات کی طرف آتے ہیں۔ اس امر کا جائزہ لینا اس لئے بھی ناگزیر ہے کہ سندھ واسی کی ماہیت اور اس کی ثقافت کا تعین کرتے ہوئے ہمارے بنیاد پرست اس خطے پر عرب اثرات کو کسی قدر بڑھا چڑھا کے بیان کرتے ہیں۔ سندھ واسی کو وراثت میں منتقل ہونے والی خصوصیات اور اس کی ثقافتی شناخت کا تجزیہ کرتے ہوئے غلط فہمی پر مبنی ان تصورات پر رائے زنی ضروری ہو جاتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ آج وادی سندھ میں بسنے والوں کی بہت بڑی اکثریت مسلمان ہے۔ انہیں اپنے عقیدے پر فخر ہے بلکہ اس معاملے میں وہ خاصے جذباتی واقع ہوئے ہیں لیکن وہ نسلی اعتبار سے عرب نہیں ہیں اور نہ ہی عرب حکمرانوں یا قبائل نے کبھی وادی سندھ کے لوگوں کے ساتھ مسلسل اور گہرے مراسم رکھنے میں گرم جوشی کا مظاہرہ کیا ہے۔

یہ بھی درست ہے کہ ہندوستان اور مشرق بعید کے ساتھ سلطنت روما کی تجارت عرب آڑھتیوں اور جہاز رانوں کے ذریعے ہوتی تھی۔ روم کے لئے ہندوستان کے پاس اچھی بندرگاہیں اور منافع بخش

بر آمدات تھیں لیکن مون سون ہواؤں کی ناموافقت نے عرب ملاحوں کو وادی سندھ سے ہمیشہ دور ہی رکھا جیسے قدرت کو یہی منظور تھا۔

پندرہویں صدی عیسوی میں بحری قطب نما کی ایجاد تک جہاز رانی کا انحصار ساحلوں کی قدرتی مادوث پر ہوا کرتا تھا۔ ملاح کو ساحل سے زیادہ دور رہنے کا حوصلہ نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی وہ متلاطم سمندر میں جانے یا اسے عبور کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ ان سب خطرات کے باوجود عرب ملاح باہمت اور مہم جو تھا۔ اس نے کھلے سمندر میں جانے کی ہمت کی اور بحیرہ عرب اور بحر ہند کے درمیان ہواؤں کی بہت ہی موافق شاہراہ کا پتہ چلایا۔

قدیم روایات کے مطابق جہاز رانی کے لئے ان ہواؤں کی دریافت کا سہرا یونانی جہاز ران ہپالس Hippalus کے سر ہے لیکن اس میں دریافت والی کوئی بات نہیں تھی کیونکہ عرب تو یہ بات پہلے سے ہی جانتے تھے۔ انہیں مختلف موسموں کے دوران بحر ہند میں مون سون ہواؤں کے رخ معلوم تھے جس کی بناء پر ان کا ہندوستان اور وہاں سے واپسی کا سفر ساحلوں کا سہارا چھوڑ کر بے کراں سمندر کو درمیان سے چیرتا ہوا مختصر اور تیز رفتار ہو گیا تھا اور اس کی نشاندہی رومیلا تھاپر Romila Thapar نے یوں کی ہے کہ "وہ جہاز جو اپنے سفر کا آغاز بحیرہ احمر کی بندرگاہوں سے کرتے تھے وہ یہاں (عرب بندرگاہوں میں) پہنچ کر جنوب مغربی مون سون کے انتظار میں لنگر انداز رہتے اور جب یہ ہوائیں چلتیں تو ہندوستان کی سمت ان کا سفر آغاز ہوتا اور سردیوں کی مون سون ان کے جہاز واپس لے کر آتی۔"

لیکن تھاپر نے جس بات کا ذکر نہیں کیا وہ یہ ہے کہ ان بہترین موافق ہواؤں کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ برصغیر سے عربوں کا رابطہ وادی سندھ کی بجائے صرف ہندوستان تک محدود رہا اور یہ بات بہت اہم ہے کہ تاریخ کے زیادہ عرصے کے دوران عربوں نے وادی سندھ کو مکمل طور پر نظر انداز کئے رکھا۔

ایک ایسے دور میں جب کھلے سمندروں سے خائف جہاز ساحلوں کے ساتھ ساتھ سفر کو ترجیح دیا کرتے تھے اور جہاز رانی کے لئے مون سون کا استعمال اور ان ہواؤں کے توسط سے متلاطم سمندروں کے درمیان سے گزرنا عربوں کا ہی کام تھا۔ مون سون ہواؤں کے دوش پر عرب بھڑوچ یعنی بمبئی تک آیا کرتے تھے اور پھر ساحل کے ساتھ ساتھ جنوب کی سمت سفر کرتے ہوئے کیپ کمورن یا راس کماری تک پہنچتے تھے۔ واپسی میں وہ پھر بھڑوچ سے مون سون کے ساتھ ہو لیتے تھے۔ صدیوں تک مون سون کی 'شاہراہ' پر اسی طرح گرمیوں میں ہندوستان کی طرف اور سردیوں میں واپسی کا سفر کرتے ہوئے وادی سندھ سے وہ کترا کے گزر جاتے رہے کیونکہ جو ہوائیں انہیں ہندوستان کے جنوب مغربی

ساحلوں تک لے جاتی تھیں وہ ہوائیں وادی سندھ کی طرف نہ جاتی تھیں اور نہ وہاں سے عرب ساحلوں کی طرف واپس آتی تھیں گویا دونوں صورتوں میں وادی سندھ عربوں کی گزرگاہ سے پرے رہی اور محمد بن قاسم کے علاوہ بلکہ اس کے بعد بھی عربوں اور وادی سندھ کے مابین تاریخی اور فطری روابط کے آثار نہیں ملتے۔

وادی سندھ کا طلسم

عظیم تبدیلیوں کے اس عہد میں جب مشرق "شجاعت کے سورج" چندر گپت ثانی اور شاعر کالیداس پر نازاں تھا اور جنوب آندھرا کی فرمانروائی میں ترقی پذیر تھا تو عربوں کے تجارتی راستوں سے پرے وادی سندھ میں بھی زندگی اتنی ہی رنگارنگ اور بھرپور تھی۔ یہاں بھی شجاعت، رومان اور ولولہ انگیز اساطیری کہانیوں جیسی عظیم داستانیں جنم لے رہی تھیں۔

پنجاب میں شاعر' سیالکوٹ کے حیرت انگیز حد تک جری اور بہادر دو سوتیلے بھائیوں کی تعریف میں رطب اللسان تھے اور سیالکوٹ اس وقت تک بالائی وادی سندھ کے ایک اہم صنعتی شہر کا مقام حاصل کر چکا تھا۔

7

راجہ رسالو کا سحر

رسالو کا دور

سیالکوٹ کے راجہ کے دو بیٹوں میں سے رسالو اگرچہ چھوٹا تھا لیکن اپنی دلکش شخصیت اور ذہانت کے اعتبار سے وہ اپنے بڑے بھائی پورن کو ماند کرتا تھا حالانکہ پورن کی اپنی کہانی بھی نیکی اور بدی کے درمیان معرکے کی ایسی دلیرانہ داستان ہے جو المیے اور کامرانی سے بھرپور ہے لیکن رسالو کی عہد ساز شخصیت اپنے زندہ جاوید کارناموں اور اپنی جرات' اپنی بے خوفی اور اپنی شجاعت' اپنی سحر انگیزی اور اپنی حوصلہ مندی کی بدولت دیومالائی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ دونوں بھائیوں کی یہ داستانیں آپس میں گندھ کر وادی سندھ کی ثقافت کا اصل روپ سامنے لاتی ہیں جو بصورت دیگر اس خطے کی سیاسی اور ثقافتی تاریخ کے طالب علم کی نظر سے شاید اوجھل رہتا۔

راجہ رسالو کس عہد میں ہوا' اس کا صحیح تعین مشکل تو ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں اگرچہ کوئی باضابطہ تاریخی حوالہ' سکہ' مجسمہ یا قدیمی آثار ایسے باقی نہیں جن سے کوئی سراغ ملے البتہ سیالکوٹ اور کالووال کے درمیان ایک کنواں ابھی تک پورن کے سحر کا مظہر بتایا جاتا ہے۔ بانجھ عورتیں آج بھی اس کنویں کی منڈیر پر گود ہری ہونے کی دعا مانگنے آتی ہیں اور کہا بھی یہی جاتا ہے کہ ان کی مراد پوری ہوتی ہے اور ان کے ہاں اولاد نرینہ پیدا ہوتی ہے۔

رسالو ' سیالکوٹ کا جاٹ راجا تھا اور سیالکوٹ اس زمانے میں سیال قبیلے کا مضبوط گڑھ تھا۔ راجہ کے عہد کا صحیح تعین مشکل ہے لیکن چند حقائق ایسے ہیں جن کے بارے میں کوئی اختلاف رائے نہیں۔

رسالو اور پورن کے بارے میں لکھی گئی رزمیہ نظموں میں لوہے کے آلات اور ہتھیاروں کا ذکر

کثرت سے ملتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان دنوں وادی سندھ میں اس دھات کا استعمال عام تھا۔

وادی سندھ میں لوہا اگرچہ آریاؤں نے متعارف کرایا تھا لیکن عام آدمی کی پہنچ میں یہ اشوک اعظم اور بعد از اں اشوک دور میں ہی آیا۔ بہار سے لوہے کے وسیع ذخائر کی دستیابی نے موریا سلطنت کو وسعت دی۔ اس کے بعد 'اور لوہے کے ہتھیاروں سے لیس برصغیر میں وہ جہاں کہیں بھی پہنچے لوہا ان کے ساتھ گیا۔ بہار کے ذخائر کو استعمال میں لائے جانے سے قبل لوہے کی رسد بہت محدود تھی اور یہ رؤسا کی دھات شمار ہوتا تھا جب کہ مقبول عام داستانوں کے حوالے بتاتے ہیں کہ رسالو کے دور میں لوہے کا استعمال عام ہو چکا تھا گویا رسالو کی داستان موریا عہد کے بعد کا قصہ ہے۔

اور یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ قبل از اسلام کا واقعہ ہے کیونکہ اس داستان میں اسلام کا کہیں کوئی حوالہ موجود نہیں اور نہ ہی اسلام سے متعلق کسی نظریئے یا کسی شے کا حوالہ ہے۔ صوفیا کرام یا اسلامی روایات سے منسلک کسی ہیرو کا بھی کوئی ذکر نہیں۔ اس داستان میں مظاہر پرستی کی بہتات نظر آتی ہے۔ پھر عام آدمی سے لے کر شہزادے اور شہزادیوں اور رسالو کے حوالے سے جن افراد کا بھی ذکر آتا ہے ان سب کے نام قبل از اسلام دور کے ہیں۔ اس حوالے سے بھی رسالو کے دور کا زیادہ صحت کے ساتھ تعین کیا جا سکتا ہے۔

اس کہانی میں جلاوطن شہزادہ جب مجبوراً اپنا گھر بار چھوڑ کر رخت سفر باندھتا ہے تو دو نوجوان لڑکے بھی اس کے ہمرکاب ہیں۔ ان میں سے ایک سنار کا بیٹا ہے اور دوسرا بڑھئی کا۔ یہ رفاقت واضح کرتی ہے کہ اس وقت کا معاشرہ خاصی حد تک انسانی مساوات کا پاسدار تھا گویا وادی سندھ ابھی جاگیردارانہ چنگل کی اسیر نہیں ہوئی تھی۔ اس نظام کو فروغ دینے والی گپتا سلطنت کو تو چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی میں کہیں جا کر اپنے اثرات مرتب کرنا تھے کیونکہ اس کے بعد وادی سندھ کا قبائلی سماج ' جاگیردارانہ معاشرے میں تبدیل ہوا۔

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو راجہ رسالو کا دور قطعی طور پر موریا عہد کے بعد لیکن قبل از اسلام بلکہ وادی سندھ میں جاگیردارانہ معاشرے کے قیام سے بھی پہلے کا زمانہ بنتا ہے جو سن عیسوی کی ابتدائی صدیوں یعنی 200 تا400 صدی عیسوی کے لگ بھگ شمار کیا جا سکتا ہے۔

راجہ رسالو کا جنم

رسالو کی داستان 'محبت اور مہم جوئی سے بھرپور ایک دلکش طلسماتی کہانی ہے۔ وہ راجہ سلیبوان کے بیٹوں میں سے دوسرا اور راجہ کی دوسری اور حسین ترین بیوی لونا کے بطن سے تھا۔

رسالو نے خونچکاں واقعات اور شدید رقابتوں کی بدشگونیوں میں جنم لیا۔ خوبصورت اور ہوس سے مغلوب رانی لونا جو ابھی تک بے اولاد تھی اپنے سوتیلے بیٹے پورن سے ناجائز التفات کی خواہاں ہو گئی لیکن نیک طینت پورن نے اسے دھتکار دیا۔ اپنے حسن کی اس توہین پر رانی بے حد برافروختہ ہوئی۔ پورن کی بے اعتنائی سے برہم ہو کر اس نے مکروفریب سے راجہ کو یقین دلا دیا کہ پورن نے اسے ناجائز تعلقات پر مجبور کیا تھا۔ یہ الزام پورن کی ذلت ورسوائی کے لئے بہت تھا۔ راجہ نے طیش میں آکر اپنے بیٹے کے قتل کا حکم جاری کر دیا۔ جلاد اسے قتل گاہ کی طرف لے کر چلے لیکن اس جوان رعنا کو موت کے گھاٹ اتارنے پر ان کے دل آمادہ نہ ہوئے۔ راجہ کے حکم پر عمل کرنے کے بجائے رحمدل غلاموں نے شہزادے کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر اسے ایک اندھے کنویں میں پھینک دیا۔ وہ ایک خوبصورت اور پاکباز شہزادے کو قتل تو نہیں کر سکتے تھے۔

پورن اس اندھے کنویں میں بارہ برس تک قید رہا جہاں پرندوں اور چرندوں نے اس کی خبر گیری کی پھر ایک روز کسی بھگت کا وہاں سے گزر ہوا۔ جس نے پانی لینے کے لئے کنویں میں ڈول ڈالا تو پورن اس کے ساتھ لٹک گیا۔ بھگت نے اسے باہر نکالا اور اپنی مافوق الفطرت قوت سے نہ صرف پورن کے بریدہ اعضا بحال کر دیئے بلکہ اپنی شکتی اسے بھی ودیعت کر دی۔

کہتے ہیں پورن کی غیر حاضری میں بارہ سال تک نہ تو سیالکوٹ کے درختوں کو پھل لگا نہ کبھی پرندے چہچہائے اور نہ گایوں نے دودھ دیا۔ رانی لونا جسے رسالو کی ماں ہونا تھا' اس دوران وہ بھی اولاد نہ ہونے کے عذاب کا شکار رہی۔

پورن کہ اب خود بھی بھگت ہو چکا تھا۔ سیالکوٹ واپس آیا اور اپنے راجہ باپ کے باغ میں ستانے کو رکا۔ پورن کا باغ میں قدم رکھنا تھا کہ سوکھے درخت ہرے ہو گئے' پرندوں کے نغمے لوٹ آئے اور گایوں کے تھنوں میں دودھ اتر آیا۔ راجہ اور اسکی رانیاں اور سیالکوٹ کے لوگ ششدر رہ گئے۔ پرندوں اور چرندوں کے انبوہ کے پیچھے پیچھے راجہ اپنے خاندان کے ہمراہ اپنے ہی باغ میں داخل ہوا تو وہاں ایک سحر انگیز بھگت کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ فوری طور پر پورن کو اس کی اصل ماں کے سوا کوئی نہ پہچان سکا لیکن پہچاننے کے باوجود وہ اس خوف سے چپ رہی کہ راجہ اپنی حکم عدولی پر کہیں دوبارہ پورن کے قتل کا حکم صادر نہ کر دے۔

سوتیلی ماں رانی لونا نے پورن کی شکتی سے متاثر ہو کر اس سے اولاد کی التجا کی۔ پورن نے وعدہ کر لیا اور رانی کو ایک چاول کا دانہ کھانے کو دیا لیکن اس کے ساتھ ایک شرط بھی عائد کر دی کہ رانی کے ہاں بیٹا ہو گا لیکن ماں باپ میں سے کوئی بھی اسے بارہ سال تک دیکھے گا نہیں۔ اگر ان میں سے کسی نے بھی اس

شرط کی خلاف ورزی کی تو وہ تینوں فی الفور ہلاک ہو جائیں گے۔

ان سب کو آشیرباد دے کر، پورن غیر محسوس انداز میں اپنی سگی ماں کی دعائیں سمیٹتے ہوئے وہاں سے روانہ ہوا اور دور کہیں افق میں جا کر ایسا گم ہوا کہ پھر کبھی پلٹ کر نہ آیا۔

راجہ رسالو کی داستان

پیدائش کے بعد بارہ سال تک رسالو کو اپنے قریب لیکن نگاہوں سے دور رکھنے کے لئے راجہ نے ایک زیرزمین محل خاص طور پر اس کے لئے ہوایا۔ جہاں رسالو کو ہر طرح کا آرام و آسائش حاصل تھا، خدمت کے لئے نوکر چاکر تھے اور اس کے دونوں افسانوی ہم نشیں گھوڑا اور طوطا بھی اس کے ساتھ تھے، جن کے نام بالترتیب 'فولادی' اور 'شادی' تھے۔

زور آور شہزادے نے قد کاٹھ نکالا تو اسے یوں مسلسل قید میں رکھنا ممکن نہ رہا اور وہ بارہ سال کی مقررہ مدت سے چھ مہینے پہلے ہی زبردستی محل سے باہر نکل آیا اور ضد کرنے لگا کہ اسے اپنے باپ سے ملوایا جائے۔ ظاہر ہے اس کی یہ خواہش پوری نہیں کی جا سکتی تھی۔

ضد میں وہ اپنے علاقے کی عورتوں کو تنگ کرنے پر اتر آیا۔ لڑکیاں جب ندی سے مٹی کے گھڑوں میں پانی بھر کے لوٹتیں تو شہزادہ غلیل سے نشانہ لے کر ان کے گھڑے پھوڑ دیتا۔ راجہ نے تنگ آکر ہر گھر کو دھات کے برتن مہیا کر دیئے رسالو باز آنے والا کب تھا اس نے اپنے تیروں پر لوہے کی انی چڑھائی اور اس کا نشانہ بلا کا تھا، تھوڑے دنوں میں ہر دھات کے برتن میں سوراخ ہو چکا تھا جس سے دوسری دھاتوں کے مقابلے میں لوہے کی برتری بھی ثابت ہوتی ہے۔

اب تو دو ہی راستے باقی رہ گئے تھے۔ شہزادہ اپنی حرکتوں سے باز آجائے یا پھر شہری پانی کو ترسیں۔ رسالو کی شرط وہی تھی کہ اگر اسے اپنے باپ سے ملا دیا جائے تو وہ لوگوں کو ہراساں کرنا چھوڑ دے گا۔ لیکن پورن بھگت نے کہا تھا کہ بارہ سال سے پہلے ماں باپ میں سے کسی کی نظر بھی رسالو پر پڑی تو اس کا انجام تینوں کی موت کی صورت میں نکل سکتا ہے۔ اس لئے رسالو کی ضد نہیں مانی جا سکتی تھی۔ راجہ کے پاس اس کے سوا اب کوئی راستہ نہیں رہا تھا کہ وہ ضدی بیٹے کو اپنی سلطنت سے باہر نکال دینے کا حکم صادر کرتا اور یہیں رسالو کی مہم جوئی کا آغاز ہوتا ہے۔

رسالو نے اس دمج سے ویرانوں کی راہ لی کہ اس کے ایک ایک تیر کا وزن سو پونڈ تھا۔ اس کے کندھے پر شادی (طوطا) تھا اور وہ خود فولادی (گھوڑے) پر سوار تھا۔ وہ دیس دیس گھوما۔ کہیں عفریتوں کو زیر کیا اور کہیں دوشیزاؤں سے شادیاں رچائیں۔ کہیں جھارتوں کو سلجھایا اور کہیں

ناانصافیوں کو نابود کیا۔ قبائلی آویزشوں کو ختم کراتے اور نفرت کی آگ بجھاتے بجھاتے نوجوان راجہ رسالو قرون وسطیٰ کے پنجاب کا مقبول ترین لوک ہیرو بن گیا۔

رسالو کی لوک داستان کے مطابق ایک بار وہ جب نیلا پہنچا (یہ اٹک کے جنوب میں وہی جگہ ہے جسے آج کل باغ نیلاب کہا جاتا ہے) تو وہاں اسے ایک بوڑھی عورت نظر آئی جو آٹا گوندھتے ہوئے بیک وقت روتی اور ہنستی جاتی تھی (وادی سندھ کی لوک داستانوں میں یہ حرکت عورتوں سے اکثر منسوب کی جاتی ہے) بوڑھی عورت ہنستی اس لئے تھی کہ اس کا بیٹا بستی کا سب سے خوب رو جوان تھا اور روتی اس لئے تھی کہ اسی رات اس کے بیٹے کو ایک بد روح کے بھینٹ چڑھایا جانا تھا۔ رسالو کو جب پتہ چلا کہ بوڑھی عورت کے سات میں سے چھ بیٹوں کو اس سے پہلے بد روحوں کے بھینٹ چڑھایا جا چکا تھا اور آج ساتویں کی باری تھی تو رسالو سے رہا نہ گیا اور اس نے بوڑھی عورت کے بیٹے کی جگہ خود کو قربانی کے لئے پیش کر دیا۔

بھینٹ کے لئے رات کا وقت مقرر تھا' لیکن انتظار رسالو کی سرشت میں نہیں تھا۔ وہ اسی وقت اٹھا اور قربانی کی شرط کے مطابق ایک بھینس اور روٹیوں کا ٹوکرا لے کر بد روحوں کے علاقے میں جا گھسا۔ وہاں تو جیسے خوف و ہراس پھیل گیا کیونکہ بد روحوں کے علم میں تھا کہ جس روز ناقابل شکست رسالو اپنے گھوڑے پر سوار بھینس اور روٹی کے ٹوکرے کے ساتھ ان کے علاقے میں داخل ہو گا تو وہ ان کی بربادی کا آخری دن ہو گا۔ اس کے باوجود جب ان میں سے کچھ نے رسالو کی شناخت کے بارے میں شک کا اظہار کیا تو رسالو نے اپنی کچھ اور نشانیاں ظاہر کیں۔ پہلے تو اس نے اوپر تلے رکھے ہوئے لوہے کے سات بھاری تھال اپنے تیر کے ایک وار سے چھید ڈالے اور پھر اس نے ایک رسہ پھینکا جس نے تمام بد روحوں کو خود بخود جکڑ لیا اور پھر اس کی تلوار نے بھی از خود ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ بستی کے لوگ ابھی نجات کا جشن منانے میں مصروف ہی تھے کہ رسالو فولادی پر سوار شادی کو کندھے پر بٹھائے اپنے اگلے پڑاؤ کی طرف نکل کھڑا ہوا۔

رسالو کا پنجاب

بعد ازاں کئے گئے ترمیم و اضافے کے باوجود' داستان رسالو کی مہمات سے ہمیں اس عہد کے پنجاب کے بارے میں بہت سی باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ یہ دور' شمال سے مسلمانوں کی پنجاب میں آمد سے کوئی ایک ہزار سال پہلے کا ہے۔

اس داستان سے جو بہت سے نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں' دوسرے کئی شواہد سے بھی ان کی تصدیق ہوتی ہے۔ ٹیکسلا کے کھنڈرات سے ملنے والی کلہاڑیاں' درانتیاں اور بیلچے جن کا اس داستان اور اس سے پہلے کے زمانے سے تعلق ہے یہ ثابت کرتے ہیں کہ قرون وسطیٰ میں بھی زراعت کے نسبتاً جدید اور بہتر

طریقے متعارف ہو چکے تھے۔ ان آلات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس دور' میں پنجاب میں بھی عمدہ قسم کے لوہے کے استعمال کا آغاز ہو چکا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ سیالکوٹ کے نوجوان راجہ کو وراثت سے زیادہ اپنی اہلیت پر تکیہ کرنا پڑا تھا اور یہ بات اس حقیقت کی نشاندہی کرتی ہے کہ اس دور میں پنجاب اور سندھ کے اکثر علاقوں میں جمہوریاؤں کا نظام رائج تھا۔ بادشاہتوں میں بھی جمہوری روایات کی پاسداری کی جاتی تھی۔ بادشاہ کا اختیار نہ تو مطلق ہوتا تھا اور نہ شخصی۔ وادی سندھ کی یہی روایت تھی اور یقیناً پاکستانی ثقافتی روایت بھی یہی ہونا چاہیئے۔

رسالو کے باپ نے جب بیٹے کو جلاوطن کر دیا تو وہ اپنے محبوب گھوڑے کی پشت پر سوار بہت سے علاقے گھوما پھرا۔ اس دوران بہت سے راجوں مہاراجوں سے اس کا واسطہ پڑا جن میں ہودی اور ہری چند بھی شامل تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وادی سندھ اس زمانے میں ٹوٹ پھوٹ اور انتشار کے عمل سے دوچار تھی۔ جس میں بہت ساری چھوٹی بڑی ریاستیں تھیں اور کسی ایک وسیع شاہی سلطنت کا وجود نہ تھا۔

داستان رسالو میں حسن پرست رانی لونا اور دوسری خوبصورت شہزادیوں کو کلاں' سوکھنی' سندراں اور چاندنی کے دلفریب کردار یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ اس دور کے معاشرے میں عورت کو خاصی اہمیت حاصل تھی اور وہ مرد کی ہمسری کرتی تھی۔ چونکہ اس زمانے میں چھوٹی چھوٹی خودمختار ریاستیں عام تھیں لہٰذا شہزادیوں کی بھی بہتات تھی ان میں سے اکثر اپنے شوہر کے انتخاب میں آزاد تھیں۔ مرد عورت کا میل جول آزادانہ اور برابری کی سطح پر تھا۔ وہ متین اور حیادار تو تھیں لیکن ناروا پابندیوں سے بہر حال آزاد تھیں۔

آزاد منش شہزادے رسالو پر نچلے طبقوں کی حسین دوشیزائیں بھی فدا تھیں۔ ایک بار جب کچھ لڑکیوں نے اس سے باری باری جھولا جھلانے کی فرمائش کی تو کہتے ہیں اس نے وہاں موجود ستر کی ستر لڑکیوں کو اکٹھے اور ایک ساتھ جھولا جھلا دیا اور یہ حیرانی کی بات نہیں کہ بھگت بننے کے بعد جب پورن نے رسالو کی ماں رانی لونا کو بیٹے کی نوید دی تو اس نے یہ پیش گوئی بھی کر دی تھی کہ :

پیدا رسالو ہوویگا تے چھلیا اس دا ناں
تن سو سٹھ چھلسی تے نال نہ کسے سنگ

رسالو پیدا ہوگا اور وہ ہرجائی مشہور ہوگا۔ وہ تین سو ساٹھ (لڑکیوں) کو دھوکا دے گا اور ان میں سے کسی کا بھی ہو کر نہیں رہے گا۔

8

جاگیرداری کا آغاز اور پہلی جاگیردارانہ ریاست کا قیام

گپت میراث

جاگیرداری نظام ابتدا میں تو ایک ہمہ گیر اور وسیع تر سلطنت کے قیام کی راہ میں رکاوٹ بنا رہا کیونکہ چھوٹی چھوٹی جاگیرداریاں باہمی چپقلش اور رقابت کے ہاتھوں تباہ ہوتی رہیں اور قبل از گپتا دور میں سیاسی ہنگامہ آرائی کی بنیادی وجہ بھی یہی تھی۔ یہ وہی زمانہ تھا جب جاگیردارانہ پیداواری رشتوں کا ابھی آغاز ہوا تھا۔

چندر گپت اول کی گپتا سلطنت 320 عیسوی میں قائم ہوئی۔ اس سلطنت کا قیام جاگیرداری نظام کے فروغ اور تاجر طبقے کے مفادات کے لئے نیک فال ثابت ہوا۔ گپتا راج نے ہندوستان کے ٹوٹ پھوٹ سے دوچار منقسم معاشرے کو متحد کرنے میں بھی بہت مدد دی اسی لئے گپتا عہد کو ہندوستان کا سنہرا دور قرار دیا جاتا ہے۔ اس سلطنت کا دارالخلافہ بھی اگرچہ بہت دور مشرق کی موریائی ریاست مگدھ میں تھا۔ لیکن وادی سندھ جیسے دور دراز علاقے میں بھی معاشی اور معاشرتی تبدیلیوں، خاص طور پر جاگیرداری نظام کے فروغ کے حوالے سے گپتا سلطنت نے گہرے اثرات مرتب کئے۔

گپتا عہد کے ہندوستان میں جاگیرداری نظام کے وہ مخصوص خدوخال نمایاں ہونا شروع ہوئے جو قرون وسطی کے یورپی جاگیرداری نظام کے مقابلے میں کئی لحاظ سے مختلف تھے۔ گپت جاگیرداری نظام

کا نمایاں پہلو یہ تھا کہ اس میں زیادہ تر رقبہ جاگیرداروں کی بجائے براہ راست سرکار کی ملکیت میں تھا اور ریاست ہی دراصل سب سے بڑی جاگیردار تھی۔ دوسرا بنیادی فرق یہ تھا کہ یہاں عام طور پر نہ تو زمین اور نہ ہی منصب وراثتاً منتقل ہوتے تھے اس بناء پر عام آدمی کے لئے بھی اپنی اہلیت کے بل بوتے پر فوجی افسر یا سیاسی مشیر جیسے اعلیٰ عہدوں تک پہنچنا ممکن تھا۔ اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جاگیردار کو چونکہ یہ تحفظ حاصل نہیں تھا کہ اس کی جاگیر اور اس کا منصب اگلی نسل کو منتقل ہو سکتا ہے اس لئے بچت کی حوصلہ شکنی اور اشیائے صرف میں اضافے کے رجحان کو تقویت ملی۔ بچت کی آخر کار ضرورت ہی کیا تھی جب آپ کی اولاد اس کا فائدہ ہی نہیں اٹھا سکتی تھی؟ بعد کے حالات میں یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں رہتا کہ اس طرز عمل نے تمام برصغیر اور یہاں بسنے والوں کے مستقبل پر کیسے تباہ کن اثرات مرتب کئے۔

گپت جاگیرداری اگر یورپ سے مختلف تھی تو اس کے بعض پہلو اس سے مماثل بھی تھے۔ دونوں طرف معیشت کا انحصار کسان کی جسمانی مشقت پر تھا اس کی زائد پیداوار ایک جابرانہ نظام کے تحت حاصل کی جاتی جس کا جواز رائج الوقت سماجی نظام اور مذہبی ضابطوں کے ذریعے فراہم کیا جاتا تھا۔ زرعی طریقہ پیداوار کے متعارف ہونے کے ساتھ یہ ہوا کہ غلام داری سماج کا وادی سندھ میں بھی خاتمہ ہو گیا۔

جاگیردارانہ نظام سے قبل ٹکڑوں میں بٹی ہوئی وادی سندھ نے گپتا سلطنت کے توسیع پسندانہ عزائم کی مزاحمت کی اور یہ خطہ کبھی اس سلطنت کا اٹوٹ انگ نہیں بنایا جا سکا لیکن گپتا فرمانروائی کو تسلیم کر کے خراج یقیناً ادا کیا گیا۔

گپتا سلطنت کو گلڈ اور خود مختار دیہات سے جو ٹیکس حاصل ہوتے تھے ان کی بناء پر ریاست مالی اعتبار سے اس قابل ہو گئی کہ وہ آس پاس کی ریاستوں اور فرمانروائیوں پر قبضہ جما سکے یا انہیں مطیع بنا سکے۔ اگرچہ وادی سندھ میں جاگیرداری نظام کا آغاز بھی گپتا اثرات کے نتیجے میں ہوا تھا لیکن اس کے باوجود یہ سلطنت کبھی اس قابل نہ ہو سکی کہ وسطی ایشیا کے ہن قبائل کو وادی سندھ سے دور رکھنے کے لئے کسی مستقل فوجی مہم کا اہتمام کرتی۔

مالیہ کے نظام میں تبدیلی

پچاس سال کی قلیل مدت میں یعنی 500 سے 550 عیسوی کے درمیان ہن وادی سندھ تک پہنچ گئے۔ اس دوران انہوں نے اس خطے کو بے حد جانی اور مالی نقصان پہنچایا۔ خاص طور پر ہن سردار مہر گل

تو انتہائی ظالم فاتح تھا۔ ٹیکسلا کے نزدیک کھدائی کے دوران جو بے شمار انسانی ڈھانچے برآمد ہوئے وہ اسی ظالم ہن کی بربریت کا شکار ہوئے تھے۔ اس کے بہت سے غارت گر مشغلوں میں سے ایک ہاتھیوں کو ڈھلوانوں سے لڑھکا کے ان کی اذیت ناک موت کا تماشا دیکھنا تھا۔

گپتا حاکمیت بتدریج سکڑتے ہوئے اب وادی سندھ سے نکل کر ستلج کے جنوب تک محدود ہو چکی تھی۔ دوسری طرف باختر ریاستوں میں بدامنی کے باعث ہن ہر گزرتے ہوئے دن کے ساتھ اپنے داخلی مسائل کا شکار ہوتے چلے جا رہے تھے اور وادی سندھ پر ان کی گرفت ڈھیلی پڑنا شروع ہو گئی تھی۔

ہن جب وادی سندھ میں آئے تو اپنے ساتھ راجپوت، جاٹ اور گوجر قبائل کو بھی لائے ان کے بہت سے ذیلی قبائل، سیستانی حملہ آوروں کے ساتھ پہلے ہی یہاں پہنچ چکے تھے۔ عام طور پر خیال یہی کیا جاتا ہے کہ شمال مغربی سرحدی صوبے میں پٹھانوں کے نام کا مقبول ترین لاحقہ 'گل' بھی ہن قبائل سے لیا گیا تھا اسی طرح ہن عورتوں نے یہاں ڈھیلے ڈھالے پاجامے یعنی غرارے کی ابتدائی شکل کو رواج دیا۔

اپنی خاصیت کے عین مطابق وادی سندھ نے کبھی حملہ آوروں کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ جیسا کہ پہلے ہوتا رہا ہن قبائل کے حملوں نے بھی وادی سندھ میں نئے اتحادوں کو جنم دیا۔ کھشتری اور ویش اتحاد ہن قبائل کو وادی سندھ سے نکال باہر کرنے پر کمربستہ ہوا اور بالآخر ہن بالادستی کو ختم کرنے میں کامیاب رہا اور اس کی جگہ شمالی اور وسطی ہندوستان میں پشیابھتی خاندان کی وساطت سے ہندو ریاست کا قیام عمل میں آیا۔ یہ ریاست مستقبل کے تمام بیرونی حملہ آوروں کے خلاف مزاحمت کا ہراول دستہ ثابت ہوئی۔ اس کام میں پشیابھتی خاندان کو تاجروں اور حال ہی میں ابھر کر سامنے آنے والے جاگیرداروں کی مکمل حمایت حاصل تھی کیونکہ امن اور محفوظ سرحدوں کی ضرورت دونوں کو تھی۔

پشیابھتی خانوادے کا سب سے نمایاں اور بے مثل حکمران ہرش وردھن تھا جو 606 سے 648 عیسوی کے درمیان حکمران رہا۔ ہرش جب تخت پر بیٹھا تو اس کی عمر صرف 16 سال تھی۔ اس نے قنوج کو اپنی راجدھانی بنایا لیکن وہ اکثر و بیشتر مملکت کے دور دراز کے علاقوں کے سفر پر نکلا رہتا۔

لیکن راجہ ہرش کی ناکامی یہ رہی کہ اپنی ریاست کو مضبوط کرنے کے لئے وہ زیادہ لگان وصول نہیں کر سکا کیونکہ گاؤں اور ذات پات کا نظام' دونوں بے لچک ہو چکے تھے جس سے پیداواری قوتوں کی کارکردگی کو ضعف پہنچا تھا۔ گپتا اور ہرش دونوں کے پاس موریا جیسی منظم انتظامیہ نہیں تھی اور نہ ہی ان کی ریاستیں' موریا سلطنت کی طرح وسیع و عریض تھیں۔ یہ تو ایک مرکزی ریاستی ڈھانچے پر مشتمل بادشاہت تھی جس کے گرد بہت سی باج گزار ریاستیں ہوتی تھیں اور جنہیں داخلی معاملات میں خاصی

خود مختاری حاصل ہوتی تھی۔

ان عوامل کے پیش نظر لگان کی وصولی کے نظام میں تبدیلیاں لائی گئیں۔ تنخواہ دار افسروں کی جگہ ریاست سے انعام میں زمین حاصل کرنے والے ٹیکس وصول کرنے لگے جو ریاست کو ایک مقررہ میعاد میں مقررہ رقم لگان کی صورت میں ادا کرتے تھے اور اس کے عوض انہیں کسان سے اس کی فاضل پیداوار ہتھیانے کا حق حاصل تھا۔ اس طرح انہیں کچھ ریاستی امور تفویض ہوئے اور جاگیرداروں کے اختیارات میں اضافہ ہوا۔ اگرچہ اب بھی ان کو جاگیریں اپنی وراثت میں چھوڑنے کا حق حاصل نہ تھا مگر اس تاریخی عمل سے ریاست کی گرفت کمزور ہوتی گئی اور وادی سندھ ایک مرتبہ پھر بہت سی خود مختار ریاستوں کی صورت میں وادی گنگا سے علیحدہ ہوگئی۔

جاگیرداری۔ برہمنیت کے لئے باعث تقویت

ہرش وردھن اور محمود غزنوی کے دور حکومت کے درمیانی (648 تا1000 عیسوی) ساڑھے تین سو برسوں کے دوران وادی سندھ چھوٹی چھوٹی ریاستوں اور فرمانروائیوں میں منقسم رہی۔ صدیوں پر محیط یہ طویل دورانیہ' عظیم سلطنتوں کے درمیان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے وجود میں آنے کا وقفہ تھا۔ جب بڑی سلطنتوں پر زوال آتا تھا تو وہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر لاتعداد چھوٹی چھوٹی جمہوریاؤں اور بادشاہتوں میں تقسیم ہونے لگتی تھیں۔ وادی سندھ ایک بار پھر اسی صورت حال سے دوچار تھی۔ وادی سندھ کے جنوب میں صوبہ سندھ کے علاقے میں صرف ریاست سندھ قابل ذکر ہے جبکہ وادی سندھ سے ملحق صرف ایک اور قابل ذکر بڑی ریاست پرتی ہاروں کی ریاست تھی جس کا دارالحکومت قنوج تھا۔

ہندو برہمن اور کھشتری کے لئے تجارت جیسے کم تر پیشے کو اپنانے کی اجازت نہیں تھی۔ ویش نے تجارت کو اپنایا لیکن جیسا کہ ہم کسی گزشتہ باب میں جائزہ لے چکے ہیں۔ برہمن پیشواؤں نے اپنی بالادستی قائم رکھنے کے لئے بہت ہی سخت تاجر مخالف ضابطے لاگو کر دیئے تھے لہٰذا ایک وقت ایسا بھی آیا جب تاجر کو خواہ کچھ عرصے کے لئے سہی مجبوراً بدھ مت اختیار کرنا پڑا اور اس کی سرپرستی بھی کرنا پڑی۔

ابتدا میں تو قریہ قریہ گھومنے والے تاجر کو بدھ مت کے عدم تشدد کا فلسفہ بہت بھلا لگا کیونکہ متحارب قبائل کی بستیوں میں جانا اس کی ضرورت تھی اور بدھ عدم تشدد کی وجہ سے قبائل کے درمیان امن قائم کرنے میں مدد ملی تھی لیکن وسیع منڈیوں تک رسائی' ان کا حصول اور ان پر تسلط قائم رکھنے کے لئے تلوار کی ضرورت تھی۔ اس نئی حقیقت کے سامنے بدھ مت کے ساتھ تاجر کی وفاداری

ناپائیدار ثابت ہوئی۔ تاجر کے نزدیک دولت ہی سب سے بڑی حقیقت تھی اس لئے اس نے نہ صرف جاگیرداری سماج میں ایک کمتر حیثیت قبول کرلی بلکہ وہ جاگیرداری نظام کے بنیادی فلسفے یعنی برہمنیت کی طرف بھی لوٹ گیا۔

جاگیرداری نظام کے عروج نے برہمن کھشتری اتحاد اور برہمنیت کے نظریئے کو بھی قوت بخشی۔ عزت وناموس اور شجاعت کے نام پر آپس کی خونریز جنگوں میں اضافہ ہوا۔ شخصی وقار کے ان معرکوں نے بدھ مت کے عدم تشدد پر کاری ضرب لگائی۔ برہمنیت کی تاریخ تو پہلے ہی دیومالائی لڑائیوں اور کائناتی جنگوں سے بھری پڑی تھی۔ جاگیرداری نظام نے اپنے لئے عزت اور شجاعت کے جو پیمانے وضع کئے' برہمنیت اس کے لئے موزوں ترین نظریہ تھا۔ وادی سندھ کے مشرقی علاقوں میں آباد جاٹ اور راجپوتوں کو بھی یہ نظریہ بہت بھلا لگا۔

گلڈ Guild اور دیہاتوں کا وجود' جسے ذات پات کے نظام نے آپس میں باندھ کر رکھا تھا برہمنیت کو عروج دینے میں بہت سازگار ثابت ہوا۔ لہٰذا اس دور میں بدھ مت اور جین مت کو سرحدی علاقوں کی طرف دھکیل دیا گیا۔ مہاتمابدھ کو البتہ ہندوؤں کے بے شمار دیوتاؤں کے پہلو میں ان کے ایک دیوتا وشنو کے متعدد جنموں میں سے ایک جنم کے اوتار کے طور پر جگہ مل گئی۔ گویا برہمنیت کی طرف سے یہ ہندوستان کے ایک عظیم ترین انسان گوتم سدھارتھ بدھ کا سنگ مزار تھا۔

برہمنیت نے بدھ مت کو ہندوستان سے نکال باہر کر دیا تھا۔ بدھ مت کا وجود اب صرف چند سرحدی علاقوں تک محدود تھا۔ ایسے وقت میں وادی سندھ اپنا آزادانہ تشخص برقرار رکھتے ہوئے بدھ مت کے لئے جائے پناہ ثابت ہوئی۔ آٹھویں صدی عیسوی تک بدھ مت وادی سندھ کے بیشتر علاقوں میں پروان چڑھتا رہا جن میں صوبہ سندھ' مغربی اور جنوبی پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبے کے کچھ علاقے خاص طور پر نمایاں تھے۔

گوتم بدھ کی رواداری اور برداشت وادی سندھ کے مکینوں کے تہذیبی رویوں سے ہم آہنگ تھی جنہوں نے ہمیشہ تعصب سے دامن بچایا تھا۔ یہ اچنبھے کی بات نہیں کہ وادی سندھ میں بدھ مت کی جگہ اگر کسی نظریئے نے لی تو وہ صوفیاء ہی کی تعلیمات تھیں جو مہاتمابدھ کی طرح باطنی سکون اور معاشرتی یگانگت کے پرچارک تھے۔ ان صوفیاء نے سندھ واسیوں کے دل موہ لئے اور اس طرح عدم تشدد کا نظریہ نئے سرے سے مقبول عام ہوا۔ مگر یہ بعد کا قصہ ہے۔

ہندوستان میں اس وقت تو برہمن کشتری اتحاد کو بالادستی حاصل تھی۔ اس اتحاد کے اثرات ہندوستان کی سرحدوں سے رس رس کر وادی سندھ کے مشرقی کناروں تک پہنچ رہے تھے۔ برہمنوں

نے کشتریوں کے اقتدار اعلیٰ کی حمایت میں مختلف جواز گھڑ لئے تھے اور انھیں اس خدمت کا مناسب عوضانہ ملتا تھا۔ جاگیردار اور حکومتی اشرافیہ ان کے مندروں میں قیمتی چڑھاوے چڑھاتے تھے۔ سبھی ہندو مندر ہیرے جواہرات اور سونے چاندی کے قیمتی خزانے تھے۔ سومنات، متھرا، تھانیسر اور قنوج کے مندر بعد میں بت شکن محمود غزنوی کا نشانہ بنے۔

لیکن محمود غزنوی سے پہلے ایک اور جری نوجوان مسلم سپہ سالار نے جنوب کی طرف سے وادی سندھ میں پیش قدمی کرتے ہوئے صوبہ سندھ کی سرزمین پر اپنے گہرے اور انمٹ نقوش چھوڑے۔

9

ایک عرب فاتح کی آمد

عرب عسکری مہمات

جس زمانے میں وادیٔ سندھ کے بیشتر حصے پر راجہ ہرش وردھن کی حکومت تھی ' جزیرہ نما سعودی عرب اسلام کے حیات افروز پیغام سے بہرہ ور ہو رہا تھا۔

زمانہ قبل از تاریخ کا عرب قبائلی نظام ابھی حال ہی میں لوہے ' مستقل زراعت اور خاندان کی اکائی سے متعارف ہوا تھا۔ اسلام نے ان تبدیلیوں کو ایک انقلابی فلسفہ دیا۔ اس نے صحرائی بدوؤں میں ایک نئی روح پھونک کر انہیں ایک ایسی قوت بنا دیا جو اسلام کے سادہ و سنجیدہ پیغام کو لے کر مغربی افریقہ اور انڈونیشیا جیسی دور دراز مختلف النوع سرزمینوں تک جا پہنچے۔ عرب افواج نے مغرب کا رخ کیا اور عرب تاجروں نے اپنے جہازوں کے بادبان مشرق کی جانب کھول دیئے۔

اس بارے میں تو ہمیں پہلے ہی اندازہ ہو چکا ہے کہ گہرے سمندر کا آبی راستہ جو عرب ملاح بھروچ (ممبئی) کی بندرگاہ تک آنے جانے کے لئے استعمال کرتے تھے وہ دریائے سندھ کے دہانے یا اس کی قریبی ساحلوں سے ہو کر نہیں گزرتا تھا اور یوں بھی دریائے سندھ کا ڈیلٹا جہاز رانی کے قابل نہیں تھا۔ البیرونی نے دریائے سندھ کی ڈیلٹائی شاخوں کے بارے میں رائے دیتے ہوئے کہا تھا کہ ''یہ کھاڑیاں بحری جہازوں کے لئے خطرناک ہیں کیونکہ ان کا میٹھا پانی کھارے پانی کی طرح بھاری اجسام کا متحمل نہیں ہو سکتا۔''

لہٰذا سندھ کی ساحلی ریاست کی رسائی عرب تاجروں کے حت آور سمندری راستے تک نہیں تھی

لیکن جب تک خشکی کے وسطی ایشیائی راستے دستیاب تھے ' بالائی ساحلی ریاستیں دریائے سندھ کو بنیادی تجارتی راستے کے طور پر استعمال نہیں کرتی تھیں کیونکہ زمینی راستے معروف بھی تھے اور محفوظ بھی۔ بلوچستان میں پیراک کے مقام پر آثار قدیمہ کی کھدائی کے دوران 1968 سے 1974ء کے عرصے میں جو ظروف برآمد ہوئے وہ میسوپوٹیمیا (عراق) کی تہذیب کی نمائندگی کرتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قدیم دور میں بھی درۂ بولان ایک اہم زمینی تجارتی راستہ تھا۔

خشکی کے راستوں سے تجارتی سامان لانے ' لے جانے والے ' آڑھتیوں اور اس تجارت سے منسلک دوسرے لوگوں کو جو پرکشش مالی فوائد حاصل تھے ' سندھ اور مکران کے ساحلوں پر بسنے والے جہازران اس سے محروم ہونے کے باعث بحری قزاقی پر اتر آئے تھے۔ یہ انتقامی کارروائی کی کھلی دعوت تھی اور بالآخر 711 عیسوی میں ایسا وقت آگیا جب سندھ کے دو اہم ساحلی شہروں دیبل (لاہوری بندر) اور دیبل ٹھٹھہ پر جوابی لشکر کشی کی گئی۔ اس عسکری مہم کی قیادت نوجوان اور حوصلہ مند مسلمان سالار محمد بن قاسم کے سپرد تھی۔

قاسم کا حملہ ' سندھ کو زیر کرنے کی پہلی مسلم کوشش نہیں تھی ' چچ نامہ میں محمد بن قاسم کے حملے اور اس سے پہلے کے کچھ حکمرانوں کا ذکر ملتا ہے جس میں سندھ پر مسلمانوں کی چند پہلی مہمات کا تذکرہ بھی ہے۔ حضرت عمرؓ کے دور میں بحرین کے گورنر اور عرب امیر البحر مغیرہ ابن ابی عاص نے بھی سندھ پر چڑھائی کی۔ فتح کو اپنا مقدر سمجھتے ہوئے گورنر نے خلیفہ سے مشورہ کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔

خلیفہ عثمانؓ نے بھی سندھ پر حملہ کرنے کی تجویز پر غور کیا جسے حاکم بن جبالہ کی رائے کے بعد ترک کر دیا گیا۔ حاکم کو حملے کی کامیابی کے امکانات کا جائزہ لینے بھیجا گیا تھا۔ اس نے اپنے جائزے میں لکھا تھا کہ "سندھ کا پانی کھاری ہے۔ یہاں کے پھل یا تو بے ذائقہ ہیں یا کڑوے۔ علاقہ بنجر چٹانوں سے اٹا پڑا ہے اور زمین تھور کا شکار ہے۔ سندھ کے لوگ بہادر ہیں اگر یہاں مختصر فوج بھیجی گئی تو اسے شکست ہوگی ' بڑی فوج بھوکوں مر جائے گی۔"

مسند خلافت پر براجمان ہونے کے بعد امیر معاویہ نے چار ہزار جوانوں پر مشتمل ایک فوجی دستہ عبداللہ بن سوار عابدی کی قیادت میں روانہ کیا۔ بدقسمت فوج کو بلوچستان کے پہاڑی سلسلوں اور ملتان کے نزدیک پنجاب کے میدانوں میں کئی شکستوں کا سامنا کرنا پڑا۔ معاویہ کی دوسری کوشش بھی کامیابی سے ہمکنار نہ ہوئی اور اس کے دو سالار راشد بن امت اور سنان بن سلمہ ' بدھیا (آج کا جیکب آباد) کے قریب شہید ہوئے۔

جب عراق کے گورنر حجاج بن یوسف نے خلیفہ ولید بن عبدالمالک سے سندھ پر ایک اور حملے کی اجازت چاہی تو اس وقت ساحلی علاقوں کے برعکس بالائی سندھ ایک خوشحال خطہ تھا لہٰذا حجاج نے ضمانت دی کہ خلیفہ کے خزانے سے اس مہم پر جتنی رقم بھی خرچ ہوگی اس سے دوگنی رقم لوٹادی جائے گی۔ چچ نامہ کے مطابق محمد بن قاسم کی مہم جوئی پر چھ کروڑ درہم خرچ ہوئے اور حجاج کی طرف سے کچھ ہی عرصے میں دوگنا رقم سرکاری خزانے میں جمع کرادی گئی اس سے بالائی سندھ کی خوشحالی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

محمد بن قاسم نے 711 عیسوی میں ایک خونریز جنگ کے بعد سندھ فتح کر لیا اور اگلے چار سال میں ملتان تک کا علاقہ مسلمانوں کے زیرِ نگیں آگیا۔ اپنی کمسنی کے باوجود قاسم نے بہت منصفانہ انداز میں حکومت چلائی۔ اسے اپنے چچا حجاج کی راہنمائی حاصل تھی جس نے قاسم کو ہمیشہ اعتدال سے چلنے کا مشورہ دیا تھا۔ ایک خط میں حجاج نے اپنے بھتیجے کو غیر مسلموں کے مذہبی اعتقادات کا احترام کرنے کی تلقین کی تھی حالانکہ اسلام قبول کرنے سے انکار پر انہیں تہ تیغ بھی کیا جاسکتا تھا۔ قاسم کو بہت سے قابل وزیروں کی مشاورت بھی حاصل رہی جن میں ایک ہندو سیاکر بھی شامل تھا جو اس سے پہلے شکست خوردہ راجہ داہر کا مشیر ہوا کرتا تھا۔

خلیفہ ولید بن عبدالمالک کا انتقال 715 عیسوی میں ہوا۔ حجاج کا مرتبہ اور اس کا اثرورسوخ خلیفہ ولید کے حوالے سے تھا۔ خلیفہ کی آنکھ بند ہونے کے بعد حجاج کی گورنری بھی زیادہ دیر نہ چل سکی۔ حجاج کے گورنری سے ہٹائے جانے کے فوری بعد محمد بن قاسم کو بھی واپس بلالیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اسے بیل کی کھال میں سی کر بھیجا گیا لیکن راستے میں ہی اس کا انتقال ہوگیا۔

عرب رابطے

عربوں نے 711 عیسوی میں سندھ فتح کیا۔ اس کے بعد 143 سال تک وادیٔ سندھ کا یہ علاقہ پہلے امیہ اور پھر عباسیوں کی اسلامی ریاست کا حصہ رہا۔ اس دوران زیادہ تر خلفاء محلاتی سازشوں میں الجھے رہے۔ ادھر چونکہ سندھ بھی منافع بخش تجارتی راستوں سے دور ایک خارجی ریاست تھی اس لئے داخلی طور پر اسے کافی خودمختاری حاصل رہی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ عرب حکمرانوں کی منصوبہ بندی میں سندھ کو کبھی کوئی ترجیحی مقام حاصل نہیں رہا۔ پھر ملتان سے محمد بن قاسم کی بے وقت واپسی کے بعد اس خطے میں مزید فتوحات کی طرف کوئی توجہ نہ دی گئی۔ یہاں کی روزمرہ زندگی پر بھی عرب جرنیلوں اور گورنروں کے اثرات نہ ہونے کے برابر تھے۔ ایسے کچھ اثرات اگر کبھی مرتب ہوئے بھی تو وہ دیرپا نہیں

تھے۔

لیکن اس کے باوجود، وادیٔ سندھ کے قبائل میں اپنا شجرۂ نسب عربوں، خاص طور پر پہلے چار خلفاء یعنی خلفائے راشدین میں سے کسی ایک کے ساتھ جوڑنے کا رجحان پایا جاتا تھا اور یہ رجحان محض سیدوں تک ہی محدود نہیں تھا جن کی سماجی حیثیت سے قطع نظر یہ شجرۂ نسب ان کے عالی مرتبت ہونے کی علامت تھا بلکہ پٹھانوں اور بلوچوں کے علاوہ پنجاب کے ارائیں اور اعوان بھی ایسے ہی شجرۂ نسب کے دعویدار ہیں جب کہ تاریخ وادیٔ سندھ کی جانب عربوں کے وسیع پیمانے پر نقل مکانی کے کوئی قابل قبول شواہد فراہم نہیں کرتی اور نہ ہی نسلی اعتبار سے بھی کوئی شہادت اس دعوے کی تصدیق کرتی ہے۔

عرب بنیادی طور پر سامی الاصل ہیں جبکہ وادیٔ سندھ کے قبائل وسطی ایشیائی تھے یا مقامی اور یا دونوں کی ملی جلی نسل۔ یہ ممکن نہیں کہ چند عرب خاندان اپنی تعداد اتنی تیزی سے اور اتنی زیادہ بڑھا لیتے کہ وہ پوری وادیٔ سندھ میں پھیل جاتے۔ لگتا یہی ہے کہ ایسے اکثر دعوے محض فرضی ہیں۔

قلیچ بیگ نے، جنہیں غالباً آج بھی سندھ کا سب سے معتبر تاریخ دان سمجھا جاتا ہے، دعوے اور حقیقت کے درمیان ایسے ہی تضاد کی ایک مثال بیان کرتے ہوئے بیگ نے ایسے اٹھارہ قبائل کی نشاندہی کی ہے جو عربی النسل ہونے کے دعویدار ہیں حالانکہ امیوں اور عباسیوں کے دور میں بہت تھوڑے سے عرب سندھ میں قیام پذیر تھے پھر آج ان کی تعداد متذکرہ اٹھارہ قبائل کی اتنی وسیع آبادی کے برابر کیسے ہو سکتی ہے؟ البتہ کلہوڑے عباسیوں کے ایرانی نژاد میسو پوٹیمیائی ماخذ کا ایک قبیلہ ہیں لیکن اکثر قبائل ایسے واضح سلسلہ نسب سے عاری ہیں۔ قلیچ بیگ نے اسی مفروضے کو آگے بڑھاتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک مخصوص سندھی قبیلے کا نسبی سلسلہ عرب جدامجد سے ملتا ہے لیکن ان کے ہاں بھی تخصیص کے ساتھ اس جدامجد کی نشاندہی نہیں ہو سکی۔ وہ عرب اگر ایک روایت کے مطابق ابن عمر بن ہاشم بن ابولہب تھا تو دوسری روایت اسے ابن عمر بن عکرمہ بن ابوجہل ثابت کرتی تھی جب کہ تیسری روایت کے حوالے سے اس کا سلسلہ نسب ابن عکرمہ بن اسامہ بن ابوجہل سے جا ملتا تھا۔ بعد میں کہیں جا کر قبیلے کے اکارین نے جام کا لقب اختیار کر لیا لہٰذا اس بات کا زیادہ امکان ہے کہ وہ فارس کے بادشاہ جمشید کی نسل سے ہوں یا اس قبیلے کا جدامجد وہی شخص ہو جو تاریخ میں نوح کے بیٹے سام کے نام سے جانا جاتا ہے۔

تو پھر اس صورت حال سے کیا مطلب اخذ کیا جائے، یقینی طور پر تو کچھ بھی نہیں۔ ان سارے حوالوں میں ٹھوس شواہد تو کہیں نہیں۔ اگر سندھ کے کچھ مکین اس امر کے دعویدار ہیں کہ ان کا قبیلہ کسی شاہی سلسلہ نسب سے منسلک ہے تو قرین قیاس یہی ہو سکتا ہے کہ ان کے جدامجد کا تعلق فارس سے ہو کیونکہ وادیٔ سندھ اور ایران کے مابین قریبی سیاسی اور جغرافیائی رابطوں کے باعث صرف یہی شجرۂ

نسب کسی حد تک قابل قبول تاریخی شہادت کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

غالباً یہ محض ایک تاریخی اتفاق نہیں کہ وادیٔ سندھ میں اسلام عربوں کے ذریعے نہیں بلکہ وسطی ایشیائی باشندوں کے ذریعے متعارف ہوا' خاص طور پر سلجوقی ترک' افغانی اور منگول (مغل) صوفیاء اور مہم جو شہزادے یہ کارنامہ انجام دینے میں پیش پیش رہے۔ یہ تاریخ کی حقیقت ہے کہ اس خطے نے عربوں کے ساتھ اپنے روابط کبھی استوار نہیں رکھے۔ اس کے برعکس وادیٔ سندھ کے سیاسی اور ثقافتی روابط ہندوستان سمیت کسی بھی قوم اور ملک کے مقابلے میں وسطی ایشیا اور ایران کے ساتھ زیادہ قریبی اور مسلسل رہے۔

گلہ بان قبائل اور دیہی کنبہ

اس امر کی اور بھی کئی معقول وجوہات موجود ہیں جن کی بناء پر وادیٔ سندھ نے جزیرہ نما سعودی عرب سے اسلامی توضیحات اور عقائد کا براہ راست اثر قبول کرنے کے بجائے ایران اور وسطی ایشیا سے پہنچنے والے اثرات کو زیادہ خوش دلی سے قبول کیا۔

سماجی' اقتصادی اور ثقافتی حوالے سے خانہ بدوش عرب اس خطے یا اس کے گردونواح کی کسی اور نسل یا قوم کے مقابلے میں سندھ واسیوں سے بہت زیادہ مختلف تھے۔ عربوں کا انحصار زراعت پر نہیں تھا۔ سعودی جزیرہ نما کے پیاسے اور ناموافق ریگزاروں میں زراعت کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ لہٰذا عرب بدستور ایک گلہ بان معاشرہ تھا جو اپنے اونٹوں اور بکریوں کے ساتھ 'سبزے کی تلاش میں ایک سے دوسرے نخلستان کی طرف نقل مکانی کرتے رہے اور ہریالی جو ان کی سرزمین پر یقیناً کمیاب تھی اس کے حصول کے لئے آپس میں جنگیں لڑتے رہے۔ اسی بناء پر عربوں کا طرز حیات ہمیشہ اور مکمل طور پر خانہ بدوشانہ ہی رہا۔ جزیرہ نما عرب کی زمینوں یا صحراؤں میں آج تک کہیں سے بھی کوئی قدیم زرعی آلات برآمد نہیں ہوئے۔

خانہ بدوش ہونے کے ساتھ ساتھ عرب معاشرہ ایک پدر سرانہ معاشرہ تھا۔ عورتیں نہ صرف حق وراثت سے محروم تھیں بلکہ اسلام سے قبل لڑکی کی پیدائش کو محض باعث شرم ہی نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ اکثر اوقات اسے پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کر دیا جاتا تھا۔ چونکہ صرف مرد ہی قبیلے کی اندرونی اور بین القبائلی جنگیں لڑنے کے قابل تھے۔ وہ جنگیں جو ریگستان میں نخلستانوں کی تلاش اور ان پر قبضہ جاری رکھنے کے لئے ناگزیر تھیں لہٰذا کسی بھی قبیلے کے لئے مرد ہی اس کا سب سے بڑا سرمایہ تھے۔

صحرا نے سعودی عرب کو زراعت کی سہولت سے مسلسل محروم رکھا اس لئے قبل از اسلام

عربوں میں خاندان کی اکائی اور اس سے منسلک سماجی مدھن پوری طرح پروان نہ چڑھ سکے۔ زراعت کی عدم موجودگی نے قبائلی نظام کو دوام بخشا۔ اس لئے عرب معاشرہ اب تک واضح طور پر ایک خانہ بدوش' پدر سرانہ اور قبائلی طرز حیات پر مبنی معاشرہ ہی تھا جب کہ وادئ سندھ میں صورت حال اس سے قطعی برعکس تھی۔

یہ بات تو ہمارے علم میں ہے کہ وادئ سندھ پر مادر سرانہ نظام کی واضح چھاپ تھی جس کے بہت سے پہلو آج بھی یہاں کی ثقافت کو مالا مال کئے ہوئے ہیں۔ وادئ سندھ کی زرعی بنیاد زمانہ قبل از تاریخ کی موئن جوڈارو تہذیب کے دور سے ہی شہروں کے فروغ کا باعث ہوئی کیونکہ یہاں دیہات کی حیثیت مستقل تھی اور یہ زرعی اجناس کی فاضل پیداوار مہیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے زراعت انسان کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنی زمینوں اور اپنے کھیتوں کے قرب و جوار میں ہی بودوباش اختیار کرے۔ زراعت' گزرے وقتوں کے خانہ بدوشوں کو زمین کے ایک ٹکڑے اور ایک مستقل ٹھکانے سے وابستہ کر دیتی ہے اور یوں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پہلے ایک گھر' پھر ایک بستی' پھر گاؤں اور شہر نمودار ہوتے ہیں۔

چھوٹے چھوٹے گھروں اور مکانوں میں الگ الگ سکونت اختیار کئے ہوئے لوگ آہستہ آہستہ نہ صرف خانہ بدوشی بلکہ قبیلے کو بھی ترک کر دیتے ہیں۔ علیحدہ گھر' قبیلے کو بہت سی خاندانی اکائیوں میں تقسیم کر دیتا ہے اور گھر کے مکین مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے زیادہ قریب اور قبیلے سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ عورت گھرداری میں چولہے پر مکمل قدرت رکھنے کی بناء پر اب تحفظ اور اپنے مرتبے کی شناخت چاہتی ہے۔ اس طرح خاندان کی صورت میں ایک نئی سماجی اکائی جنم لیتی ہے۔ مائل بہ خاندان گھرانوں میں عورت کا مقام پدر سرانہ خانہ بدوش قبائل کی نسبت زیادہ بہتر اور محفوظ ہوتا ہے گویا زراعت کا فروغ خاندان کو جنم دیتا اور قبیلے کے زوال کا باعث بنتا ہے۔

عربوں کے ہاں پیاسے صحرا تھے جن میں زراعت ممکن نہ تھی جبکہ وادئ سندھ کے بہتے دریاؤں کی دھرتی جیسے کبھی زراعت کے بغیر تھی ہی نہیں۔ عرب ابھی تک خانہ بدوش تھے اور سندھ واسی بستیوں میں آباد ہو چکے تھے۔ عربوں میں قبیلہ جب کہ سندھ واسیوں میں خاندان بنیادی سماجی اکائی بن چکا تھا۔ عرب ابھی تک ظالمانہ پدرسری قبائلی نظام کی گرفت میں تھے جب کہ سندھ واسیوں کی تہذیب مادر سرانہ نظام کی نرم خوئی سے معتدل ہو چکی تھی۔

لیکن یہ صورت حال مکمل طور پر جمود کا شکار نہیں تھی اور اسلام کے مقدس پیغام سے پہلے عرب دنیا میں اہم تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔

اسلام کی آمد سے چار' پانچ سو برس پہلے جزیرہ نما عرب میں زرعی معاشرے کے کچھ آثار نمایاں

ہونا شروع ہو گئے تھے۔ مدینہ منورہ کے مضافات میں ایک مختصر اور محدود زرعی علاقہ تھا جہاں کنویں کے ذریعے آب پاشی ہوتی تھی۔ اسی دوران عرب تاجر عراق ' لبنان اور حیرہ روم کے ممالک سے ایک نئی دھات یعنی لوہا ' زرعی اسلوب اور آلات کے بارے میں معلومات لے کر آئے۔ لوہے نے زراعت میں مدد دی ' اور زراعت کے نتیجے میں نہ صرف مستقل ٹھکانوں کی بنیاد پڑنا شروع ہوئی بلکہ ایک حد تک خانہ بدوشی ترک ہونے لگی اور قبائل کی ٹوٹ پھوٹ کا آغاز ہو گیا۔ یوں عرب سماج میں بتدریج خاندان نمودار ہونے لگا۔

لیکن قابل کاشت اراضی اور آب پاشی کے وسائل کے لحاظ سے سعودی عرب وادیٔ سندھ کے مانند تو نہیں تھا۔ یہاں تو زراعت کے امکانات بہت محدود تھے لہٰذا اس خطے میں خاندان کو بھی خاطر خواہ فروغ نہ ملا اور جدید دور تک عرب میں قبیلہ ہی غالب سماجی اکائی رہا۔

اگرچہ عرب میں قبائلی طرز حیات کا غلبہ رہا لیکن جہاں کہیں زراعت ممکن تھی وہاں خاندان کے قیام سے سماجی تبدیلی کے کچھ رجحانات نے جنم لیا گو ان کا حلقہ اثر اور دائرہ کار محدود تھا۔

نئی معاشرتی اکائی یعنی خاندان کے تناظر میں اگر ایک طرف عورت کے سماجی مرتبے میں اضافہ ہوا تھا تو دوسری طرف اس کے ذریعے مرد کی بے روک اور ظالمانہ برتری کو بھی چیلنج در پیش تھا اگرچہ اسے ختم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اب ماں ' بیوی ' بہن اور بیٹی کے نو دریافت رشتوں کے لئے جگہ بنانا ضروری ہو گیا تھا۔ قبائلی رواج کی تیز نوکیلی دھار کو کند کر کے اس میں خاندان کے جائز مطالبوں کے لئے گنجائش نکالنا ناگزیر تھا۔ گو خاندان کا رسوخ ابھی ناکافی تھا اور قبائلی معاشرے میں اس کی حیثیت کسی سماجی مرتبے اور شناخت کی حامل نہیں تھی۔ معاشرے میں مختلف قبائل کی درجہ بندی بھی مختلف تھی جس کا انحصار اس بات پر تھا کہ کسی قبیلے نے نئے پیداواری روابط کو کس حد تک تسلیم یا اختیار کیا ہے یا سرے سے تسلیم ہی نہیں کیا۔ معاشرے کے اس بنیادی تضاد کے باعث بے شمار اختلافات جنم لیتے اور مسلسل تصادم اور خون ریزی کی بنیاد بنتے رہتے تھے۔ ان حالات میں کیا امن قائم کیا جا سکتا تھا اور کیا اس بہیمانہ ابتری اور بدادرکش غارت گری کا خاتمہ ممکن تھا؟

اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کی سکت صرف اسلام میں تھی۔ صرف اسلام ہی قدیم اور جدید کے درمیان ایک معقول اور دائمی تصفیہ کرا سکتا تھا۔

قبیلے کا مطالبہ تھا کہ عورت کو وراثت سے محروم رکھا جائے۔ رواج کے مطابق عورت کو کسی قسم کا کوئی حق حاصل نہیں تھا۔ اسے انسان تک نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اسے طلاق دی جا سکتی تھی ' اسے ملکیت میں رکھا جا سکتا تھا ' اسے خواہش ' وہم یا ترنگ میں آکر قتل کیا جا سکتا تھا۔ جب کہ خاندان کا تقاضا تھا کہ

عورت کو حقوق حاصل ہیں اور اسے وراثت میں حصہ ملنا چاہئے۔ اسلام کے مفاہمانہ تصفیے نے عرب تاریخ میں پہلی بار بیٹی کو وراثت کا حقدار قرار دیا اگرچہ اس کا حصہ بیٹے سے نصف تھا۔

قبیلے نے تو عورت کو اس جائیداد سے بھی محروم کر رکھا تھا جو دور پرے تک کسی مرد وارث کے دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے عورت کو حاصل ہو سکتی تھی لیکن خاندان ان حالات میں عورت کو حصہ دینے پر تیار تھا۔ اسلامی تصفیئے کے مطابق قبیلے اور خاندان کے مابین معتدل رستہ اختیار کیا گیا۔

پدر سرانہ قبائل بیویوں کی کثرت اور انہیں طلاق دینے کا لامحدود اختیار برقرار رکھنا چاہتے تھے لیکن خاندان سے منسلک افراد اب اپنی بہنوں' بیٹیوں' پوتیوں اور نواسیوں کے لئے تحفظ کے خواہاں تھے۔ وہ طلاق اور کثرت ازواج پر پابندیاں عائد کرنا چاہتے تھے۔ اگرچہ قبائلی رواج کو بالادستی حاصل رہی لیکن اسلام نے کثرت ازواج اور طلاق دینے کے سابقہ بے لگام اختیار پر کچھ پابندیاں عائد کر دیں۔

اس بات کا پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے کہ سعودی جزیرہ نما میں زراعت کی گنجائش محدود تھی لہٰذا خاندان کی سماجی اکائی ایک مخصوص حد سے آگے نہ بڑھ سکی لیکن اس کے مقابلے میں میسوپوٹیمیا یعنی عراق اور وادیٔ سندھ کے زرخیز اور دریاؤں کے کناروں پر آباد خطوں کی بات دوسری تھی۔ یہاں زراعت اور خاندان کو پھیلتے پھولتے ایک ہزار سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وادیٔ سندھ نے جزیرہ نما عرب سے براہ راست آنے والی اسلامی توضیحات کی نسبت فارس اور عراق سے یہاں پہنچنے والے اسلامی فلسفے کا اثر زیادہ تیزی سے قبول کیا۔

اسی لئے وسطی ایشیا کے عسکری بادشاہ اور عراق و فارس کے صوفیاء کرام وادیٔ سندھ میں اشاعت اسلام کا وسیلہ بنے۔

10

مزید شہسواروں کی آمد

وادی سندھ کے نام کیا ہوئے؟

یہ بات اکثر کہی جاتی ہے کہ اسلام تلوار کے زور پر نہیں پھیلا۔ بلا شبہ یہ بڑی حد تک درست بھی ہے۔ اگرچہ یہ الفاظ وسطی ایشیا کے جفاکش اور شمشیر زن مسلمان عسکری بادشاہوں کی اسلامی خدمات سے انصاف نہیں کرتے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اسلامی عقیدے کے نفوذ اور اشاعت میں ایران اور وسطی ایشیا کے قریہ قریہ گھومنے والے متقی صوفیاء کا بہت بڑا حصہ ہے۔ مگر دونوں بیانات کا اطلاق بھی ہمہ گیر سطح پر نہیں ہوتا۔

ان عالی دماغ بزرگوں کا احترام اور ان کے مزاروں سے عوام کی بدستور عقیدت ان کے زہد و تقویٰ کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان ہستیوں نے ایک سادہ سے پیغام کے ذریعے کہ تمام لوگ آپس میں برابر ہیں' وادی سندھ کے شہروں اور صحراؤں میں اسلام کی روشنی پھیلائی لیکن ایک اور ہمہ گیر اور ناقابل استثناء پہلو بھی ہے جس کا آج تک جائزہ نہیں لیا گیا یا شاید اس طرف کبھی توجہ ہی نہیں دی گئی حالانکہ اس کی اپنی ایک الگ اہمیت ہے اور وہ اہم پہلو یہ ہے کہ وادی سندھ میں کوئی بھی مسلمان' زمانہ قبل از اسلام کے مقامی نام کا حامل نہیں ہے۔ یہ صورت حال صرف اسی خطے سے مخصوص ہے اور وادی سندھ کے علاوہ دنیا بھر میں ایسی شاید ہی کوئی مثال ملتی ہو۔ حتیٰ کہ اسلام کا گھر سعودی عرب بھی اس معاملے میں وادی سندھ کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

سبھی جانتے ہیں کہ عمر، عثمان اور علی بعثت اسلام سے پہلے کے نام ہیں۔ اسلام قبول کرنے سے

پہلے حضرت عمرؓ کا نام عمر ہی تھا اور انہوں نے قبول اسلام کے ساتھ اپنا نام تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ یہی بات عثمانؓ، علیؓ، سفیانؓ اور خالدؓ کے ناموں پر صادق آتی ہے۔

جب اسلام فارس میں پہنچا اور اس کے ذریعے زرتشتی یا پارسیوں سمیت ہر طرح کی مت پرستی کا خاتمہ ہوا تو یہاں کے نام فارسی تھے۔ ظاہر ہے یہ نام نہ تو عربی تھے اور نہ ہی اسلامی جیسا کہ اس دور کے جہل پسندوں نے تعرض کیا ہوگا۔ فارسی نام کفار کے خاص نام تھے جیسے رستم سہراب، جمشید اور پرویز لیکن کسی رستم سہراب، جمشید اور پرویز یا پروین، نسرین و شیریں نے اسلام قبول کرنے کے بعد اپنے نام کو "اسلامی" بنانے کے لئے اسے تبدیل کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ پھر کیا وجہ تھی کہ وادی سندھ کے سوبھا اور موہن لال قبول اسلام کے بعد اپنا نام ترک کرنے پر مجبور ہوئے؟

وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ صوفیا نے تو نام تبدیل کرنے کا حکم نہیں دیا ہوگا۔ وہ تو مذہب تبدیل کرنے پر بھی اصرار نہیں کرتے تھے اور ان کی اس رواداری نے ہی سب سے زیادہ لوگوں کو مشرف بہ اسلام کیا۔ لیکن وسطی ایشیا کے عسکری بادشاہ اتنے تحمل مزاج نہیں تھے اور ابتدائی دور کے فاتحین پر تو یہ بات زیادہ صادق آتی ہے کیونکہ وہ یہاں مستقل سکونت اختیار کرنے نہیں آتے تھے۔ انہیں تو اپنی سرمائی لشکر کشی کے بعد واپس جانا ہوتا تھا۔ وہ تو یہاں شہرت، عزت اور اللہ کی تائید حاصل کرنے آتے تھے اور اپنے ساتھ غلام اور مال غنیمت بھی لے جاتے تھے۔

غزنی کے بادشاہوں اور شہزادوں کے نزدیک غلاموں کی بڑی خاص اہمیت تھی۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ جب دریاؤں کے کناروں پر آباد وادی سندھ کی معیشت ایک مکمل زرعی معاشرے میں ڈھل چکی تھی اور جاگیرداری نظام کی طرف مائل تھی تو غزنی اور افغانستان کے بیشتر حصے ابھی "غلام داری سماج" کی گرفت میں تھے۔ اپنی متعین حدود میں رہتے ہوئے اس سماج میں ارتقاء کی اہلیت بہت کم تھی اس لئے وہ ترقی سے قاصر تھا۔ اس کے تنزل کا عمل شروع ہو چکا تھا جسے روکنے کے لئے مال غنیمت اور غلاموں کی درآمد ناگزیر تھی۔ ہندوستان کے دولت سے لدے ہوئے برہمن کشتری مندر، مال غنیمت کی کھلی دعوت تھے اور مفتوحہ علاقے کا ہر فرد بالخصوص غیر مسلم متوقع غلام تھا۔

زنجیروں سے باندھ کر لے جائے جانے اور پھر ایک دور دراز اجنبی سرزمین میں غلام بنا کر رکھے جانے سے بچاؤ ضروری تھا اس لئے اپنے طور پر بھی اسلام قبول کرنے والے لوگوں نے محض اسلام ہی قبول نہیں کیا بلکہ اپنے نام بھی تبدیل کر لئے اور اپنے بچوں کو بھی اسلامی نام دیئے۔ اپنی اسلامی شناخت کی توثیق کے لئے انہوں نے حملہ آوروں کے نام اختیار کئے جو عربی اور فارسی سے ماخوذ تھے۔

نام کی اس تبدیلی کا مقصد حملہ آور فوجوں کو یہ باور کرانا تھا کہ وہ مسلمان ہیں اور قانون الٰہی

مسلمانوں کو غلام بنانے سے روکتا ہے۔ اسلام میں غیر مسلم کے برعکس ایک مسلمان کو کسی حالت میں بھی غلامی کی ذلت سے دوچار نہیں کیا جا سکتا۔

اگر وادی سندھ کا حکمران طبقہ مقامی مسلمانوں پر مشتمل ہوتا تو لوگوں پر اسلام قبول کرتے ہوئے نام تبدیل کرنے کا کوئی دباؤ نہ ہوتا لیکن یہ اولین فاتح مقامی نہیں تھے۔ اسلام کے ساتھ رابطے کے پہلے دو سو سال یعنی محمود غزنوی سے شہاب الدین غوری تک جو روایت قائم ہوئی وہ بعد میں ایک مستقل انداز اختیار کر گئی۔ آج بھی اسلام قبول کرنے والوں کو نئے اسلامی نام دیئے جاتے ہیں۔ یہ پیشگی شرط قبول اسلام کی راہ میں ہمیشہ رکاوٹ بنتی رہی ہوگی۔ ایسے لوگ جو مذہب بدلنے پر تیار ہوں یا جنہیں آمادہ کر لیا جائے وہ بھی اپنا نام تبدیل کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عرب اور فارس کے برعکس وادی سندھ اور ہندوستان میں سو فیصد لوگوں نے اسلام کا انقلابی اور آفاقی پیغام قبول نہیں کیا حتیٰ کہ مسلمان حکمرانوں کے دور میں بھی ایسا ممکن نہیں ہوا اور شاید اس کی بنیادی وجہ نام بدلنے کی شرط ہو سکتی ہے۔

اسپ وسطی ایشیا

جب وادی سندھ میں مکمل طور پر ایک زرعی معاشرہ قائم ہو چکا تھا تو وسطی ایشیا کے زیادہ تر معاشرے ابھی خانہ بدوشی کے مراحل طے کر رہے تھے یا پھر ان میں سے کچھ قبل از زراعت کے غلام داری سماج کی شہری ریاستوں کے مدارج تک پہنچ سکے تھے۔ تو پھر ان معاشروں میں آخر ایسی کون سی خوبی تھی جس نے انہیں وادی سندھ پر ایسی برتری دلا دی کہ وسطی ایشیا سے کئی صدیوں تک ناقابل مزاحمت حملہ آور ادھر کا رخ کرتے رہے جبکہ وادی سندھ کی تہذیب اور معیشت بلاشبہ وسطی ایشیا سے زیادہ ترقی یافتہ تھی۔

وسطی ایشیا کے عسکری بادشاہوں کا ایک ناقابل تسخیر حلیف ان کا گھوڑا تھا۔ یہ بہت ہی کارآمد سواری تھی خاص طور پر حملے اور دوبدو جنگ کے دوران اس کی کارکردگی بے مثال تھی۔ لڑائی کا پانسہ پلٹنے میں گھوڑا فیصلہ کن عنصر ثابت ہوتا جبکہ وادی سندھ اور وادی جمنا کے میدان اس جانور کی افزائش کے لئے موزوں نہ تھے۔ وادی سندھ کے اس پہلو کو ' ہم دیوتا ''اندر'' کی دریاؤں کو آزاد کر دینے کی قدرت کے ضمن میں پہلے ہی زیر بحث لا چکے ہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ آخر وہ کیا وجوہات تھیں کہ وادی سندھ کا ماحول گھوڑے کے لئے ناسازگار ثابت ہوا۔

رومیلا تھاپر اس نااہلیت کی شناخت کرتے ہوئے متاسف ہوتی ہے "یہ عجیب بات ہے کہ ہندوستان میں اعلیٰ نسل کے گھوڑوں کی ایک بڑی تعداد میں افزائش کبھی ممکن نہیں ہو سکی۔ اعلیٰ نسل کے گھوڑے ہمیشہ درآمد کرنا پڑے۔ ہندوستانی افواج کے گھڑ سوار دستوں پر اس کے اثرات تباہ کن رہے اور بالآخر وسطی ایشیائی گھڑ سواروں کے مقابلے میں ہندوستانی گھڑ سوار دستے قطعی طور پر غیر موثر ثابت ہوئے" تھاپر جیسی عالم و فاضل خاتون بھی اس ضمن میں اپنی عاجزی کا اعتراف کرتے ہوئے قدرے ہچکچاہٹ سے اپنی تحریر کے زیر حاشیہ اس طرح رقم طراز ہوتی ہے "اس صورت حال کی صرف یہی ایک وضاحت سمجھ میں آتی ہے کہ ہندوستان میں گھوڑوں کی افزائش کے لئے مخصوص چراگاہیں اور موافق موسمی حالات موجود نہیں"

اگر مورخین اسے گستاخی پر محمول نہ کریں تو کہا جا سکتا ہے کہ تھاپر اپنی تحقیق کے دوران یہ نتیجہ اخذ کرنے میں ناکام رہی کہ گھوڑا اپنے سموں کی ساخت کے باعث وادی سندھ اور شمالی ہندوستان کے موسموں کے لئے غیر موزوں ثابت ہوا۔ وادی سندھ کے ہموار میدان ہر سال گرمیوں کے موسم میں پنجاب کے پانچ بل کھاتے ہوئے دریاؤں اور لاتعداد برساتی نالوں کے سبب ایک وسیع دلدل نما میدان میں بدل جاتے ہیں۔ جتنی بارش بہت سے دوسرے ممالک میں شاید پورے سال میں نہیں ہوتی' یہاں صرف دو مہینوں میں آسمان سے نازل ہو جاتی ہے۔

پھر ہمالیہ اور قراقرم کے پہاڑوں کی برف بھی پگھل کر بارشوں کے ساتھ شامل ہو جاتی ہے اور دریاؤں کا پانی کناروں سے بہہ نکلتا ہے۔ پہاڑی ندیاں یکایک بیدار ہو کر بے پناہ قوت سے میدانوں پر ٹوٹ پڑتی ہیں۔ بارشوں کے تھمنے اور پانیوں کے پلٹ جانے کے باوجود زمین میں نمی باقی رہ جاتی ہے۔ ایسے مرطوب موسم میں تو عرب اور ایران کے بہترین گھوڑے بھی ناقص کارکردگی کا مظاہرہ کر سکتے تھے۔ شاید اسی لئے مشرق وسطیٰ کے ماہرین کو اکثر یہ شکوہ رہتا تھا کہ وادی سندھ اور وادی جمنا کے لوگ گھوڑوں کی مناسب دیکھ بھال نہیں کر سکتے۔

مرطوب آب و ہوا' نم زمین اور گرمی کی شدت گائے اور بھینس جیسے جانوروں کے لئے سازگار ہے کیونکہ ان کے سموں کا درمیانی شگاف نمی کے اخراج اور ہوا کی گردش کو نہ صرف یقینی بناتا ہے بلکہ پھسلواں' دلدلی اور خطرناک زمین پر قدم جما کے چلنے اور توازن برقرار رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ لیکن گھوڑے کے سم میں ایسا کوئی شگاف نہیں۔ آج کے دور میں جب دریاؤں پر قابو پا لیا گیا ہے' پختہ راستے اور سڑکیں بن چکی ہیں مگر اس کے باوجود لوگ اپنے گھوڑوں کو مون سون کے موسم میں باہر لانا پسند نہیں کرتے۔

گھوڑا سردی سے خوشی کے ساتھ سمجھوتہ کر لیتا ہے، گرمی بھی برداشت کر سکتا ہے لیکن جب نمی اور گرمی باہم شیر و شکر ہوتی ہیں، خاص طور پر جب دونوں نیچے زمین سے اٹھ رہی ہوں تو یہ موسم گھوڑے کا واٹرلو (Water Loo) ثابت ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی بنگلہ دیش اور برما جیسے گرم مرطوب خطے گھوڑے کی نسل افزائی کے لئے مناسب خیال نہیں کئے جاتے۔ ہر سال جب گرمی عروج پر ہوتی ہے تو مون سون وادی سندھ اور شمالی ہندوستان میں بنگلہ دیش اور برما جیسے موسمی حالات پیدا کر دیتی ہے۔ اسی لئے یہاں کے اکثر علاقے گھوڑے کے لئے غیر موزوں ہیں۔

یہ درست ہے کہ بلوچستان کے علاقے پیراک میں کھدائی کے دوران گھوڑے سمیت بہت سے جانوروں کی مورتیاں برآمد ہوئی ہیں لیکن یہ کسی صورت بھی وادی سندھ کے جانوروں کی نمائندگی نہیں کرتیں۔ درہ بولان کی طرف جاتے ہوئے پیراک ایک قصباتی پڑاؤ ہوا کرتا تھا۔ یہ علاقہ سلیمانی سلسلہ ہائے کوہ کے دوسری طرف کی سرزمینوں کے اثرات بھی قبول کر رہا تھا جس کا ثبوت سرخ پختہ مٹی ٹیراکوٹا Terracotta سے بنائی گئی دوسری بہت سی مورتیوں کی موجودگی ہے جن میں گھوڑے کے علاوہ دو کوہان والا اونٹ بھی شامل ہے جو کبھی وادی سندھ کا جانور نہیں رہا۔ جب تک ہم یہ تسلیم نہ کر لیں کہ یہ دونوں ہی غیر ملکی چوپایوں کی نمائندگی کرتے ہیں ہم ایک کوہان والے اونٹ کی سرزمین پر دو کوہان والے اونٹ کی موجودگی کی وضاحت نہیں کر سکتے۔

وسطی ایشیا کے گیاہستان گھوڑے کا قدرتی مسکن ہیں۔ غزنی کے عسکری بادشاہوں کو اپنے شہسواروں کے باعث بھاری بھر کم ہاتھیوں اور سست رفتار رتھ بانوں پر واضح برتری حاصل رہی۔

سلطان محمود

وسطی ایشیا کے عسکری بادشاہوں کے لئے وادی سندھ گویا ان کے آباؤ اجداد کا ترکہ تھا جہاں ان کی قانونی اور فطری عملداری تھی۔ یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ کشان اور باختریوں کی مستحکم اور دیرپا حکومتوں نے آمو دریا اور وادی سندھ کے درمیان یگانگت کی فضا پیدا کر دی تھی۔ ابتدا میں تو ایک دوسرے کی طرف جانے اور آپس میں روابط بڑھانے کا رجحان بھی ہوا کرتا تھا لیکن ان میں سے کسی میں بھی وادی سندھ سے آگے ہندوستان کی طرف جانے کی کوئی خواہش نہیں ہوتی تھی جب تک کہ عقب سے کوئی زیادہ بڑی قوت انہیں آگے نہ دھکیل دے جیسا کہ سیتانیوں کے ساتھ ہوا تھا۔

کشانوں کا صدر مقام کوہ ہندوکش کے جنوب میں پرش پور یعنی پشاور تھا۔ ان کی سلطنت اور ذیلی ریاستوں کی سرحدیں ہندوکش کے شمال میں وسطی ایشیا تک پہنچتی تھیں لیکن غزنی کے محمود نے اس

توازن کو پلٹ دیا۔ اس نے اپنا دار الخلافہ وادی سندھ سے پرے سلسلہ ہائے کوہ سلمان کے شمال میں قائم کر کے پنجاب اور سندھ کی باج گزار ریاستوں پر اپنی بالادستی قائم کرلی۔ محمود غزنوی نے 999 عیسوی میں برسر اقتدار آتے ہی خلیفہ بغداد سے اپنی حاکمیت اعلیٰ کی سند بھی حاصل کرلی۔ اس خود حفاظتی کے بعد اس نے اپنی فاتحانہ مہم جوئی کا آغاز کیا۔

سلطان محمود غزنوی (999 تا 1030ء) ہمہ صفت شخصیت تھا۔ وہ بیک وقت ایک بادشاہ' ایک اچھا منتظم' ایک سپاہی 'ایک انتھک مہم جو ہونے کے ساتھ ساتھ سائنس اور فنون کا سرپرست بھی تھا۔ رزمیہ شاہنامے کا خالق شاعر فردوسی اور مشہور عالم ریاضی دان اور مورخ البیرونی اس کے دربار کی زینت بڑھاتے تھے۔ لیکن سلطان محمود کو سب سے زیادہ شہرت ان سترہ حملوں سے ملی جو اس نے وادی سندھ اور شمال مغربی ہندوستان پر کیئے۔ یہ 17 حملے صرف 25 سال کے دوران کئے گئے۔ وہ ہر حملے کے بعد غزنی لوٹ جاتا لیکن پنجاب اور سندھ کو اس نے بدستور اپنی عملداری میں رکھا۔ محمود کے اکثر حملے دریائے سندھ کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ تھے اور ان کا رخ سندھ سے جنوب مشرق کی جانب گھومتے ہوئے کاٹھیاواڑ اور گجرات کی سرحد پر سومنات کی طرف رہا۔

غزنی' چین اور بحیرہ روم کی تجارتی شاہراہ پر ایک اہم شہر تھا۔ وادی سندھ پر حملوں میں بہت سے عوامل نے محمود غزنوی کی اعانت کی۔ وسطی ایشیا کے گھوڑے کی رفتار اور اس کے سوار کی قوت برداشت وادی سندھ اور ہندوستان کے لئے حیران کن تھی اور وسطی ایشیا کے ترک' افغان اور منگول اس میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ آنے والے زمانوں کے جنگی معرکوں کے دوران وادی سندھ اور ہند پر اس گھوڑے اور سوار کی چابکدستی کے بہت سے پہلو ابھی آشکار ہونا تھے۔

جب سلطان محمود پہلی بار وادی سندھ پر حملہ آور ہوا تو شمال مغربی پنجاب اور صوبہ سرحد میں ہندوشاہی خاندان کا دور حکومت تھا۔ جس کی بنیاد تقریباً ایک سو سال پیشتر لالیا نے رکھی تھی۔ جو کابل کے حکمران افغان مسلم شاہ یا بادشاہ کا ہندو وزیر تھا اور اب اسی شاہی خاندان کا آخری بادشاہ جے پال مسند اقتدار پر براجمان تھا۔ جے پال کا مسکن اوھند تھا آج یہ جگہ ھنڈ کہلاتی ہے اور اٹک سے پندرہ میل دور شمال میں ہے۔

جے پال کو پہلے بھی غزنویوں کے ساتھ جنگ کا تجربہ ہو چکا تھا۔ غزنوی بادشاہ الپتگین کے غلام اور داماد سبکتگین کی قیادت میں اٹک کے مقام پر غزنوی فوجوں کا ہندو بادشاہ جے پال سے آمنا سامنا ہو چکا تھا۔ 977 عیسوی میں غلام سبکتگین نے غزنی کا بادشاہ بننے کے بعد بھی جے پال کو مطیع بنانے اور اس کی ریاست کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کی کوشش جاری رکھی لیکن یہ اعزاز تو اس کے بیٹے محمود کی

قسمت میں لکھا تھا۔

محمود نے پندرہ ہزار گھڑ سواروں کے ساتھ سن ایک ہزار عیسوی کے موسم خزاں میں پشاور کی طرف کوچ کیا۔ جے پال 1001ء میں تین سو ہاتھیوں ' 30 ہزار پیادوں اور کئی سو گھوڑوں کے ساتھ مقابلے میں آیا۔ سلطان محمود کی حکمت عملی بہتر اور اس کے شہسواروں کے جذبے توانا تھے۔ جے پال کو شکست ہوئی۔ کہتے ہیں کہ اس لڑائی میں مدافعت کرنے والوں کی اتنی بڑی تعداد ہلاک ہوئی کہ جس پہاڑ کے دامن میں یہ جنگ لڑی گئی اسے آج بھی ''ہندو کش'' یعنی ہندوؤں کا قاتل پکارا جاتا ہے۔

شکست خوردہ راجپوت بادشاہ البتہ اتنا غیرت مند تھا کہ ذلت اور رسوائی سے چھپنے کے لئے اس نے خود کو چتا کے شعلوں میں بھسم کر لیا۔

پانچ سال بعد محمود نے جے پال کے وارث انندپال کو پشاور کے مقام پر مکمل شکست سے دوچار کیا اور سرحد کے علاقے کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس کے بعد سلطان محمود کے تیس سالہ دور حکومت میں وادی سندھ اس کے لئے اپنے محل کے پائیں باغ کی طرح تھی۔ اگرچہ سلطان نے 1021ء تک اس تمام خطے کو باقاعدہ طور پر اپنی سلطنت میں شامل نہیں کیا تھا لیکن وہ سترہ بار اس وادی کے شہروں اور مندروں کو تاراج کرنے کے لئے حملہ آور ہوا۔

سلطان محمود اپنی ذات کے حوالے سے یقیناً ایک عظیم اور منصف مزاج حکمران رہا ہوگا۔ اس کی خاطر ہتھیار اٹھانے والے جس سے محبت کرتے اور اس کی راہ میں آنے والے جس سے خوفزدہ رہتے تھے البتہ یہ حقیقت ہے کہ اپنے پہلے حملے کے دوران سلطان کے ہاتھ جو دولت لگی اس کی بناء پر سرحد کے دونوں طرف بسنے والے ہزاروں ترک اور افغانیوں کو ہر موسم خزاں میں محمود کے ساتھ جنگ میں شامل ہونے کی ترغیب ملی۔ بہت سے سردار تو بغیر کسی مشاہرے کے صرف اس امید میں سلطان کے پیچھے ہو لیتے تھے کہ انہیں مال غنیمت سے حصہ ملے گا۔ لہٰذا سلطان محمود کے پاس افرادی قوت کی کوئی کمی نہیں تھی۔

ایک اور اہم عنصر جو مہم جوئی میں سلطان کے لئے سازگار رہا وہ اس خطے کے داخلی حالات تھے۔ وادی سندھ چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستوں میں بٹی ہوئی تھی اور سلطان کی مہمات محض ہندوؤں یا صرف غیر مسلم ریاستوں کے خلاف نہیں تھیں بلکہ اس کی راہ میں آنے والی کسی مسلم ریاست کو بھی نہیں بخشا گیا۔

ملتان پر اسماعیلی مسلمانوں کی حکومت تھی جن کا عقیدہ تھا کہ شیعہ امام جعفرؒ کے بڑے بیٹے اسماعیل اور ان کی اولاد ہی پیغمبر اسلام ﷺ کے اصل وارث ہیں۔ اسمٰعیل کا انتقال اپنے والد سے پہلے ہو گیا تھا۔

ملتان کی اسمٰعیلی مسجدوں میں نماز سے پہلے مصر کے اسماعیلی فاطمی خلیفہ سے وفاداری کا عہد کیا جاتا تھا۔ سلطان محمود نے اس سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ بلخ' سیستان' ملتان اور تلنبہ سب مسلمان ریاستیں تھیں جن پر سلطان حملہ آور ہوا اور انہیں محکوم بنا لیا گیا۔ اس کے عقب میں آنے والوں نے یہاں بھی لوٹ مار کی۔

ملتان کے قرب وجوار میں ایک مسلم ریاست منصورہ تھی۔ یہاں ایک عرب خاندان حکمران تھا۔ مشرق کی جانب قنوج' کاشی' دہلی' مہوبہ' کالنجر' مالوہ اور گجرات کی فرمانروائیاں تھیں جو مسلسل باہم برسرپیکار ہونے کی وجہ سے غیر مستحکم اور ناتواں ہو چکی تھیں۔ ان حالات میں سلطان نے جس طرف کا بھی رخ کیا' اپنے راستے میں آنے والی ہر ریاست کو تاخت وتاراج کر دیا۔

سومنات

اگرچہ سلطان محمود نے آمودریا اور وادی سندھ کو ایک بار پھر سیاسی وحدت کے طور پر متحد کر دیا تھا۔ اس نے بے شمار معرکے بھی سر کئے اور البیرونی کے مطابق یہ سب معرکے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کے تھے لیکن اسے سب سے زیادہ شہرت سومنات کی فتح اور وہاں کے مندر اور دیوتا کو زمین بوس کر کے حاصل ہوئی۔

اس ساحلی شہر اور مندر کی وجہ شہرت وہ بُت تھا جو مندر کے مرکزی کمرے میں کسی سہارے کے بغیر محض ہوا میں معلق تھا۔ رومیلا تھاپر نے ال قزوینی کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ؛

> ''جب بادشاہ نے ہوا میں معلق بت کے شعبدے کے بارے میں دریافت کیا تو اکثر مصاحبین کا خیال تھا کہ بت کسی خفیہ سہارے کے زور پر معلق ہے۔ بادشاہ نے ایک شخص کو حکم دیا کہ وہ نیزے کی مدد سے بت کے چاروں طرف اور اوپر نیچے کا جائزہ لے۔ ایسا ہی کیا گیا لیکن بت کے اردگرد کوئی شے ایسی نہیں تھی کہ جس نے اسے سہارا دے رکھا ہو۔ تب وہاں موجود لوگوں میں سے ایک نے رائے دی کہ بت لوہے کا اور اس کا سائبان مقناطیسی ہو سکتا ہے۔ کوئی ذہین وفطین معمار اپنی مہارت سے یہ اہتمام کرنے میں کامیاب رہا ہے کہ کسی ایک طرف سے مقناطیس کی طاقت کم یا زیادہ نہ ہونے پائے' یہی وجہ ہے کہ بت عین درمیان میں معلق ہے۔ کچھ مصاحبین نے اس رائے سے اتفاق کیا اور کچھ نے اختلاف۔ بادشاہ کی اجازت سے جب سائبان کی چھت سے دو پتھر نکالے گئے تو بت ایک جانب لڑھک گیا' کچھ اور پتھر

ہٹائے گئے تو مت بھی کچھ اور جھک گیا اور بالآخر زمین بوس ہو گیا"

اس حقیقت کے باوجود کہ محمود کی مہم جوئی کی قوت اور تباہ کاری کا نشانہ صرف غیر مسلم ہی نہیں تھے بلکہ اس نے اپنی راہ میں آنے والی کسی مسلم ریاست کو بھی نہیں بخشا تھا لیکن ہندو ذہن کو اصل دھچکا سومنات کی تباہی سے پہنچا اور اس واقعے نے وادی سندھ اور ہند کی تفریق کو مزید دوام بخشا۔ رومیلا تھاپر شاکی ہے کہ سومنات کی تباہی جنون پر مبنی تھی اور اس کے اثرات ہندو ذہن پر کئی صدیوں تک باقی رہے اسی لئے محمود کے بارے میں بالخصوص اور دوسرے مسلم حکمرانوں کے بارے میں عام طور پر ان کی رائے متوازن نہیں۔

ہندو ذہن کو سومنات کی تباہی پر اتنا شدید جذباتی صدمہ پہنچا تھا کہ محمود کی افواج میں سے پیچھے رہ جانے والے افراد کو مقامی معاشرے میں ضم کرنے کا جو طریق کار اختیار کیا گیا وہ انتہائی مریضانہ ذہنیت کا مظہر تھا۔ پنڈت نہرو نے اپنی تحریر میں ایک مسلمان ذریعے کا حوالہ دیا ہے جس سے تفریق کی ایک واضح تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے کہ ؛

> "ترک' افغان اور مغل قیدی عورتیں اگر باکرہ ثابت ہوتیں تو انہیں ہندو سپاہیوں کی بیویوں کے طور پر قبول کر لیا جاتا لیکن اگر وہ باکرہ نہ ہوتیں تو قے اور دست آور دوائیں دے کر پہلے ان کا زیریں پیٹ اور آنتیں صاف کی جاتیں پھر کہیں جا کر انہیں اس قابل سمجھا جاتا کہ مساوی حیثیت کے مرد' ان سے شادی کر سکتے"۔

یہ کم و بیش وہی زمانہ تھا جب جفاکش بلوچوں کے اولین قبائل آج کے بلوچستان میں وارد ہونا شروع ہوئے۔

بلوچوں کے اصل وطن کے بارے میں مختلف خطوں کے نام لئے جاتے ہیں۔ جن میں عرب' بابل یا عراق' کردستان حتیٰ کہ کرمان تک شامل ہیں۔ ایک معتبر حوالے کے مطابق بلوچوں کا اصل وطن عراق کی وادی الیپو ہے۔ بلوچوں کی اپنی روایت کے مطابق "وہ لوگ بارہویں صدی میں حلب سے براستہ بغداد' فرات اور پھر خلیج فارس کے شمالی کنارے کے ساتھ ساتھ مکران تک پہنچے جہاں سے وہ شمال کی جانب پھیلتے ہوئے پٹھان قبائل کے ساتھ گھل مل گئے" مرحوم خان آف قلات میر احمد یار خان بلوچ جیسی شخصیت نے بھی اس روایت اور موقف کی تائید کرتے ہوئے وادی حلب کو ہی بلوچوں کا اصل گھر قرار دیا ہے۔

سلطان محمود کی مہم جوئی کے بعد کی صدیوں میں اولین بلوچ آباد کار بلوچستان سے باہر بھی پھیل گئے اور وہ جنوبی پنجاب اور شمالی سندھ کے وسیع رقبوں پر آباد ہوئے۔

11

جاگیرداری سماج پر مبنی دوسری ریاست

راجپوت قلمرو

پنجاب پر قبضہ سلطان محمود کے جانشینوں کے لئے گراں قدر ورثہ تھا۔ جب 1151 عیسوی میں علاؤالدین جہاں سوز نے غزنی فتح کر کے اسے آگ لگادی تو محمود کے پڑپوتے نے لاہور میں پناہ لی۔ غزنوی جو کبھی لاہور کو اپنی سلطنت کا پائیں باغ سمجھتے تھے' اب انہوں نے اس شہر کو اپنا دارالحکومت بنالیا۔

سلطان خسرو شاہ نے ملک بدر ہو کر جب لاہور میں پناہ لی تو یہ شہر اپنا درخشاں دور گزار چکا تھا۔ صوفی بزرگ علی ہجویریؒ داتا گنج بخش علم کی روشنی پھیلانے کے بعد اسی شہر میں ہمیشہ کے لئے محو آرام ہو چکے تھے۔ علی ہجویریؒ کے ہم عصر شاعر مسعود سعد سلمان لاہور اور اس کے نواحی علاقوں کے ترقی پسند اور مزاحمتی شعراء کے قابل قدر سلسلے کے پہلے شاعر تھے۔ مسعود سعد سلمان فی الواقع اتنے مقبول ہو گئے تھے کہ حکمرانوں کے پاس انہیں جیل بھیجنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہا۔ انہیں دس سال کی سزا سنائی گئی۔ اقبال' فیض اور جالب سے ایک ہزار سال پہلے انہوں نے کہا تھا کہ :-

"جب تقدیر نے مجھے جیل میں دھکیل دیا تو میرے سر کا ایک بال بھی سفید نہیں تھا۔ میں اتنا طویل عرصہ سلاخوں کے پیچھے رہا کہ میرے سر کا ایک بال بھی سیاہ نہیں ہے"

1030 عیسوی میں سلطان محمود کی وفات کے بعد ایک صدی سے بھی زیادہ عرصے تک وادی سندھ غزنوی سلطنت کا حصہ رہی۔ یہ سلطنت دریائے سندھ کے معاون دریاؤں تک ایک وسیع قوس کی شکل میں پھیلی ہوئی تھی لیکن وادی سندھ وسطی ایشیائی حملہ آوروں کے آئے دن کے طوفانی حملوں سے نڈھال ہو چکی

تھی اگرچہ ان دگرگوں حالات میں بھی لاہور اور ملتان جیسے شہروں کے ذریعے اس خطے کی عظمت اور شان و شوکت کا اظہار ہوتا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ شہروں کے مضافات کو ہر حملے کے بعد سنبھلنے میں بہت وقت لگتا تھا۔ غیر ملکی حملہ آور فوجیں لوٹ مار کرتی ہوئی جہاں جہاں سے گزرتیں ان علاقوں میں زرعی اجناس ،مال مویشی حتیٰ کہ جسمانی طور پر تندرست و توانا افراد کا بھی قحط پڑ جاتا تھا۔

البتہ ستلج، جمنا اور نربدا کی درمیانی وسیع و عریض مثلث میں حالات ایسے نہیں تھے۔ وسطی ہندوستان اور راجپوتانہ کے اس خطے کو حملہ آوروں سے شاذ و نادر ہی واسطہ پڑا تھا۔ یہ درست ہے کہ اس مثلث کے سرحدی علاقے قنوج اور سومنات تاراج کئے گئے لیکن وادی سندھ میں پائی جانے والی مسلسل انارکی Anarchy وسطی ایشیائی حملہ آوروں کی اولین پہنچ سے دور بسنے والوں پر اثر انداز نہیں ہو سکی تھی۔

اس خطے میں عام طور پر راجپوتوں کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں۔ وسطی ایشیائی حملہ آوروں سے نسبتاً محفوظ رہنے کے باعث، خاص طور پر سلطان محمود کے بعد کی دو صدیوں کے دوران ان علاقوں کے سردار اپنے کسانوں اور دستکاروں سے اچھا خاصا لگان وصول کر لیتے تھے۔ زیادہ آمدنی حاصل ہوئی تو انہوں نے طاقتور افواج تیار کیں اور آپس کی خون ریز لڑائیوں میں فاضل پیداوار سے حاصل ہونے والی دولت کو خوب ضائع کیا۔ گیارہویں اور بارہویں صدی میں کبھی ختم نہ ہونے والی ان جنگوں کا یہ عالم تھا کہ راجپوت اور جاٹ رواج میں دلیری اور شجاعت کے عمومی ضابطے ان سے ترتیب پاتے تھے۔

بارہویں صدی کے اواخر میں پرتھوی راج چوہان دلی کا حکمران تھا۔ وہ ایک حوصلہ مند اور بہادر جنگجو تھا جسے اپنی زندگی ہی میں راجپوت لوک داستانوں کے کردار کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ پرتھوی راج نے جس ڈرامائی بہادری سے شاہ قنوج کی بیٹی شہزادی سمیوگیتا کا سوئمبر جیتا، اس سے دلیر راجپوت کی شہرت میں مزید اضافہ ہوا۔

قصہ کچھ یوں ہے کہ قنوج کے بادشاہ نے اپنی بیٹی کے لئے "سوئمبر" رچایا جہاں شہزادی سمیوگیتا نے دربار میں موجود شہزادوں میں سے کسی ایک کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈال کر اپنے ہونے والے شوہر کو پسند کرنا تھا۔ قرب و جوار کی سبھی ریاستوں کے راجپوت شہزادے اس تقریب میں موجود تھے لیکن پرتھوی راج کو مدعو نہیں کیا گیا تھا کیونکہ شاہ قنوج اسے قطعی پسند نہیں کرتا تھا۔ اپنی اس نفرت کا اظہار بادشاہ نے یوں کیا کہ پرتھوی راج کا ایک بدہیئت مجسمہ بنا کر تقریب کے روز شاہی دربار کے داخلی دروازے پر رکھ دیا اور اس مجسمے کے گلے میں پرانی جوتیوں کا ہار ڈال دیا گیا۔

داخلے کی اجازت نہ ہونے کے باوجود پرتھوی راج، جو تمام شہزادوں میں سب سے حسین اور راجپوت سلسلہ نسب کا فخر قرار دیا جاتا تھا، بھیس بدل کر اور اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر سوئمبر کی رسم میں پہنچ گیا اور اپنے

مجسے کی آڑ میں آن کھڑا ہوا۔ شہزادی اسے پہچان چکی تھی اور فیصلہ بھی کر چکی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے۔ وہ اپنی مشتاور محبوب کی موجودگی کو من ہی من میں چھپائے شادی کے خواہش مند شہزادوں کی لمبی قطار کے سامنے سے گزرتی ہوئی داخلی دروازے تک جا پہنچی اور اس نے پھولوں کا ہار اچانک پر تھوی راج کے بد ہیئت مجسمے کے گلے میں ڈال دیا۔ دربار میں موجود تمام شاہی مہمان حیرت زدہ رہ گئے۔ شہزادے نے بھی ایک لمحے کا توقف کئے بغیر خوبصورت شہزادی کو اپنے بازوؤں میں سمیٹا' گھوڑے پر زقند بھری اور چشم زدن میں بھرے دربار سے شہزادی کو نکال لے گیا۔ محل اور دربار میں کوئی راجپوت گھوڑا اور کوئی بہادر سردار ایسا نہ تھا جو نوجوان جوڑے کی محبت کی پہلی پرواز کی گرد کو پہنچ سکتا۔

اس خطے میں یہ زمانہ سرداری کا تھا۔ دلیری' شجاعت اور رومان کا تھا۔ تاریخی اعتبار سے جاگیرداری سماج نے ابھی ہوش سنبھالا تھا اور معاشی اعتبار سے یہ سماج اپنے ساتھ خوشحالی لایا تھا۔ دولت اتنی تھی کہ اس کے لئے جنگ لڑنا نقصان کا سودا نہیں تھا کہ جیت کی صورت میں مال غنیمت کے انبار تھے۔ اسی لئے یہ دور تفریق اور تنازعوں کا دور بھی تھا۔

یہ تفریق اور یہ تنازعے وسطی ایشیائی حملہ آوروں کے لئے وادی سندھ سے آگے بڑھ کے ہندوستان میں داخل ہو کر اسے فتح کرنے کی ترغیب کا باعث بنے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔

سلاطین دہلی

محمد غوری نے 1186ء میں غزنی پر قبضہ کیا۔ اس نے پہلے تو اس علاقے کے لوہے کی بھٹیوں اور گھوڑوں کی افزائش نسل کے ماہرین کی مدد سے اپنے عسکری وسائل میں اضافہ کیا اور پھر غزنی سے پیش رفت کرتے ہوئے' پہاڑوں کو عبور کر کے لاہور پر قابض ہو گیا۔ یہاں سے غوری دہلی کی طرف بڑھا جہاں پر تھوی راج اس کی پیش قدمی روکنے کے لئے سامنے آیا۔

ترائن مقابلے کا میدان بنا یہ جگہ پانی پت سے ذرا پہلے کورک شیتر سے متصل اور سرہند سے زیادہ دور نہیں۔ یہ چاروں مقامات وہ ہیں جہاں کم از کم سات ایسے معرکے بپا ہوئے جو پورے برصغیر کی تقدیر کے لئے فیصلہ کن ثابت ہوئے۔ ایسی دو جنگیں تو صرف ترائن کے میدان میں ہی لڑی گئیں۔

ترائن کے پہلے معرکے میں غوری کو شکست ہوئی اور اسے پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ غوری نے اس ناکامی پر اپنے جرنیلوں کو خوب لتاڑا۔ کہتے ہیں کہ اس نے وہ تھیلے جن میں گھوڑوں کو دانہ ڈالا جاتا ہے' ان جرنیلوں کی گردنوں پر کس دیئے تھے۔ اگلے سال (1192ء) اسی میدان جنگ میں پھر معرکہ بپا ہوا۔ پر تھوی راج کی قیادت میں سارے راجواڑے متحد ہو کر لڑنے کے لئے نکلے لیکن انہیں شکست ہوئی اور محمد غوری کی سلطنت

اب جمنا کے کناروں تک وسعت اختیار کر گئی۔

غوری سلطنت کی بنیاد 'غلاموں کی تجارت کرنے والی اس "اشرافیہ" کے ہاتھوں پڑی جو وسطی ایشیا سے غلام درآمد کرتی تھی۔ آئے دن کی مہم جوئی' افرادی قوت کی طلب اور عسکری مہارت کی ضرورت نے وسطی ایشیائی غلام کا سماجی مرتبہ اتنا بلند کر دیا تھا کہ غلامی کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ طاقت' شجاعت اور جنگی مہارت کا مظاہرہ کرنے والے غلام کو بڑی آسانی سے آزادی مل جاتی تھی۔ اکثر اوقات آزاد کئے گئے ان غلاموں کو فوج میں اعلیٰ انتظامی عہدے بھی تفویض کر دیئے جاتے تھے۔ ان میں سے بہت سے ذاتی اہلیت کی بناء پر اقتدار اعلیٰ تک بھی پہنچے اور زیرک منتظم اور جرنیل ثابت ہوئے۔

1206 عیسوی میں شہاب الدین غوری کو لاہور میں قتل کر دیا گیا اور اس کی سلطنت تین غلام جرنیلوں میں بٹ گئی۔ غزنی پر تاج الدین یلدوز قابض ہوا۔ سندھ نصیر الدین قباچا کے حصے میں آیا جبکہ پنجاب اور دہلی پر قطب الدین ایبک کی حکمرانی ہوئی۔ وادی سندھ اور وادی جمنا کے بیشتر حصوں پر مشتمل ایبک کی یہ سلطنت پہلی اسلامی ریاست تھی جسے صحیح معنوں میں مقامی حکومت کہا جا سکتا تھا۔

کہنے کو تو دہلی کا حق سلطانی جہاں تک تھا اسے سلطنت کہا جاتا تھا لیکن سچ تو یہ ہے کہ اپنے قیام کے پہلے تین سو برس میں دہلی سلطنت کبھی اپنے صحیح معنوں میں ایک وسیع اور عظیم بادشاہت نہیں رہی۔ اس میں شک نہیں کہ اس دوران کئی بار طویل وقفوں کے لئے ایسا وقت بھی آتا رہا کہ جب دہلی دربار نے وادی سندھ اور شمالی ہندوستان کی سیاست اور حکمران خانوادوں کی تقدیر کو بگاڑنے سنوارنے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا مگر خود دہلی پر بھی کسی ایک خاندان کی حکومت مسلسل نہیں رہی۔ غلام' خلجی' تغلق' سید اور لودھی یکے بعد دیگرے حکمران ہوتے رہے۔ لودھیوں کو مغل حملہ آوروں نے شکست دی۔ یہ حملہ آور بھی وسطی ایشیا سے آئے تھے۔

دہلی سلطنت پر وسطی ایشیائی رنگ غالب رہا اور یہاں کے حکمران وادی سندھ کے جانے پہچانے مرکز گریز Separatist رجحانات کے بارے میں ہمیشہ متفکر رہے۔ انہیں ہمیشہ یہ خدشہ رہتا کہ یہ خطہ کسی روز دہلی تخت سے علیحدہ ہو کر خود مختار ہو جائے گا یا پھر وسطی ایشیا سے الحاق کر لے گا۔ ایک مرحلے پر تو دہلی کے سلطان قطب الدین ایبک کو اپنا دارالخلافہ دہلی سے لاہور منتقل کرنے پر مجبور ہونا پڑا تا کہ حاکم غزنی کے وادی سندھ اور لاہور پر دعوے کا توڑ کیا جا سکے۔

پہلے ایبک کا داماد اور وارث التمش (1211 سے 1236ء) بعد ازاں اس کی بیٹی' ملکہ رضیہ سلطانہ (1236 سے 1240ء) اپنے عہد حکومت کے دوران مسلسل سلطنت کے شمال مغربی حصے یعنی وادی سندھ کے مسائل میں الجھے رہے کیونکہ یہ خطہ وسطی ایشیا کے وحشی منگولوں کی زد میں تھا۔ دہلی کے

حکمرانوں کی وسطی ایشیا میں برپا منگول طوفان سے خود کو الگ رکھنے کی خواہش اتنی شدید تھی کہ انہوں نے اپنے بھائی بندوں کی طرف سے مدد کی اپیلوں پر بھی کان نہیں دھرا۔ وسطی ایشیا کا ایک حکمران جلال الدین خوارزم شاہ دہلی کے حکمرانوں کے ساتھ قرابت داری کے باوجود' منگولوں سے شکست کھانے کے بعد دو سال تک سندھ طاس کے طول و عرض میں متعاقب منگولوں سے جان بچا کر بھاگتا پھرا۔ خوارزم شاہ کے پاس ابھی تک اچھی خاصی فوج تھی جس کے بل پر اس نے مقامی آبادیوں کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ اس نے پسرور کو تاراج کیا۔ جنوب میں جا کر اچ کو آگ لگائی اور پھر دیبل پر قابض ہو گیا۔ دہلی کے فرمانروا منگولوں کے انتقام سے خائف تھے اسی خوف کے مارے انہوں نے خوارزم شاہ کی مدد سے اجتناب کیا۔ اس کے ایلچی کو خالی ہاتھ لوٹا دیا اور اس کے سفیر کے قتل سے چشم پوشی کی۔

سلطان بلبن (1266 سے 1287) کے پیشرو وسطی ایشیا کی سیاست سے مکمل طور پر لاتعلق رہے لیکن بلبن نے منگولوں کا راستہ روکنے کے لئے عملی اقدامات کئے۔ وہ ایک وزیر سے سلطان بنا تھا۔ اس نے اپنی سلطنت کو مضبوط اور وسطی ایشیا کے غارت گروں سے محفوظ بنایا لیکن اس کی قیمت وادی سندھ کو چکانا پڑی۔ بلبن نے دہلی کے تخت کو منگولوں سے بچانے کے لئے پنجاب اور سندھ کے شمال مغرب میں ایک طویل و عریض زمینی پٹی کے کنووں کو خشک اور آب پاشی کے نظام کو تباہ کر دیا' فصلوں اور دیہات کو آگ لگا دی اور اس طرح ایک ناقابل عبور سرحد تخلیق کر دی۔ بلاشبہ بلبن کا وضع کردہ یہ دفاعی نظام ایک صدی سے بھی زیادہ عرصے تک ناقابل تسخیر رہا اور بالآخر 1398 عیسوی میں تیمور کی ناقابل مزاحمت افواج اسے روندکر وادی سندھ سے ہوتے ہوئے دہلی تک جا پہنچیں۔

اگرچہ دہلی کے سلاطین نے وسطی ایشیائی حملہ آوروں سے محفوظ رہنے کے لئے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی لیکن اپنا وطن جسے وہ پیچھے چھوڑ آئے تھے' اس کی یاد ابھی پوری طرح ان کے دل سے محو نہیں ہوئی تھی۔ وہ اسی امید پر زندہ رہے کہ ایک نہ ایک روز وہ ایسی سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جو وسطی ایشیا تک محیط ہو گی۔ اس کے ساتھ ان کے دلوں میں پورے جزیرہ نما ہندوستان کو تسخیر کرنے کی خواہش بھی پلتی رہی۔ لیکن کئی بار کی کوشش کے باوجود وہ دونوں محاذوں پر ناکام رہے۔

علاؤالدین خلجی کے عہد حکومت (1296 سے 1316ء) کے دوران دہلی کے تخت کی عظمت اپنے عروج پر تھی۔ اس دور میں لگان کے نظام کو از سر نو منظم کیا گیا جس کے پیچھے بنیادی طور پر یہی مقصد کارفرما تھا کہ پیسہ اکٹھا کر کے پورے ہندوستان کی تسخیر کے خواب کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ علاؤالدین کے جرنیل اور وزیر ملک کافور نے جنوب کی طرف پیش قدمی بھی کی لیکن اسے محض جزوی کامیابی حاصل ہو سکی۔ محمد تغلق کا دور حکومت 1325 سے 1351ء عیسوی تک رہا۔ ان 26 سالوں میں علاقے فتح کرنے کی متعدد

کوششیں ناکامی سے دوچار ہوئیں اور تسخیر کا یہ خواب ادھورا ہی رہ گیا۔

مہم جوئی کی ان ناکامیوں نے دہلی سلطنت کے زیر تسلط علاقوں پر بھی برے اثرات مرتب کئے۔ جب تغلق نے شمال میں اپنی فوجی مہمات کے اخراجات پورے کرنے کے لئے جنوب میں ٹیکس بڑھائے تو کسانوں نے بغاوت کر دی۔ باغی جنوب پر اپنی بالادستی کو یقینی بنانے کے لئے اس نے دکن میں دولت آباد کے مقام پر نیا دارالحکومت بنانے کا آغاز کر دیا۔ شیخ چلیوں والا یہ منصوبہ اپنے ہی معاشی بوجھ تلے دب کر ناکام ہو گیا اور تین سال بعد اسے ترک کرنا پڑا لیکن اس دوران عوامی محاصل سے اور افرادی قوت کی شکل میں بے تحاشا دولت اس منصوبے پر صرف ہو چکی تھی۔ دولت کے ضیاع کے ایسے منصوبے 'بے لگام اختیارات کے من مانے استعمال' بیکار مہم جوئی' کسانوں اور دستکاروں سے محاصل کی وصولی کا ظالمانہ نظام اور ایسے بہت سے دوسرے عوامل کی بنیاد پر دہلی کے مسلمان سلاطین حکومت کرنے کا سیاسی اور اخلاقی جواز کھو چکے تھے۔

محمد تغلق بنیادی طور پر عاقبت نااندیش تھا۔ یہ وہی تھا جس نے پہلے پہل اپنے آپ کو زمین پر خدا کا سایہ قرار دیا۔ اور جس کا ثبوت اس کے دور حکومت میں جاری ہونے والے سکوں پر آج بھی موجود ہے۔ ایک بار جب معروف عرب سیاح ابن بطوطہ نے ایک ایسے صوفی بزرگ سے ملاقات کی جنہیں اب سلطان پسند نہیں کرتا تھا تو ابن بطوطہ کو محمد تغلق کی ناراضی کا سامنا کرنا پڑا 'سزا کے طور پر بطوطہ کو نو دن کے لئے روزے رکھنے پڑے اور دربار میں سلطان کے سامنے کئی دن تک قرآنی آیات کا مسلسل ورد کرنا پڑا۔

محمد تغلق کے بعد اس کے جانشینوں نے جتنی جنگیں لڑیں ان میں سب سے شدید اور اعصاب شکن وہ تھیں جو وادی سندھ میں گھکڑوں اور سارنگ خان کے خلاف لڑی گئیں۔

جسرت' سارنگ اور چاکر خان

وادی سندھ اس وقت طوائف الملوکی کی زد میں تھی جس سے حوصلہ پا کر سالٹ رینج کے ایک سردار شیخا گھکھڑ نے 1394 عیسوی میں لاہور پر قبضہ کر لیا۔ سلطنت کے نزدیک یہ بہت بڑی گستاخی تھی۔ پنجاب کے صوبیدار نے جس کا صدر مقام دیپال پور تھا' اپنے تمام وسائل اور افرادی قوت کو بروئے کار لا کر لاہور واپس لے لیا۔ سن 1398 عیسوی میں تیمور نے دہلی پر چڑھائی کی تو پنجاب میں اس کا مقابلہ گھکھڑوں سے ہوا۔ تیمور دہلی پہنچا تو شیخا نے جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے لاہور پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ دہلی سے واپسی پر ایک بار پھر شیخا نے تیمور سے مقابلہ کیا۔ شیخا مارا گیا اور تیمور اس کے بیٹے جسرت کو قیدی بنا کر اپنے ساتھ لے گیا۔

جسرت گکھڑ' تیمور کی قید سے بڑے دلیرانہ انداز میں فرار ہو کر سنگلاخ چٹانوں اور دشوار گزار راستوں سے گزرتا ہوا اپنے لوگوں میں واپس پہنچ گیا اور پھر وادی سندھ کا سب سے طاقتور جنگجو بن کر ابھرا۔ سالٹ

رنج اور بھیرہ تو پہلے ہی اس کی عملداری میں تھے 'اب اس نے سیالکوٹ اور لاہور پر بھی قبضہ کر لیا۔ پھر ستلج عبور کر کے ریاست تلونڈی کو فتح کرنے کے بعد وہ دیپال پور پر بھی قابض ہو گیا۔ تلونڈی اور دیپال پور کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کے بعد وہ پنجاب کا سب سے بڑا سردار بن چکا تھا۔

جس زمانے میں جسرت پنجاب اور شمالی سندھ میں مہم جوئی پر تھا' انہی دنوں ایک اور مہم جو بھی اپنی فوج کے ساتھ پنجاب کے شہروں میں سرگرم تھا۔ جسرت نے دہلی کی فوجوں سے براہ راست ٹکر لینے سے گریز کیا تھا لیکن کابل کا منگول شہزادہ شیخ علی ایسا نہ کر سکا اور نظام گڑھ کے مقام پر دہلی کی مضبوط اتحادی فوجوں سے شکست کھا کر واپس کابل فرار ہو گیا۔

اس دوران جسرت کو بھی کشمیر سے پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ ایسے وقت میں اسے مزید کمک کی ضرورت تھی۔ اس نے شیخ علی سے الحاق کر لیا۔ جسرت اور شیخ علی کئی ماہ تک وادی سندھ میں دندناتے پھرے اور اپنے راستے میں آنے والی ہر شے کو انہوں نے روند ڈالا اور ہر شہر کو فتح کر لیا۔ ان دونوں کو وادی سندھ سے نکالنے اور یہاں امن بحال کرنے میں دہلی کے مبارک شاہ کو کئی سال لگ گئے۔

دہقان جو آبادی کا بہت بڑا حصہ تھے 'ایسے غیر یقینی حالات میں بعض اوقات ان کے پاس اپنے گھر بار چھوڑ کے جنگلوں میں روپوش ہونے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہتا تھا۔ دربار کے مورخین اپنے روزناچوں میں پنجاب کے جن ڈاکو قبائل اور راہزنوں کے گروہوں کا ذکر کرتے ہیں وہ غالباً یہی مفرور کسان ہوتے تھے۔ جنگل اور پہاڑیاں جن کی پناہ گاہیں تھیں اور گزر اوقات کے لئے وہ حملے کرتے تھے۔

سارنگ ایسی ہی ایک کسان تحریک کا سربراہ تھا۔ جو 1419 میں ایک طاقتور بغاوت کی شکل اختیار کر گئی۔ جاگیردار اس تحریک کو کچلنے کے لئے متحد ہو گئے۔ سارنگ کو سرہند کے قریب شکست ہوئی اور وہ پہاڑوں میں کہیں روپوش ہو گیا۔ پریشان حال دہقان اب بھی اس کے جھنڈے تلے متحد تھے۔ سلطنت کو معاملہ اپنے ہاتھ میں لینا پڑا۔ آخر کار شاہی فوج کے مقابلے میں سارنگ کو شکست ہوئی اور اسے گرفتار کر لیا گیا۔ اسیری کے دوران موت سارنگ کا مقدر بنی جو اسے شہرت کی ان بلندیوں پر لے گئی جو صرف لوک داستانوں کے سورماؤں کے نصیب میں ہوتی ہے۔

چودہویں صدی عیسوی میں دو بڑے بلوچ قبائل آپس میں جنگ آزما تھے۔ بلوچستان میں زمین پر قبضے کی یہ لڑائیاں بعد میں وادی سندھ کے باقی علاقوں پر بھی اثر انداز ہوئیں۔ ایک ہی وقت میں تنگ دروں کے راستے ایک ہی علاقے کی طرف نقل مکانی کرتے ہوئے ان کی آپس میں ٹھن جاتی لیکن بلوچستان کے کشادہ علاقوں میں پہنچ کر وہ اپنے اپنے راستوں پر ہو لیتے۔ رند قبیلہ سبی میں آباد ہوا اور لاشاری کچھی میں لیکن اس کے باوجود ان کے درمیان اکثر جنگ جاری رہتی۔

چاکر خان، رند قبیلے کے ممتاز ترین سرداروں میں سے تھا۔ عام طور پر خیال یہی کیا جاتا ہے کہ پنجاب اور سندھ کے ان وسیع رقبوں پر جہاں بلوچ قبائل آباد ہیں وہ اسی بلوچ سردار کی قیادت میں حاصل کئے گئے۔ چاکر خان کے زیر تسلط بہت بڑا علاقہ تھا، جس میں بالائی قلات، زیریں کچھی، شمالی سندھ کا وسیع رقبہ اور ساہیوال تک جنوبی پنجاب شامل تھا۔ چاکر خان رومانی اور رزمیہ شاعری کا مقبول ترین ہیرو تھا اور اسے بلوچی سلسلہ نسب اور وادی سندھ کے ایک حصے کے لوک ورثے میں سرمایہ افتخار سمجھا جاتا ہے۔

12

پُر آشوب شمال' پُر امن جنوب اور پانی پت

بغاوتوں کی سرزمین

وسطی ایشیائی سیاست کا اتار چڑھاؤ بالواسطہ دہلی دربار کی اندرونی محلاتی سازشوں اور حکمران خاندانوں کے مستقبل پر اثر انداز ہوتا رہا۔ محمد غوری کے جانشینوں سے سید بادشاہوں تک' تمام حکمران ترک تھے۔ وہ اپنے اقتدار کی بقاء کے لئے افغانی النسل فوجی دستوں اور جرنیلوں پر زیادہ انحصار کرتے تھے لیکن ان سب کو اپنے افغان وابستگان کا مکمل اعتماد حاصل نہیں رہا۔ افغانوں کو خوش رکھنے میں صرف خلجی کامیاب رہے۔ بلبن اور محمد تغلق نے صلے اور سزا کے امتزاج سے اکثر جرنیلوں کی حمائت حاصل کی لیکن دوسرے حکمران اس حکمت عملی پر خوش اسلوبی سے عمل پیرا نہ ہو سکے جس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسلسل عدم استحکام نے سلطان کے اختیار اور سلطنت کے اتحاد کو خطرے میں ڈال دیا۔

اس انتہائی غیر یقینی صورت حال میں دہلی سلطنت اندرونی نفاق کی عیاشی کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ ہندوکش سے پرے منگول خطرہ منڈلا رہا تھا جو پہلے ہی وسطی ایشیا کے کئی خوش حال شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجا چکا تھا۔

لیکن یہاں ذرا دیر کے لئے رک کے ہمیں وسطی ایشیا اور منگولوں کی تاریخ کا تھوڑا سا جائزہ لینا ہوگا۔

چنگیز خان 1155ء میں پیدا ہوا اور 1206ء میں قراقرم کے تمام منگول' ترک اور تاتاری

قبائل کا ایک عظیم قرولتائی جرگہ ' منگولیا میں منعقد ہوا جس نے چنگیز خان کو اپنا سربراہ منتخب کر لیا۔ اس انتخاب کے ساتھ ہی چنگیز اپنی افواج کے ساتھ فاتحانہ مہم جوئی پر روانہ ہو گیا۔ بخارا ' سمرقند ' ہرات اور بلخ کے خوشحال اور گنجان آباد شہروں پر قیامتیں گذر گئیں۔ ان میں سے ہر شہر کی آبادی دس لاکھ سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔ لوگ تہ تیغ کر دیئے گئے۔ فصلوں کو آگ لگا دی گئی' مکانوں اور عمارتوں کو لوٹنے کے بعد مسمار کر دیا گیا اور نظام ہائے آبپاشی تباہ کر دیئے گئے۔

چنگیز کے جانشینوں میں سب سے دہشتناک ہلاکو خان نے عظیم الشان عباسی سلطنت کے دارالخلافے بغداد پر 1258ء میں قبضہ کر کے شہر کو اس کی رفعتوں سمیت خاک میں ملا دیا۔ اپنے پیچھے تباہی ' دکھ اور موت کی ایک خونریز لکیر چھوڑتے ہوئے ہلاکو یہاں سے حلب اور دمشق کی طرف نکل گیا۔

دو صدیوں تک منگول وسطی ایشیاء کی مسلم تہذیبوں کو مسلسل تباہ و برباد کرتے رہے لیکن وسطی ایشیاء میں منگول غارتگری کا اثر وادی سندھ اور ہندوستان پر قطعی مختلف اور مثبت انداز میں ہوا۔ مسلم شہزادے ' جرنیل ' منتظم ' شاعر اور صوفیا ' لامتناہی قافلوں کی شکل میں ' وسطی ایشیاء سے وادی سندھ اور ہندوستان کے نسبتاً محفوظ میدانوں کی جانب نقل مکانی پر مجبور ہو گئے۔ دانش کے اس امتزاج نے فلسفے ' ریاضی ' علم نجوم اور فنون لطیفہ کو جلا بخشی۔ مختلف زبانوں اور ان کے تخلیقی ادب کے اختلاط نے ایک نئی زبان اردو کو جنم دیا جس کا مطلب ہی لشکر کی زبان ہے۔ اس زبان میں وادی سندھ اور وسطی ایشیائی زبانوں کے علاوہ فارسی کے الفاظ بھی شامل ہیں۔

بے گھر مہم جوؤں اور ایرانی مسلمانوں کی مسلسل آمد اور ہندوستان کے حکمران طبقوں میں ان کی فوری قبولیت نے برصغیر کی سماجی ترقی پر اہم اثرات مرتب کئے۔ انہوں نے وہ مقام اور مرتبہ حاصل کیا جو بصورت دیگر شاید مقامی اشرافیہ کے حصے میں آتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وادی سندھ اور ہندوستان کے دو بڑے فرقوں یعنی ہندو اور مسلمانوں کے باہمی جذب و ادغام کے عمل میں رکاوٹ پیدا ہوئی۔ وسطی ایشیا اور ایران سے باکمال افراد کی مسلسل آمد نے اس امر کو یقینی بنا دیا کہ حکومتی اشرافیہ کی غالب اکثریت ایرانی پس منظر کی حامل ہو گی۔ یہی وجہ تھی کہ ہندو ' اپنی انتظامی صلاحیتوں پر فخر کرنے والے کشتریوں سمیت ' اعلیٰ انتظامی اور حکومتی عہدوں پر فائز ہونے سے محروم رہے۔

منگول ابھی تک ہندوستان نہیں پہنچے تھے۔ وہ اس کی انتہائی شمالی سرحدوں سے ہی واپس چلے گئے تھے۔ پھر 1398 میں تیمور نے چنگیز سلطنت کی تجدید کا عندیہ ظاہر کیا حالانکہ وہ خود منگول نہیں بلکہ ترک تھا لیکن اپنے آپ کو چنگیز خان کا جانشین قرار دیتا تھا۔

سمرقند کے شہزادر خوارزم شاہ کی طاقت کو بے مثال درندگی سے کچلنے اور پنجاب کو تاخت و تاراج کرنے کے بعد تیمور دہلی پر نازل ہوا۔ یہ تغلق خاندان کا آخری دور تھا۔ تیمور کے حملے کے بعد دہلی کے کھنڈرات اس کے نامزد کردہ حکمران کی میراث ٹھہرے اور اس طرح ہندوستان میں سید خاندان کی حکمرانی کی بنیاد پڑی۔

تیمور کے بعد نصف صدی کے بیشتر حصے میں دہلی سلطنت افلاس کا شکار رہی۔ اس دوران سلطنت بالخصوص وادی سندھ کو قحط اور طوائف الملوکی نے گھیرے رکھا۔ لگان کی وصولی کم اور سیاسی بے چینی زیادہ تھی اور سلطنت دہلی کے سید بادشاہ بھی اپنے افغان مصاحبین کی وفاداری برقرار رکھنے میں ناکام رہے۔

سلطنت کے زمانے میں وادی سندھ بغاوتوں کا مرکز رہی۔ کم و بیش ہر سلطان پنجاب میں بغاوتیں فرد کرنے میں الجھا رہا۔ ملکہ رضیہ کے دو صوبیداروں نے اوپر تلے بغاوت کی۔ پہلے لاہور کے صوبیدار کبیر خان نے اور پھر بھٹنڈہ کے صوبیدار التونیہ نے بغاوت کی۔ دوسری بغاوت ختم کرنے کی مہم کے دوران رضیہ سلطانہ گرفتار ہوئی۔ بعد میں گرفتار کرنے اور گرفتار ہونے والا' دونوں آپس میں مل گئے اور دہلی پر چڑھائی کردی جہاں انہیں فیصلہ کن شکست ہوئی۔ محمد تغلق کے دور میں اُچ' سندھ اور ملتان کے صوبیداروں نے بغاوت کردی۔ سندھ میں بغاوت فرد کرنے کی سعی کرنے کے بعد ٹھٹھہ میں تغلق کا انتقال ہو گیا۔

طوائف الملوکی کے باوجود ان صدیوں کے دوران جاگیردارانہ نظام مستحکم ہوا۔ سلطنت کے کمزور پڑنے سے جاگیردار زیادہ طاقتور اور خود مختار ہو گئے۔ جب بلبن نے ایسے خاندانوں سے بھی جاگیریں واپس لینے کی کوشش کی جن میں ہتھیار اٹھانے کے قابل بھی کوئی مرد نہیں تھا تو اتنی بدامنی پھیلی کہ سلطان کو بہ امر مجبوری یہ فیصلہ واپس لینا پڑا۔

ہندوستان کی ریاست' جاگیروں میں یکساں سطح پر محاصل لاگو کرانے میں ناکام رہی کیونکہ ہر جاگیردار کی کوشش ہوتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ لگان وصول کیا جائے جس کے باعث کسانوں کے لگان دینے کی اہلیت ختم ہوتی جا رہی تھی۔ سولہویں صدی کے آغاز میں نظام حکومت کے زوال اور پھر مکمل انہدام کے ساتھ ساتھ ہتھیار بند جاگیرداروں کی من مانیوں سے دیہی آبادی کی زندگیاں انحطاط اور پامالی کی آخری حدوں کو چھونے لگیں۔

لیکن اس کے باوجود دہلی سلطنت کے دور میں بہت سی اصلاحات کے علاوہ سماجی اور معاشی سطح پر بھی پیش رفت ہوئی۔ علم و فن کی دنیا کو امیر خسرو جیسا بے مثل عالم ملا۔ اگرچہ وسطی ایشیائی افراد ہندوستان میں کپڑے کی کتائی اور سلائی بہت پہلے متعارف کرا چکے تھے لیکن ترکوں اور ایرانیوں کی برصغیر میں آمد

ہوئی تو یہاں شلوار کرتے ' پشواز ' غرارے اور شروانی جیسے پر وقار ملبوسات کو رواج ملا۔ سلطنت دہلی سے پہلے آب پاشی کا مقامی نظام ' ڈھلوان پر اترتے بیلوں کے ذریعے کنویں سے ایک وقت میں ایک چھاگل نکالنے تک محدود تھا۔ اس پر مشقت انداز کے بجائے لوہے سے بنے ہوئے ایک بڑے پہیئے کے گرد لگے مٹی کے بہت سے برتنوں کے ذریعے آب پاشی کے لئے پانی حاصل کیا جانے لگا۔ ایک طرف سے یہ برتن لگاتار پانی میں ڈوبتے اور دوسری طرف پانی کی مسلسل دھار انڈیلتے چلے جاتے۔ یہ رہٹ کی ابتدائی شکل تھی اور تکنیکی اعتبار سے ایک اہم پیش رفت جس سے زرعی اہلیت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔

قبول اسلام کا عمل خاصا سست رفتار تھا حالانکہ صوفی تحریک کے مقابلے میں ہندومت کے پاس بھی بھگتی فلسفہ تھا۔ اس دوران متضاد نظریات کو یکجا کرنے ' طوائف الملوکیت کی ضرر رسانی کو کم کرنے اور کسانوں کی حالت زار کو بدلنے کے لئے ایک نیا رجحان اور ایک نئی کوشش سکھ مذہب کی ابتدائی شکل میں دکھائی دی۔ وقت گزرنے کے ساتھ سکھ مذہب کاشتکاروں کی سب سے طاقتور تحریک کی صورت اختیار کرنے والا تھا۔ بعد ازاں مغلوں کے دور میں سکھ مذہب وادی سندھ کے مقامی نظریات میں سب سے بڑھ کر قوم پرست فلسفہ ثابت ہوا۔

جب بہلول لودھی نے 1451 عیسوی میں سید حکمرانوں کے آخری فرمانروا کو شکست دی تو سلطنت کے ڈوبتے سورج پر چھائے ہوئے بادل چھٹ گئے اور یکایک شفق کی سنہری کرنوں نے سارا منظر روشن کر دیا۔ بہلول لودھی نے دہلی میں حقیقی افغان سلسلہ شاہی کی بنیاد رکھی جسے افغان فوج پر مکمل اعتماد تھا۔ فوج نے بھی اس اعتماد کا مثبت جواب دیا جس سے سلطنت کو استحکام نصیب ہوا۔

استحکام کا یہ دور ابراہیم لودھی تک جاری رہا جو 1517ء سے 1526ء تک حکمران رہا اور لودھی سلسلہ نسب کا آخری فرمانروا تھا۔ ابراہیم لودھی نے ناعاقبت اندیشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے وفاداری اور استحکام کو حکمران کا استحقاق سمجھا اور تمام تر اختیارات اپنی ذات میں مرکوز کرنا شروع کر دیئے۔ اس نے رواج اور ماضی کی روایات کو پس پشت ڈالتے ہوئے اتحادی قبائل سے مشاورت اور امور سلطنت میں ان کی شمولیت کو زیادہ اہمیت نہ دی۔ یہ غیر دانشمندانہ طرز حکومت جب حد سے گزرنے لگا تو شمال مغربی صوبیداروں نے اصلاح احوال کے لئے اپنے اولین مادر وطن سے تعاون چاہا۔

ان کا نجات دہندہ ' تو جیسے اشارے کا منتظر اور جنگ کے لئے بیتاب تھا۔ بدخشاں کا حکمران اور فرغانہ کا سابق سردار اپنی اوائل عمری کی بدحالی کے نتیجے میں اتنی زمانہ شناسی سیکھ چکا تھا کہ جرأت اور بے باکی کے ساتھ اس موقعے سے فائدہ اٹھانے کے لئے نکل کھڑا ہوتا اور ظہیر الدین محمد بابر نے ایسا ہی کیا کہ اس نے بڑی بے صبری کے ساتھ یہ موقعہ اچک لیا۔

جنوب میں الجبرے، علم ہئیت اور شیو پرستی کا عروج

اس تاریخی لمحے، جب بابر ہندوستان پر حملہ کرنے کے لئے تیار کھڑا ہے۔ ہم ذرا دیر کو رک کے برصغیر میں شمال جنوب تفریق کا جائزہ لیتے ہیں۔

اگر اس سلسلے میں صرف دہلی سلطنت کے عہد پر ہی واقعاتی تسلسل کے اعتبار سے سرسری نظر ڈال لی جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ شمال اور جنوب کے مابین حائل خلیج نے کس تیزی سے وسعت اختیار کی۔ شمال پر وسطی ایشیا کا اثر غالب تھا اور جنوب اس اثر سے قطعی بیگانہ اور مکمل طور پر ہندوستانی رہا۔

سلاطین دہلی کے عہد کی تین صدیوں کے دوران حقیقت یہ ہے کہ جنوب نے اپنی مخصوص دھج کے ساتھ مختلف سمتوں میں پیش رفت کی۔ گلبرگہ کی بھمنی بادشاہت نے چودھویں صدی عیسوی کے اوائل میں برسر اقتدار آتے ہی جزیرہ نما دکن کو شمال سے مکمل طور پر علیحدہ کر لیا۔ دکن میں یہ بادشاہت، سلطنت کے سابقہ صوبیدار ظفر خان نے قائم کی تھی۔ چند سال بعد جنوبی جزیرہ نما میں وجے نگر کی بادشاہت وجود میں آئی۔ اگرچہ ان دونوں ریاستوں کے درمیان قابل کاشت اراضی کا حصول وجہ نزاع رہا لیکن طویل ساحل اور منفعت بخش بحری تجارت نے خوشحال تاجروں کے جس طبقے کو جنم دیا تھا، اس کے تعاون سے بڑی حد تک اراضی کی عدم دستیابی کا تدارک ہوا۔ ریاست کو ان تاجروں سے محصولات کی مد میں خاصی رقم حاصل ہو جاتی تھی اور وجے نگر کے دربار میں تاجر گہرا اثر و رسوخ رکھتے تھے۔

محمد بن قاسم اور محمد غوری کے درمیانی پانچ سو برسوں میں وادی سندھ اور ہندوستان کے جنوبی جزیرہ نما کے مابین انمٹ تہذیبی دوریاں حائل ہو چکی تھیں البتہ راجستھان اور جمنا کے میدانی علاقے ان دونوں کی بعض مشترکہ خصوصیات کے حامل تھے۔

جنوب وہ سب کچھ تھا جو کہ شمال نہیں تھا۔ شمال پیداواری روابط کے جاگیرداری عہد میں داخل ہو چکا تھا، جنوب ابھی تک قبائلی اور بالعموم خانہ بدوشانہ طرز حیات کا حامل تھا۔ دشوار گذار سنگلاخ زمین اور قابل کاشت راضی کی عدم دستیابی کا فطری تقاضا یہی تھا۔ اگر ایک طرف شمال چھوٹی چھوٹی فرمانروائیوں اور بادشاہتوں میں منقسم، گھوڑوں کی ٹاپ اور طبل جنگ سے مسلسل گونجتا رہتا تھا تو دوسری طرف جنوب خاموش تھا۔ یہاں الجبرا اور علم ہیئت میں پیش رفت ہو رہی تھی اور لوگ شنکر اچاریہ کی صلح کیش تعلیمات پر کان دھرتے تھے۔ شمال میں مذہب پر درویش صوفیاء کا متحمل انداز غالب تھا لیکن اس کے ساتھ مسلمان جرنیلوں کا پرجوش عسکری طرز زندگی بھی یہاں دیکھنے میں آتا تھا۔

جنوب میں شدید ہیجانی تنتری رسوم پر مبنی شیو پرستی کا شہوت انگیز مسلک اپنے عروج پر تھا۔ شمال کے ہندو اور مسلم جاگیر دار نے اپنی عورتوں کو گھر کی چار دیواری تک محدود کرنا شروع کر دیا تھا۔ جن میں بہت سی عورتیں بے شمار لڑائیوں اور جنگی مہموں کا انعام بھی ہوتیں جب کہ جنوب میں مادر سرانہ قبائلی اثر و رسوخ نے مندر میں ناچنے والیوں کی سرپرستی کا آغاز کر دیا تھا اور ان کے رقص کو پاک اور مقدس رسم کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔ شمال میں عورتوں کو پردے کے پیچھے رکھنے کی رسم رائج ہو چکی تھی۔

شمال مسلسل داخلی جنگ و جدل کے باعث نڈھال تھا۔ یہاں دیہاتوں اور دستکاروں پر ان کی استطاعت سے زیادہ محصولات عائد تھے جس کی وجہ سے اناج پیدا کرنے والا اور تاجر طبقہ دونوں ناتواں ہو چکے تھے۔ قصبے مفلس اور پیداواری اہلیت سے عاری ہو گئے تھے۔ اس کے برعکس جنوبی جزیرہ نما کے ساحلی شہر خوش منظر اور خوشحال تھے۔ تجارتی گہما گہمی عروج پر تھی یہاں دنیا بھر کی مصنوعات دستیاب تھیں۔

شمال کا جاگیر دار کسان کی فاضل پیداوار ہتھیا کے بے مقصد جنگوں پر صرف کر رہا تھا۔ جس نے معاشرے کو مسلسل بد امنی میں مبتلا کر دیا تھا۔ جنوب میں ساحلی تجارت کی فراوانی کے نتیجے میں زندگی خوشحال، رنگا رنگ اور جوش حیات سے بھرپور ثقافت میں ڈھل چکی تھی جب کہ شمال چاروں طرف سے خشکی میں گھرا ہوا ایک ایسا خطہ تھا جو سمندر تک رسائی کے لئے طویل دریائی راستوں کا محتاج تھا۔ بین البراعظمی وسطی ایشیائی رابطہ بھی سمندر تک رسائی کا وسیلہ نہیں بن سکا تھا۔ جنوب کی ریاستیں اپنے تجارتی اور عسکری بحری بیڑوں میں اضافہ کر کے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں کوشاں تھیں۔ پلاوا، چالکیا اور پانڈیا ریاستوں نے بحری تجارت اور ساحلی تجارت میں چولا خاندان کی روایت کو برقرار رکھا۔ محصولات اور منافع میں اضافے کے ساتھ تنازعات میں بھی شدت آتی گئی۔ شمال کی طرح اس بد نصیبی نے جنوب کو بھی بیرونی حملوں کے خطرے سے دوچار کر دیا۔ جنوب میں امن کے ایک ہزار سال اپنے اختتام کو پہنچ رہے تھے۔

شمال اور جنوب کی نسلی اور ثقافتی تفریق سے جنم لینے والے تضادات، دکن کی گلبرگہ ریاست کے حصے بخرے ہونے کے المئے میں جتنی صراحت سے نظر آئے شاید کہیں اور اتنے نمایاں ہو کر سامنے نہیں آسکے تھے۔ دکن کے مقامی لوگ مہاجر نو آباد کاروں سے کشیدہ خاطر رہتے تھے۔ یہ بیزاری بالآخر پردیسیوں کے قتل عام پر منتج ہوئی۔ ریاست بد امنی کے اس شدید جھٹکے کو برداشت نہ کر سکی۔ مختلف صوبیداروں نے اپنے علاقوں میں آزادی کا اعلان کر دیا اور ریاست پانچ ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ اس طرح سولہویں صدی میں بیجاپور، گولکنڈا، احمد نگر، بِڈار اور برار کی جنوبی ریاستیں وجود میں آئیں۔

وجے نگر کے تاجروں کے ساتھ بڑھتے ہوئے تنازعات نے حال ہی میں قائم ہونے والی ریاستوں

میں سے چار کو متحد کر کے وجے نگر کے خلاف میدان جنگ میں لا کھڑا کیا۔ اگرچہ وجے نگر نے پرتگال کے ساتھ اپنے دوستانہ تعلقات کے ذریعے گھوڑوں کی درآمد سے بھرپور استفادہ کیا لیکن 1564ء میں اس کی اپنے سرحدی ہمسایوں کے ساتھ جنگ ' جنوب کی باہمی تباہ کاری کی بنیاد بنی۔ لگ بھگ اسی زمانے میں شمال کی ایک نئی اور مستحکم ریاست ' خستہ حال جنوب پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنا رہی تھی کہ 1564 تک تو ظہیرالدین بابر ' اس کے بیٹے اور اب پوتے نے دہلی کے تاجداروں کی حیثیت سے اپنا اقتدار بہت مستحکم کر لیا تھا۔

مگر ہم "سندھ ساگر" کی کہانی سے ذرا آگے چلے گئے ہیں۔ ہم تو بدخشان کے حکمراں کی موقعہ پرستی کی بات کر رہے تھے۔

تاریخی فاصل آب

پانی پت کا میدان جنگ ہی وہ جگہ تھی جہاں اکثر اوقات ہندوستانی سلطنت کی قسمت کے فیصلے رقم ہوئے لیکن اس کا مطلب یہ قطعی نہیں کہ وسطی ایشیائی حملہ آوروں کے لئے وادی سندھ محض ایک خاموش گذرگاہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ وسطی ایشیا کی ریاستوں نے وادی سندھ کو ہمیشہ اپنا بیرونی مستقر سمجھا' ایک ایسا مستقر جس نے ہمیشہ مزاحمت کی۔ بیرونی حملہ آور صرف اسی صورت ہندوستان پر قابض ہو سکتے تھے جب وہ وادی سندھ کو کامیابی سے عبور کر کے پانی پت کوروکشیتر یا ترائن کے میدان جنگ تک پہنچ جاتے تھے۔ مقبول لیکن من گھڑت کہانیوں کے برعکس وادی سندھ ایک ایسی دفاعی سرحد ثابت ہوئی جس نے برصغیر کے لئے ہمیشہ اولین اور مضبوط ترین مزاحمت فراہم کی۔

لیکن اس کے باوجود وسطی ایشیائیوں نے اپنے تئیں وادی سندھ کو ہمیشہ وسطی ایشیا کا حصہ سمجھا۔ ان کے لئے ان کی بین الاقوامی سرحد ' تو دریائے ستلج تھا۔ پانی پت کی اہمیت بھی اسی لئے تھی۔ پشاور اور لاہور کے مزاحم ہونے پر جب وسطی ایشیا کے حملہ آور ان پر قبضہ کرنے میں کامیاب رہتے تو وہ اس فتح کو اپنے ہی علاقوں پر دوبارہ قبضے کے مترادف سمجھتے تھے۔ ہندوستان پر بالادستی دہلی کی فتح سے مشروط ہوتی تھی۔ دہلی جو وادی جمنا کا محافظ تھا اور پانی پت کا میدانی علاقہ دہلی میں داخل ہونے کا راستہ بھی تھا اور تاریخ کی عظیم فاصل آب بھی۔

یہاں سے ہم دوبارہ 1526ء میں ہونے والی پانی پت کی لڑائی کی طرف لوٹتے ہیں۔

13

دوسری عظیم سلطنت

ایک قدیم تصوراتی سرحد

اپنے برتر توپ خانے اور شہسواروں کی مہارت کے نتیجے میں پانی پت کا میدان بابر کے ہاتھ رہا اور 1526 عیسوی میں وہ دہلی کے تخت پر قابض ہو گیا لیکن بابر کا معرکہ کوئی ہندو مسلم معرکہ نہیں تھا۔ اس نے کسی غیر مسلم حکمران سے ہندوستان نہیں چھینا تھا بلکہ سلطنت عہد کے آخری مسلمان بادشاہ ابراہیم لودھی کو شکست دی تھی۔ مگر اسی سال کے دوران آگرہ کے نزدیک ایک راجپوت اتحاد پر فتح حاصل کرنے سے ہندوستان کی بادشاہت پر اس کے دعوے کو مزید تقویت ملی۔ اس طرح ہندوستان میں عہد مغلیہ کے شاندار دور کا آغاز ہوا۔ مغلیہ خاندان نے 1707ء تک ہندوستان پر بڑے موثر انداز میں حکومت کی اگرچہ اس کے بعد بھی مزید 150 سال تک، تیزی سے سکڑتی ہوئی سلطنت پر ان کی علامتی فرمانروائی جاری رہی۔

یہاں مغلیہ عہد کی تاریخ کو از سر نو دہرانا مقصود نہیں۔ اس سے کہیں زیادہ جامع تحریروں میں بڑی مہارت اور ثقاہت کے ساتھ یہ کام سرانجام دیا جا چکا ہے اس تحریر کا مقصد تو صرف ایسے واقعات و حقائق کو سامنے لانا ہے جو گورداسپور سے کاٹھیاوار کی تاریخی اور قدیم سرحد کے دونوں طرف وادی سندھ اور ہندوستان کے مابین تضادات کو نمایاں کرتے ہوں یا ان کی اہم خصوصیات کو اجاگر کرنے میں مدد دیتے ہوں اور ظاہر ہے اس کے لئے بہت زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں صرف ایسے حقائق کا ذکر ہی کافی ہے جو ہماری اس سوچ یا اس مفروضے کی توثیق کرتے ہیں یا پھر اس سے براہ راست

متصادم ہیں۔

اگرچہ گورداسپور کا ٹھیا دار قوس، بر صغیر کے نقشے پر محض ایک تصوراتی لکیر ہے لیکن یہ تاریخ اور ثقافت کی ایک ایسی ٹھوس حد فاصل کی نشاندہی کرتی ہے جسے باقاعدہ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس تناظر میں اگر مغلیہ دور پر نظر ڈالی جائے تو وادی سندھ اور ہندوستان پر مشتمل اس وسیع اور ہمہ گیر سلطنت کی چند ایسی خصوصیات نمایاں ہو کر سامنے آتی ہیں جو اس خطے کے مخصوص سیاسی اور معاشرتی نظام کی عکاس ہیں جس میں کسی نمایاں وقفے کے بغیر ہمیشہ ایک تسلسل قائم رہا اور یہ خصوصیات اس قدیم اضطرابی لہر کا بین ثبوت بھی ہیں جو وادی سندھ کو ایک آزاد قومی ریاست' کی حیثیت سے اپنا تشخص برقرار رکھنے پر اکساتی ہیں۔ خصوصی تشخص برقرار رکھنے کی یہ خواہش اور آزاد ریاست یا علاقے کی حیثیت سے خود کو منوانے کی یہ قدیم اضطرابی لہر ہی بالآخر پاکستان کی جغرافیائی سرحدوں کے تعین میں فیصلہ کن ثابت ہوئی۔

دہلی پر قبضہ کرنے اور اسے اپنا دارالحکومت بنانے کے باوجود مغل اپنی وسطی ایشیائی سرزمینوں کی طرف لوٹنے کے جذبے سے مغلوب رہے۔ 1526ء سے قبل بابر نے تین بار ہندوستان فتح کرنے کی کوشش کی اور وہ ہر ناکامی کے بعد واپس کابل گیا 1530ء میں جب بابر نے وفات پائی تو اسے وصیت کے مطابق شمالی میدانوں اور پہاڑوں سے پار کابل میں دفن کیا گیا۔

بابر اپنی تین ناکام مہمات کے دوران وادی سندھ کے قلب تک تو آ پہنچا تھا۔ مگر وادی کو سر کر کے ہندوستان میں داخل نہ ہو سکا۔ 1505ء میں وہ پہلی بار ہندوستان فتح کرنے کے لئے نکلا۔ ہوں' کوہاٹ اور ڈیرہ جات کی فتح کے بعد اسے پسپائی اختیار کرنا پڑی اور وہ کابل لوٹ گیا۔ دوسرے حملے کے لئے وہ باجوڑ کے راستے وادی سندھ میں داخل ہوا۔ قلعے کو فتح کر کے اس نے کم و بیش تین ہزار افراد ہلاک کئے اور تیمور کی روایت کے مطابق یہاں انسانی سروں کے مینار تعمیر کئے۔ ان حملوں کے دوران صرف ان پٹھانوں کی جان بخشی کی گئی جو منہ میں گھاس دبائے بطور "بابر کی گائے" اس کے سامنے سے گزرے۔ بابر نے سخت کوش اور بہادر یوسف زئی قبائل کو اپنا مستقل اتحادی بنانے کے لئے ان کے سردار کی بیٹی بی بی مبارکہ سے شادی کی۔ مگر بابر کے تخت کے وارثوں کو اس رشتے کے باوجود یوسف زئی قبائل کی بغاوتوں کا سامنا رہا۔

بابر ہندوستان پر قبضہ کرنے کی تیسری کوشش کے دوران بھیرہ' سیالکوٹ اور دیپالپور تک آ سکا لیکن پنجاب میں سخت ترین مزاحمت کے باعث دہلی کا تخت بدستور اس کی پہنچ سے دور رہا۔ دراصل وادی سندھ کے بہادر لوگوں کی پناہ میں ہندوستان دفاعی اعتبار سے ایک ایسا مضبوط قلعہ تھا جہاں تک

پہنچنا بھی حملہ آوروں کے لئے آسان نہیں تھا۔ وادی سندھ کی مزاحمت ہر مرتبہ ایک ناقابل تسخیر دیوار کی طرح حملہ آوروں کا راستہ روکتی رہی۔ ہر دفعہ گرمیوں کے آغاز پر بابر کو واپس کابل کی طرف پسپائی اختیار کرنا پڑتی۔

بابر مزاحمت سے کس قدر پریشان تھا اس کا اظہار بابر نامے میں اس کی اپنی تحریر سے ہوتا ہے۔ 29 دسمبر 1525ء کو اس نے لکھا تھا کہ "سیالکوٹ پر قبضے کے باوجود جاٹ اور گوجروں کی مزاحمت جاری رہی۔" اگرچہ بابر نے انہیں راہزن قرار دیا ہے لیکن اسے یہ اعتراف بھی تھا کہ یہ راہزن صرف ان لوگوں پر حملہ آور ہوتے جو فاتحین کے پڑاؤ کی طرف جارہے ہوتے ہیں۔ بابر لکھتا ہے کہ "جب کوئی ہندوستان میں داخل ہوتا ہے تو یہ جاٹ اور گوجر لاتعداد جتھوں کی صورت میں پہاڑوں اور میدانوں سے مال مویشی لوٹنے آجاتے ہیں۔ یہ بدنصیب لوگ عقل سے عاری ہیں۔ کیونکہ ہمیں ملک دشمن سمجھتے ہوئے انہوں نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز اس وقت کیا جب ہم اس پر قبضہ کر چکے تھے۔ جب ہم سیالکوٹ پہنچے تو وہ پر آشوب غول کے مانند غریبوں اور ضرورت مندوں پر اس وقت ٹوٹ پڑے جب وہ قصبے سے نکل کر ہمارے پڑاؤ کی طرف آرہے تھے اور انہیں برہنہ کر دیا" ظاہر ہے کہ صرف دربار ہی کی جانب جانے والے لوگوں پر حملہ کر کے انہیں برہنہ کرنے والے محض چور ڈاکو تو نہیں ہو سکتے تھے ان حملوں کی نوعیت تو سیاسی ہی ہو سکتی ہے۔

بابر ایک بار وادی سندھ عبور کر کے پنجاب سے آگے نکلا تو دہلی اور ہندوستان اس کے قدموں تلے تھا۔ پانی پت کی فتح ایک عہد ساز واقعہ تھا۔ نتیجے میں ایک نئی سرزمین پر بابر اور اس کے سلسلہ نسب کے اقتدار کا آغاز ہوا۔

آج کے بعد دہلی بابر کا مستقل گھر تھا اور اب اسے کابل صرف دفن ہونے کے لئے جانا تھا۔ پانی پت کی جنگ ظہیر الدین بابر کی ایک فیصلہ کن کامیابی تھی۔

طفل شاہی، قلعے کی فصیل پر

وادی سندھ کے بارے میں وسطی ایشیائی حکمرانوں کا نظریہ آج کے مورخین اور ہندوستانی تجزیہ نگاروں کی سوچ سے یکسر مختلف تھا۔ وسطی ایشیا نے وادی سندھ کو کبھی برصغیر یا ہندوستان کا حصہ تصور نہیں کیا بلکہ اسے ہمیشہ اپنی "تاریخی میراث" قرار دیا اور انہیں نہ تو آسانی کے ساتھ اس دعوے سے دستبردار ہونا تھا اور نہ ہی اس کے خود ساختہ جلاوطن طالع آزما اپنے آبائی وطن کی وفاداری کے مدھن سے کبھی آزاد ہو پائے۔ کابل کی نظریں ہمیشہ ہندوکش کے پار وادی سندھ پر گڑی رہیں۔

بابر کی موت کے چار سال بعد اس کے بیٹے اور جانشین ہمایوں کو اپنے بھائی اور کابل کے گورنر کامران کی مہم جوئی کا سامنا کرنا پڑا۔ کامران نے آگے بڑھ کر پنجاب کو بھی اپنی تحویل میں لے لیا تھا لیکن اس پر بھی کامران کی تشفی نہیں ہوئی اور وہ مسلسل اپنے بھائی ہمایوں سے برسرپیکار رہا۔ جب مستقبل کا شہنشاہ ہند، تخت الٹ جانے کے سبب اپنی بدبختی کے ہاتھوں پریشان ہو کر مارا مارا پھر رہا تھا تو ایسے وقت میں بھی کابل کا گورنر کامران اپنے بھائی کے خلاف صف آرا ہو گیا۔

ہندوستان میں ہزیمت اٹھانے کے بعد وسطی ایشیا کے مہم جو ہمیشہ پہاڑوں کے پار شمال مغرب میں پناہ لیتے تھے۔ جب شیر شاہ سوری، ہمایوں کے تعاقب میں تھا تو ہمایوں کابل سے کتراتے ہوئے جنوبی سندھ کے راستے ایران کی جانب فرار ہو گیا کیونکہ وہ اپنے بھائی کامران کی عداوت اور کینہ پروری سے اچھی طرح آشنا تھا۔ یہ عداوت اس وقت اور بھی کھل کر سامنے آگئی جب کامران نے اپنے نوزائیدہ بھتیجے اور ہمایوں کے بیٹے اکبر کو سیاسی دباؤ کے طور پر استعمال کیا۔

شیر شاہ سے جان بچا کر جب ہمایوں ایران کی طرف فرار ہوتے ہوئے سندھ کے شہر عمر کوٹ میں تھا تو ملکہ حمیدہ بانو کے بطن سے اکبر پیدا ہوا۔ ہمایوں نے بیوی اور نومولود کو عمر کوٹ کے راجہ کے پاس چھوڑا اور خود ایران پہنچ گیا۔ سندھی راجہ مرزا شاہ حسن ارغون نے انتقامی کارروائی سے خوفزدہ ہو کر جب شہزادے سے جان چھڑانے کی ٹھانی تو اس نے نومولود اکبر کو دہلی کے سلطان شیر شاہ کے حوالے نہیں کیا کیونکہ راجہ کی دانست میں تو وادی سندھ کا حقیقی حکمران کابل کا فرمانروا تھا۔ لہٰذا اس نے شہزادہ اکبر کو اس کے چچا کامران کے حوالے کر دیا۔ راجہ کا خیال تھا کہ کامران کے نزدیک ننھے اکبر کو پناہ دینے سے زیادہ بڑا جرم یقیناً معزول ہمایوں کو اپنے علاقے میں بلا روک ٹوک دو سال تک آزادانہ رہنے کی اجازت دینا تھا اس لئے راجہ کے نزدیک اپنے حکمران کے غیض و غضب سے ڈرنے میں زیادہ دانائی تھی۔ اس معاملے میں وہ نہ تو دہلی کے سلطان سے خائف ہوا اور نہ ہی اس نے خود کو تخت دہلی کی وفاداری کا پابند سمجھا۔ سندھی راجہ نے شہزادے کے علاوہ اپنی بیٹی ماہ چوچک بیگم کو بھی کامران کے عقد میں دے دیا۔

ننھا اکبر اوائل عمری ہی میں ڈرامائی واقعات کے حیران کن سلسلے کا خاموش تماشائی تھا۔

اکبر کو مرزا کامران کے حوالے کئے جانے کے چند سال بعد ہمایوں نے کابل پر حملے کا قصد کیا۔ بھائی کی برتر ایرانی افواج سے خائف ہو کر کامران نے کمسن اکبر کو قلعے کی فصیل پر محاصرہ کرنے والی فوج کے سامنے لا کھڑا کیا۔ اسے امید تھی کہ باپ حملہ کر کے بیٹے کی جان کا خطرہ نہیں لے گا لیکن ہمایوں اپنے ارادے میں اٹل رہا اور بیٹے کی جان کی پرواہ کئے بغیر پورے جوش و خروش سے حملہ آور ہوا۔ قلعہ

سرنگوں ہوا' اکبر بہ حفاظت آزاد کرالیا گیا اور گرفتار کامران کی آنکھیں نکال کر اسے اندھا کر دیا گیا۔

مغل شہزادوں کے لئے کابل کی گورنری بہت ہی باعث توقیر منصب تھا۔ خاص طور پر اس لئے بھی کہ دولت سے مالا مال وادی سندھ جب خود مختار نہ ہو تو کابل یا دہلی میں سے کسی ایک کی تحویل میں ہو سکتی تھی۔ دہلی پر مغلوں کی حکمرانی مستحکم ہو جانے کے بعد بھی شاہی خاندان کے ممکنہ وارث ہمیشہ افغانستان کی مہمات میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں کوشاں رہے اور ان کی یہ مہم جوئی اس وقت بھی جاری رہی جب افغانستان پر دہلی کی گرفت ڈھیلی پڑتی جا رہی تھی۔ جب اورنگ زیب 1649ء اور 1652ء میں مسلسل دوبار قندھار کو ایرانیوں سے واپس لینے میں ناکام رہا تو دارا شکوہ نے اورنگ زیب کو نیچا دکھانے کے لئے شہر فتح کرنے کی پیشکش کی۔ 1653ء میں دارا شکوہ کا ناکام حملہ' مغلوں کی جانب سے قندھار واپس لینے اور سلطنت ہند کا حصہ بنائے رکھنے کی آخری کوشش قرار دیا جا سکتا ہے۔

وادی سندھ میں مغلیہ عہد کے باغی

دہلی کی حکومت کے خلاف وادی سندھ سے پے در پے اٹھنے والی بغاوتیں' آزادی اور خود مختاری کے لئے وادی سندھ کی مرکز گریز قوت کا بر ملا اظہار ہیں۔ اکثر ادوار کی سیاسی بدامنی کے باوجود دریائے سندھ اور اس کے معاون دریا قابل کاشت اراضی کے وسیع رقبے کو سیراب کر کے قابل قدر فاضل پیداوار مہیا کر رہے تھے۔ انہی دریاؤں کے کنارے باغیوں کے لئے قدرتی پناہ گاہیں ثابت ہوتے تھے لہٰذا وادی سندھ بغاوتوں کے آغاز اور ان کی مسلسل کفالت کے حوالے سے انتہائی موزوں جگہ تھی۔ شمال اور جنوب کے باغیوں کے لئے بھی یہ خطہ پناہ گاہ کی حیثیت رکھتا تھا۔

مثال کے طور پر بیرم خان اپنی بغاوت میں شدت پیدا کرنے کے لئے اس خطے کے سوا اور کہاں جا سکتا تھا؟ بیرم خان کی بغاوت کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ اس بغاوت نے مغل سلطنت کو ہلا کے رکھ دیا تھا۔ بیرم خان نوجوان شہنشاہ کا اتالیق تھا۔ بیرم کے ہاتھوں گورداسپور میں تیرہ سالہ اکبر کی تاجپوشی ہوئی تھی اور اسی نے اپنے نوخیز بادشاہ کے لئے اجمیر' گوالیار اور پنجاب فتح کئے تھے لیکن بیرم خان شیعہ مسلک سے تعلق رکھتا اور جب اکبر کے دربار میں سنی اثر و رسوخ کو تقویت حاصل ہوئی تو بیرم خان راندۂ درگاہ ٹھہرا۔ اکبر جیسے کشادہ نظر بادشاہ کے دربار میں بھی ڈھکے چھپے انداز میں کٹر مذہبی فرقہ واریت موجود تھی۔ بیرم وہاں سے بھاگ کر سیدھا باغیوں کی پناگاہ' وادی سندھ میں پہنچا لیکن بالآخر اتالیق نے اپنے شاگرد اور ہندوستان کے شہنشاہ کی فوجی برتری کے ہاتھوں شکست کھائی۔ اکبر نے ترس کھا کے اپنے اتالیق کی جان بخشی کر دی اور اسے ملک بدر ہو کر مکہ جانے کی اجازت دے دی لیکن گجرات

میں کسی گمنام شخص کے ہاتھوں بیرم خان قتل ہو گیا۔ کیا اس قتل کا حکم اکبر نے دیا تھا؟ کیا اکبر کو قتل کی اس سازش کا علم تھا؟ کیا یہ قتل محض کسی مذہبی جنونی کے ہاتھوں ہوا تھا؟ یہ سوال بھی تاریخ کے بہت سے ایسے تشنہ سوالوں میں سے ہیں جن کا شاید کبھی جواب نہ مل سکے۔

1606 عیسوں میں جہانگیر کے سب سے بڑے بیٹے نے بھی پنجاب میں ہی بغاوت کا علم بلند کیا۔ فتح ایک بار پھر مرکز کی برتر فوج کو حاصل ہوئی اور باغیوں کو سر عام انتہائی کڑے اور خونریز انتقام کا نشانہ بنایا گیا۔ شاہ جہان کے بیٹے دارا شکوہ نے بھی اپنے بھائی اورنگ زیب کے خلاف مہم کا آغاز وادی سندھ سے کیا تھا۔

مرکز کی طرف سے وادی سندھ میں تعینات کئے جانے والے فوجی جرنیلوں اعلٰی انتظامی عہدیداروں اور دوسرے اکابرین کی بغاوتیں تو عام تھیں۔ سلیم شاہ سوری کے دور میں لاہور کے صوبیدار کی بغاوت (1545ء)' نیازیوں کی بغاوت (1548ء) اکبر کے نائب اور پنجاب کے گورنر شاہ عبدالعالی کی بغاوت (1556ء)' گکھڑوں کی بغاوت (1558ء) روشنائیوں کی پے در پے بغاوتیں' اکبر اور پھر جہانگیر کے عہد میں بالائی وادی سندھ کے یوسف زئی قبائل کی بغاوتیں' خوشحال خان کے زمانے میں خٹک قبائل کی بغاوت اور اکبر کے عہد میں بھٹی قبیلے کے سردار عبداللہ کی قیادت میں پنجاب کے مزارعوں اور کسانوں کی تحریک مزاحمت' مغل دور میں وادی سندھ کی نمایاں ترین بغاوتیں تھیں۔ سکھوں کے چوتھے گورو ارجن کی ہلاکت تشدد کے نتیجے میں ہوئی جس کے بعد پنجاب میں سکھوں کی شورش کم و بیش مسلسل ہی جاری رہی۔

سکھ مذہب کی کہانی بے خونی اور الم ناک واقعات سے بھری پڑی ہے اور وادی سندھ کی تاریخ کے ایک بڑے حصے پر محیط ہے۔

فطری میلانِ آزادی

سکھ مذہب' اپنے آغاز میں نچلی ذاتوں اور دہقانوں کی ایک مشترکہ تحریک تھی۔ یہ جاگیرداری کے خلاف ایسی جدوجہد تھی جس میں پنجاب کے کسان اور شہری متحد ہو کر عظیم مغلوں اور درانی شاہوں اور ان کی حمایت کرنے والے مقتدر مسلمان اور ہندو زمینداروں کی بالادستی کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ یہ تحریک اپنے آغاز میں حکمران طبقوں کی باہمی کشمکش کو مسترد کر کے وادی سندھ میں رائج مختلف مذہبی عقائد میں ہم آہنگی پیدا کرنے میں کوشاں رہی۔ شہنشاہ اکبر نے بھی ایک ایسا نظام یعنی دین الٰہی وضع کیا تھا اور اسے رائج کرنے کی کوشش بھی کی جو دونوں بڑے مذاہب کے مابین ایک

درمیانی راستہ ثابت ہو لیکن شدید بنیاد پرستانہ ردعمل نے اس تجربے کی کامیابی کے امکانات معدوم کر دیئے۔

گرونانک (1468ء تا1539ء) کی تعلیمات کا ذکر اسی کتاب کے ایک اور باب میں بھی ہو گا لیکن یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ گرونانک نے دونوں بڑے مذاہب میں سے کسی کو بھی اپنے فلسفے کی بنیاد نہیں بنایا تھا بلکہ یکسر ایک نئے نظریئے کو رواج دینے کی کوشش کی اور اسی لئے اس نظریئے کو نسبتاً زیادہ پذیرائی حاصل ہوئی۔ نانک بھی دونوں بڑے مذاہب کے باہمی نزاع کا شاکی تھا اور اس کے خیال کے مطابق اس دور میں ہر طرف پھیلی ہوئی بے چینی اور افراتفری کی وجہ یہی باہمی مسابقت تھی۔

پہلے تین گوروؤں کے زمانے میں صرف تاجر' دستکار اور کسان سکھ مذہب کے پیروکار بنے۔ ابتدا میں اس مذہب کی کوئی عملی تنظیم یا انتظامی ڈھانچہ موجود نہیں تھا۔ چوتھے گرو ارجن کے دور میں اسے کچھ جاگیردار خاندانوں کی حمایت بھی حاصل ہو گئی اور امرتسر میں زمین حاصل کر کے ایک گوردوارہ بھی تعمیر کر لیا گیا۔ گرو ارجن نے سکھوں کو مستقل بنیادوں پر منظم کیا اور ان کی آمدنی سے باقاعدہ چندہ وصول کیا جانے لگا۔ رضاکارانہ ادائیگی کی بجائے ہر خاندان کے لئے ایک مقررہ رقم کا تعین کر دیا گیا۔ سکھوں کو شہنشاہ اکبر کی حمایت بھی حاصل رہی لیکن جہانگیر کے عہد حکومت میں جب اس کے بیٹے خسرو نے پنجاب میں علم بغاوت بلند کیا تو سکھوں نے اس کا ساتھ دیا' سزا کے طور پر جہانگیر نے گرو ارجن کے قتل کا حکم صادر کیا۔ اپنے چوتھے گورو کی اذیت ناک موت کا سکھوں کو بہت صدمہ ہوا تھا اور اس کے بعد سے مغلوں کے خلاف سکھوں کی سرکشی مسلسل جاری رہی۔

پنجاب میں صرف سکھ ہی مغلوں کی مزاحمت نہیں کر رہے تھے اور بھی کئی سورما تھے جن میں ایک عبداللہ بھی تھا۔ رچنا دوآب کے اس بہادر سپوت کا ذکر کئے بغیر وادی سندھ کے اس دور کا احوال مکمل نہیں ہو سکتا۔

ڈلا بھٹی کے نجی منشور آزادی کا نفاذ

وادی سندھ میں بپا ہونے والی شورشوں کے باعث دہلی کے حکمرانوں کو لاہور میں اکثر شاہی دربار منعقد کرنا پڑتا تھا۔ اس خطے کے باغیانہ تیور' بادشاہ کی موجودگی کا تقاضا کرتے تھے۔ شہنشاہ اکبر باقاعدگی سے لاہور آتا تھا۔ عبداللہ نے ایک طویل عرصے تک اسے یہاں الجھائے رکھا تھا۔

1589 عیسوی میں جب اکبر کشمیر سے واپسی پر لاہور آیا تو اس نے مسلسل نو سال یہیں گزارے۔ اس دوران شاہی قلعے کے محل کو وسعت دی گئی۔ آج بھی قلعے کی سیر کرانے والے گائیڈ اس بات کا حوالہ'

ضرور دیتے ہیں۔ تاریخی واقعات اور درسگاہوں میں پڑھائی جانے والی کتابوں میں بھی اکبر کے لاہور میں اس طویل قیام کا ذکر ملتا ہے لیکن ان حوالوں میں شاید ہی یہ وضاحت ملتی ہو کہ اپنے قیام کے دوران اکبر کی ساری توجہ شمالی سرحدوں کو محفوظ بنانے اور پنجاب کے باغی کسانوں کی سرکوبی پر مرکوز رہی۔

وادی سندھ اور ہندوستان کا کسان انتہائی عسرت کی زندگی گزار رہا تھا اس کے لئے جسم و جاں کا رشتہ برقرار رکھنا مشکل تھا جب کہ حکمران شہزادوں اور جاگیرداروں کا طرز زندگی اسراف اور عیاشی کی انتہاؤں کو چھو رہا تھا۔ ان شاہ خرچیوں کو برقرار رکھنے کے لئے محاصل میں من مانے اور مسلسل اضافے کی ضرورت رہتی۔ جنگی مہمات کے اخراجات اور درباروں کے ٹھاٹ باٹھ بھی محاصل میں ناقابل برداشت اضافے کا باعث تھے۔ اکثر اوقات تو ایسا بھی ہوتا کہ کسان کے ڈھور ڈنگر اور زرعی آلات بھی چھین لئے جاتے۔ قسمت کے مارے کسان کو سرکار کے لئے بلا معاوضہ مشقت بھی کرنا پڑتی۔ جب بھی کسی بادشاہ کو قلعہ یا کوئی شہر تعمیر کرنا ہوتا تو قرب وجوار کے علاقوں میں ہر شخص کو تعمیراتی کاموں میں حصہ لینے کا حکم جاری کر دیا جاتا جسے ''بیگار'' کا نام دیا جاتا تھا۔

کسان اس بدترین صورت حال سے عاجز آ چکا تھا' وہ بغاوت کی دہلیز پر کھڑا تھا' اسے محض قیادت کا انتظار تھا اور پنجاب میں اسے یہ قیادت میسر آ گئی تھی۔

بھٹی قبیلے کے سردار' پنڈی بھٹیاں کے عبداللہ کو عام طور پر دلا بھٹی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ دلا اپنے بہادر اور جی دار کسان ساتھیوں کے ساتھ مل کر دولت مندوں کو لوٹتا اور غریبوں کی مدد کرتا تھا۔ بہت سے کسانوں نے لگان اور دوسرے سرکاری محاصل دینے سے انکار کر دیا اور جب اکبر نے جاگیرداری نظام ختم کر کے جاگیرداروں کو اپنا تنخواہ دار بنانا چاہا تو کچھ جاگیردار بھی دلا بھٹی سے جا ملے۔ دلا بھٹی نے مغلوں کی بہت سی فوجی مہمات کو ناکام بنایا۔ پنڈی بھٹیاں پر قبضہ کرنے کی مغل مہم جوئی بھی کئی بار ناکامی سے دوچار ہوئی۔ دلا بھٹی کی دلیرانہ مزاحمت کی شان میں کہی گئی ایک رزمیہ نظم کے مطابق بھٹی قبیلے کی خواتین خاص طور پر دلا بھٹی کی ماں لدھی نے حیران کن عزم' جرات اور استقلال کا ایسا مظاہرہ کیا کہ اسے وادی سندھ کی بہادر ماں کا مثالی نمونہ قرار دیا گیا۔ ایک جدید پنجابی شاعر سلیم جہانگیر نے لدھی کی مثالی جرات کو اس انداز میں نظم کیا۔

میں لدھی آں
اج وی میرے دو ہیں پاسے
سو پتراں دے شوکاں مار دے ڈھانے
میں لدھی آں

جس نے کدے وی ڈُلے 'جبر و' مرزے
جٹ توں
گھٹ کد نے ئیں جمیا
میں لدھی آں
جس نے سدا ای سورے پتر لاڑھیاں وانگوں
ما' شنگھار کے ہتھیں جنگ نوں تورے
میں لدھی آں
جس دے پتراں 'سولیاں اتے پینگھاں جھوٹیاں
تے آپ میں تاڑی ماڑی
میں لدھی آں
نال ظالماں 'نویں لام داہو کائی میرا
میں لدھی آں

دلا بھٹی کو بالآخر اپنے سے کہیں زیادہ بڑی اور طاقتور فوج کے ہاتھوں شکست ہوئی۔ اسے قیدی بنا لیا گیا اور اسیری میں اسے جو موت نصیب ہوئی وہ یقیناً پنجاب کے سب سے زیادہ محترم اور مقبول ہیرو کے شایان شان تھی۔

دلا بھٹی کی دلیرانہ مزاحمت نے پنجابی شاعری کو بڑا بانکپن عطا کیا اور پنجاب کے شعری اظہار پر اس کا بھرپور اثر مرتب ہوا۔ اسی زمانے کے مشہور صوفی شاعر شاہ حسین دلا بھٹی کے ہم عصر اور دوست تھے۔ کہا جاتا ہے کہ دلا بھٹی کو جب سرعام پھانسی دی گئی تو شاہ حسین وہاں موجود تھے اور اس جبر و تشدد کے مشاہدے سے ان کی شاعری میں شدت احساس اور ظلم کے خلاف احتجاج اور ظالم حکمرانوں کی مذمت کا عنصر نمایاں ہوا۔ سولہویں اور سترھویں صدی کے بے شمار لوک شاعروں نے اپنے رزمیوں میں دلا بھٹی کی شجاعت اور دلیرانہ مزاحمت کو نظم کیا ہے جنہیں آج بھی داستان گو پنجاب کے طول و عرض میں سنا کر اپنے لوک ہیرو سے عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ انہی گیتوں میں سے ایک میں دلا بھٹی مغلوں کی یلغار کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے بڑی سرکشی سے کہتا ہے۔

ول ول ماراں مغلاں دیاں ڈھانیاں   دیواں پور دے پور اتھل
میں بدل ما دیا دھوڑ دے   تے کوئیں امر تھر تھل
میں مار دیا بچے شیر نوں   اوہدی بیٹھ وچھاداں کھل

میں چڑھ کے گھوڑا پھیر لاں　　　　میری جگ تے رہ جاؤ گل
کون کمینہ بادشاہ　　　　　　　　آوے دلے جوان تے چل

عبداللہ کی مزاحمت سے دہقانوں کی حالت زار تو شاید نہ بدل سکی لیکن اس کے نتیجے میں مقامی جاگیر داروں کو زیادہ خود مختاری اور زمین کی ملکیت کے حوالے سے مزید تحفظ حاصل ہو گیا کیونکہ دہقانوں کی بغاوت کے پیش نظر حکمرانوں کے لئے زمینداروں کو مراعات دے کر تخت کا ہم نوا بنانا زیادہ ضروری تھا۔ اگر زمینداروں میں بھی بے چینی پھیل جاتی تو سلطنت کی تباہی لازمی تھی۔ شدید مزاحمت سے نحیف ہو کر مصالحانہ رویہ اپنانا اس وقت سلطنت کی مجبوری تھی۔

مختلف نوعیت کی بہت سی زمینداریوں کو موروثی قرار دے دیا گیا۔ یہ صدیوں پرانی روایت سے واضح انحراف تھا۔ موریا دور سے یہ دستور چلا آرہا تھا کہ زمین بادشاہ کی ملکیت ہوتی اور گپتا عہد میں اس اصول پر سختی سے عمل بھی کرایا گیا۔ ہر زمیندار کی موت کے بعد اس کی ملکیتی زمین واپس بادشاہ یا شہنشاہ کی عملداری میں چلی جاتی تھی۔ اس کے بعد پھر یہ بادشاہ کا استحقاق تھا کہ وہ جس پر چاہے نظر کرم کر دے۔ اکثر اوقات مرحوم جاگیر دار کے وارث اس کی جائیداد اور مال و اسباب سے محروم رہ جاتے تھے۔ اگرچہ پنجاب کے بہت سے علاقوں میں زمین بادشاہ کی ملکیت کا اصول بھی جاری رہا لیکن عبداللہ نے اپنے ہم وطنوں کے لئے جو کچھ حاصل کیا وہ تین صدی قبل کے برطانوی 'میگنا کارٹا' کی ایک نسبتاً کمزور شکل تھی جس نے شاہ برطانیہ کے استحقاق کو برطانوی جاگیر داروں کی نسبت کسی حد تک محدود کر دیا تھا۔

پنجابی کسان کی مزاحمت اور شاہی افواج کے اسے فرد کرنے کے بہیمانہ انداز نے اس خطے کے لوگوں پر انمٹ نقوش مرتب کئے۔ ان کے دلوں میں دہلی کے حکمرانوں سے نفرت اور حقارت کوٹ کوٹ کر بھر گئی۔ مغل اپنا سلسلہ نسب چغتائی ترکوں سے بھی جوڑتے تھے۔ وادی سندھ میں انہیں حقارت سے "چغتا" کہا جانے لگا اور پنجابی ادب اور شاعری میں یہ نام لٹیرے جاگیر داروں اور ظالم حکمرانوں کی علامت بن گیا۔

اکبر اور بعد میں اس کے بیٹے جہانگیر نے لاہور میں جس کثرت سے سکے جاری کئے وہ اس خطے کی خوشحالی جبکہ عبداللہ کی تحریک مزاحمت یہاں کے کسانوں کے افلاس کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اس علاقے میں سونے چاندی کا ذخیرہ اور فصلوں کی بہتات تھی۔ دریاؤں سے سیراب ہونے والی یہ زرخیز مٹی تو بڑی آسانی سے لاکھوں افراد کی کفالت کر سکتی تھی۔ اس لئے یہ تعجب خیز نہیں اگر وسطی ایشیا کے تاجدار وادی سندھ کی ملکیت کے دعوے سے کبھی دستبردار نہیں ہوئے اور 1707ء میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد مرکز کے کمزور ہونے کے ساتھ تو یہ دعوے کہیں زیادہ شدت اور جارحیت اختیار کر گئے۔

14

مزاحمت' مفاد پرستی اور اسراف

وادی سندھ مزاحم اور ہندوستان مسحور

یہ درست ہے کہ اقتدار اعلیٰ میں تبدیلی کے درمیانی ادوار کے غیر یقینی حالات میں وادی سندھ کی تقدیر وسطی ایشیا اور ہندوستان کے مابین ڈولتی رہی۔ اس دوران خطے کا جھکاؤ کبھی دہلی اور کبھی کابل کے حق میں رہا لیکن وادی سندھ کی ریاستوں اور اس کے عوام کی طرف سے ہمیشہ ایسے کسی بھی تغیر کی مزاحمت ہوئی۔ اس علاقے نے ہمت اور استقلال کے ساتھ دونوں جانب کے دباؤ کی مزاحمت کی اور اسی مزاحمت کا نتیجہ تھا کہ وادی سندھ کی آزادی کے ادوار' وسطی ایشیا اور دہلی سے اس کے الحاق کے مقابلے میں ہمیشہ طویل تر رہے۔

وید کی دیومالائی کہانیوں میں جن کائناتی لڑائیوں کا ذکر ہے ان کے مطابق وادی سندھ کے جوانمردوں نے شمال سے موج در موج آنے والے آریائی حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے میں بڑی جرات اور دانائی کا مظاہرہ کیا۔ اسی روایت کے تسلسل میں یہ ممکن ہوا کہ اشوک کے جلاوطن دادا چندر گپت نے وادی سندھ سے گوریلا جنگ کے اسرار و رموز اور گراں قدر جنگی مہارت حاصل کی اور پھر اسے کام میں لا کر برصغیر کے مشرق میں ایک عظیم سلطنت کی بنیاد رکھنے میں کامیاب رہا۔ اسی خطے میں پورس نے سکندر کے خواب چکنا چور کر کے بالآخر اس کی فتوحات کا سلسلہ ختم کر دیا۔ جب تیمور آگ' بربادی اور موت کی دہشت پھیلاتا دہلی تک پہنچا اور پھر اسی انداز میں وہاں سے پلٹا تو دونوں بار وادی سندھ کے سردار شیخا گکھڑ نے کمال جرات سے اس قہر سامانی کا مقابلہ کیا۔ محمد تغلق کے باغی جرنیل تغی کو بھی وادی

سندھ ہی میں پناہ کی توقع تھی اور بادشاہ نے اپنی زندگی کے آخری چار سال سندھ میں اپنے اس غلام اور غدار جرنیل کے تعاقب میں صرف کر دیئے۔ سلطان دہلی کے لئے یہ ایک ناکام اور مایوس کن مہم تھی اور یہیں اس کا انتقال بھی ہوا۔

مقبول عام تاثر کے برعکس، وادی سندھ میں مزاحمت کے سبب بابر دہلی پہنچنے میں تین بار ناکام رہا اور چوتھی کوشش میں کہیں جا کر اسے کامیابی نصیب ہوئی۔ اس کے بعد شیر دل اور باہمت نوجوان عبداللہ نے مغل شہنشاہ اور اس کی طاقتور فوج کو تقریباً دس سال تک پنجاب میں الجھائے رکھا۔ عبداللہ کے تقریباً سو برس بعد ایک نڈر سپاہی اور شاعر خوشحال خان نے دریائے سندھ پر خٹک کے علاقے میں اپنی آزاد ریاست قائم کر لی اور بھرپور قوت اور پامردی سے مغل طاقت کا مقابلہ کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ وادی سندھ میں اٹھارویں صدی سے زیادہ خونریزی اور آگ میں راکھ ہوتی گندم کی فصلیں شاید کسی اور عہد نے دیکھی نہ ہوں۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد جب اس کے وارثوں کے درمیان برادر کش سازشوں اور مسلسل جنگوں نے مغل سلطنت کی ساری توانائی نچوڑ لی تو یہ صرف وادی سندھ تھی جس نے اپنے جفاکش قبائل اور کسانوں اور بہادر جنگجوؤں کے ساتھ ان حملہ آوروں کا رستہ روک رکھا تھا جو شمال مغرب کے تنگ پہاڑی دروں سے اپنی للچائی ہوئی نظریں اس طرف جمائے بیٹھے تھے۔ وادی سندھ کی حوصلہ شکن مزاحمت کے برعکس ہندوستان انہیں کھلی دعوت مداخلت دے رہا تھا۔

بندہ بیراگی کی زرعی اصلاحات

یہاں پر برسبیل تذکرہ تاریخ کے ایک دلچسپ اتفاق کو تحریر میں لانا شاید کچھ ایسا غیر مناسب نہ ہو کہ بابر نے مغلیہ سلطنت اور گرونانک نے سکھ مذہب کی بنیاد ایک ہی زمانے میں رکھی بلکہ دونوں کے درمیان ملاقات اور تبادلہ خیال بھی ہوا۔ مغلیہ سلطنت کے آخری اہم حکمران اور نانک سلسلے کے بارہویں اور آخری گرو کے انتقال کا زمانہ بھی ایک ہے۔ 1707ء میں اورنگ زیب اور 1708ء میں گرو گوبند کی موت سے اٹھارویں صدی کے اوائل میں مغل اور سکھ دونوں ہی بہت بڑے نقصانات سے دو چار ہوئے۔ اس لحاظ سے ان اموات نے دو مختلف حوالوں سے ایسی صورت حال پیدا کر دی کہ وادی سندھ پر جس کے بہت گمبھیر اثرات مرتب ہوئے۔

اورنگ زیب کے بعد کابل کے صوبیدار شہزادہ بہادر شاہ نے تخت سنبھالا۔ پہلے وہ لاہور آیا جہاں اس کی تاجپوشی ہوئی پھر اس نے دہلی پر قبضہ کیا لیکن اورنگ زیب کی وفات سے سلطنت مغلیہ کے قلعے

میں جو شگاف پیدا ہو گیا تھا اسے ایسے چھوٹے موٹے پتھروں سے پر نہیں کیا جا سکتا تھا۔

مگر اس حوالے سے سکھ نسبتاً خوش قسمت ثابت ہوئے کہ بندہ بیراگی کے روپ میں انہیں گرو گوبند کا بہتر جانشین مل گیا۔

مغلیہ سلطنت کے ساتھ سکھوں کے تعلقات کی تاریخ میں بڑا اتار چڑھاؤ رہا۔ ابتدا میں انہیں دہلی تخت کی سرپرستی حاصل رہی لیکن جہانگیر کے عہد میں تعلقات بہت بگڑ گئے اور تقریباً ایک سو سال تک سکھ مسلسل مغل صوبیداروں کے جور و ستم کا شکار رہے۔ کہا جاتا ہے کہ گرو گوبند کی وفات سے چند سال پہلے اس کے دو بیٹوں کو سرہند کے صوبیدار نے دیوار میں زندہ چنوا دیا تھا۔ مگر گوبند نے جب سرہند کو دوبارہ فتح کیا تو گرو نانک کی تعلیمات کے مطابق انتقامی جذبے پر قابو رکھتے ہوئے اس دیوار سے محض دو اینٹیں نکال کر شہر کے ذمے تاوان چھوڑ دیا۔ گرو گوبند نے بستر مرگ سے اپنا جانشین مقرر کیا۔ اورنگ زیب کے بعد مغلوں کی زبوں حالی کے برعکس بندہ بیراگی کی توانائی اور اس کی عملیت پسندی نے سکھوں کے نقصانات کا بڑی حد تک ازالہ کر دیا۔

مسلمانوں کے نزدیک تو بندہ بیراگی محض ایک لٹیرا تھا جب کہ سکھ اسے اپنا محسن اور اپنا ہیرو قرار دیتے ہیں۔ آٹھ سال تک بالائی وادی سندھ میں اس کے نام کا ڈنکا بجتا رہا۔ اس کے کارنامے جرات مندانہ اور اس کی سرعت لاثانی تھی۔ مسلم آبادیوں سے اس نے مغلیہ ظلم کا وحشیانہ خراج وصول کیا۔ اس کے فرار کے انداز بھی جداگانہ اور ڈرامائی تھے۔ 1716ء میں گرفتاری اور دہلی میں سرعام پھانسی تک بندہ بیراگی کی زندگی مسلسل خطرات سے عبارت رہی۔

سکھ سربراہی کے چند ہنگامہ خیز سالوں میں ہی بندہ بیراگی نے اراضی کی ملکیت میں دوررس تبدیلیاں کر دیں۔ اس نے ستلج کے دونوں جانب پھیلی ہوئی وسیع جاگیریں ضبط کر کے کسانوں میں تقسیم کر دیں جس کے نتیجے میں سکھ مسلک کے پیروکاروں اور دہلی کے غیض و غضب دونوں میں اضافہ ہوا۔ مغل شہنشاہ فرخ سیار نے بندہ بیراگی کی موت کا فرمان جاری کیا۔ اس کے دور حکومت میں سکھوں کے خلاف انتہائی مہنگی اور فہر ساماں مہمات کی بہت سرپرستی کی گئی اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب 1719 عیسوی میں خود بادشاہ فرخ سیار گرفتار ہوا اور اسے اندھا کر دیا گیا۔

قدم قدم مزاحمت

اگلے چھ مہینوں کے دوران تین نو عمر شہزادے دہلی تخت پر بیٹھے اور معزول ہوئے۔ ان میں سے ایک کو اتنی عجلت میں محل سے متصل سلیم گڑھ کی شاہی جیل سے نکال کر شہنشاہ بنایا گیا کہ اسے نئے

سنور نے تو کیا' نہانے دھونے تک کا موقعہ نہ مل سکا۔ اسے' غلیظ کپڑوں پر موتیوں کا ایک ہار ڈال کے تخت پر بٹھا دیا گیا۔ اسی سال ستمبر 1719ء میں محمد شاہ بادشاہ تخت افروز ہوا۔ اس کا دور حکومت طویل لیکن غیر مستحکم تھا اور 1749ء تک جاری رہا۔ عیاش طبع اور آلکسی ہونے کے ناطے اسے حقارت سے ''رنگیلا'' کہا گیا۔

محمد شاہ رنگیلا کے دور میں فارس اور افغانستان سے وادی سندھ اور وادی جمنا پر حملوں کا نیا سلسلہ شروع ہوا۔ فارس کا بادشاہ نادر شاہ 1739ء میں حملہ آور ہوا اور اس نے سرحد اور پنجاب سے دہلی تک' ہر طرف خون کی ندیاں بہادیں۔

پشاور کے صوبے دار ناصر خان نے نادر شاہ کا راستہ روکنے کے لئے درۂ خیبر کو بند کر دیا حالانکہ اسے دہلی کے روبہ زوال مغل دربار سے کوئی کمک حاصل نہ ہو سکی تھی۔ ایرانی ایک پرانے راستے سے پشاور پہنچ کر اچانک حملہ آور ہوئے۔ خونریز لڑائی کے نتیجے میں فتح ان کا مقدر بنی اور انہیں دریائے سندھ تک نسبتاً ایک محفوظ راستہ مل گیا۔ دریائے سندھ عبور کر کے ایرانی فوج پنجاب میں اٹک کے مقام پر خیمہ زن ہوئی۔

ایرانی فوج کو اپنی پیش قدمی کے دوران پنجاب میں قدم قدم پر جس مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا' نادر شاہ کے ایک ہم عصر شاعر نجابت نے اسے اپنے رزمئے میں بڑی جزئیات کے ساتھ نظم کیا ہے۔ سندھ جہلم دوآبے کے علاقے میں نادر شاہی افواج کی مزاحمت کو اس رزمئے کے ایک بند میں یوں بیان کیا گیا ہے۔

اٹک توں چڑھیا نادر شاہ رن بھیری ٹٹے
تے دیہہ پئے پنجاب پاستے سے مارے مٹھے
کھٹڑ' گھیبے تے گکھڑ پے کھینیں لٹے
کوہ پنجاہ نجزتی لڑ آہوں بھجے
ڈیرے اتے جہلے آن لگو بھجے

دریائے جہلم کو عبور کر کے گوندل راجپوت بار میں ایرانی بادشاہ کی آمد کو نجابت نے اس طرح نظم کیا ہے:

دو باریں راہ نیں گوندلاں ' لجھو تاں آہے
تے دلو تے سیدو وڈھیاں اسانیں سائے
ادہناں ہمت کیتی سور میاں چک سیون لنگھائے

نادر شاہ گجرات سے آگے بڑھا تو سامنے چناب تھا جہاں کئی جنگیں اور بہت سی رکاوٹیں اس کی منتظر تھیں۔ مرزا قلندر اپنی مختصر مگر بہادر فوج کے ساتھ دریا کے دوسرے کنارے پر اس کا منتظر تھا۔

مرزے قلندر بیگ دا وچ کچھی دے تھانا
تے مرزا کہے سپاہ نوں اک سخن سیانا
یارو ایسا جو صفت اصیل دی پڑ چھڈ نہ جانا
اساں سوہنیاں نال گواہیاں وچ شک نہ آنا
سنج جڑے تے بھتر پیدیاں ' ہتھ پکڑ کماناں
تے چھٹن تیر مینہ اناں وانگ ساڑ گھنی بانا
ادتھے چھٹن بندوقاں کاڑ کاڑ کھوکت ازاناں
جیویں اگ لگی سی ناڑنوں توں بھوجن دھانا

جب مرزا نے لاہور سے کمک مانگی تو وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں تھا کہ وادی سندھ کے سپوت ہمیشہ برصغیر کے دفاع کے لئے مورچہ بند ہوئے ہیں۔

ایسے ملک پنجاب وچ چڑھ حکم چلائے
تے ایتھوں بھجا کنڈ دے جگ لعنت پائے
پر سر دینا منظور ہے ' جے ہند نہ جائے

ان اشعار میں نادر شاہ کے خلاف کھرل ' کھیپے ' گکھڑ ' گوندل ' جاٹ اور راجپوت قبیلوں کی مزاحمت کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔ دریائے راوی کے نزدیک جرنیل خواجہ یعقوب نے بھی نادر شاہ کا ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن اس کے باوجود ایرانی بادشاہ نے لاہور کے ساتھ ایسا سلوک کیا جیسے وہ ہندوستان کا نہیں بلکہ اس کی اپنی سلطنت کا حصہ رہا ہو۔ کابل کے حکمران وادی سندھ پر حق ملکیت کے افغان ایرانی دعوے میں اتنا یقین رکھتے تھے کہ ایرانی حملہ آور نے لاہور کو اپنی لوٹ مار سے محفوظ رکھا البتہ اس نے تاوان میں دو کروڑ روپے کے مساوی رقم اور کچھ ہاتھی وصول کئے لیکن تاوان وصول کرنے کے باوجود وہ شہر پر اپنے دعوے سے دستبردار نہ ہوا اور نہ ہی یہ رقم اس کے قزلباش فوجیوں کو محمود بوٹی اور مغلپورہ جیسی لاہور کی مضافاتی بستیوں میں لوٹ مار کرنے اور رنگ رلیاں منانے سے باز رکھ سکی۔ اپنے ملکیتی دعوے کو محض علامتی سطح تک محدود رکھنے کے بجائے نادر شاہ نے لاہور میں سونے کے سکے ڈھالے اور پھر یہاں سے آگے بڑھ کر اس نے دہلی پر چڑھائی کر دی۔

دہلی کا المیہ

دہلی کے بادشاہ محمد شاہ رنگیلا کو یقین تھا کہ وادی سندھ ہی میں حملہ آور کو پسپائی پر مجبور کر دیا جائے گا۔ اسے مزاحمت کے بارے میں خوش کن خبریں مل رہی تھیں اور اسے یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ دشمن کو آگے بڑھنے میں کافی دقت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے لیکن ہوا یہ کہ نادر شاہ نے وادی سندھ میں در پیش مزاحمت پر قابو پالیا۔ اس کے بعد دہلی تک پہنچنا اس کے لئے مشکل نہیں تھا۔ رنگیلے کو جب بتایا گیا کہ نادر شاہ کی افواج دہلی کے دروازے پر دستک دے رہی ہیں تو اس نے خبر کی صحت سے انکار کرتے ہوئے بڑی حقارت سے وہ جملہ کہا جو آج بھی ضرب المثل ہے کہ:

ہنوز برو ' ہنوز دلی دور است

ابھی (میری نظروں سے) دور ہو جاؤ 'ابھی دہلی (حملہ آور سے) دور ہے۔

محمد شاہ رنگیلا نے لڑے بغیر ہتھیار ڈال دیئے جس سے وقتی طور پر دہلی کو لوٹ مار سے نجات مل گئی لیکن نادر شاہ کے قیام دہلی کے دوران ہی یہ افواہ پھیل گئی کہ نادر شاہ مر گیا ہے 'بد نصیب دہلی کے کچھ مکینوں نے اس افواہ سے حوصلہ پا کر چند ایرانی فوجی ہلاک کر دیئے۔ نادر شاہ طیش میں آگیا وہ دہلی کی جامع مسجد (شاہجہانی مسجد) میں آیا اور نیام سے تلوار نکال کر لہرائی۔ یہ گویا اس کے فوجیوں کے لئے اشارہ تھا۔ کئی گھنٹے بعد جب اس نے تلوار دوبارہ نیام میں ڈالی تو شہر قتل گاہ کا منظر تھا اس دوران تیس ہزار افراد قتل کئے جا چکے تھے اور شہر تاخت و تاراج ہو چکا تھا۔ تخت طاؤس اور کوہ نور ہیرا دشمن کے قبضے میں جا چکے تھے۔

1739ء میں جب نادر شاہ نے دہلی میں خون کی ہولی کھیلی تو یہ خونچکاں منظر ایک سولہ سالہ لڑکے کی دہشت سے ویران آنکھوں میں ساکت ہو گیا۔ چند سال بعد وہ لڑکا دہلی کو چھوڑ چھاڑ لکھنؤ جا کر آباد ہو گیا۔ اس نے دہلی میں جو کچھ دیکھا تھا جب اسی کرب کو شاعری کی زبان ملی تو اردو زبان کے عظیم شاعر میر تقی میر کا جنم ہوا۔ جس نے دہلی کے بارے میں لکھا تھا:

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا

ایران واپسی پر نادر شاہ سندھ سے گزرا جہاں اس نے لاڑکانہ میں جشن نوروز (ایرانی سال نو) منایا۔ نادر شاہ نے سندھ اور شمال مغربی وادی سندھ کو باقاعدہ اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اور باقی ماندہ وادی سندھ پر اپنی ملکیت کا دعویٰ بر قرار رکھا۔ آفریدیوں نے ایک بار پھر درۂ خیبر کا راستہ کاٹ دیا تھا اور نادر شاہ کو اپنے ایک اورک زئی دوست سردار کی مدد سے تیراہ کے علاقے میں پہاڑی سلسلوں سے گزر کر واپس ایران جانا پڑا۔

ایک اور جاگیر دارانہ ریاست

نادر شاہ کو 1747ء میں قتل کر دیا گیا۔ ابدالی قبیلے کا احمد شاہ اس وقت افغانستان میں نادر شاہ کا سالار اعلیٰ تھا۔ باصلاحیت اور جاہ طلب ابدالی، نادر شاہ کی موت کے بعد افغانستان کا حکمران بن گیا اور اس نے باقیماندہ وادی سندھ کو بھی اپنی سلطنت کا حصہ قرار دے دیا۔ احمد شاہ ابدالی نے اپنے لئے دُرِّ دُراں (موتیوں کا موتی) کا خطاب اختیار کیا جس کے بعد ابدالیوں کو درانی بھی کہا جانے لگا۔

احمد شاہ ابدالی کے عروج اور دوسرے ممالک پر اس کی لشکر کشی کی صلاحیت دراصل چند اہم پختون علاقوں میں جاگیر داری روابط میں فروغ کی رہین منت تھی اور ابدالی نے ہی پختونوں کی پہلی جاگیر دارانہ ریاست کی بنیاد رکھی۔

وسیع علاقے میں آباد پختون قبائل کی زیادہ تر زمینیں بنجر تھیں یا پھر چھوٹی بڑی جھاڑیوں میں کہیں کوئی چراگاہ نظر آ جاتی۔ معاشی اور معاشرتی اعتبار سے یہ سماج ابھی تک گلہ بان اور قبائلی تھا۔ پختون علاقے عام طور پر الگ تھلگ اور بیرونی دنیا کی پہنچ سے دور تھے اور بعض اوقات تو یہ قبیلے خود آپس میں بھی ایک دوسرے سے بہت فاصلوں پر ہوتے تھے۔ فطرت اور ماحول نے انہیں جفاکش بنا دیا تھا۔ صرف اپنے قبائلی علاقے تک ہی محدود رہنے کے باعث وہ سخت گیر اور کسی قدر بے لچک نظریات کے حامل بھی تھے۔ بعض صورتوں میں تو اپنا قبیلہ ان کے لئے پوری کائنات اور قبیلے کے رسم و رواج کی سختی سے پابندی ان کا سرمایہ افتخار تھا۔ فطرت نے چونکہ انہیں صرف گلہ بانی طرز حیات تک محدود کر دیا تھا اس لئے آبادی میں اضافے کی بناء پر کچھ پختون قبائل کرائے کے فوجیوں کی حیثیت سے وادی سندھ اور ہندوستان پر حملہ آور فارس اور وسطی ایشیائی افواج میں شامل ہو جاتے۔

لیکن پختون سرزمین میں دو وسیع خطے زرخیز اور قابل کاشت تھے۔ ان علاقوں میں زراعت کے فروغ کے ساتھ گلہ بانی ختم ہو رہی تھی اور قبیلے کی جگہ خاندان رواج پا رہا تھا۔ یہ جنوب مشرق میں

قندھار اور شمال مغرب میں وادی پشاور اور اس سے ملحقہ علاقے تھے۔ وادی پشاور کو اگر ایک طرف اپنی زراعت سے فاضل پیداوار حاصل ہو رہی تھی تو دوسری طرف درۂ خیبر کے راستے وادی سندھ اور ہندوستان کے شمالی علاقوں کے ساتھ ہونے والی تجارت سے بھی اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی۔ اسی طرح قندھار درۂ گومل اور درۂ بولان کے راستے ایران سے وادی سندھ کے جنوبی حصوں تک جانے والے تجارتی قافلوں کی گزرگاہ پر واقع تھا۔

زراعت اور تجارت کی آمدنی نے پختونوں کے طرز حیات کو یکسر بدل ڈالا۔ مغلیہ دور کے آغاز سے ہی طاقتور خوانین اور ملکوں نے محاصل کی وصولی اور ذاتی فوج رکھنے کا سلسلہ شروع کر کے گویا جاگیرداری سماج کی بنیاد ڈال دی تھی۔ اس طرح قندھار کے گردونواح میں ایک ایسا جاگیرداری نظام قائم ہو گیا تھا جسے اپنی فاضل زرعی پیداوار اور آس پڑوس کے گلہ بانوں اور دوسرے غریب علاقوں پر بالادستی کے سبب بے حد استحکام نصیب ہوا۔ اکوزہ اور تیراہ میں بھی چھوٹی ریاستی جاگیرداریاں قائم ہو گئیں جو زیادہ تر خٹک قبائل پر مشتمل تھیں۔

کسی بھی معاشرے میں بنیادی نوعیت کی کسی بھی تبدیلی کو مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جاگیرداری سماج کی طرف بڑھنے کے اس عمل میں یہی صورت حال پختون معاشرے کے ساتھ بھی پیش آئی۔

سولہویں صدی میں بایزید انصاری کی زیر قیادت روشنائی تحریک بھی اپنے ابتدائی مدارج میں ایک ایسی ہی مزاحمتی تحریک تھی جو بنیادی طور پر مغل فرمانرواؤں اور پختون جاگیرداروں کے گٹھ جوڑ کے خلاف شروع ہوئی لیکن جاگیردارانہ پیداواری روابط کے فروغ کے اس عمل میں تاریخ کے پہیئے کو الٹا نہیں گھمایا جا سکتا تھا۔ جب فارس کے بادشاہ نادر شاہ نے وادی سندھ اور ہندوستان پر حملہ کیا تو جاگیرداری نظام قندھار اور اس کے گردونواح میں پوری طرح جڑ پکڑ چکا تھا اور یہاں کے جاگیردار بھرپور انداز میں اس کی برکتوں سے فیضیاب ہو رہے تھے۔ یہ خطہ زرعی دولت اور نسبتاً بہتر پیداواری روابط کی بدولت ترقی پذیر تھا۔ لہٰذا جب قندھار ابدالی کے سامنے سرنگوں ہوا تو گویا شہنشاہیت اس کے قدم لینے کو تیار تھی۔ یہاں سے پشاور کی طرف پیش قدمی میں اس نے زیادہ وقت نہیں لیا کیونکہ اس سے آگے وادی سندھ اور اس سے بھی آگے ہندوستان پر قبضے کی خواہش اسے بے چین کئے ہوئے تھی۔

احمد شاہ ابدالی وادی سندھ پر کئی بار حملہ آور ہوا اور ہر بار اسے سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ ادھر وادی سندھ کی اشرافیہ کے طرز عمل میں بھی اس دوران ایک نئی خصوصیت کا اضافہ ہو چکا

آزمودہ کار اور موقعہ شناس گورنر

اٹھارویں صدی کے وسط میں لاہور اور ملتان نے ایسے کئی زیرک اور زمانہ شناس صوبیداروں کا عروج وزوال دیکھا جو اپنی جرات کی بدولت ' جسے ان کی معاملہ فہم موقعہ پرستی نے لگام دے رکھی تھی ' ایک ایسی روایت قائم کر گئے جو آئندہ کئی نسلوں تک یہاں کے شاطر صوبیداروں کے لئے قابل تقلید قرار پائی۔ زکریا خان ' لکھ پت رائے ' میر مانو ' اس کی بیوہ مراد بیگم اور ادینہ بیگ ایسے نمایاں مقامی حکمران تھے جنہیں پروانہ تقرر تو دہلی سے جاری ہوا۔ لیکن ان میں برتر افغان فوج کا مقابلہ کرنے کی ہمت بھی تھی اور شکست کی صورت میں وفاداریاں تبدیل کر کے انہیں اپنے عہدوں پر قائم رہنے کا فن بھی آتا تھا۔

اس سلسلے میں میر مانو (معین الملک) کی مثال خاص طور پر قابل ذکر ہے جس نے 1747ء میں دہلی کی جانب احمد شاہ ابدالی کی پہلی پیش قدمی کو نہ صرف کامیابی سے روکا بلکہ اسے پسپائی اختیار کر کے واپس کابل جانے پر مجبور کر دیا۔ وادی سندھ پر ابدالی کی دوسری لشکر کشی کی مزاحمت کر کے میر مانو لاہور بچانے میں تو کامیاب رہا لیکن سیالکوٹ ' ایمن آباد اور پسرور اس کے ہاتھ سے جاتے رہے۔

اپنے تیسرے حملے کے دوران جب 1752ء میں ابدالی نے لاہور کا محاصرہ کیا تو یہ میر مانو کے حوصلے اور اس کی فراست کا امتحان تھا۔ طویل محاصرے کے بعد شہر سے باہر محمود بوٹی کے مقام پر ایک خونریز معرکہ ہوا جس کے نتیجے میں مانو نے شکست تسلیم کرتے ہوئے ابدالی کو اپنی اطاعت کی پیشکش کی۔ ابدالی نے اسے طلب کیا اور میر مانو کسی محافظ یا ساتھی کے بغیر اکیلا اس کے پاس پہنچا۔ اس سے وہی روایتی سوال پوچھا گیا کہ وہ فاتح سے کس سلوک کی توقع رکھتا ہے ؟ کہتے ہیں مانو کا جواب تھا " اگر تم بیوپاری ہو تو مجھے تاوان کے عوض بیچ دو۔ اگر تم قصائی ہو تو مجھے قتل کر دو لیکن اگر ایک بادشاہ ہو تو مجھ پر نوازش کرو اور معاف کر دو " مانو کو صوبیداری واپس مل گئی مگر آقا بدل گیا تھا۔

میر مانو 1756ء میں گھوڑے سے گر کر ہلاک ہو گیا اور لاہور کی صوبیداری اس کی بیوہ مراد بیگم کے ہاتھ آئی جس نے درباری سیاست کے انتہائی پر پیچ راستوں پر شاطرانہ حکمت عملی کا ایسا جال بچھایا کہ ناممکن کو ممکن بنا دیا۔ مراد بیگم بیک وقت دہلی اور کابل کے حکمرانوں کی سرپرستی حاصل کرنے میں کامیاب رہی اور اس کا حق حکمرانی بھی دونوں طرف سے تسلیم کر لیا گیا لیکن یہ دو رخی سفارت کاری زیادہ عرصہ تک ساتھ نہ دے سکی اور مراد بیگم مغل دربار کے امیر الامراء غازی الدین کے دام فریب کا شکار ہو گئی۔ بیگم کی بیٹی سے شادی رچانے کا جھانسہ دے کر غازی الدین لاہور آیا اور اپنی ہونے والی ساس کو گرفتار کر کے اس کی جگہ جالندھر کے مغل صوبیدار ادینہ بیگ کو لاہور کا ناظم الامور مقرر کر

گیا۔

مراد بیگم نے قید خانے سے ادینہ بیگ کو دھمکی دی کہ وہ ابدالی کے غیض و غضب کو للکار رہا ہے اور یہ سچ ثابت ہوا۔ ابدالی لاہور کے حکمران کی تبدیلی پر سخت طیش میں تھا' اس نے لاہور پر چڑھائی کر دی۔ ادینہ بیگ فرار ہو گیا۔ ابدالی نے آگے بڑھ کر دہلی کا محاصرہ کر لیا۔

مغل بادشاہ عزالدین عالمگیر ثانی اپنے پیچھے اور پیشرو محمد شاہ رنگیلا کی روایت پر عمل کرتے ہوئے دہلی سے باہر حملہ آور سے ملنے آیا' مقابلے کے لئے نہیں بلکہ کھلے بازوؤں کے ساتھ استقبال کرنے لیکن یہ تدبیر کارگر نہ ہوئی اور ابدالی نے مراد بیگم کی پیشگوئی پوری کرتے ہوئے اپنے سپاہیوں کو مفتوحہ شہر میں لوٹ مار کی کھلی چھٹی دے دی۔ تقریباً دو ماہ تک غارتگری کا یہ بازار گرم رہا۔ متھرا کو بھی تاراج کیا گیا۔ قندھار واپس جانے سے قبل احمد شاہ نے عالمگیر ثانی کو دہلی کے تخت پر بحال کر دیا لیکن پنجاب اور سندھ اپنی سلطنت میں شامل کر لئے اور افغان شہزادے تیمور شاہ کو اس خطے کا حکمران مقرر کیا۔

مرہٹوں کی اتحادی فوجوں نے 1758ء میں لاہور پر قبضہ کر لیا۔ مرہٹے طاقتور تھے اور ان دنوں پورے برصغیر میں کوئی اور قوم ان سے مقابلے کی سکت نہیں رکھتی تھی۔ وہ اپنے اقتدار کے عروج پر تھے لیکن ابدالی کی نظر میں یہ گستاخی قابل معافی نہیں تھی۔ لاہور پر قبضہ کر کے مرہٹوں نے گویا ہندوستان کی روایتی تاریخی سرحدوں سے تجاوز کیا تھا۔ افغان بادشاہ کے نزدیک مرہٹوں کا دہلی پر قبضہ کرنا اتنا بڑا جرم نہیں تھا لیکن لاہور پر قبضہ کر کے تو مرہٹوں نے براہ راست اس کے علاقے میں مداخلت کی تھی۔ گویا ابدالی کے اقتدار اعلیٰ کو للکارا تھا۔ ہندوستان سے وادی سندھ میں داخل ہو کر انہوں نے اپنی حد سے تجاوز کیا تھا۔ مرہٹوں کی طاقت خواہ کیسی ہی مرعوب کن کیوں نہ تھی' ابدالی کے نزدیک ان کے جرم سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی تھی۔ دوسری طرف دہلی کے ممتاز عالم دین شاہ ولی اللہ نے بھی افغان بادشاہ کو ہندوستان پر حملے کی دعوت دی جو بجائے خود ایک اہم ترغیب تھی۔ 1761ء میں احمد شاہ ابدالی ہندوستان پر ٹوٹ پڑا۔

ادھر مرہٹے بھی فیصلہ کن معرکے پر تلے بیٹھے تھے۔ وہ اپنی پوری قوت مجتمع کر کے ابدالی کے منتظر تھے۔ متحدہ مرہٹہ افواج کی قیادت پونا کے پیشوا کا بیٹا وسواس راؤ کر رہا تھا۔ ماہر جنگ باز اور وسواس کا کزن سداشیو راؤ جو بھاؤ صاحب کے نام سے مشہور تھا' افواج کا کمان دار تھا اور اسے ملہار راؤ جیسے قابل سالار کی معاونت حاصل تھی۔ بھرت پور کا طاقتور جاٹ حکمران راجہ سورج مل اپنے توپ خانے اور شہرت یافتہ توپچی ابراہیم خان گاردی کے جلو میں برق رفتار گھڑ سوار دستوں کے ہمراہ مرہٹوں کے ساتھ تھا۔

غیر مسلموں کی صف میں مسلمان توپچی گاردی کا شامل ہونا کوئی ایسی انہونی بات نہیں تھی۔ ایسا کئی بار ہوا کہ فوجی سالار دوسرے مذاہب کی افواج کے ہمرکاب جنگوں میں شریک تھے۔ اورنگ زیب کی سب فوجی مہمات میں ہندو راجپوت اس کی طرف سے لڑتے رہے حالانکہ یہ جنگیں زیادہ تر اس کے اپنے باپ، بھائیوں اور دکن کی شیعہ ریاستوں کے خلاف تھیں اور ظاہر ہے یہ سب مسلمان ہی تھے۔ مخالف فوجوں میں بھی ہندو اور مسلمان جرنیل اور سپاہی ملے جلے ہوتے تھے۔ بعض لوگ اس فرقہ وارانہ یکجہتی کو "قوم پرستی" کا نام دیتے ہیں اور بعض اسے برصغیر کے دو قومی نظریئے کی تکذیب کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اغلب گمان یہی ہے کہ فوجی سالار، وہ ہندو تھے یا مسلمان، ان کے اس عمل کے پیچھے صاف اور سیدھے سبھاؤ محض کرائے کے فوجیوں کی مخصوص ذہنیت کار فرما ہوتی تھی۔ وادی سندھ اور ہندوستان میں اٹھارویں صدی کی بدامنی کے دوران تو یہ رویہ عام تھا۔

مرہٹوں کا اتحاد کسی کام نہ آیا۔ افغانوں کی مختصر مگر پرعزم فوج، وادی سندھ پر اپنے بلاشرکت غیرے "حق" کی حفاظت کے لئے لڑ رہی تھیں۔ مرہٹوں کی اجتماعی قوت کو پانی پت کے میدان میں شکست ہوئی۔

احمد شاہ ابدالی وادی سندھ پر نوبار حملہ آور ہوا۔ ہر حملے کے دوران اسے سکھوں اور پنجابی کسانوں کی بتدریج بڑھتی ہوئی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا، ہر حملہ پہلے حملے کی نسبت ناکام ہوتا۔ اس کے بیٹے تیمور شاہ اور پوتے شاہ زمان نے اپنے باپ اور دادا کے جنگی کارناموں کو دہرانے کی کوشش جاری رکھی لیکن احمد شاہ کی طرح یہ دونوں بھی اس خطے پر اپنی انتظامی بالادستی قائم رکھنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ سکھ فوجی دستوں نے اس امر کو یقینی بنادیا کہ شورشوں اور غیر یقینی حالات کے باوجود یہ خطہ آزاد رہے۔ بعد کے حملوں کے دوران ایسا وقت بھی آیا کہ وادی سندھ پر افغان فرمانروائی محض اس علاقے تک ہی محدود ہوتی کہ جہاں افغان فوجوں نے پڑاؤ ڈال رکھا ہوتا۔

پنجاب پر افغان حملوں نے زیریں وادی سندھ کو دہلی سے بازو چھڑانے کا موقع فراہم کر دیا۔ سندھ میں تالپور سردار دہلی سے رابطے منقطع کر کے کسی رسمی اعلان کے بغیر کابل کے بادشاہ کو اپنا فرمانروا تسلیم کر چکے تھے۔ میر فتح علی اور میر سہراب علی کے دور میں حیدرآباد اور شکارپور سے حاصل ہونے والی آمدنی 57 لاکھ روپے تک پہنچ چکی تھی۔ امرکوٹ، راجہ جودھ پور کی عملداری میں تھا اور کراچی پر قلات کے نصیر خان بلوچ کا قبضہ تھا۔ یہاں سے لگ بھگ سوا چھ لاکھ روپے کے مساوی محصولات حاصل ہوتے تھے۔

مسرفانہ طرز حیات کی بنیاد

ہر افغانی اور ایرانی مہم جوئی بہت شدید لیکن مختصر دورانیے کی ہوتی تھی۔ حملہ آور لوٹ مار کرتے ' مال غنیمت سمیٹتے اور پہاڑوں کے پار اپنے وطنوں کو لوٹ جاتے۔ وسطی ایشیائی طالع آزماؤں کے بارے میں سندھ واسی کی سوچ کیا تھی ؟ اسے فقیر سید اعجاز الدین نے بڑی خوبصورتی سے قلمبند کیا ہے۔ تیمور اور بابر کے حملوں کا درمیانی عرصہ ایک سو برس سے زیادہ بنتا ہے اور یہ ابدالی سے سینکڑوں برس پہلے کی بات ہے۔ اس حوالے سے اعجاز الدین نے لکھا ہے:

"لاہور پر حملہ آور ہونے والے یہ دونوں منگول تباہی اور غارتگری کے ہرکارے تھے۔ وہ جہاں بھی گئے' زمین کے اس خطے کو لوٹ کر ویران کر گئے اور اپنے پیچھے دولت اور املاک تو کیا شہریت کا نشان تک نہ چھوڑا"

اور یہ حقیقت ہے کہ تیمور ' بابر' نادر شاہ اور ابدالی نے وادی سندھ کی نفسیات پر بہت گہرے اور انمٹ نقوش مرتب کئے۔

بچت یا پس انداز کرنے کی بے ثمری اور ترت خرچ کر دینے کی افادیت نے اب وادی سندھ کی ثقافت میں ایک مستقل اور غالب رجحان کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔ حملہ آوروں کی مسلسل لشکر کشی کے نتیجے میں فصلیں نہ بچ ' جانور نہ جوان' سندھ واسیوں کے پاس کچھ باقی نہ بچتا تھا۔ لوٹ مار کرتی فوجیں اپنی خوراک اور دیگر ضروریات کے لئے مقامی آبادی سے ہر شئے چھین لیتی تھیں۔ ظاہر ہے ان حالات میں پس انداز کرنے سے کیا حاصل تھا؟ پنجابی کے اس ضرب المثل شعر میں بھی اسی رویئے کا اظہار بڑی شدت سے ملتا ہے۔

کھادا پیتا لاہے دا
تے باقی احمد شاہے دا

(صرف وہی کچھ تمہارا ہے جو تم خود کھا پی لیتے یا استعمال کر لیتے ہو ' باقی سب تو احمد شاہ چھین لے جائے گا)

دنیا کے دیگر افراد کے برعکس سندھ واسی من حیث القوم آج بھی پس انداز کرنے یا زر بچانے کے بجائے خرچ کر دینے کے قائل ہیں اور خرچ بھی وہ نمائشی انداز میں کرتے ہیں اور اسے خامی نہیں بلکہ خوبی سمجھا جاتا ہے۔ وہ شادی بیاہ ' منگنی اور دوسری تقریبات پر بساط سے بڑھ کر خرچ کرنے کے لئے بے دریغ قرض لیتے ہیں کیونکہ وہ قائل ہو چکے ہیں کہ "بس وہی کچھ تمہارا ہے جو تم نے خرچ کر لیا ' جو بچ گیا اسے بہر حال احمد شاہ لے جائے گا"

اسراف اور بے جا نمود و نمائش کی یہ عادت محض آج کے دور میں پروان نہیں چڑھی۔ یہ صدیوں پر پھیلی ہوئی بدامنی اور طوائف الملوکی کا شاخسانہ ہے۔

ماضی نے سندھ واسیوں کو ایک اور ورثہ بھی منتقل کیا ہے کہ اپنے حکمرانوں سے ان کی توقعات بہت محدود ہیں۔ یہاں تو مستقل حکمرانوں کے بجائے اکثر لوٹ مار کرنے والوں کا تانتا بندھا رہا۔ افراتفری کے ادوار میں کوئی بھی حکمران 'عوام کے تحفظ اور ان کی فلاح و بہبود کا ذمہ دار نہیں تھا۔ لفظ ''درباری'' جو کبھی وزیروں کے لئے استعمال ہوتا تھا اور عزت واحترام کی علامت تھا' حقارت اور تمسخر کا نشان بن گیا۔ اب 'درباری' خون آشام اور خوشامد پرست سرکاری اہلکار کی شناخت تھا۔ حکومت کا بنیادی مقصد رقم کا حصول اور مال و منال کی ضبطی اور شہریوں کو بزور قوت اطاعت گزار بنا کر انہیں کوڑی کوڑی کا محتاج کرنا ٹھہرا۔

اور یوں سندھ واسیوں کے مزاج میں ظالم و جابر حکمرانوں کی چیرہ دستیاں برداشت کرنے کی اہلیت بتدریج بڑھتی چلی گئی۔

پاکستان کے قیام کی صرف تیسری دہائی میں اس کے ٹوٹ جانے کی بنیادی وجہ بھی شاید مغربی پاکستان یعنی وادی سندھ (یا آج کے پاکستان) کی اشرافیہ اور اس کے دانشوروں کا ظلم برداشت کئے جانے کا وہی صدیوں پرانا حوصلہ ہے جو اس خطے کی تاریخ سندھ واسی کو وراثتاً منتقل کیا ہے۔ بنگالیوں کی قوت برداشت سندھ واسیوں کے ہم پلہ نہ تھی۔ اس لئے وہ الگ ہو گئے۔

اٹھارویں صدی کے دوران حکمران طبقے کی ایک اور خصوصیت جو ابھر کر سامنے آئی وہ یہاں کے صوبیداروں کا اپنے عہدے برقرار رکھنے کی خاطر وفاداریاں تبدیل کر لینا تھا۔ ان میں سے اکثر بڑی بے جگری کے ساتھ حملہ آوروں سے لڑ چکے ہوتے تھے اس لئے ان کی بے مثال جرات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور وفاداری تبدیل کرنے کو نہ صرف نظر انداز کر دیا جاتا بلکہ اسے کوئی معاشرتی عیب بھی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ بقاپسندی اور کامیابی کی اخلاقیات یا مصلحت کوشی کو شکست خوردگی اور افراتفری کے ادوار میں بھی بہت اہمیت حاصل تھی۔ ایک طاقتور اور جابر جرنیل 'گورنر یا جاگیردار کو اس کی بدلتی وفاداریوں سے قطع نظر ایک پر تعظیم خوف سے دیکھا جاتا تھا۔ معاشرے میں اس بات کی اہمیت نہیں تھی کہ کون کس کی جانب سے لڑا تھا۔ اہم یہ تھا کہ کون مسلسل اقتدار میں رہا تاکہ اس کے لئے عوامی عزت واحترام میں کمی نہ آنے پائے۔

وفاداریاں تبدیل کرنے کے اس مزاج کو ''تاریخی ورثے'' کے حوالے سے آج کے زمانے پر منطبق کرنے والے اگر خطے کی تاریخ کو اس کے صحیح تناظر میں پرکھ لیں تو صورت حال زیادہ واضح ہو کر

سامنے آجاتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس زمانے کے غیر یقینی حالات میں شامت قدمی کی سزا وحشیانہ اور دردناک موت تھی جبکہ آج کے موقع پرستوں کو ایسے کسی خطرے کا سامنا نہیں اس کے باوجود وہ اسی ثقافتی بدعت کا شکار ہیں اور اس کے لئے وہ سیاسی وفاداریاں تبدیل کرتے وقت تاریخ کی سند جواز مہیا کر کے اپنے تئیں ضمیر کی خلش سے بھی نجات حاصل کر لیتے ہیں۔

بہت سے پر آشوب ادوار میں وادی سندھ پر کابل اور دہلی کی حکمرانی تیزی سے آتی جاتی اور بدلتی رہی جس کے باعث یہاں کے صوبے دار کبھی ایک فرمانروا کے احکامات بجالائے اور کبھی دوسرے کے۔ اس صورت حال نے بھی وادی سندھ کی اجتماعی سوچ پر ایک اور (منفی) اثر ڈالا۔ یہاں ہونے والے ہر کام کے پیچھے انہیں ہمیشہ کوئی اجنبی (اور اب غیر ملکی) ہاتھ نظر آنے لگا۔ حکمرانی کا اصل مرکز چونکہ وادی سندھ سے باہر ہوتا تھا۔ اس لئے جب اس خطے میں کسی ایک حکمران کے خلاف مزاحمت جاری ہوتی تو دوسرا اس تصادم سے فائدہ اٹھا کر اس پر قابض ہو جاتا۔

ماضی قریب میں صرف رنجیت سنگھ اور سندھ اور قلات کے میروں کے ادوار میں ایسا ہوا جب وادی سندھ کو مقامی حکمران ملے لیکن ان کا عہد حکومت بھی زیادہ عرصہ جاری نہ رہ سکا۔ اسی زمانے میں ایک سامراجی قوت وادی سندھ کے سیاسی ڈھانچے کی شکست و ریخت اور اس کے داخلی تضادات سے فائدہ اٹھانے کے لئے پر تول رہی تھی جبکہ ہندوستان میں یہ عمل پہلے ہی کامیابی سے ہمکنار ہو چکا تھا۔

مگر نفانفسی کی یہ روش ہر ایک شخص تو نہیں اپنا سکتا تھا۔ کبھی تو اس مفاد پرستی' تصادم' نفاق اور طوائف الملوکی کا ردعمل بھی ہوتا تھا جو بالآخر اجتماعی شعور رکھنے والے صاحبان فکر و بصیرت کے مثبت روپ میں سامنے آیا۔ یہ سب رہنما اور مفکرین معاشرے پر طاری اس مسلسل بدامنی اور طوائف الملوکی سے سخت نالاں تھے لیکن اس بیزاری کے اظہار کی صورتیں مختلف تھیں۔ ایک طرف بھگتی تحریک تھی تو دوسری طرف گرو نانک کی تعلیمات' جب کہ وادی سندھ کے صوفیاء تیسرا متبادل پیش کر رہے تھے۔

15

بھگتی ' نانک اور صوفیاء

تہذیبی تفاوت مٹانے کی سعی

اب تک میں نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ ابتدا سے آج تک وادی سندھ اور ہند ایک دوسرے سے کتنے مختلف اور کیسی جداگانہ خصوصیات کے حامل تھے اور یہ کہ دونوں تہذیبیں ہم عصر ہونے کے باوجود ایک دوسرے میں مدغم اور یک جان ہوئے بغیر ہمیشہ متوازی خطوط پر رواں رہیں۔ میں نے اس حقیقت پر بھی روشنی ڈالنے کی سعی کی ہے کہ وادی سندھ نے دریائے جمنا کے کناروں پر آباد اپنے مشرقی ہمسایوں کے بجائے ہمیشہ وسطی ایشیاء کی ثقافت ' نسلی ورثے ' زبان ' سیاسی نظاموں اور مذہبی عقائد کو ترجیح دی۔ وسطی ایشیا کے ساتھ ان کے تجارتی روابط میں بھی گرمجوشی کہیں زیادہ تھی۔ آمو دریا کو وادی سندھ سے جدا کرنے والے بلند ' بنجر اور بظاہر ناقابل شکست پہاڑوں کے مقابلے میں پنجاب اور جمنائی میدانوں کو تقسیم کرنے والی غیر مرئی حد فاصل ' تہذیبوں کے ارتباط میں زیادہ بڑی رکاوٹ ثابت ہوئی تھی۔ اور یہ بھی کہ وادی سندھ اور عربوں کے درمیان روابط ' اس مختصر عرصے کے سوا جب اس خطے کے ایک حصے پر عربوں کا قبضہ رہا ' کبھی محدود تجارت سے آگے نہیں بڑھے۔

لیکن وادی سندھ اور ہندوستان کی جداگانہ حیثیت کے ادراک کے باوجود ہمیں ان اہم کاوشوں کو قطعی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے جو ان دو تہذیبوں کو یکجا کرنے کے لئے کی گئیں۔ اس سلسلے میں وقتاً فوقتاً بہت سی قابل ذکر تحریکیں شروع ہوئیں جن کا مقصد وادی سندھ کو ہندوستان میں ضم کر کے اس تنوع کی کوکھ سے ایک اٹوٹ برِ اعظمی اکائی تخلیق کرنا تھا لیکن ان میں سے کوئی ایک تحریک بھی کامیابی

سے ہمکنار نہ ہو سکی۔ یہ تحریکیں دراصل اقتدار کی جنگوں سے پیدا ہونے والے تصادم ' نفاق ' افراتفری اور طوائف الملوکی کے خلاف متحرکین کا ردعمل تھا۔

امیر خسرو (1253 تا 1325 عیسوی) نے اس ردعمل کو میٹھی شاعری کا رنگ دیا۔ وادی سندھ کے شہر ملتان کا یہ باسی بعد میں دہلی جا کر آباد ہوا۔ وہ مقامی زبان کا پہلا شاعر تھا جس نے اپنی شاعری میں مقامی استعارے اور ہندوستانی تراکیب کے استعمال کو ترجیح دی۔ امیر خسرو نے حکمرانوں کے طرز کلام کو شعوری طور پر مسترد کیا۔ اس نے شاعری کے فارسی حوالے بھی ترک کر دیئے۔ وہ غالباً ہندوستان کا پہلا فطرت پسند شاعر تھا جس نے علامتی انداز میں اپنے اردگرد کے ماحول اور وادی سندھ اور ہندوستان کے مقامی رسم و رواج کو نظم کیا۔ اس حوالے سے خسرو پہلا قوم پرست بھی تھا۔ کوئی اور اس جیسی روانی اور برجستگی سے چرخا 'کتا' ڈھول اور کھیر جیسے الفاظ کو مقامی محاورے میں باندھ کر نظم نہیں کر سکا۔ مقبول عام کہانی اس طرح ہے کہ ایک دن سفر سے تھکے اور پیاس سے نڈھال امیر خسرو نے ان لڑکیوں سے پانی مانگا جو اسے پہچان چکی تھیں۔ لڑکیوں نے کنویں سے پانی پلانے کی شرط یہ رکھی کہ وہ پہلے ان چار الفاظ پر شعر کہے۔ خسرو نے بھی دیر نہ لگائی اور بولا:

کھیر پکائی جتن سے
چرخا دیا جلا
آیا کتا کھا گیا
تو بیٹھی ڈھول بجا

بعد میں بلھے شاہ ' سلطان باہو ' اور شاہ لطیف نے مقامی ماحول اور اشیاء کے حوالے سے خسرو کے اظہار کی برجستگی برقرار رکھی۔ موسیقی میں بھی خسرو کی خدمات لاثانی ہیں۔ اس نے نئے راگ وضع کیے اور بہت سی ایرانی دھنوں کو ہندوستانی قالب میں ڈھالا۔

وادی سندھ اور ہندوستان میں رائج مختلف مکاتیب فکر کے خمیر سے کسی مشترکہ عقیدے کی بنیاد اٹھانے والوں میں ایک ہندو معلم راما نند (1400-1470ء) بھی تھا جسے ناموری اگرچہ بھگتی فرقے کے حوالے سے ملی لیکن اس کے اصل کام سے کہیں زیادہ اہم وہ علمی ترکہ ہے جو اس نے منطق کے ایک نئے رجحان اور فکر کے ایک نئے انداز کی صورت میں چھوڑا۔ کیا تو اس کے شاگرد کبیر (1440-1518ء) نے بھی یہی لیکن اس نے قطعی طور پر ایک نئی راہ اختیار کی تھی۔

کبیر نے اپنی اختراعی منطق سے اسلامی وحدانیت کے ساتھ ہندو عقیدے آواگون (کرما) کو منسلک کر دیا۔ بنارس کے اس جولاہے کی نظمیں 'گیت اور کہاوتیں آج بھی مقبول ہیں۔ اس نے بتوں کی

پرستش اور تمام مقدس کتابوں اور تحریروں کے احکامات کو یکساں طور پر ہدف تنقید بنایا۔ کبیر نے دنیا اور اس کے موجودات کو ''مایا'' کا نام دیا اور انسان کو بدی سے مغلوب ہونے کا ملزم ٹھہراتے ہوئے اسے تمام برائیوں کی جڑ قرار دیا۔

بھگتیوں نے اعتقاد' محبت اور عقیدت کی بنیاد پر شہری دستکار اور تاجروں کو ساتھ لے کر ایک تحریک شروع کی اور مسلمانوں سمیت ہر ذات اور عقیدے کے افراد کو اس میں شامل کیا۔ اچھوتوں اور نچلی ذات کے دستکاروں کی حالت زار سے بھی ان کے نظریئے کی آبیاری ہوئی۔

لیکن نہ تو مقامی زبان اور محاورے کو اپنی تحریروں میں استعمال کر کے' دو مختلف ثقافتوں کو یکجا کرنے کی امیر خسرو کوشش کامیابی سے ہمکنار ہوئی اور نہ ہی کبیر کے عام فہم دوہے کوئی رنگ دکھا سکے۔ اکبر جیسا مغل شہنشاہ بھی شاہی فرمان کے ذریعے ایک مشترک مذہب دین الٰہی رائج نہ کر سکا۔ ایسی تمام کوششیں جنم لینے سے پہلے ہی دم توڑ گئیں۔

ادھر مسلمان بادشاہوں نے ہندو حکمران خاندانوں میں شادیاں کر کے انہیں مطیع و حلیف بنائے رکھنے کی حکمت عملی اپنائی۔ اکبر نے راجہ پورن مل اور راجہ کلیان مل کی بیٹیوں سے شادی رچائی اور جہانگیر' راجہ بھگوان داس' راجہ رائے سنگھ اور راجہ اودے سنگھ کی بیٹیوں کو بیاہ کر لایا۔ مگر مسلمان بادشاہوں اور ہندو شہزادیوں کی یہ شاہی شادیاں بھی دو مختلف ثقافتوں' دو مختلف نسلوں اور دو مختلف خطوں میں بسنے والی قوموں کے درمیان خلاء کو پُر کرنے میں کارگر ثابت نہ ہوئیں۔

اگرچہ ان شاہی شادیوں کے نتیجے میں عوامی سطح پر فرقہ وارانہ کشیدگی میں کسی حد تک کمی واقع ہوئی لیکن ''اصل تفریق'' وہ تفریق جو وادی سندھ اور ہندوستان کے مابین تھی' اس پر ایسی کسی بھی سعی کا اثر نہ ہونے کے برابر تھا۔ دونوں تہذیبوں کے درمیان تفاوت اور اختلافات بدستور موجود تھے۔

امتزاج ضدین کی مزید تحاریک

اس زمانے میں دونوں تہذیبوں کے اتصالی علاقوں میں بیک وقت کئی اور اہم تحاریک بھی جاری تھیں جو اختلافات کی بیخ کنی تو نہ کر سکیں لیکن اس شدت کو کم کرنے کی سعی میں یقیناً کوشاں رہیں۔ برصغیر کی دو مختلف تہذیبوں کو یکجان کرنے میں ان دو فعال اور دوررس تحریکوں کا کردار خاص طور پر قابل ذکر ہے جو بڑے جوش اور ولولے کے ساتھ ان علاقوں میں شروع کی گئیں جہاں امن یا حالت جنگ میں دونوں ثقافتیں باہم مربوط ہوتی تھیں یا جہاں دونوں کی سرحدیں آپس میں ملتی تھیں۔

جب دو منفرد قوموں یا تہذیبوں کا باہمی ملاپ ہوتا ہے تو اکثر دونوں میں (خاص طور پر کمزور قوم

یا تہذیب میں) یہ رجحان جنم لیتا ہے کہ وہ مدافعانہ انداز اختیار کر کے اپنے خول میں بند ہو جائے تاکہ خود کو دوسری قوم کے تہذیبی اثرات سے محفوظ رکھ سکے۔ البتہ سرحدی علاقوں میں دونوں کے امتزاج کی کوشش میں محدود پیمانے پر کامیابی کے امکانات روشن ہوتے ہیں۔

برصغیر میں ایسی جگہ صرف اس غیر مرئی حد فاصل کے اطراف میں تھی جسے میں نے گورداسپور کاٹھیاواڑ قوس کا نام دیا ہے۔

کوہ ہمالہ کے دامن میں بسے گورداسپور سے لے کر بحیرہ عرب کے ساحل پر واقع کاٹھیاواڑ تک ایک لکیر کھینچی جا سکتی ہے جس کے دونوں اطراف یہ واحد علاقہ تھا جہاں وادی سندھ اور ہندوستانی ثقافت کے اہم مراکز وادی گنگا اور جنوبی جزیرہ نما ہند کی تہذیبوں کے امتزاج سے ایک مشترکہ ثقافت ابھر سکتی تھی۔ مشرقی پنجاب اور سندھ کے انہی میدانوں اور ریگستانوں میں وسطی ایشیا اور ہندوستان کا ملاپ ہوا للٰذا یہ اچنبھے کی بات نہیں اگر متضاد نظریات سے مشترکہ عقیدے کی بنیاد اٹھانے کے حامی اور کبیر کے ہم عصر گورکھ ناتھ اور گرونانک کو اپنے انہی نظریات کے حوالے سے دریائے سندھ کے مشرقی معاون دریاؤں کے علاقے میں قدرے دیرپا نظام قائم کرنے میں زیادہ کامیابی حاصل ہوئی۔ پھر اسی سرزمین نے صوفیاء کے مسلک پر مبنی ایک غیر معمولی اسلامی تحریک کی آبیاری بھی کی جسے بنی نوع انسان سے محبت اور نرم روی نے ایک معتدل تحریک بنا دیا تھا۔

گرو گورکھ ناتھ نے اگرچہ پندرہویں صدی میں جنم لیا لیکن یوں لگتا ہے جیسے اس کی شخصیت زمان و مکان کی قید سے آزاد تھی۔ داستان راجہ رسالو میں گرو گورکھ ناتھ سے کئی کارنامے منسوب ہیں جن میں سیالکوٹ کے نزدیک ایک اندھے کنویں سے پورن بھگت کو باہر نکال کر اس کی زندگی بچا لینا بھی شامل ہے لیکن جیسا کہ پہلے واضح کیا جا چکا ہے اس داستان کی تاریخ کہیں 400 سے 500ء کے درمیان بنتی ہے گویا اس حوالے سے گورکھ ناتھ کی پیدائش اور پورن بھگت کی زندگی بچانے کے درمیان تقریباً ایک ہزار سال کا ناقابل وضاحت فاصلہ حائل ہے لیکن گرو گورکھ ناتھ تو آج بھی وادی سندھ کی لوک داستانوں میں ایک ہمہ وقت موجود افسانوی کردار ہے جو مشکل وقت میں نیک لوگوں کی مدد کو پہنچ جاتا ہے۔

اپنی زندگی میں ہی گرو گورکھ ناتھ نے تصادم اور طوائف الملوکی سے متنفر ہو کر، دکھوں سے بھری اس ناپائیدار دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اس کا پیغام تو خاصے دور دراز علاقوں تک پہنچا لیکن اس کے باوجود اس فرقے کو خاطر خواہ سیاسی اثر و رسوخ حاصل نہ ہو سکا کیونکہ گورکھ ناتھ کی تعلیمات بے حد تجریدی نوعیت کی تھیں۔ یہ عقیدہ کہ شدید ذہنی محویت بدن کو لطیف بنا کر انسان کی روح کو اس

روح العالم سے ملا دیتی ہے جو ہر شئے میں نفوذ پذیر ہے۔ ظاہر ہے یہ تمام دنیاوی معاملات کو مکمل طور پہ ترک کر دینے کی تلقین ہی تو تھی۔ گورکھ ناتھ کے مسلک میں ہندو مسلم تخصیص کے بغیر ' ہر شخص کو شامل ہونے کی اجازت تھی لیکن شمولیت کے بعد سب کو اپنے کان چھدوانے پڑتے تھے اور انہیں 'کن پھٹے' یا جوگی کہا جاتا تھا۔

جبر کے خلاف نانک کا 'سچا سودا'

عام روایت یہی ہے کہ نانک تلونڈی میں پیدا ہوا حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ کننگھم Cunningham کے مطابق سکھ مذہب کے بانی کو 'نانک اس لئے کہا جاتا تھا کہ تلونڈی میں اپنے والدین کے گھر کے بجائے لاہور کے نزدیک کاہنا کاچھا میں نانا ' نانی کے گھر میں اس کی پیدائش ہوئی تھی۔ نانک پیدائشی طور پر ہندو تھا لیکن اس کا اتالیق ایک پرہیزگار مسلمان سید حسن تھا۔

نانک بار سوخ بیدی خاندان کا سپوت تھا۔ وہ ایک ہونہار بروا تھا جس کے چکنے پات اوائل عمری میں ہی نمایاں ہونے لگے تھے۔ اعلیٰ انسانی خصائل بچپن ہی سے اس کے مزاج کا حصہ بنے۔ ایک بار والد نے اسے اپنے کاروبار کے لئے کچھ سامان خریدنے بھیجا لیکن نوعمر نانک نے 40 روپے کی وہ تمام رقم بھوک سے نڈھال فقیروں کو کھانا کھلانے میں صرف کر دی۔ والد نے سرزنش کی تو جواب دیا "میں نے تو بہت سچا سودا کیا ہے" ضلع شیخوپورہ کا وہ مقام جہاں فقیروں نے کھانا کھایا تھا ' آج بھی "سچا سودا" کہلاتا ہے۔

جب نانک جوان ہوا تو سماج کا مروجہ نظام اس کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ بیوی بچوں کو اپنے بزرگوں کی حفاظت میں چھوڑ چھاڑ وہ مہاتما بدھ کی طرح گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ وہ دنیا کے دور دراز علاقوں تک گیا لیکن اس کا رابطہ اپنے گھر ' اپنے لوگوں اور اپنی زمین سے منقطع نہیں ہوا۔ سفر سے واپسی ہوئی تو نانک نے اپنا پسندیدہ پیشہ درس و تدریس اختیار کر لیا۔

کہتے ہیں سفر کے دوران نانک مکہ معظمہ بھی پہنچا اور خدا کے ہر جگہ ' ہر وقت موجود ہونے کا پرچار بھی کرتا رہا۔ ایک بار خانہ خدا کی طرف پاؤں پھیلائے سونے پر نانک کو سرزنش کی گئی تو اس نے پوچھا تھا "مجھے بتاؤ وہ کون سی سمت ہے جہاں خدا یا خانہ خدا نہیں ہے"؟ وطن واپسی پر ' مستقبل میں ہندوستان کے شہنشاہ ' مہم جو ظہیر الدین بابر کے ساتھ ایمن آباد کے قریب نانک کا مکالمہ بھی ہوا۔ ایک روایت اور بھی ہے کہ نانک نے افغانستان جاتے ہوئے حسن ابدال کے قریب محض ایک ہاتھ کی قوت سے اپنی جگہ چھوڑتی ہوئی چٹان کو روک دیا تھا۔ پہاڑ کے اس بہت بڑے ٹکڑے پر ہتھیلی اور انگلیوں کا نشان آج

بھی موجود ہے جسے نانک سے منسوب کیا جاتا ہے اور اسی حوالے سے اس جگہ کا نام "پنجہ صاحب" مشہور ہوا۔

گرونانک نے اپنے زمانے کے دونوں اہم مذاہب سے استفادہ کرتے ہوئے 'اسلام اور ہندو مت کے اعتقادات اور رسومات کو آپس میں ضم کر کے ایک نیا عقیدہ وضع کیا۔ اس نے خدا کی وحدانیت کا درس دیا اور مت پرستی کی سختی سے ممانعت کی۔ اس نے اسلام کی سچائی کو تسلیم کیا لیکن ساتھ ہی وید اور مہابھارت کے عقیدوں کی تعظیم بھی کی لیکن ان سب سے بڑھ کر نانک کا فلسفہ مساوات انسانی عام لوگوں کے لئے باعث کشش ہوا۔

دوران سفر مختلف رنگ ڈھنگ کے لوگ نانک کے ہمرکاب ہوتے تھے۔ ان میں ایک مردانہ نام کا مراثی تھا جو بانسری بجا کر اپنے تھکے ہارے ساتھیوں کا دل بہلاتا' ڈھلتی عمر کے رام داس کو سارے ہم سفر "مہاتما بدھ" کہا کرتے تھے اور تاریخ میں بھی یہی عرفیت رام داس کی پہچان ہے۔ پھر ایک لہنا بھی تھا جو سفر کے دوران گزر بسر کے لئے پٹ سن سے رسیاں بٹنے کا کام کرتا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندی اشرافیہ عوام کی نظروں میں بے توقیر ہو چکی تھی۔ دہلی سلطنت کے بادشاہ انحطاط کا شکار ہو کر آمر بن چکے تھے۔ شاہی کارندے محاصل کے نام پر عوام کا خون چوس رہے تھے۔ شاہی مصاحبین کی ذہنیت جابرانہ تھی اور جور و ستم ہو کہ لطف و کرم' اصول پاسداری ان کا وطیرہ نہ تھا ۔دہلی سلطنت کے زوال کے بعد بھی تین دہائیوں تک معاشرہ بدامنی کا شکار رہا' استحکام کہیں اکبر کے دور میں جا کر نصیب ہوا۔ ہمایوں کے تخت دہلی پر دوبارہ قابض ہونے سے پہلے نانک کا انتقال ہو چکا تھا۔

اس دور آشوب میں ذات پات سے نانک کی بیزاری ' ثقہ مذاہب سے لاتعلقی اور مانوس مقامی زبان میں عقائد کی تبلیغ نے مظلوم کسانوں اور دستکاروں کی ایک بڑی تعداد کو نانک کی طرف مائل کیا۔ اجتماعات میں عورتوں کے شریک ہونے کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ اس مسلک کو اونچی ذاتوں کی مروجہ ممنوعات اور گوشہ نشینی سے کوئی سروکار نہ تھا۔ نانک کا پیغام 'امن اور بقائے باہمی کا پیغام تھا۔ اس کا عقیدہ عدم تشدد اور مساوات انسانی کے اصولوں پر استوار تھا۔ برہمنی منتروں اور عربی یا فارسی مقالوں اور تفسیروں کے برعکس نانک کے فرمان انتہائی سادہ اور ان پڑھ عوام کے لئے بھی قابل فہم تھے۔

نانک کے جانشینوں نے بھی پرامن بقائے باہمی کے اس پیغام کی تبلیغ جاری رکھی۔ 1539ء میں اپنی موت سے قبل نانک نے تمام چیلوں کو وفاداری کے ایک امتحان سے گزارا 'صرف لہنا اس امتحان سے سرخرو ہو کر نکلا۔ اس نے مرشد کے حکم پر ایک انسانی لاش کا گوشت اپنے دانتوں سے کاٹا جبکہ دوسرے ہچکچاتے رہ گئے۔ نانک نے لہنا کو اپنا جانشین قرار دے کر اسے "انگد" کا نام دیا اور انگد نے

اتنے بڑے منصب پر فائز ہونے کے باوجود گزر اوقات کے لئے پٹ سن سے رسیاں بٹنے کا پیشہ جاری رکھا۔

انگد کے بعد 1552ء میں امر داس جانشین ہوا۔ وہ بھی اتنا ہی سادہ اور منکسر المزاج تھا اور خچر گاڑی پر سامان ڈھونا اس کی کمائی کا واحد ذریعہ تھا۔ مغل شہنشاہ اکبر سے گرو کے مذاکرات ہوئے جس میں فریقین کی باہمی رضامندی سے ' نانک مسلک کی پرامن تبلیغ کا طریقہ کار وضع کیا گیا۔ مغل بادشاہ گرو کی منطق اور عقیدے کی مضبوطی سے اتنا متاثر ہوا کہ گرو کی درخواست پر اس نے لاہور اور اس کے گردونواح کو ایک سال کے لئے لگان سے مستثنیٰ قرار دے دیا جس سے امر داس کے مرتبے میں اضافہ ہوا اور اس میں اتنی خود اعتمادی آگئی کہ اس نے نانک کے بیٹے سری چند اور اس کے وضع کردہ ایک نئے اور علیحدہ مسلک سے مکمل لاتعلقی کا اعلان کر دیا۔ اور اس طرح سکھوں میں وراثتی سلسلہ پاؤں نہ جما سکا۔

حالات کے جبر نے امر داس کے جانشینوں کو بالآخر امن اور برداشت کا راستہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ گرو ارجن سکھوں کی مقدس کتاب گرنتھ صاحب کا فاضل مصنف تھا لیکن لاہور کے مغل صوبیدار چندو شاہ سے گرو کے تعلقات میں کشیدگی آگئی کیونکہ گرو نے صوبیدار کے بیٹے کے لئے اپنی بیٹی کا رشتہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ چندو شاہ نے شہنشاہ جہانگیر کے دربار میں گرو کے خلاف مسلسل زہر افشانی کر کے اس کی گرفتاری کے احکامات حاصل کر لئے اور حراست کے دوران بے پناہ تشدد گرو ارجن کی بے وقت موت کا سبب بنا۔

گرو ارجن کی موت سکھوں کی تاریخ کا فیصلہ کن موڑ ثابت ہوئی۔ اس کے بعد کھلے ذہن کا سنت ہار گوونددیا گوبند جب گیارہ سال کی مسلسل نظر بندی کے بعد گوالیار قلعے کی جیل سے باہر آیا تو وہ ایک پرعزم اور بلند حوصلہ جنگجو بن چکا تھا۔ بدقسمت مغل شہزادے دارا شکوہ کا ساتھ دیتے ہوئے اس نے تین بار مغل حملہ آوروں کو پسپائی پر مجبور کیا۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ 1645ء میں جب اس کی موت واقع ہوئی تو کئی بہادر جوانوں نے اس کی چتا میں کود کر جان دے دی۔ گرو ہار رائے نے بھی اپنے دادا کے نقش پر چلتے ہوئے دارا شکوہ کی حمایت جاری رکھی جس کے نتیجے میں سکھ اورنگزیب کے مسلسل اور شدید عتاب کی زد میں رہے۔

سکھوں کے نویں گرو تیغ بہادر نے پنجاب کے میدانی علاقوں میں پہلی بار سکھوں کے برق رفتار گوریلا دستے منظم کئے۔ تیغ بہادر کی شخصیت کا فسوں اتنا گہرا اور اس کی شہرت اتنی ہمہ گیر تھی کہ اسے مافوق الفطرت صلاحیتوں کا حامل قرار دیا جانے لگا۔ مغلوں کے ساتھ ایک ہلاکت خیز معرکے میں وہ

گرفتار ہوا۔ اس کے خفیہ ٹھکانوں اور روپوش جانثاروں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے دوران اس پر اتنا تشدد کیا گیا کہ وہ زندگی سے عاجز آ گیا۔ مختلف روایتوں کے مطابق کہا جاتا ہے کہ گرو تیج بہادر کو زنجیروں میں جکڑ کر مغل فرمانروا کے سامنے پیش کیا گیا۔ شہنشاہ نے حکم دیا کہ گرو اپنی مافوق الفطرت صلاحیتوں کا مظاہرہ کرے۔ تیج بہادر نے کہا کہ اس کی گردن میں بندھا تعویذ تلوار کے ہر وار کو ناکام بنادے گا۔ گردن پر وار کیا گیا اور گرو کا سر تن سے جدا ہو گیا۔ بادشاہ ششدر رہ گیا جب اس نے دیکھا کہ تعویذ میں لپٹے کاغذ پر تحریر تھا "سر دیا سر نہ دیا" یعنی میں نے اپنا سر کٹوا دیا لیکن راز فاش نہیں کیا۔

اب تک سکھ ایک جنگجو قوم میں تبدیل ہو چکے تھے۔ گرو گوبند نے نیم فوجی تنظیم خالصہ بنا کر بغاوت کو جاری رکھا۔ سرہند میں شاہی فوج سے مقابلے کے دوران گرو کی ماں اور اس کے چار بیٹے مارے گئے۔ وہ ایک جنونی کی طرح شاہی فوجوں پر حملہ آور ہوا اور مکیتسر کے مقام پر انہیں شکست سے دوچار کیا۔ گوبند نے سرہند فتح کیا تو نانک کی تعلیمات کے مطابق شہر کو کوئی گزند نہیں پہنچنے دیا اور بدلہ لینے کی علامت کے طور پر محض دو اینٹیں نکال لیں۔

مفلوک الحال کسان اور بے روزگار دستکار سکھ مذہب کی قوت بنے۔ گوبند انہیں ہمیشہ ہتھیار بند رہنے کی تلقین کرتا۔ اورنگ زیب کی موت کے بعد سکھوں پر عذاب میں کمی آئی اور گرو نے نئے مغل تاجدار بہادر شاہ کی مصاحبت اختیار کر لی۔ 1708ء میں ایک پٹھان نے دکن میں گوبند کو قتل کر دیا۔

صوفیاء کرام

توانائی سے بھرپور اور کہیں زیادہ شفاف اور روشن ایک اور تحریک صوفیاء کی تھی۔ لفظ صوفی کا مصدر صوف ہے جس کا مطلب ہے اون۔ صوفی اونی لباس پہنتے تھے جو اس بات کی علامت تھا کہ وہ دنیا کو ترک کر کے زاہدانہ زندگی اپنا چکے ہیں۔ وہ ایسے مسلمان مبلغ تھے جو سدا سفر میں رہتے۔ ان میں سے اکثر وسطی ایشیا کے شورش زدہ علاقے خود چھوڑ آئے تھے یا انہیں ایسا کرنے پر مجبور کر دیا گیا تھا اور انہوں نے وادی سندھ کے سرحدی علاقوں میں آباد ہونے کو ترجیح دی تھی۔

ابتدا میں شمالی ہندوستان کے صوفیا محض مبلغین تھے جنہیں تبلیغ اسلام میں بعض اوقات شاہی سرپرستی بھی حاصل ہو جاتی تھی۔ صوفیاء کے سلسلے کا پہلا عظیم نام لاہور کے داتا گنج بخش شیخ علی مخدوم ہجویری کا ہے۔ وہ محمود غزنوی کے بیٹے، جانشین اور لاہور کے حکمران مسعود غزنوی کے ساتھ یہاں آئے تھے۔ اگرچہ اس علاقے پر مسلمانوں کی حکمرانی تھی لیکن وادی سندھ میں یہ وقت اسلام کے لئے

کچھ اتنا آسان نہیں تھا۔ آبادی کی اکثریت ابھی تک غیر مسلم تھی لیکن داتا گنج بخش کے علم اور زہد و تقویٰ نے بے شمار افراد کو ان کا پیروکار بنادیا۔ سلاطین دہلی کے زمانے میں نظام الدین اولیاء دربار کی سرپرستی میں رہے۔ یہ صوفیاء کی تحمل مزاجی اور انسان دوستی تھی جس کے نتیجے میں ' شورش ' عدم برداشت اور غیر یقینی حالات کے باوجود نچلی ذات اور طبقات کے لوگ ان کے ہاتھوں مشرف بہ اسلام ہوتے رہے۔

لیکن سبھی صوفیاء حکمران بادشاہوں کی ترغیب پر وادی سندھ اور ہندوستان میں نہیں آئے تھے۔ 1161ء میں خواجہ معین الدین چشتی غزنی سے لاہور پہنچے اور جلد ہی یہاں سے اجمیر چلے گئے جہاں ابھی راجپوت شہزادہ پرتھوی راج حکمران تھا۔ سلسلہ چشتیہ کا ایک اور عظیم نام شیخ فریدالدین گنج شکر (1175 تا 1265) کا ہے جو کم و بیش اسی زمانے میں وادی سندھ آئے جب خواجہ معین یہاں آئے تھے۔ بابا فرید کا شمار پنجابی کے اولین شعراء میں ہوتا ہے اگرچہ اس زمانے کے صوفیاء نے عمومی طور پر شاعری کو تصوف کا وسیلہ نہیں بنایا تھا۔ گنج شکر سکھوں میں بابا فرید کے نام سے معروف تھے اور گرو ارجن نے ان کے بہت سے اشعار سکھوں کی مقدس کتاب گرنتھ صاحب میں شامل کئے۔

چشتیہ کے علاوہ سلسلہ سہروردیہ بھی وادی سندھ میں دہلی کے سلطنت عہد میں قائم ہوا جس کے بانی شیخ بہاؤالدین ذکریا تھے جو ملتان آکر آباد ہوئے اور 1263ء میں انتقال کے بعد یہیں دفن بھی ہوئے۔ پندرہویں اور سولہویں صدی میں بالترتیب سلسلہ قادریہ اور سلسلہ نقشبندیہ اسی خطے میں قائم ہوا۔ ان چاروں سلسلہ ہائے تصوف کے مقلدین اور ماننے والوں کی ایک بڑی تعداد مغلوں کے عروج سے پہلے ہی وادی سندھ اور شمالی ہندوستان میں موجود تھی۔

اورنگ زیب کے زمانے میں صوفیاء کے پیغام اور وسیلہ ترسیل میں تبدیلی آئی کیونکہ اورنگ زیب ایک سخت گیر 'اصول پرست اور اپنے کٹر مذہبی عقیدے کو آمرانہ انداز میں لاگو کرنے کا قائل تھا۔ اس لئے رد عمل میں صوفیاء کرام نے بھی اپنا انداز بدل لیا۔ شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے کہ صوفیاء نے کبھی کسی سے قبول اسلام پر اصرار نہیں کیا۔ ان کی مجالس میں ہر ذات ' مسلک اور مذہب کے پیروکار موجود ہوتے تھے۔ وہ ہندو کو مسلمان بنانے کے بجائے مسلمانوں کو اپنی عادات و عمل درست کرنے کی تلقین کیا کرتے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ صوفیاء ظلم کی شکار اقلیتوں کے ساتھی اور محافظ تھے۔

شاعرانہ طرز اظہار اگرچہ صوفی روایات کے لئے اجنبی نہیں تھا لیکن ابتدا میں عام طور پر صوفیاء نے اسے نہیں اپنایا۔ اورنگ زیب کے عہد تک صرف بابا فرید اور شاہ حسین (1539 تا 1593-94ء) جیسے چند صوفیا نے اپنا پیغام پھیلانے کے لئے شاعری کو ذریعہ اظہار بنایا۔ اس سلسلے میں اورنگ زیب کی کٹر مذہب پرستی عمل انگیز ثابت ہوئی۔ اس نے جب ایک طرف وادی سندھ میں سکھوں اور دوسری

طرف دکن میں شیعہ ریاستوں کے خلاف مہم جوئی کا آغاز کیا تو صوفیاء شدید غصے اور ذہنی صدمے سے دوچار ہوئے۔ ان کے نزدیک حکمران کی حیثیت سے اورنگ زیب ایک انتہائی غیر متحمل مزاج بادشاہ تھا۔ صوفیاء نے بادشاہ اور اس کے منصب داروں کے ظالمانہ اقدامات کی شدید مذمت کی اور جب وہ ظلم کا ہاتھ روکنے میں کامیاب نہ ہو سکے تو ان کا دکھ نغموں میں ڈھل گیا اور شاعری ان کے لئے ذریعہ اظہار ٹھہری۔

اورنگ زیب کے زمانے میں اور اس کے بعد بھی ' جب ریاست نے اختلاف رائے کو جرم ٹھہرایا اور اقلیتوں پر زندگی تنگ کر دی گئی تو کم و بیش تمام بڑے صوفیاء مزاحمتی شاعری کے پیکر رفعت تھے اور ان میں سلطان باہو ' رحمان بابا ' بلھے شاہ ' وارث شاہ ' شاہ لطیف ' سچل سرمست اور میاں محمد کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

سلسلہ صوفیاء کے ان اطوار کو مروجہ انتظامی اور مذہبی نظام کے خلاف منافرت پھیلانے کا الزام دے کر اسے کچلنے کی کوشش کی گئی۔ ریاستی تشدد کی ایک انتہائی شکل اس وقت سامنے آئی جب سندھ میں جھوک کے صوفی شاعر شاہ عنایت کو منصور الحاج کی طرح ان کی تعلیمات کے باعث 1708ء میں سزائے موت دے دی گئی۔ شاہ عنایت محض ایک مفکر اور شاعر ہی نہیں ' عملی جدوجہد کرنے والا ایک ایسا شخص بھی تھا جس نے غریب کسانوں میں اجتماعی زراعت متعارف کرا کے استحصالی نظام کی بنیادیں ہلا کر رکھ دی تھیں اور سوشلسٹ رجحان کا یہ اولین اظہار ہی اس کا سب سے بڑا جرم ٹھہرا۔

مغل منصب داروں کے ظلم کے ان ادوار نے صوفیاء کے پیغام کو ایک نئی جہت دی۔ اس سے پہلے صرف شاہ حسین نے اس رد عمل کا اظہار کیا تھا اور اکبر کے دور میں سامنے آنے والا یہ رد عمل بھی وادی سندھ پر جبر کے خلاف تھا۔ اورنگ زیب کے بعد تو صوفیاء کا پیغام یکسر بدل گیا۔ اب صوفیا نے ہندو اور مسلمان دونوں کی رجعت پسندی کو قطعی طور پر مسترد کر دیا تھا۔ انہوں نے سماجی عصبیت اور سیاسی بدامنی کے خلاف رد عمل کا اظہار کیا۔ تصادم ' جنگ ' عدم رواداری اور موت کے مہیب سایوں میں بھی صوفیا نے محبت اور بردباری کا درس دیا۔ دنیاوی مظالم اور ناانصافیوں سے توجہ ہٹانے کے لئے انہوں نے کائنات کی بے ثباتی کا پرچار کیا اور ہستی کو فریب نظر کی کرشمہ سازی قرار دیا۔ صوفیاء نے رسومات اور بنیاد پرستی کی مذمت کی۔ ملا اور پروہت کو تحقیر کا نشانہ بنایا اور دربار سے فاصلہ ہمیشہ برقرار رکھا۔

صوفیاء عوام الناس کو خوف اور نفرت سے نجات دلانا چاہتے تھے۔ انہوں نے محبت کو تمام مذہبی اور سماجی بندھنوں سے آزاد اور عظمت کی معراج قرار دیا۔ سوچ کے اس انداز نے دکھی اور نراش دلوں

کے لئے مرہم کا کام دیا۔ شاعری میں بیان کئے گئے یہ نظریات ہی غالباً صوفی مسلک کی سب سے بڑی میراث ہیں۔ بلھے شاہ کے بول آج بھی جبر اور بے یقینی کے کرب میں نڈھال لوگوں کو سکون و عشق کا پیغام دیتے ہیں۔

عشق دی نویوں نویں بہار
وید قرآناں پڑھ پڑھ تھکے
سجدے کر دیاں گھس گئے متھے
نہ رب تیرتھ ' نہ رب مکے
جس پایا تس نور انوار
عشق دی نویوں نویں بہار

ملا جو بزعم خود عالم اور اسلامی اقدار کا محافظ بن بیٹھا تھا اس کے لئے وارث شاہ نے بھی کچھ ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔

پڑھ پڑھ علم قضا پئے کرن مفتی
باغ عشق دے رہن مجہول میاں
پڑھیاں علم نہ رب دی تم ہوندی
اکو عشق دا حرف معقول میاں

اور سلطان باہو کی سوچ کا انداز بھی ان سے مختلف نہیں ہے۔

پڑھ پڑھ علم ہزار کتاباں
عالم ہوئے سارے ہو
ہکو حرف عشق دا نہ پڑھدے
بھلے پھرن وچارے ہو

وادی سندھ کی نار

صوفیاء نے اپنی شاعری میں محبت ' دکھ اور مکر و فریب کی بڑی جانگداز داستانیں نظم کی ہیں۔ ہیر رانجھا ' سسی پنوں ' مرزا صاحباں ' سوہنی مہیوال یہ سب وادی سندھ کی ایسی ہی مقبول لوک داستانیں ہیں۔ ان منظوم داستانوں کو اپنے مخصوص انداز میں دوبارہ بیان کرتے ہوئے صوفیا نے بے پایاں محبت اور بلند حوصلگی کا درس بھی دیا اور بے لچک سماجی رواجوں کے ساتھ ساتھ مُلا اور حکمرانوں کے تعصب

اور تنگ نظری کی شدید مذمت بھی کی۔

صوفیاء کی شاعری میں وادی سندھ کے روزمرہ کا بر ملا اظہار ملتا ہے۔ اس شاعری میں تو نبہ 'چرخہ 'بیجا' جھاڑو اور بھانبڑ جیسے لفظ ہمیں آج سے تین چار صدی پہلے کی وادی سندھ کے طرز زندگی کے بارے میں بہت کچھ بتاتے ہیں۔ یہ داستانیں اس دور کے سماج میں عورت کی اہمیت ' اس کی قدر و منزلت اور اس کی آزادانہ سوچ کی واضح گواہی دیتی ہیں۔ ہیر ' لوک داستان کا مرکزی کردار ہے جو پوری داستان میں اپنے محبوب رانجھا پر حاوی ہے۔ رانجھا محض بانسری بجاتا ہے جبکہ ہیر اپنی راہ میں آنے والی ہر مشکل کا مردانہ وار مقابلہ کرتی نظر آتی ہے۔ سوہنی مہینوال میں یہ سوہنی ہے جو عورت ہوتے ہوئے بھی بپھرے چناب کی لہروں پر اپنے محبوب سے ملنے نکل کھڑی ہوتی ہے اور مہینوال ہمیں دریا کے پار محض انتظار کرنے پر اکتفا کرتا دکھائی دیتا ہے۔ مرزا صاحباں کی صاحباں ایک دور اندیش عورت کے روپ میں سامنے آتی ہے جس کے عاقلانہ مشورے کو نظر انداز کر کے اس کا محبوب مرزا ان دونوں کی افسوسناک موت کا سبب بنتا ہے اور پنوں کی سسی تو اپنے محبوب کی تلاش میں سرگرداں ' ریگستانوں کی خاک چھانتی موت کے آغوش میں اتر جاتی ہے۔ صوفیاء کی روایات میں اپنے محبوب کا دل جیتنے کے لئے رقص ناگزیر ہے۔ ان زمانوں کی عورت اپنے محبوب کو اس شدت سے چاہتی ہے کہ اس کے نام کی مالا جپتے جپتے خود اس کا مجسم عکس ہو جاتی ہے۔

رانجھا رانجھا کوکدی میں آپے رانجھا ہوئی

وادی سندھ کے ثقافتی مزاج سے ناآشنا' بد قسمتی سے 'اس احترام اور مساویانہ سلوک کی پہچان سے بھی عاری رہے جو صدیوں تک اس خطے کی عورت کو حاصل رہا تھا۔

دوسری طرف وادی سندھ کی ثقافت کے اسی استرداد نے بالآخر انہیں اس حقیقت کے ادراک سے بھی محروم رکھا جو ایک نئی قوت کی صورت میں بتدریج لیکن یقینی انداز میں ہندوستان سے وادی سندھ کی جانب مخالفانہ بلکہ جارحانہ پیش قدمی کر رہی تھی۔

حصہ دوم

دو دنیائیں

1600ء سے 1857ء تک



وکٹوریہ۔برطانیہ کی ملکہ اور برصغیر کی شہنشاہ



ہندوستان کا حاکم، ابو غازی ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ دوم

دو دنیائیں

1600ء سے 1857ء تک

تعارف

اب تک میں 'وادیٔ سندھ اور ہندوستان کے مابین گزشتہ چار ہزار سالوں پر محیط ثقافتی تفریق کا جائزہ لے چکا ہوں۔ اسی تفریق اور انہی بنیادی تضادات کے تقابلی جائزے سے میں نے سندھ واسی کا ایک علیحدہ تشخص سامنے لانے کی سعی کی ہے اور یہ تشخص 'ہندی فرد' سے یقیناً مختلف ہے۔ میں نے تاریخ کے مختلف ادوار میں ہم عصر افراد کے کردار کی تشکیل میں کارفرما عوامل کا تجزیہ کیا ہے اور یہ جاننے کی کوشش بھی کی ہے کہ اس دوران اپنے ہم وطنوں اور اپنے بھائی بندوں کے بارے میں افراد کے رویوں کی نوعیت کیا تھی۔ میں نے لوگوں کے باہمی میل جول یا تعامل باہمی کا جائزہ بھی لیا کیونکہ جب تک ہم محرکات اور ان کے پس منظر کو اچھی طرح سمجھ نہیں لیتے' ہم سندھ واسی یا آج کے پاکستانی کو نہیں سمجھ سکتے۔ سندھ واسی کے ماضی کا معروضی جائزہ لئے بغیر ہم نہ تو اس کے حال کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی اسے اپنا مستقبل سنوارنے کے قابل بنا سکتے ہیں۔

یہاں پہنچ کر ہمارے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وادی سندھ کے ان علاقوں میں آج کے سندھ واسی کے کردار کی تشکیل کا بالخصوص جائزہ لیا جائے جہاں آج پاکستان قائم ہے۔ میرے اس جائزے کا عرصہ گزشتہ چار صدیوں پر محیط ہے۔

گزشتہ چار صدیوں کے اثرات کا احاطہ کرنے کے لئے ہمیں دو مختلف پہلوؤں سے صورت حال کا تجزیہ کرنا ہوگا۔ پہلے مرحلے میں ہمارے لئے ضروری ہے کہ وادی سندھ اور ہندوستان دونوں پر یورپی

نوآبادیاتی تسلط کے اثرات کا مشترکہ جائزہ لیا جائے کہ برطانوی راج وادی سندھ اور ہندوستان دونوں جگہ مختلف انداز میں کیسے پہنچا' یہاں کن تبدیلیوں کا باعث بنا اور دونوں خطوں میں اس کے استعمال کا انداز کیا تھا؟ وہ کون سے عوامل تھے جن کی بناء پر ایک نوآبادیاتی طاقت دونوں خطوں سے مختلف سلوک روا رکھنے پر مجبور ہوئی؟ وادی سندھ اور ہندوستان دونوں خطوں میں راج کے خلاف ردعمل کا اظہار بھی مختلف کیوں تھا؟ اور دونوں نے 1940ء کی دہائی میں راج کے خاتمے کے لئے مختلف حل کیوں تجویز کئے؟

دوسرا پہلو جس کی واضح نشاندہی کی اہمیت ناگزیر ہے وہ اس خطے کی سیاست میں کسی داخلی تضاد کی موجودگی ہے۔ کیا وادی سندھ کی تاریخ میں ایسی کوئی تفریق موجود تھی اور اگر تھی تو کیا اس کی بنیاد محض مذاہب کا مختلف ہونا تھا یا اس کی جڑیں ثقافتی اور معاشی و سماجی تفاوت میں بھی تھیں؟ کیا ہندو مسلم تفریق میں بورژوائی اور جاگیر دارانہ تفریق کا عنصر بھی شامل تھا؟ کیا ایک طرف ہندی بورژوازی اور دوسری طرف وادی سندھ کے جاگیر دار اور یہاں کی نومولود مسلم بورژوازی کے مابین واضح تضاد تھا جسے خط تقسیم کے دونوں طرف کی نومولود مسلم بورژوازی اور سر محمد علی جناح نے بھانپ لیا تھا؟

یہاں پہنچ کر ہماری تحقیق دو مزید سمتوں میں آگے بڑھتی ہے۔ اب تک ہم نے صرف یہ جائزہ لیا ہے کہ سندھ واسی' ہندی فرد سے کس طرح مختلف ہے؟ اب ہمیں یہ جائزہ بھی لینا ہے کہ سندھ واسی یورپی فرد سے کس قدر مختلف ہے اور مزید یہ بھی کہ کیا وادی سندھ کا مسلمان' وادی سندھ ہی کے ہندو سے بھی مختلف تھا؟ اگر ان تمام سوالوں کا جواب اثبات میں ہے تو کیا یہ تفریق کسی ایک پہلو یا کسی ایک خصوصیت تک محدود ہے یا اس کا دائرہ اثر بہت سے اختلافی پہلوؤں تک پھیلا ہوا ہے؟

لیکن ان سوالوں کے کسی بامعنی جواب کے لئے ہمیں وادی سندھ سے پرے یورپ اور ہندوستان کی جانب' کئی بار تاریخ کے سفر سے گزرنا ہوگا۔

انگلستان کی موجودہ نسل آج بھی "برطانوی راج" کے دور کی حسین یادوں کی اسیر ہے۔ مشہور برطانوی مصنف ای ایم فورسٹر کی اے پیسج ٹو انڈیا E.M. Forster's A Passage to India جو بے شمار دفعہ طبع ہوئی اور فلمائی بھی جا چکی ہے۔ ایم ایم کائیز کی دی فار پویلین M.M. Kayes's The Far Pavilions' پال سکاٹ کی جیول ان دی کراؤن Paul Scott's Jewel in the Crown' جیمز موریس James Morris اور دوسرے مصنفین کی عالمی سلطنت کے موضوع پر کتابیں' کولنز اور لیپیرے کی فریڈم ایٹ مڈ نائٹ Collins and Lapierre's Freedom at Midnight' کرسٹوفر ہیبرٹ کی دی گریٹ

میوٹنی Christopher Hibbert's The Great Mutiny اور فلپ مورس کی اے میٹر آف آنر Philip Morris' A Matter of Honour ' یہ سب ان کتابوں میں سے چند ایک معروف نام ہیں جو انگلستان اور انگریزی بولنے والے دوسرے ممالک میں کتابوں کی دکانوں پر عام طور پر نظر آتے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کتابوں کی ایک ختم نہ ہونے والی فہرست ہے۔ جو ٹیلز فرام دی راج ' سم مور ٹیلز فرام دی راج ' ہیلرز آف راج جیسے ناموں کے ساتھ لگاتار طبع ہوتی رہتی ہیں جن میں انگریزی کے نوآبادیاتی طرز زندگی ' دور دراز کے جنگلوں اور سرحدی علاقوں میں قیام کے قصے کہانیاں ' مقامی ملازمین کی فوج ظفر موج کے ساتھ وسیع و عریض بنگلوں میں رہائش پذیر میم صاحباؤں کی نزاکت اندامیاں اور بغاوت اور سرکشی کے دوران صاحبوں کی بہادری کے قصوں کی اس انداز میں تصویر کشی کی گئی ہے جیسے یہی راج کی اصل سرگزشت ہو۔ انگریز بہادر کی جرات اور دلیری کو نمایاں کرنے میں دیسی لوگوں کا تذکرہ بھی ملتا ہے لیکن محض اس ناگزیر تقابل کے لئے جو ایسی کہانیوں میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے کام آتا ہے۔

یاد ماضی بلکہ ماضی پرستی کے اس ادب میں تصورات کی دنیائیں آباد کر لینا کوئی نئی بات نہیں اور نہ ہی راج کی قصیدہ خوانی صرف انگریز مصنفین کا استحقاق رہا ہے۔ آج سے ایک سو برس پہلے ایس ایم لطیف نے بھی اپنی تصنیف ''ہسٹری آف دی پنجاب'' History of the Punjab کے آغاز میں ہی راج کی مدح سرائی کرتے ہوئے مبالغہ آرائی کے آسمان کو چھو لیا تھا۔ لطیف نے (کئی اور لحاظ سے اپنی اس قابل قدر تصنیف کے) آغاز ہی میں لکھا ہے کہ:

> ''ہندوستان پر انگریز کے قبضے اور مشرق میں برطانوی اقتدار کی مسلسل پیش قدمی سے زیادہ شاندار ' رومان پرور اور سبق آموز کہانی شاید آج سے پہلے تاریخ نے کبھی رقم نہ کی ہو۔ عالی نسب شجاعت ' پرسکون عزم صمیم اور انتھک جانثاری کی وہ کون سی داستانیں تھیں جو اس کہانی کا عنوان نہیں بنیں۔ وہ کون سا ناقابل تسخیر قلعہ تھا جہاں انگلستان کا جھنڈا فاتحانہ شان سے نہیں لہرایا۔ وہ ناقابل عبور پہاڑی درے کہاں تھے جہاں انگریز کے بگل کی تان نہیں گونجی اور وہ تیرہ و تاریک گھاٹیاں اور پرپیچ تنگ وادیاں کون سی تھیں جہاں برطانوی اسلحے کی چمک نے آنکھیں خیرہ نہیں کر دیں۔ وہاں کوئی عظیم الشان دربار ہال 'کوئی ضیافتی خیمہ اور جواہرات سے مزین کوئی گنبد ایسا نہ تھا جو ان کے جنگی ترانوں اور پیش قدمی کرتے ہوئے فوجیوں کے نعروں سے گونج

نہیں رہا تھا۔ قنوج اور اجودھیا کی طاقتور سلطنتیں ' مشرق کے بیٹوں کی حیثیت
سے جن کے بانیوں کا ذکر رامائن کی دیومالائی داستانوں میں آج بھی محفوظ ہے
' انگریز کی اطاعت کو اپنے لئے باعث افتخار قرار دے رہی تھیں اور وہ سخت
جان مرہٹے جو طویل عرصے تک مغلوں کی طاقت کے سامنے سدراہ بنے رہے
' بڑے عجز و انکسار کے ساتھ برطانیہ کے قدموں میں بیٹھے تھے اور ان کے
ساتھ وہ مغرور افغان بھی تھے جو ایک صدی قبل ظالم نادر شاہ درانی جیسے
فاتح کی قوت کو للکار چکے تھے۔

لطیف ' سامراجی حکومت میں ایکسٹرا جوڈیشل اسسٹنٹ کمشنر Exstra Judicial Assistant Commissioner تھا اور اپنے آقاؤں کے لئے جذبات میں اس طرح بہہ جانا سمجھ میں آتا ہے لیکن اس کے باوجود یہ سوالات اپنی جگہ موجود ہیں کہ آخر ایک دور افتادہ طاقت ایسی وسیع اور موثر فتوحات حاصل کرنے میں کیسے کامیاب رہی ؟ کیا اسے یہ فتح کسی مزاحمت کے بغیر نصیب ہو گئی تھی ؟ اور اس سامراجی قوت نے اپنی نو آبادیوں کی بہبود یا خانہ خرابی میں کیا تاریخی کردار ادا کیا ؟

16

ہندوستان میں یورپ کی آمد

ایجاد اور دریافت کا سنہری دور

تین سو سال پہلے یورپ جب ہندوستان میں داخل ہوا تو وہ ایک پختہ کار سرمایہ دارانہ سامراجی عالمی نظام میں ڈھل چکا تھا لیکن اس کے باوجود ابھی وہ سرمایہ دارانہ سامراجیت کے مزید بلند درجے پر فائز ہونے کے لئے کوشاں تھا۔ پرانے جاگیردارانہ نظام کو یورپی اقوام کی سیاست میں پہلے جیسی بے لگام اجارہ داری حاصل نہیں رہی تھی اور اس کی جگہ بتدریج ایک ایسے متحرک اور ترقی پذیر سرمایہ داری نظام نے حاصل کر لی تھی جو ہمہ وقت خام مال اور منڈیوں کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ ادھر ہندوستان اپنے افسانوی خزانوں کے ساتھ یقیناً ایک پرکشش اور غیر محفوظ شکار تھا۔

یورپ از منہ وسطیٰ سے ہی سرمایہ داری کی راہ پر گامزن ہو چکا تھا۔ آج سے سات سو برس پہلے کی صلیبی جنگوں کے ساتھ ہی مال کے بدلے مال کی تجارت بتدریج سکوں کی معیشت میں تبدیل ہونے لگی تھی۔ اس کا آغاز وسطیٰ اور بالائی اٹلی سے ہوا اور وہاں سے جنوبی جرمنی، فرانس اور ہالینڈ سے ہوتے ہوئے دولت کی معیشت نے پورے یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سکہ رائج ہوا تو اس کا ارتکاز بھی ہونا تھا۔ اس ارتکاز کے نتیجے میں ایک طبقہ روٴسا نے جنم لیا مثلاً آگسبرگ کے فگرز The Fuggers of Augsburg جو محض جولاہوں کا ایک کاشتکار خاندان تھا لیکن دیکھتے ہی دیکھتے پندرہویں صدی کے یورپ میں تمام اہم مالی اداروں اور مذہبی رہنماؤں کے بیکار بن چکے تھے۔

جاگیردارانہ نظام کے بتدریج زوال اور سرمایہ داری کے رواج کے ساتھ ساتھ آج سے چار پانچ

سو سال پہلے ہی یورپ میں دولت مند اشرافیہ میں شمار ہونے کے پیمانے بھی بتدریج تبدیل ہوتے گئے۔ جاگیریں، شجرۂ نسب، وراثت اور خاندان جو کبھی امارت کی پہچان تھے، قصہ پارینہ ٹھہرے۔ اب مستحکم مالی حیثیت، منڈی کا اعتبار اور مالی تمسکات ہی سکہ رائج الوقت بھی تھے اور طبقاتی برتری کو پرکھنے کی کسوٹی بھی۔

کرنسی کی بہم رسانی عام ہوئی تو پیداواری رشتوں میں بھی تبدیلی آئی۔ اجناس کے بجائے طے شدہ رقم کی ادائیگی کے نظام نے رواج پایا۔ جاگیردار کی غلامی کا بندھن ٹوٹا اور اس کی جگہ اجرت کے بندھن کو ملی۔

کرنسی کی شکل میں اجرت، خرید و فروخت اور تجارت کے امکانات نے کسانوں کے شہر کی جانب رجوع کو آسان بنادیا اور شہر تیزی سے بڑھنے اور پھیلنے لگے۔ شہروں کی رونق اور دولت بڑھی تو شہریوں نے اپنے اردگرد پھیلے ہوئے نظام کے شکنجوں سے خود مختاری حاصل کرنا شروع کر دی اگرچہ شہروں کے خود مختار انتظامی اداروں میں ڈھلنے کا آغاز تو بہت پہلے گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی میں ہو چکا تھا۔ اب ظالم جاگیرداروں کے چنگل سے بھاگ نکلنے والے غلاموں کو شہروں میں پناہ بھی ملنے لگی اور ملازمت کی شکل میں مالی تحفظ بھی حاصل ہو تا گیا۔

تیرہویں صدی میں لندن اور پیرس جیسے بڑے شہر' دیہی علاقوں کے کھیت مزدوروں کے لئے ایسی پرکشش پناہ گاہیں بن چکے تھے جہاں پہنچ کر انہیں جاگیردار کے طوق غلامی سے نجات بھی ملتی تھی' اور ان شہروں کی صنعتی پرولتاریہ میں ضم ہونے کے باوجود کچھ لمحے اپنی زندگی جینے کا حق اور حوصلہ بھی۔ دور دراز کے دیہی علاقوں کے بے بس و مجبور لوگ شہروں کی طرف اس طرح امڈے چلے آتے تھے جیسے وہ سب ڈک وٹنگٹن Dick Whittington ہوں اور شہروں کی مسحور کن گھنٹیاں انہیں اپنی طرف بلا رہی ہوں۔ وہ افسانوی شہر جن کی گلیوں میں سونے کی اینٹیں جڑی تھیں' جہاں سارے خواب حقیقت کا روپ دھار لیتے تھے اور جہاں سنہرا مستقبل ان میں سے ہر ایک کا منتظر تھا۔

یہی وہ زمانہ تھا جب نجی تجارتی ادارے تیزی سے ترقی کے مدارج طے کر رہے تھے۔ تاجروں نے دور دراز کے علاقوں کو اپنے دائرہ کار میں لانے کے لئے تجارتی کمپنیاں بنانا شروع کر دی تھیں۔ یہ ایک نیا اور حوصلہ افزا تجربہ تھا۔ اس طرح اپنی گرفت کمزور کئے بغیر وسیع تر علاقوں سے مرکز کی طرف سرمائے کا ارتکاز بھی ممکن تھا اور اپنے تجارتی تسلط کی وسعت پذیری کے لئے مزید علاقوں میں اس کے ذریعے مزید سرمایہ کاری بھی کی جا سکتی تھی۔ یہ سلسلہ اتنی سرعت سے ترقی پذیر تھا کہ چرچ بھی تجارت کی اس دوڑ میں شامل ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اپنے نائٹ ٹمپلرز Knight Templars کے ذریعے

چرچ بھی تجارت کی اس دوڑ میں ایک اہم اور بڑا فریق تھا۔

بینک جو پہلے پہل صرف جینوا، فلورنس، آگسبرگ اور انٹورپ میں قائم ہوئے تھے، اب ان کے حجم اور تعداد میں اضافہ ہو چکا تھا۔ سولہویں صدی میں تاجروں کی ایسی طاقتور انجمنیں وجود میں آنے لگی تھیں جو اپنے محدود تجارتی مقاصد سے تجاوز کر کے فرانس اور انگلستان سمیت دوسرے بہت سے یورپی ممالک کے نو آبادیاتی مفادات کے تحفظ کا فریضہ بھی ادا کر سکیں۔

آبادی اور حجم کے اعتبار سے شہر پھیل رہے تھے اگرچہ ان میں ابھی تک مناسب شہری سہولتوں کا فقدان تھا۔ تجارتی سرگرمیاں اپنے شباب پر تھیں۔ 1305ء میں ہاؤس آف ٹیکسز House of Taxis کے بہت ہی مناسب اور دیرپا نام سے خچروں کے ذریعے ڈاک کی تیز رفتار ترسیل کے ایک باقاعدہ ادارے کا اجراء ہو چکا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کا دائرہ کار پورے یورپ تک پھیل گیا۔ 1628ء میں اس کے ملازمین کی تعداد بیس ہزار تک پہنچ چکی تھی۔ نیلی اور روپہلی وردیوں میں ملبوس اس کے نامہ بر یورپ کے طول و عرض میں شہزادوں اور جرنیلوں، تاجروں اور قرض فراہم کرنے والوں کے مابین پیغامات کی ترسیل کا ذریعہ تھے۔ یہ ادارہ سن 1800ء تک بڑی خوش اسلوبی سے اپنے فرائض منصبی ادا کرتا رہا۔ اس دوران یورپ میں اسی قسم کے اور بہت سے ادارے بھی کام کر رہے تھے۔

بورژوازی اور نئے پرولتاریہ کے درمیان کشمکش کے امکانات جلد ہی واضح ہونے لگے تھے۔ یورپ کے کئی شہروں کے دستکاروں میں بے چینی کے آثار تھے۔ صرف چودھویں صدی کے دوران ایسے کئی طبقاتی تصادم ہوئے جن میں 1302ء کے فلینڈرز Flanders اور 8-1357 میں پیرس گلڈز Paris Guilds کی بغاوتیں نمایاں تھیں۔ 1378ء میں فلورنس Florence کے اونی کپڑے کی صنعت اور 1381ء کے انگلستان نے کسانوں کی شورش کا سامنا کیا۔ یہ بے چینی، شورش اور بغاوتیں زرعی محاذ پر بھی تبدیلیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں اور اس کے نتیجے میں زراعت اور جزوی طور پر آزاد اور متحرک دیہاڑی دار کھیت مزدور کے درمیان ایک بہتر اور سود مند تعلق کا آغاز ہوا۔ طبقاتی کشمکش کے اس ارتقائی عمل سے یورپ میں نئے اور مستحکم پیداواری رشتے معرض وجود میں آ رہے تھے جو بالآخر سرمایہ داری نظام کی بنیاد فراہم کرنے کا سبب بنے۔ دوسری طرف ہندوستان کے انڈوگنگائی میدانوں میں لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا۔

جب ہندوستان کے مغربی ساحلوں میں کالی کٹ کی بندرگاہ پر واسکوڈے گاما پہلی بار لنگر انداز ہوا تو گویا یورپ اور اس کے ابھرتے ہوئے نئے طبقات پر امکانات کی ایک نئی دنیا کے در، وا ہو گئے۔

ترکی کی سلطنت عثمانیہ کے بادشاہ محمد ثانی فاتح نے کامیاب محاصرے کے بعد جب 1453ء میں قسطنطنیہ Constantinople فتح کیا تو بازنطینی راہب خوف زدگی کے عالم میں وہاں سے فرار ہو گئے اور اپنے ساتھ وہ علمی خزانہ بھی لے گئے جسے اب تک وہ دنیا کی نظر سے پوشیدہ رکھے ہوئے تھے۔ اس علم سے یورپ کی نشاۃ ثانیہ کو ایک فیصلہ کن توانائی ملی۔ مثلاً بارود جسے برطانیہ ' فرانس کے خلاف اپنی صد سالہ جنگ (1339-1453ء) کے دوران محدود پیمانے پر استعمال کر چکا تھا۔ اب اسے بنانے اور چلانے کی جدید فنی مہارت بازنطینیوں کے طفیل یورپ کے ہاتھ لگی تھی۔

اسی دوران مینز کا جان گٹن برگ John Gut-Enberg' 1445ء کے لگ بھگ اپنے دھات کے بنے ہوئے متحرک ٹائپ کی ایجاد کے ساتھ ایک عہد آفریں انقلاب کا آغاز کر چکا تھا۔ یہ مشین ملائم کاغذ پر دوطرفہ طباعت کر سکتی تھی۔ 1455ء میں بائبل کی 42 سطروں کی طباعت نے دنیا بھر میں تہلکہ مچادیا۔ طباعت کے آغاز کے ساتھ ہی علم ' خیال ' تصور اور نظریات ہر طرف جنگل کی آگ کی طرح پھیلنے لگے۔

ابھی تک قطب نما سمندر کی ہمہ متلاطم لہروں میں کام نہ کرتا تھا لیکن اسی زمانے میں ملاحوں کے لئے بھی قطب نما Mariner's Compass ایجاد ہو گیا۔ سمندر میں محل وقوع کا تعین کرنے کے لئے ''جیکب سٹاف'' جیسے ضمنی آلات سامنے آنے کے بعد تو قطب نما نے انتہائی دوررس اثرات مرتب کئے اور یہ ایجاد کسی طرح بھی چھاپہ خانے کی ایجاد سے کم اہمیت کی حامل نہیں تھی۔ سمندری قطب نما کے استعمال میں آنے سے جہاز رانی تو جیسے تمام پابندیوں سے آزاد ہو گئی۔ بحری جہاز اب ساحلوں کے ساتھ ساتھ سفر کرنے کے بجائے سمندروں کے آرپار سفر کرنے لگے۔ 1487ء میں بارتھولو میوڈائز Bartholomew Diaz نے افریقہ کے انتہائی جنوبی ساحل راس امید کا چکر لگایا۔ 1492ء میں کرسٹوفر کولمبس نے ' سپانوی ملکہ ازابیلا کے تنخواہ دار کی حیثیت سے مغرب کی سمت سے ہندوستان پہنچنے کی کوشش میں ایک نئی سرزمین امریکہ دریافت کر لی اور 1498ء میں واسکوڈے گاما ہندوستان کے جنوب مغربی ساحل پر اترا۔

دریافت اور ایجادات کا یہ سفر مسلسل جاری تھا۔ 1500ء میں پیٹر ہینلین Peter Henlein نے جیبی گھڑی ایجاد کی جسے شروع شروع میں ''نورمبرگ کا انڈا'' کہا جاتا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی تشکیل سے بہت پہلے فرڈی نینڈ میگیلن Ferdinand Magellan کا بحری بیڑا زمین کے محیط کے گرد 1519-21ء کے دوران چکر لگا چکا تھا۔ پچاس سال بعد فرانسس ڈریک نے بھی یہی عمل دہرایا۔ حالانکہ اس سے پہلے جہاز رانی کی دنیا میں یہ کام ناممکن سمجھا جاتا تھا۔

1543ء میں ٹورس کے نکولس کوپرنیکس Nicholas Copernicus نے نظام شمسی میں سورج کی کلیدی حیثیت کے بارے میں اپنی انقلاب آفریں تحقیق شائع کی۔ اگرچہ یہ نظریہ ابھی تشنۂ ثبوت تھا لیکن اس نے دنیا کے بارے میں ارسطو کے نظریئے کو باطل ٹھہرایا۔ ارسطو کے راسخ العقیدگی کے نظریئے میں انسان کو کائنات کا مرکز قرار دیا گیا تھا لیکن کلیسا کی تعلیمات نے اسے ویٹی کن Vatican کی مرکزیت میں بدل دیا۔ مگر اب کوپرنیکس کے نظریئے نے دنیائے علم کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

سائنس کی ایسی بہت سی پیش قدمیوں کی بدولت یورپی جہاز ران اور کاروباری حلقے زیادہ پر اعتماد اور زیادہ خطرات مول لینے کے قابل ہو گئے تھے۔ انہوں نے پہلے یورپ اور بعد ازاں دنیا بھر کی سماجی اقتصادیات کو تبدیل کر کے رکھ دیا۔ اس کے نتیجے میں بالٹک اور بحیرہ روم کی بندرگاہوں اور راجتاہیوں کے مقابلے میں بحر اوقیانوس کے ساحلی شہر اور بندرگاہیں زیادہ اہمیت اور وقار حاصل کر گئے۔ وینس اور جینوا کے بجائے اب لزبن، سیویلیا، روٹرڈیم اور پورٹس ماؤتھ کی بندرگاہیں زیادہ وقعت کی حامل تھیں۔ نوآبادیوں سے حاصل ہونے والی اجناس آلو، مکئی اور تمباکو نے عالمی تجارت کو بے پناہ وسعت دی اور بڑے بڑے تجارتی ادارے وجود میں آئے۔ نئے منصوبوں کے لئے دولت اور سرمائے کی بڑھتی ہوئی طلب کے نتیجے میں اجارہ داریوں کے قیام کی حوصلہ افزائی ہوئی اور یوں سوداگر، بینکار، تاجر اور صنعتکار طبقات کے حجم اور طاقت میں معتدبہ اضافہ ہوا۔

مضبوط قومی سیاست: تاجر کی ضرورت

زرعی جاگیردار کی دنیا میں مداخلت کر کے تاجر اپنے لئے ایک بلائے بے درماں کا سامان کر رہا تھا۔ یورپ میں تاجروں کے اس بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ سے بہت پہلے زراعت اور بعد ازاں جاگیردارانہ نظام کے بتدریج پھیلاؤ نے کلیسائی تانے بانے کی متعین حدود میں رہتے ہوئے ایک نظریاتی ہم آہنگی پیدا کر کے اپنے وجود کو مستحکم کر لیا تھا۔ تجارت کے ان نئے مواقع کی فراہمی سے کئی صدیاں پہلے، قبل از زراعت کے دیومالائی کثیر الدیوتائی تصور کی جگہ مسیحیت کے وحدانی نظریات قبول عام کی سند حاصل کر چکے تھے۔ یورپ میں یہ تبدیلی رومن اور جرمن دیوی دیوتاؤں کی جگہ عیسائیت کے خدائے واحد کی صورت میں آئی۔ چرچ نے یورپ کے وحدانیت پرست جاگیرداری نظام کو ایک معقول ماورائی ڈھانچہ فراہم کر دیا لیکن صورت حال اتنی بھی سادہ نہیں تھی کیونکہ اس ڈھانچے کی سب سے اوپری سطح پر خود پوپ کا وجود تھا اور بتدریج نچلی سطحوں پر یورپ بھر میں بشپ، پادری، جاگیردار، ڈیوک اور زمینداروں کی ایک فوج ظفر موج تھی جن کی وفاداریوں کا مرکز براہ راست پوپ کی ذات تھی۔ اگرچہ جاگیردار اور

اس کے خادم اور غلام دونوں بادشاہ کے نام پر ہتھیار بند ہو سکتے تھے لیکن ایک وسیع اور خود مختار کلیسائی اکائی کے علاوہ نہ تو کہیں کوئی مضبوط قومی حکومت تھی اور نہ ہی کسی مستحکم قومی بادشاہت کے وجود کا تسلسل۔

تاجر طبقہ کے عروج پذیر ہونے سے پہلے یورپ بیک وقت ایک وسیع اتحاد بھی تھا اور ان گنت چھوٹی چھوٹی فرمانروائیوں' سرداریوں اور جاگیروں کا رنگا رنگ مجموعہ بھی۔ روم کے چرچ سے وفاداری نے ان تمام کیتھولک فرمانروائیوں کو متحد کر رکھا تھا اور مقدس سلطنت روما جسے تمام پادریوں اور یورپ کی خوشنودی حاصل تھی' یورپ کے اقتدار اعلیٰ کی مالک تھی۔ یہ اسی اقتدار اعلیٰ کی کرشمہ سازی تھی کہ پوپ الیگزینڈر ششم نے ساری دنیا کو اپنے دو سب سے قریبی اتحادیوں سپین اور پرتگال کے درمیان تقسیم کر دینے کا منصوبہ بنایا۔

پاپائیت کے اسی اقتدار اعلیٰ کی ہمہ گیریت کے تحت بشپ اور جاگیردار بے شمار چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے فرمانروا تھے۔ وہ اپنے علاقے سے گزرنے والی ہر شئے پر محصول اور چونگی وصول کرتے تھے۔ مزارعین پیداوار کا دسواں حصہ اور دوسرے بہت سے محاصل جاگیردار کو ادا کرتے تھے۔ انہی مزارعین اور دیہی دستکاروں کو معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل تھی کیونکہ زرعی معاشرے کو خود کفیل بنانے والی اشیاء کے اصل پیداکار وہی تھے۔

لیکن یہ نظام تاجر کے لئے قابل قبول نہیں تھا۔ ہر جاگیردار اپنی قلمرو سے گزرنے والے سامان پر بھاری محصول عائد کرتا تھا اور ہر سردار قدیم رواج کے مطابق سامان کی قرقی کے ذریعے تجارت پر عائد ان محاصل کی وصولی کو یقینی بنا سکتا تھا۔ تاجر کو ہر چند میل کے فاصلے پر کسی جاگیردار یا کسی سردار کے عائد کردہ کسی نئے محصول یا کسی نئی چونگی سے واسطہ پڑتا تھا جس کی بناء پر تجارتی اشیاء کی قیمتیں خریدار پر بوجھ بن جاتی تھیں۔

شاہراہوں پر 'امن مفقود تھا کیونکہ ہر تجارتی راستہ متعدد جاگیروں اور فرمانروائیوں سے گزرتا تھا' اس لئے امن کے قیام اور لوٹ مار کے تدارک کی ذمہ داری کا تعین ممکن نہیں تھا۔ ایک ریاست کے لٹیرے دوسری ریاست کی پناہ میں چلے جاتے تھے۔ والٹئر Voltaire نے اسی شکایت کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ "یورپ میں سفر کرتے ہوئے قوانین بھی اسی تیزی سے تبدیل ہوتے چلے جاتے ہیں جس رفتار سے مسافر گھوڑے بدلتا ہے"۔

اس صورت حال میں جاگیرداروں کے مقابلے میں کسی قومی اقتدار اعلیٰ کی پوری شدومد سے حمایت کرنا تاجر کے اپنے مفاد میں تھا۔ انگلستان میں تیرہویں صدی کے Magna Carta کے تحت بادشاہ

کے اختیارات قدرے محدود ہو گئے تھے لیکن اس عمل نے ایک نئی طاقت کے طور پر ابھرتے ہوئے اختیارات کے اس دھارے کو معقول جواز اور قانونی تحفظ فراہم کر دیا تھا۔ بالآخر سولہویں صدی کے سورج نے کھلی آنکھوں سے دیکھا کہ انگلستان کے ٹیوڈر حکمران' روم سے ناطہ توڑنے پر مجبور ہوئے اور انہوں نے سوداگر اور جہازران کی کھلم کھلا حمایت شروع کر دی اور یہی صدی اس حقیقت کی چشم دید گواہ بھی ہے کہ سٹیوارٹ بادشاہوں کی جانب سے تاریخ کے پہیئے کو الٹا چلانے کی کوشش میں' ان میں سے ایک بادشاہ کو فرار ہونا پڑا اور دوسرے کو جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔

یوں توانائی کا ایک تازہ دم ریلا جب قدامت کی قید سے آزاد ہوا تو یورپی جہازران اور سوداگر اور فوجی نت نئی سرزمینوں کی تلاش میں دور دراز کے علاقوں تک پہنچے تو معاشرے کے معیار اور اصولوں میں بھی تبدیلی آئی۔ پرانا طبقاتی نظام نئے سانچوں میں ڈھلنے لگا۔ تاجروں کی اہمیت تسلیم کی جانے لگی۔ اب ظہور میں آنے والے نئے سماجی طبقات کے تعین اور مقتدر حلقوں میں ان کی شمولیت کو یقینی بنانے کے لئے معیار بھی نئے تجویز کئے گئے۔ قدیم جاگیردارانہ اقدار کو اسی طرح مسترد کر دیا گیا جیسے کبھی قدیم قبائلی اقدار کو جاگیردارانہ قدریں اپنانے کے لئے رد کیا گیا تھا۔ جاگیرداری نظام قائم ہوا تھا تو یورپی قبیلہ سکڑ کر انکلز اور کزنز Uncles & Cousins تک محدود ہو گیا تھا۔ سرمایہ داری نظام کو عروج حاصل ہوا تو خاندان مزید مختصر ہو کے صرف والدین اور اولاد تک محدود ہو کر رہ گیا۔ غلام کا جانشین' یورپ کا مزارع یا زرعی مزدور تھا اور اس کی جگہ اب صنعتی کارکن لے رہا تھا۔

سابقہ نظام میں پسنے والے مظلوموں کو جدید نظام کی اشرافیہ میں شامل ہونے کے مواقع حاصل ہونے لگے۔ بے زمین اور ماضی میں قابل نفرت تاجر جو کبھی جاگیرداری سماج کے حقیر سود خور شمار ہوتے تھے' اب باعزت تاجر اور بینکار بن گئے اور نئے نظام میں وسیع تر مفادات کی ایک دنیا ان کی زیرنگیں تھی۔ ماضی کے بہت سے اکابرین تباہ حال اور برباد ہوئے اور بہت سے قدامت پرست اور مستقبل ناشناس امراء اور روساکی جاگیریں نیلام کر کے ان کے قرض اتارے گئے۔

تاجر کی معاشی اور سیاسی قوت میں اضافے کے ساتھ یورپ کی آزاد اور خود مختار قومی ریاستیں بھی مستحکم ہوتی چلی گئیں۔ تاجر' چھوٹی چھوٹی جاگیرداریاں ختم کر کے انہیں وسیع تر قومی ریاست میں ضم کر دینے کا خواہاں تھا۔ تجارت اور بیوپار کی ترقی کا انحصار مکمل طور پر اس بات پہ تھا کہ وسیع تر علاقوں پر مشتمل بالادست سیاسی اکائیاں وجود میں آئیں۔ ابھرتا ہوا' نیا اور مستحکم تاجر طبقہ یعنی بورژوازی چھوٹی چھوٹی فرمانروائیوں سے نفرت کرتا تھا کیونکہ یہ قدم قدم پر تجارت میں رکاوٹ کا سبب بنتی تھیں اور خشکی کے راستے اشیاء کی ترسیل کے دوران مختصر فاصلوں پر انہیں بے شمار محصولات ادا کرنا پڑتے تھے

لیکن نہ تو دور افتادہ ویٹی کن Vatican' تاجر کو کسی قسم کا تحفظ فراہم کر سکتا تھا اور نہ ہی پاپائیت کی حمایت یافتہ ہیپس برگ Hapsburgs کی مقدس سلطنت روما' ویانا میں چاروں طرف سے خشکی میں محصور رہتے ہوئے تاجر کی مدد کرنے پر قادر تھی۔ دیہی زمینداریوں میں بٹے ہوئے جاگیرداری نظام میں بھی اتنی سکت نہیں تھی کہ تجارتی جہازوں کو بحری قزاقوں یا دشمن بحریہ کے حملوں سے محفوظ رکھ سکتا۔

تاجروں اور جہاز رانوں کو بلاشبہ ایک طاقتور اور بالادست قومی حکمران کی ضرورت تھی جو ایک وسیع قومی سلطنت کا فرمانروا ہو اور اس کے پاس موثر بحری طاقت بھی ہو۔ گویا پاپائیت کے اثرورسوخ کے خلاف آواز بلند کرنے اور اسے مسترد کرنے کا وقت آن پہنچا تھا۔ تاجروں کے بڑھتے ہوئے اثرورسوخ اور جاگیرداری نظام کے ڈھلتے اقتدار کے ساتھ ساتھ مذہب میں بھی بنیادی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں اور مسیحیت جاگیرداری کو چھوڑ کے بورژوازی کا ہاتھ پکڑنے والی تھی اور یورپ میں انقلاب نت نئے مذہبی عقائد کا حامل ایک نیا مذہبی انقلاب برپا ہونے والا تھا۔

پارلیمنٹ کا ارتقاء اور ریاست سے مذہب کی غیروابستگی

یہ 31 اکتوبر 1517ء کا واقعہ ہے۔ مارٹن لوتھر نے وٹن برگ Wittenberg کے قلعہ نما چرچ پر اپنے انقلابی نظریات پر مبنی 95 نکات آویزاں کیے۔ بس یہیں سے چرچ میں اصلاحات کے عمل کا آغاز ہوا جسے ابھرتے ہوئے نئے بورژوائی عالمی نظام سے تقویت ملی۔

بورژوازی نے پوپ کی برتری کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور ویٹی کن Vatican کے "کبھی غلطی پر نہ ہونے" کے تصور عام کی مخالفت کی تھی جبکہ ماضی میں زرعی اور جاگیرداری نظام نے وحدانیت کے عقیدے کی حمایت کر کے اس کے استحکام کو دوام بخشا تھا۔

اب پروٹسٹنٹ عقیدہ مختلف النوع عقائد کی حامل ایک قومی ریاست کا نظریہ اور اس کا جواز فراہم کر رہا تھا اس کے بعد ریاست کبھی مذاہب یا عقائد کے درمیان فریق نہ بنی اور اس کا اپنا کوئی مذہب نہ رہا۔ بورژوائی ریاست اب سرمایہ دارانہ نظام اور اس کے پہلو بہ پہلو علم اور سائنس کی پیش قدمی کا ایک ذریعہ بن گئی۔

بورژوازی کا ارتقاء یا دوسرے لفظوں میں تاجروں کے طاقتور اور موثر طبقے کے فروغ نے یورپ کی سماجی سیاسیات پر گہرے نقوش چھوڑے۔ تاجر سماجی نظام کے پرامن تسلسل کا حامی تھا۔ وہ امن و سکون کے ایام میں سرمایہ کاری کرتا تھا اور اس تسلسل کو یقینی بنانے میں دلچسپی رکھتا تھا کیونکہ

زمیندار کی نسبت اس کا بہت کچھ داؤ پر لگا ہوا تھا۔ جب تک فوج فی الحقیقت اس کی اپنی زمینوں اور فصلوں کو تاراج کرتی ہوئی نہ گزرے، زمیندار کو رتی برابر اس امر کی فکر لاحق نہیں ہوتی تھی کہ ملک پر کون حکمران ہے۔ اس کی خود کفالت، دارالحکومت سے اس کی دوری اور فصلوں کے حوالے سے منڈی کی صورت حال سے لاتعلقی نے جاگیرداری کی دنیا کو جاگیروں اور فرمانروائیوں کے ایک دروں بیں ٹولے میں تبدیل کر رکھا تھا۔ مرکز کے معاملات میں جاگیردار صرف اسی وقت ملوث ہوتے جب بادشاہ کو جنگ کے لئے سرمایہ اور افرادی قوت مہیا کرنے کا معاملہ آن پڑتا اور یا پھر بادشاہ کی فوجیں اس منحرف شنزادے کی عملداری کی طرف بڑھتیں جو لگان میں سے مرکز کا حصہ ادا کرنے سے انکار کرتا تھا۔

چند جاہ طلب اور زیادہ خوشحال جاگیردار امراء اور روٴسا کے سوا کسی کاؤنٹ اور ڈیوک، کسی راجہ اور نواب کے لئے کسی طرح بھی یہ صورت حال پریشان کن نہیں ہوتی تھی کہ مرکز میں کون حکمران ہے، وہ کیسے اقتدار تک پہنچا اور کب معزول کر دیا گیا۔ اس کے لئے ملکی امن وسکون کے مقابلے میں اپنی فرمانروائی کا امن وسکون زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ اگر دہلی کی افراتفری جے پور پر اثرانداز نہیں ہوتی تھی تو راجہ کو دہلی جیسے دور دراز شہر میں خونریزی پر کوئی پریشانی نہیں تھی۔ اپنی جاگیر میں مست کسی ڈیوک کو شاذ ہی ٹاور آف لندن کے بدبخت شاہی قیدیوں کا احوال معلوم کرنے میں دلچسپی ہو سکتی تھی۔

تاجر کا نقطۂ نظر قطعی مختلف تھا۔ گلاسگو کے ایک بیوپاری کو ساؤتھمپٹن کے گودام سے بحیرہ روم کے ساحلوں تک اپنے تجارتی سامان کی حفاظت ترسیل کے بارے میں تشویش ہونا فطری بات تھی۔ سکاٹ لینڈ میں رہتے ہوئے اسے لندن کے معاملات سے دلچسپی تھی۔ جن علاقوں سے اس کا سامان گزرتا تھا اسے ان علاقوں میں بھی امن وسکون کی ضرورت تھی۔ پوپ بہت دور تھا اور جاگیرداریاں لاتعداد، اس لئے تاجر اپنی حمایت کا وزن ہمیشہ ایسے حکمران کے پلڑے میں ڈالنے کے حق میں تھا جو مناسب وسعت کی ایسی ایک قومی ریاست کا فرمانروا ہو جو منظم اور مستحکم ہو اور جہاں اس کے اقتدار اعلیٰ کو مکمل طور پر تسلیم بھی کیا جائے۔

بورژوائی نظام کی آمد کے ساتھ ساتھ یورپ میں ایسی کئی ایک قومی ریاستیں معرض وجود میں آ گئیں جن میں سے ہر ایک وسعت کے اعتبار سے ہزاروں جاگیروں پر محیط مگر پھر بھی وہ اندرونی منڈی کی تعریف پر پورا اترتی اور اس کے ساتھ ہی اتنی ہم آہنگ اور متحدہ اکائی میں اس طرح گندھی ہوئی کہ اس میں قانون کی عملداری آسانی سے ممکن تھی۔

ان مختلف قومی ریاستوں کی سرحدوں کے تعین میں طویل عرصہ لگا اور یہ بہت سی جنگوں کا باعث

ہیں۔ یوں جب بادشاہ نے شاہراہوں پر امن حال کیا اور اس کی گشتی عدالتیں سلطنت کے طول و عرض میں لٹیروں اور قزاقوں کو موقع پر سزائیں سنانے لگیں تو ان قومی ریاستوں کی سرحدیں بھی کچھ دھکم پیل کا شکار ہو گئیں۔ اگر ایک طرف سرحد دوسری ریاست میں داخل ہوئی تو کہیں دوسری طرف وہ سکڑ بھی گئی۔ بعض ریاستوں کا ادغام بھی اس نئے طبقے کے یقینی دباؤ کا نتیجہ تھا۔ سکاٹ لینڈ کا جیمز ششم جب انگلستان کا جیمز اول بنا تو یہ بورژوائی کی آمد کا واضح اعلان تھا۔

لیکن تاجر ایک ظالم کی جگہ دوسرا ظالم قبول کرنے پر قطعی تیار نہیں تھا۔ جابر جاگیردار کی جگہ ہمہ مقتدر بادشاہ نہیں لے سکتا تھا۔ کسی بادشاہ کو مطلق العنان نہیں بنایا جا سکتا تھا اور بادشاہ کے من مانے اختیارات میں تخفیف کے لئے تاجر ایک نئی جدوجہد شروع کرنے کو تیار تھا۔ بورژوا نظام میں بادشاہوں کو قطعی کوئی "خدائی اختیار" Divine Right of Kings نہیں دیا جا سکتا تھا۔ پوپ سے پنڈا چھڑانے کے بعد ٹیوڈر Tudor بادشاہ بے پناہ اختیارات کے مالک بن بیٹھے تھے۔ مضبوط قوت ارادی کا حامل ہنری ہشتم Henry VIII اور الزبتھ اول Elizabeth I بہت ہی طاقتور اور مطلق العنان حکمران تھے اور اپنے اپنے عہد میں بے پناہ اختیارات اور قانون سازی کا واحد سرچشمہ بھی رہے لیکن ان کے جانشین سٹوارٹ Stuart خاندان کے بادشاہ ' تاجر طبقے کے عزم کے سامنے جھکنے پر مجبور ہو گئے۔

یہ تاریخ کی جبریت تھی اور نوشتہ دیوار بھی کہ اس کے بعد بادشاہ پھر کبھی قانون ' عدل اور اختیار کا مطلق العنان سرچشمہ نہ بن سکے۔

بادشاہ کو اب بورژوائی دنیا کے وجود میں آنے والے نئے اداروں یعنی پارلیمینٹ ' عدالت اور کابینہ کے بالاتر دائرۂ اختیار کا پابند ہو کے رہنا تھا۔ تبدیلی کے طوفان کا ادراک نہ کر سکنے کی پاداش میں چارلس اول Charles I 17 ویں صدی میں پھانسی کے تختے پر جھول گیا اور لوئی شش دہم Louis XVI اٹھارہویں صدی میں گلوٹین کی تیز دھار کا شکار ہوا۔ اگر اصلاح کلیسا اور قومی ریاستوں کا قیام یورپ میں بورژوازی کی آمد کا اعلان تھا تو انگلستان کا درخشاں انقلاب اور فرانس میں نپولین بونا پارٹ کا عروج ' اس نظام کی فتح کی نوید بنا۔

یورپ اب تک معاہدہ عمرانی Social Contract کے نظریات سے پوری طرح متعارف ہو چکا تھا۔ ٹیوڈر حکمرانوں کی مطلق العنانیت جس کا جواز ' سترہویں صدی کے ہابز Hobbes نامی مفکر نے پیش کیا جو مطلق العنانیت پر مبنی ایک ایسا عمرانی معاہدہ تھا جسے بہت مختصر عرصے میں ہی "تحلیل کر دینے کے عوامی اختیار" کے سامنے سرنگوں ہونا پڑا۔ اس کے بعد جان لاک John Locke نے

بورژوائی پارلیمنٹ کے اختیارات کے لئے نظریہ سازی کی جس کے نقش قدم پر روسو Rousseau کا 'عوامی حاکمیت' کی بالادستی کا نظریہ سامنے آیا۔ آمریت کے لئے حوصلہ شکن اس نظریئے میں ایسی حیرت انگیز توانائی تھی کہ انقلاب فرانس کے آغاز میں بسطیل Bastille کی قلعہ نما جیل پر قبضے کے ساتھ ہی قدیم فرانسیسی سلطنت کا خاتمہ بھی ہو گیا۔

انقلاب فرانس پرانے نظام کے خلاف بورژوائی بغاوت کے فیصلہ کن مرحلے کی علامت ثابت ہوا۔

ٹیکنالوجی کا تفاوت

جب 1526ء میں بابر نے پانی پت کے میدان میں فتح حاصل کی تو یورپ میں اس سے پہلے چھاپہ خانہ ایجاد ہو چکا تھا' بارود کی بہت سی ترقی یافتہ اقسام تیار کی جا چکی تھیں' جہازرانی کے جدید آلات اور انتہائی اہم ایجاد' قطب نما سے آراستہ منظم بحریہ اور شاندار تجارتی بیڑے وجود میں آچکے تھے اور ان کے ملاحوں کے پاس جیبی گھڑیاں تھیں اور یورپ' ہندوستان کے ساحلوں پر آزمائشی طور پر لنگرانداز ہو چکا تھا۔ پھر 1707ء میں جب اورنگ زیب کا انتقال ہوا تو یورپ میں بورژوازی طبقہ واضح طور پر غلبہ حاصل کر چکا تھا اور بادشاہ کے اختیارات کو محدود کر دیا گیا تھا۔

لیکن وادی سندھ اور ہندوستان پر مشتمل برصغیر میں ایسی کسی پیش قدمی کا دور تک نام و نشان بھی نہیں تھا۔

یورپی اقوام اب تک ہونے والی بے شمار سائنسی دریافتوں اور ایجادات کو اپنے توسیع پسندانہ سامراجی عزائم کی تکمیل کے لئے استعمال میں لا چکی تھیں۔ عظیم تر عمومی خوشحالی' ایجادات کے تسلسل اور مظاہر فطرت کی آگہی میں بے پناہ اضافے نے یورپ کے لئے سرمایہ داری نظام کی حوصلہ افزائی کی اور اسے ہر دم وسعت اختیار کرتے عالمی نظام میں تبدیل کر دیا اور یوں توسیع پسندانہ عالمی سامراج وجود میں آیا۔

اٹھارویں صدی کے دوران یورپ اور برصغیر کے درمیان سائنسی علوم اور فنی مہارت کی خلیج اور بھی وسیع ہوئی۔ مسلسل بڑھتی ہوئی سرمایہ دارانہ طلب نے مزید دریافتوں اور مزید ایجادات کی راہ ہموار کی۔ 1735ء میں ڈھلائی کا فولاد Cast Steel اور 1738ء میں کپڑے کی بنائی کے لئے بیلن نما کھڈی Roller Loom کی ایجادات سامنے آئیں۔ 1764ء میں ہارگریوز Hargreaves ایسی ایجاد سامنے لایا جس سے مشینی طرز پر کپڑے کی بنائی کا آغاز ہوا۔

اس دور کی اہم ترین ایجاد بھاپ کا انجن 1768ء میں واٹ Watt کی ذہانت کا رہین منت تھا۔ خودکار پادر لوم 1785ء میں کارٹ رائٹ Cart Wright' 1795ء میں برامہ Bramah نے ہائیڈرالک چھاپہ خانہ اور رابرٹ Robert نے 1799ء میں کاغذ سازی کا آغاز کیا۔ 1807ء میں فلٹن Fulton نے یورپ کو دخانی جہاز کا تحفہ دیا۔ جو بادبانوں کے بجائے بھاپ کی توانائی سے چلتا تھا۔ ان ایجادات کے نتیجے میں بین البراعظمی فاصلے سکڑ گئے اور جیسے تمام دنیا یورپی صنعتکار کی منڈی بن گئی۔

اب خودکار ذرائع سے وسیع پیمانے پر پیداوار کا حصول ممکن بھی تھا اور قرین مصلحت بھی، مگر پیداوار کے اس عمل کے لئے خام مال کی ضرورت تھی۔ نئی ایجادات سے لیس یورپ کے بڑے بڑے صنعت کاروں نے خام مال کی تلاش میں ایشیا اور افریقہ کی گھریلو دستکاریوں کو تباہی کے دہانے پر پہنچادیا۔ برصغیر کی مختلف قوموں اور ریاستوں اور دنیا کے ایک بہت بڑے حصے پر یورپی غلبے کا راز دراصل ان کی انتظامی صلاحیت اور ان کی فوجی برتری سے کہیں زیادہ اس سائنسی ترقی اور فنی مہارت میں پوشیدہ تھا جس کا سلسلہ گزشتہ دو صدیوں سے یورپ میں جاری تھا۔

ادھر برصغیر میں مغلوں کا عہد اپنے اختتام کو پہنچ رہا تھا لیکن اپنی تمام تر طاقت اور کروفر کے باوجود وہ ایک معمولی چھاپہ خانے کا آغاز بھی نہیں کر سکے تھے۔

اٹھارویں صدی کے اختتام پر جب کیمبرج اور آکسفورڈ جیسی درسگاہیں اپنی زندگی کے پانچ سو برس مکمل کر چکی تھیں، برصغیر غنودگی کے عالم میں ابھی تک ایک ایسے دقیانوسی نظام تعلیم کو گلے لگائے ہوئے تھا جو شک کے اظہار، اختلاف رائے اور تحقیق و جستجو کی راہ میں حائل تھا اور شاید یہاں آج بھی وہی نظام رائج ہے۔ مہاجن لکھتا ہے کہ:

> ''ہندوؤں اور مسلمانوں کا نظام تعلیم رجعت پسندانہ تھا۔ تعلیمی اعتبار سے دونوں ہی پسماندہ تھے اور دونوں ہی مغرب کی سائنسی ترقی کے بارے میں بے خبر بھی تھے۔ وہ مشاہدے، تجربے اور تنقید کے جدید انداز فکر سے قطعی ناآشنا تھے۔ ہندوستان کے اطراف میں سمندر پر یورپ کی حکمرانی تھی۔ یورپی جہازران ہندوستان کے مغربی اور مشرقی ساحلوں پر لنگرانداز ہونے کی سہولتیں حاصل کر چکے تھے اور ان ساحلوں پر یورپی صنعتکار نے چھوٹی صنعتیں لگا رکھی تھیں لیکن گجرات، کیرالا، کولامنڈل، اڑیسہ اور بنگال کے باشندے دانشورانہ سطح پر، یورپی اقوام کی اپنی سرزمین پر موجودگی سے قطعی لاتعلق اور بے پرواہ رہے۔ ہندوستان کے شہزادگان اور یہاں کی اشرافیہ یورپ کے

جانوروں ' پرندوں ' آئینوں ' کھلونوں اور شرابوں میں تو دلچسپی کا برملا اظہار کرتی لیکن انہیں یورپ کے سماجی ' معاشی اور ثقافتی منظر نامے کے بارے میں کوئی تجسس نہیں تھا۔

اگرچہ مسلمانوں کے تمام علوم سپین ' اٹلی اور فرانس کی عیسائی درسگاہوں میں پڑھائے جاتے تھے لیکن اٹھارویں صدی کے اختتام تک یورپ کی نئی دریافتوں اور ایجادات کے بارے میں ہندوستان کے لوگ قطعی طور پر بے خبر تھے اور ہندوستان میں تعلیمی اداروں کی کمی اس کی بنیادی وجہ نہیں تھی ' سکول تو یہاں بہت تھے۔ اصل خرابی تعلیم کے معیار میں تھی۔ تعلیمی نصاب فرقہ واریت کی بنیاد پر مرتب کیا جاتا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے دو قطعی مختلف نظام تعلیم رائج تھے۔''

''ہندو سکول دو یکسر الگ الگ حصوں میں منقسم تھے۔ ایک حصہ بنیادی تعلیم دیتا تھا جس کا نصاب پانچ سے آٹھ سال پر محیط تھا یہاں طلبا کو لکھنا ' پڑھنا اور حساب سکھایا جاتا تھا۔ مقصد ' انہیں حساب کتاب یا درخواستیں لکھنے کے قابل بنانا تھا۔ اتفاقیہ طور پر یہی ''مہارت'' بعد میں ہندو لڑکوں کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارتی سرگرمیوں میں آسانی کے ساتھ ضم کرنے کے کام آئی۔ ثانوی مدرسوں میں حالات زیادہ خراب تھے جہاں نصاب عام طور پر دینی تعلیم پر مشتمل ہوتا تھا۔ قانون کے طالب علموں کو ہندو قانون اور رسوم کی مختلف شاخوں پر عبور حاصل کرنے میں عام طور پر 8 سے 23 سال تک لگ جاتے تھے۔''

مسلمانوں کا نظام تعلیم اس سے کہیں زیادہ ناقص تھا۔ مسلمانوں کے ہاں دراصل عوام الناس کے لئے سرے سے کوئی تعلیمی نظام تھا ہی نہیں۔ تعلیم صرف اونچے طبقوں کا استحقاق تھا اور عام آدمی کے لئے تدریس کا کوئی اہتمام نہیں تھا۔ مسلمان مدرسوں میں فارسی ذریعہ تعلیم تھی۔ اردو سمیت ہندوستان میں بولی جانے والی کوئی زبان بھی درس و تدریس کے لئے استعمال نہیں ہوتی تھی۔

اگر یورپ کے کسی اہل علم کو اجنبی زبان میں تعلیم حاصل کرنے پر مجبور کیا جاتا تو کیا وہ اپنے مضمون پر عبور حاصل کر سکتا تھا۔ کیا وہاں کوئی کوپرنیکس Copernicus یا نیوٹن Newton پیدا ہو سکتا تھا؟ قرون وسطیٰ میں مذہبی اور عدالتی شعبوں پر لاطینی زبان کا غلبہ تھا لیکن سائنسی عہد کی آمد کے

ساتھ ہی لاطینی کو مسترد کر دیا گیا تھا۔

برصغیر میں تعلیم حاصل کرنے کا ایک مروجہ ذریعہ مساجد کے مکتب تھے جہاں عام طور پر معذور افراد کو مفاہیم کی ترجمانی کے بغیر قرآن حکیم حفظ کروایا بلکہ رٹایا جاتا تھا۔ عملی سائنس کے مضامین کی تدریس کا کوئی تصور نہیں تھا' صرف اتنا ہوتا کہ انتہائی غیر مجسانہ انداز میں کچھ کتابیں رٹ لی جاتی تھیں۔ تجربہ گاہیں اور رصدگاہیں ناپید تھیں۔ ایک ایسے وقت میں جب یورپ میں ہوا کے دکھائی نہ دینے والے سالموں کو آکسیجن' ہائیڈروجن اور نائٹروجن کی شکل میں الگ الگ کیا جارہا تھا' برصغیر میں جستجو' تحقیق اور عدم یقینی کے مرتکب افراد کو سزاوار ٹھہرایا جاتا تھا۔ استاد کے خیالات کی اندھی تقلید ہی فرمان امروز تھی۔ خواتین کی تعلیم کا سرے سے کوئی وجود نہیں تھا۔ کہیں اکادکا کوئی خاتون نجی سطح پر کسی معلم سے کچھ بنیادی تعلیم حاصل کر لے تو الگ بات تھی۔

سائنس کی نئی دنیا یورپ میں تسخیر کائنات کے لیے سفر پر گامزن ہو چکی تھی مگر برصغیر میں واعظ' پنڈت' پروہت اور عالم اپنے اپنے تعصبات میں جکڑے ایک دوسرے کے خلاف فقرے بازی پر اپنی توانائیاں صرف کر رہے تھے۔

ہراول دستہ

1498ء کا سال کئی اعتبار سے 1526ء کی نسبت زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔

1526ء میں پانی پت کی جنگ اور بابر کی ہندوستان آمد بلاشبہ ایک عظیم واقعہ تھی لیکن یہ 1398ء میں تیمور کی آمد سے بس اتنا ہی مختلف تھی کہ تیمور ہندوستان کو تاراج کر کے واپس چلا گیا تھا جبکہ بابر نے مفتوحہ ملک کو اپنا مستقل گھر بنا لیا تھا۔ بابر کی "سلطنت تیموریہ" جس کا صدر مقام دہلی تھا' تغلق' علاؤالدین خلجی اور غیاث الدین کی سلطنتوں کا ایک زیادہ پر شکوہ اور موثر انداز میں تسلسل ہی تھا۔ شاہانہ کروفر میں مغلوں نے سلطنت عہد کو کہیں پیچھے چھوڑ دیا تھا لیکن فرق صرف کیت کا تھا' معیار اور ذہنی صلاحیتوں میں دونوں ایک تھے۔ سائنس کی ترقی کے اعتبار سے صرف ایک توپ ہی ایسی ایجاد تھی جو مغلوں کے استعمال میں تو تھی مگر تیمور اس سے ناآشنا تھا۔ اور یہ توپ اور بارود کا استعمال بھی مغلوں یا مسلمانوں کی ایجاد نہ تھا۔ اس کے علاوہ ٹیکنالوجی میں بھی کوئی ایسی پیش رفت نہ ہوئی تھی جس کے حوالے سے مغلوں کے عہد کو سلاطین دہلی کے عہد سے مختلف کہا جا سکتا ہو۔

لیکن 1498ء میں ہندوستان کے جنوب مغربی ساحلوں پر واسکوڈے گاما کے لنگر انداز ہونے کی نوعیت قطعی مختلف تھی۔ وہ اس دور افتادہ یورپ کے توسیع پسند اور مضطرب سرمایہ دارانہ نظام کا ہراول

دستہ تھا جسے انیسویں صدی میں بھاپ کی قوت اور نہر سوئز کے انجینئروں کی وساطت سے اپنے نو آبادیاتی محکومین کے زیادہ قریب آجانا تھا۔

دہلی کے سلاطین اور مغل بادشاہ جاگیرداری اور عالمی زرعی نظام کے بلند ترین درجے پر متمکن تھے۔ واسکوڈے گاما کے تین جہاز اور صرف 150 جوان' یورپ کے صنعتی اور تاجر بورژوازی کا وہ ہراول دستہ تھے جو دنیا بھر میں خام مال اور محکوم منڈیوں کی تلاش میں سرگرداں تھا۔

17

یورپ کا منتظر ہندوستان

اختراع سے پہلو تہی

جب اٹھارویں صدی کا یورپ' برصغیر پاک و ہند پہنچنے کے لئے بڑی تندہی کے ساتھ سمندروں کی طنابیں کھینچ رہا تھا' خود برصغیر منقسم اور نڈھال پڑا تھا۔

اب سے پہلے اس طرف' یورپ کی پیش قدمی سست اور عبوری نوعیت کی تھی لیکن اسے غیر اہم بہر حال نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کیپٹن ہاکنز Captain Hawkins (11-1607) جہانگیر کے دربار تک رسائی حاصل کر چکا تھا اور اسی دربار میں سر ٹامس رو (Sir Thomas Roe) کی سفارت کاری مغل برطانوی مکالمے کے آغاز کی صورت میں رنگ لائی تھی لیکن اس سلسلے میں یورپ کو سب سے پہلی انقلابی کامیابی اس وقت حاصل ہوئی جب 1618ء میں مغل شہنشاہ نے پرتگالی قذاقوں سے اپنی بحری آمدورفت کو تحفظ فراہم کرنے کے عوض برطانیہ کو بہت سی اہم مراعات سے نوازا۔

کیا غضب تھا کہ شہنشاہ ہند اپنی تمام تر طاقت کے باوجود اپنی ہی سلطنت کے ساحلوں اور وہاں کی تجارتی آمدورفت کی حفاظت نہیں کر سکتا تھا۔

دکن کی مہمات میں ٹامس رو Thomas Roe شہزادہ خرم کے ساتھ ساتھ رہا۔ اس دوران ان کی دوستی خوب پروان چڑھی اور جب خرم' شہنشاہ شاہجہان کی حیثیت سے تخت نشین ہوا تو ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے تعلقات کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اپنی تاجپوشی کے سال میں ہی شاہجہان نے پرتگال کے تجارتی مفادات کو کلکتہ کی بندرگاہ ہگلی پر فوج کشی کر کے ختم کر دیا اور 1640ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی

کو مدر اس میں صنعت قائم کرنے کی اجازت بھی مل گئی جس کے لئے قطعہ زمین وجے نگر کے ایک سابقہ حکمران سے پٹے پر حاصل کیا گیا۔ پرتگال کی شہزادی کیتھرین Catherine جب 1674 میں انگلستان کے بادشاہ چارلس ثانی کی دلہن بنی تو اپنے ساتھ جہیز میں بمبئی بھی لائی جسے فوراً کمپنی کے حوالے کر دیا گیا اور کمپنی نے اپنا ہیڈ کوارٹر سورت سے بمبئی منتقل کر لیا۔ بنگال میں ہگلی کے مقام پر جو صنعتی کارخانہ قائم کیا گیا تھا ' 1690ء میں اسے کلکتہ منتقل کر دیا گیا۔ گویا' مستقبل کی سلطنت پر مضبوطی سے قدم جمانے کے لئے سامراج تیزی سے پینترے بدل رہا تھا۔

یورپ کے مقابلے میں اگر دیکھا جائے تو ہندوستان نے اس تمام عرصے کے دوران مسلسل اپنی کم مائیگی کا مظاہرہ کیا۔ اپنے اقتدار اور اپنی شان و شوکت کے عروج پر ہوتے ہوئے بھی مغل حکمران چھاپہ خانے اور مضبوط بحریہ جیسے جدید عصری تقاضوں کی اہمیت کا ادراک تک نہ کر سکے۔

1582ء میں پرتگال کے عیسائی مبلغین نے شہنشاہ اکبر کو فتح پور سیکری کے مقام پر انجیل مقدس کی ایک ایسی جلد پیش کی جو چار زبانوں پر مشتمل تھی اور جس میں ہر زبان کو اس کے لب و لہجے کی صحت کے ساتھ پڑھنے کا اہتمام تھا۔ کہتے ہیں کتاب میں حضرت عیسیٰؑ اور مقدس مریم کے جو فرضی تصویری خاکے تھے ' انہیں چوم کر اکبر نے مقدس کتاب کو سر پر رکھ لیا۔ ظاہر ہے ' مبلغین مغل بادشاہ کے اس انداز سے محظوظ ہوئے۔ اکبر نے ان سے طباعت کے بارے میں بھی پوچھا لیکن اپنے شوق تجسس میں بھی اسے ایک لمحے کے لئے یہ خیال نہ آیا کہ طباعت کو برصغیر میں بھی رواج دیا جائے۔ اسے تو اپنے خطاطوں پر فخر تھا جو اس کے نزدیک طباعت سے بدرجہا بہتر کتابت کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

پھر ایسا بھی نہیں تھا کہ ہندوستان کے بادشاہ سرے سے یورپ کی مصنوعات سے متعارف ہی نہیں ہوئے تھے ' نہ ہی چھاپہ خانہ ان کی نظر میں واحد یورپی ایجاد تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ خشکی کے باسی مغلوں کو یورپی ملاحوں کے ذریعے مغرب کی مصنوعات درآمد کرنا زیادہ سہل لگا۔ بعض اوقات تو وہ ان درآمدی اشیا کا بہت دلچسپ استعمال کرتے تھے۔

1748ء میں محمد شاہ کا انتقال ہوا تو اس کا جائز وارث احمد شاہ کسی مہم پر سرہند میں تھا۔ وارث کی واپسی تک محمد شاہ کی بیوہ ملکہ زمانی جو فرخ سیار کی بیٹی تھی ' اپنے شوہر کی موت کو خفیہ رکھنا چاہتی تھی۔ اس نے لاش کو لکڑی کے ایک مستطیل صندوق میں چھپا دیا۔ یہ صندوق کیسا تھا؟ اس میں یورپ سے ایک قد آدم کلاک آیا تھا۔ ظاہر ہے گھڑیال اور صندوق دونوں یورپ سے درآمد کئے گئے تھے۔ برصغیر میں تو کلاک یا گھڑیاں بنتی ہی نہیں تھیں حالانکہ یہ بھی چھاپہ خانے اور قطب نما کی طرح ایک نہایت کارآمد ایجاد تھی۔ حیرت تو یہ ہے کہ کسی خواہش اور مصلحت کے تحت بھی ہندوستان کے حکمرانوں نے

یورپ کی صنعتی مہارت کو مستعار لے کر ان کی درآمدی اشیاء کو یہاں تیار کرانے اور فروغ دینے کی کبھی کوئی شعوری یا غیر شعوری کوشش نہیں کی۔

بعض اوقات تو ایسا بھی ہوا کہ جدید فنی مہارت کے استعمال کی راہ میں بظاہر رحم دلی اور انسان دوستی کے جذبات بھی آڑے آئے۔ برصغیر کے حکمرانوں کی ایک حوالے سے یہ بھی غیر سائنسی سوچ ہی تھی مثلاً ایک انگریز خاتون جس نے اٹھارویں صدی میں ایک ہندوستانی سے شادی کر لی تھی۔ اپنے گھر والوں کو خط میں لکھا:

> "چکی جس کا ذکر میں پہلے بھی کر چکی ہوں' دو گول اور چپٹے پتھروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ انگلستان میں پسائی کے لئے استعمال ہونے والے پتھروں سے مشابہ ہے۔ اس کے اوپری پتھر پر ایک دستہ لگا ہوتا ہے جسے فرش پر بیٹھا ہوا شخص گھماتا ہے۔ اسی پتھر میں اناج ڈالنے کے لئے سوراخ بھی ہوتا ہے اور آٹا دونوں پتھروں کے کناروں سے باہر نکلتا رہتا ہے۔ اودھ کی کثیر آبادی ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے بیشتر علاقوں میں غلہ پیسنے کا صرف یہی ایک طریقہ ہے۔ ایک موقعہ پر اودھ کے مرحوم بادشاہ غازی الدین حیدر کو اس کے یورپی دوستوں نے بہت مجبور کیا کہ وہ غلہ پیسنے کے لئے پن چکی متعارف کرا دے۔ بادشاہ اس مجوزہ منصوبے کا ذکر کرتے ہوئے میر (انگریز خاتون کا شوہر) سے کہا کرتا تھا کہ اس منصوبے پر عمل کرنے میں واحد رکاوٹ غریب عورتوں کے لئے اس کا جذبہ ہمدردی ہے کیونکہ ہاتھ کی چکی سے ہر گاؤں اور قصبے میں عورتیں اچھی خاصی رقم کما لیتی ہیں' پن چکی شروع ہوئی تو ان کا روزگار جاتا رہے گا۔ وہ اکثر یہ بھی جواز دیتا کہ ان غریب عورتوں کو وہ کوئی ایسا موقعہ نہیں دینا چاہتا کہ چکی اور اس کے فوائد سے محروم ہو کر کہیں اسے لعنت ملامت نہ کرتی پھریں"۔

ایسی صورت حال میں یہ امر قطعی حیران کن نہیں کہ جن صدیوں نے یورپ کی کایا پلٹ دی ان میں ہندوستان رتی بھر تبدیل نہیں ہوا کیونکہ یہاں بادشاہ کی ذات میں مرکوز دقیانوسی' من مانے اور ہر شعبے پر محیط اختیارات کسی مضبوط اور فعال بورژوازی طبقے نے رد نہیں کئے تھے۔ اس لئے پارلیمان یا عدلیہ جیسے اداروں کے پروان چڑھنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا اور یوں شہزادگان کی جاگیروں میں بٹا ہوا برصغیر صدیوں تک مسلسل سکوت اور جمود کا شکار رہا۔

لیکن ہندوستان ایک اور حوالے سے بھی آلکسی کی لپیٹ میں تھا۔

جمود کا شکار گاؤں اور قلیل پیداوار کا تصور

موریا، ہندی باختری، کشان، گپتا، سلاطین دہلی اور مغل سلطنتیں، عظمت، شان و شوکت اور عروج حاصل کرنے کے بعد ان گنت چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گئیں۔ جنوب میں چولے، پانڈے اور پلاوے خاندان اور ریاستیں انجام کو پہنچے تو ان کی جگہ وجے نگر اور گلبرگہ کی ریاستیں نمودار ہوئیں، پروان چڑھیں، تباہ ہوئیں اور پھر زیادہ بڑی سیاسی قوتوں میں ضم ہو گئیں۔

قبل از مسیح کی سلطنت موریا کا غلام داری نظام بتدریج راجپوت، جاٹ، افغان اور مغلوں کے جاگیرداری نظام میں تبدیل ہوا۔ ان سبھی سلسلہ ہائے نسب کے درباروں نے علم و فن کے اساتذہ، معمار، شاعر، انتظامی اور مالیاتی امور کے ماہرین، جرنیل اور فلسفی اپنی طرف راغب کئے اور انہیں پروان بھی چڑھایا لیکن ان کا اثر و رسوخ بھی صرف اوپر کے طبقات پر رہا اور گاؤں کی سطح پر ہندوستان صدیوں تک خوابیدہ اور غیر متغیر ہی رہا حالانکہ معلوم تاریخ کے بیشتر حصے میں خود مختار، خود کفیل اور دروں بین گاؤں ہی لوگوں کی اکثریت کے لئے اصل ہندوستان تھا۔ کارل مارکس (Karl Marx) نے اس صورت حال کا بڑی باریک بینی سے تجزیہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ دیہات کی سطح پر ہندو سندھ کا معاشرہ، سیاسی افق پر چھائے ہوئے طوفانی بادلوں سے ہمیشہ لاتعلق رہا ہے۔ مارکس نے اپنے تجزیے میں لکھا ہے:

"ہندوستان کی چھوٹی چھوٹی اور انتہائی قدیم بستیاں جن میں سے چند ایک کا تسلسل آج بھی جاری ہے، دراصل زمین کی مشترکہ ملکیت، زراعت اور دستکاری کے امتزاج اور محنت کی ناقابل تغیر تقسیم کی بنیاد پر قائم ہیں۔ جب بھی کوئی نئی بستی جنم لیتی ہے تو وہ انہی اصولوں اور اسی طریقہ کار کے مطابق پروان چڑھتی ہے جو صدیوں سے اس معاشرے میں رائج ہے۔ ہر بستی یا گاؤں کا زیرملکیتی رقبہ ایک سو سے کئی ہزار ایکڑ تک ہوتا ہے۔ گاؤں ایک جامع اکائی ہوتا ہے جو اپنی ضرورت کی ہر شئے پیدا کرتا ہے۔ کل پیداوار کا بیشتر حصہ براہ راست گاؤں کے اپنے استعمال میں آتا ہے اور تجارتی مال کی حیثیت اختیار نہیں کرتا لہٰذا ان بستیوں یا دیہات میں پیداوار، محنت کی اس تقسیم کار سے آزاد ہے جو ہندوستان کے معاشرے میں حیثیت مجموعی تبادلہ اجناس کے نتیجے میں پروان چڑھی۔ یہاں صرف فاضل پیداوار ہی تجارتی مال کی شکل اختیار کرتی ہے بلکہ اس کا بھی ایک حصہ اس وقت تک مال

تجارت نہیں بنتا جب تک کہ سرکار کے مال خزانے تک نہیں پہنچ جاتا اور سرکار زمانہ قدیم سے ہی اس پیداوار کا ایک حصہ جنس کی شکل میں بطور لگان وصول کرتی ہے۔

ہندوستان کے ایک سے دوسرے علاقے میں ان دیہات کے اجزائے ترکیبی بھی مختلف ہیں اس کی سادہ ترین شکل تو وہ ہے جہاں مشترکہ کھیتی باڑی کی جاتی ہے اور پیداوار آپس میں بانٹ لی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہر خاندان میں ذیلی دستکاری کے طور پر دھاگا کاتنے اور کپڑا بننے کا عمل بھی جاری رہتا ہے۔ ایک ہی جیسے کام میں جتے ہوئے عوام الناس کے علاوہ یہاں ایک 'سردار' ہے جو بیک وقت انصاف' امن وامان اور محاصل کی وصولی کا ذمہ دار ہے۔ ایک کھاتے دار ہے جو کاشتکاری کا حساب کتاب رکھتا اور دوسرے تمام متعلقہ امور کا اندراج کرتا ہے۔ ایک اور اہلکار مجرموں کو سزا دیتا اور علاقے سے گزرنے والے مسافروں کو حفاظت اگلے گاؤں تک پہنچاتا ہے۔ ایک سرحدی محافظ ہے جس کی ذمہ داری گاؤں کی سرحدوں کو ہمسایہ گاؤں کی ممکنہ دست برد سے محفوظ رکھنا ہے۔ ایک شخص پانی کی تقسیم کا ذمہ دار ہے جو مشترکہ ذخیرہ آب سے آب پاشی کے لئے پانی فراہم کرتا ہے' پھر برہمن ہے جس کے ذمے مذہبی رسوم کی ادائیگی ہے۔ استاد ہے جو بچوں کو ریت پر لکھنا پڑھنا سکھاتا ہے۔ ایک نجومی برہمن ہے جو بوائی 'کٹائی اور زراعت سے متعلقہ ہر کام کے لئے مبارک اور منحوس دنوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ لوہار اور بڑھئی زرعی آلات کی مرمت کرتے ہیں۔ کمہار گاؤں کے لئے برتن بناتا ہے۔ گاؤں میں ایک نائی اور کپڑے دھونے کے لئے دھوبی ہے۔ ایک اور شخص چاندی کے زیور بناتا ہے لیکن بعض آبادیوں میں یہی کام کمہار کرتا ہے اور بعض میں استاد۔ گاؤں مشترکہ طور پر ان درجن بھر افراد کی کفالت کرتا ہے۔ آبادی بڑھ جائے تو کسی بے آباد زمین پر' اسی پرانے طریقہ کار کے عین مطابق' ایک نئی بستی یا گاؤں کی بنیاد رکھ دی جاتی ہے۔

یہ ان خود کفیل دیہات کی تنظیمی سادگی ہے جو ان کے وجود کا تسلسل برقرار رکھتی ہے اور اگر حادثاتی طور پر ان میں سے کوئی تباہ ہو جائے تو پھر اسی

جگہ پر' اسی شکل میں' اسی بستی کا دوبارہ آغاز ہو جاتا ہے۔ ایشیائی بستیوں کی سادگی میں ہی ان کے عدم تغیر کا راز پنہاں ہے۔ ایشیائی سلطنتوں کے مسلسل عروج و زوال اور حکمران خاندانوں کی لگاتار تبدیلیوں کے پس منظر میں ان ایشیائی معاشروں کا عدم تغیر اور بھی نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔ ان معاشروں کا بنیادی معیشی ڈھانچہ' سیاسی افق پر منڈلاتے ہوئے طوفانی بادلوں سے ہمیشہ اور یکسر لاتعلق رہتا ہے۔"

سیاسی ہنگاموں سے دور' دیہات کی سطح پر ہندوستان یقیناً ناقابل تغیر تھا۔ جمود کا شکار ہونے کے باوجود کسی بھی سیاسی یا معاشی شعبے کے مقابلے میں اس کی حیثیت منفرد تھی۔ اگر ایک طرف یہ انتہائی فعال تھا تو دوسری طرف بے پناہ نڈھال بھی' اگر ایک طرف اس کے دیہات کو خود مختاری حاصل تھی تو دوسری طرف اس کی دروں بینی کے تمام مضر اثرات بھی اس پر حاوی تھے۔

یہ بات تو واضح ہو چکی کہ اپنی تنظیم کار کے حوالے سے ہندوستانی گاؤں کی معاشرتی اکائی میں ایک طاقتور اور فعال نظام میں ڈھلنے کی تمام علامتیں موجود تھیں۔ یہ ایک ترقی پسندانہ جمہوری انتظام تھا' انسان دوستی جس کے معاشی ڈھانچے کی بنیاد تھی لیکن اٹھارویں اور انیسویں صدی میں اس نظام سے وابستہ تمام امیدیں دم توڑ گئیں۔

پہلی بات تو یہ کہ کسان میں آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی ہر خواہش معدوم ہوتی چلی گئی اور یہ تبدیلی دیہات کے ڈھانچے میں کسی پیداواری رکاوٹ کے باعث نہیں آئی تھی بلکہ خارجی عناصر اس کا جواز بنے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دیہات کی بنیادی معاشرتی اکائی میں کسان اپنی پیداوار بڑھانے اور اس میں تنوع پیدا کرنے میں خود مختار تو تھا لیکن پورے گاؤں پر لاگو کئے جانے والے محاصل کے ظالمانہ نظام نے کسان سے ترقی کرنے کی خواہش چھین لی تھی۔ حکمران طبقے' کسان کو اس کی تمام فاضل پیداوار بلکہ بعض اوقات اس سے بھی کہیں زیادہ یعنی اس کے اوزار و آلات سے بھی محروم کر دیتے تھے جس کے نتیجے میں اکثر اوقات گاؤں قحط جیسی صورت حال سے دوچار ہو جاتے۔

گپتا کا رائج کردہ تقسیم اراضی کا نظام جو بعد میں ہندوستان اور وادی سندھ کے جاگیردارانہ نظام کی بنیاد بنا' دیہی معاشرے کی ترقی کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ثابت ہوا۔ اس طریقہ کار کے تحت لگان کا تعین زمین سے حاصل ہونے والی پیداوار سے جوڑ دیا گیا تھا۔ اچھی فصل ہونے کی صورت میں حکومت کا حصہ بھی اسی تناسب سے بڑھ جاتا تھا۔ زمین کے غیر ملکیتی نظام میں اس کا مطلب یہ تھا کہ زمین سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے والے کسان یا گاؤں کو لگان بھی زیادہ ادا کرنا تھا۔ لگان وصول کرنے والے کو

موریا عہد کی طرح کوئی عوضانہ نہیں ملتا تھا بلکہ اسے اب یہ اختیار حاصل تھا کہ فاضل پیداوار سے بادشاہ کے حصے کی ادائیگی کے بعد بقیہ جنس وہ خود رکھ لے۔

کیونکہ گاؤں سے صرف مقامی ضروریات کے مطابق پیداوار کے حصول کی توقع رکھی جاتی تھی اور کیونکہ فاضل پیداوار بہر صورت جاگیردار غصب کر لیتا تھا اس لئے کسان پیداواری عمل کو محدود تر رکھنے پر مائل ہوا۔ یوں ترقی کرنے کا جذبہ سرد پڑ تا گیا اور کاشتکاری کے جدید تو کیا' پہلے سے دستیاب مگر بہتر ذرائع بروئے کار لانے کی بھی حوصلہ شکنی ہوئی۔ فنی مہارت کے حوالے سے بھی زراعت میں کوئی پیش قدمی نہ ہوئی۔ فصلوں کی بوائی اور کٹائی کے طریقے وہی قدیمانہ رہے۔ دقیانوسی ہل زمین کی صرف اوپری پرت تک پہنچتا تھا۔ ایک ہی کھیت میں مختلف فصلوں کی کاشت' کسان کے لئے بزعم خود ایک امکانی تحفظ تھا۔ اگرچہ اس طرح کوئی ایک فصل بھی اچھی نہیں ہوتی تھی لیکن تمام فصلوں کی ناکامی کا خطرہ بھی کم تر تھا۔ ہاتھ اور درانتی سے فصل کی کٹائی میں بھی' ہم عصر معیار کے مطابق' بہت سا اناج کھیتوں میں ہی ضائع ہو جاتا تھا۔

مغل انڈیا کی معیشت بھی عجیب تضاد کا شکار تھی۔ یہ بات یقینی ہے کہ لوگوں کی بہت بڑی اکثریت صرف وہی اشیا استعمال کرتی جو وہ خود پیدا کرتے تھے یا اپنے ہمسایوں سے روایتی لین دین کے ذریعے حاصل کرتے تھے۔ یہ بھی یقینی ہے کہ درحقیقت ہر شخص بطور پیداکار یا صارف یا پھر دونوں حیثیتوں سے لین دین میں شامل تھا اور زرعی پیداوار کا نصف حصہ لگان کی شکل میں ادا کر دیا جاتا تھا (جو نقد رقم یا جسے انجام کار نقد رقم میں تبدیل ہونا تھا)۔ گمان یہی ہے کہ دستکار پر محصول کے بوجھ کا تناسب بھی کم و بیش کاشتکار کے مساوی تھا۔ تو ایک ایسی معیشت میں جہاں لوگوں کی اکثریت کے لئے محض گزر اوقات مشکل تھی وہاں ناقابل یقین حد تک پیداوار کا زیادہ حصہ مبادلے کے لئے وقف ہوتا تھا۔ بھاری لگان کی وصولی اسی تضاد کی وضاحت کرتی ہے اور یہ ایک ایسا کام تھا جس میں مغلوں نے اپنے پیشرو حکمرانوں کے مقابلے میں زیادہ کامیابی حاصل کی۔ زیادہ لگان کی وصولی مبادلے کے حجم اور اجناس کے تنوع میں بھی اضافے کا سبب بنتی ہے۔

اپنی کل پیداوار کا نصف لگان کی صورت میں ادا کر دینے کے بعد پیداکار میں کچھ خریدنے کا حوصلہ نہ رہ جاتا۔ فاضل پیداوار کے حصے دار چونکہ حکمران' اہلکار' لواحقین اور بیوپاری تھے اس لئے قوت خرید بھی ان کے پاس تھی اور اشیائے صرف کی طلب کے اجارہ دار بھی وہی تھے۔ ان کی بڑھتی ہوئی دیسی یا بدیسی تجارتی ضروریات' صنعت و تجارت کے دستیاب وسائل کے ذریعے بڑی آسانی کے ساتھ پوری ہو رہی تھیں۔ اس لئے نہ تو ملک کے روایتی لیکن بااثر تجارتی ڈھانچے کو رد کر دینے والی کوئی قوت ابھر

سکی اور نہ ہی اس میں کوئی بنیادی اختراعی تبدیلیاں رونما ہو سکیں۔ آخر ان کی ضرورت بھی کیا تھی؟

لیکن بنیادی اختراعی تبدیلیوں اور ایجادات کے فقدان کے باوجود ہندوستان اور وادی سندھ کلیتاً پسماندہ بھی نہیں تھے۔

پارچہ بافی اور جہازوں کے لنگر

متعدد ایسے شعبے اور میدان تھے جن میں وادی سندھ اور ہندوستان کو برتری حاصل تھی اور انہوں نے اپنا قدیم اعزاز برقرار رکھا تھا۔ صنعت اور دستکاریوں میں ہندوستان پیش رفت سے مکمل طور پر عاری نہیں رہا تھا۔ صنعتی اور تجارتی ترقی کے نتیجے میں ساحلی علاقے خوشحال ہوئے تھے اور وسطی جنوبی میدانوں نے اس میں بھرپور کردار ادا کیا تھا۔

چودہویں صدی کے مشہور عرب سیاح ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں ہندوستان کے شہر اور شہریوں کی خوشحالی کا ذکر کرتے ہوئے دہلی کو دنیا کے عظیم ترین شہروں میں سے ایک قرار دیا تھا حالانکہ اس نے مغرب میں قاہرہ اور قسطنطنیہ، مشرق بعید میں چین اور وسطی ایشیا کے بہت سے بڑے بڑے شہر بھی دیکھ رکھے تھے۔ جواہر لال نہرو نے لکھا ہے کہ بہت پہلے سلاطین دہلی کے دور میں محمد تغلق نے کپڑے کا ایک کارخانہ قائم کیا تھا جہاں سوتی کپڑا بنایا جاتا تھا اور جس کے کارکنوں کی تعداد پانچ ہزار سے تجاوز کرتی تھی۔ احمد آباد ریشم اور مخمل کے لئے مشہور تھا۔

ریشم اور ململ بنانے میں بنگال کے شہر ڈھاکہ اور مرشد آباد کا ثانی کوئی نہیں تھا۔ لارڈ کلائیو کے نزدیک مرشد آباد بھی لندن کی طرح وسیع، گنجان آباد اور متمول شہر تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ مرشد آباد میں ایسے لوگ تھے جن کی دولت اور جائیداد کا اندازہ لگانا بھی مشکل تھا جبکہ لندن کے کسی شہری کے پاس اس دولت کا عشر عشیر بھی نہیں تھا۔ ہندوستان میں کپڑے کے علاوہ اس کی ملحقہ صنعتیں بھی اس قدر ترقی یافتہ تھیں کہ لنکا شائر جیسے جدید اور عظیم صنعتی مرکز کو کپڑے کی درآمد اور برآمد میں دہرے تحفظات کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ہندوستان سے کپڑا انگلستان بھیجنے پر پابندی لگا دی گئی اور انگلستان سے ہندوستان کپڑا برآمد کرنے پر سہولتیں دی گئیں۔

وادی سندھ اور ہندوستان میں طویل عرصے سے دھاتوں کی ڈھلائی کا کام جاری تھا اور دھاتی مصنوعات برآمد بھی کی جاتی تھیں۔ چوتھی صدی عیسوی کی ایرانی فوج کی تلواروں سے لے کر اورنگ زیب کے زمانے میں برآمد کی غرض سے ملتان میں تیار کئے جانے والے جہازی لنگروں تک، وادی سندھ اور ہندوستان کی مصنوعات چین، وسطی ایشیا، ایران اور مشرق وسطیٰ کو برآمد کی جاتی تھیں۔ بنگال

نے جہاز سازی میں بہت ترقی کی تھی نپولین کے خلاف بحری جنگوں میں ایک انگریز ایڈمرل کا جہاز ہندوستان میں تیار کیا گیا تھا۔ ایک شعبہ پرزے جوڑ کر مشینیں تیار کرنے کا بھی تھا' بعد میں برطانیہ کی طرف سے جس کی سخت حوصلہ شکنی ہوئی اور انیسویں صدی میں تو ایسی مشینوں کی درآمد پر پابندی لگا دی گئی۔

سرمائے کے حصول کے لئے کارپوریشنوں کا قیام اگرچہ سرمایہ دارانہ نظام میں ایک ناگزیر ضرورت بن چکا تھا لیکن وادی سندھ اور ہندوستان کے لوگ ابھی تک اس سے ناآشنا تھے۔ یہاں تو مالی ساکھ کی معیشت کا نظام رائج تھا اور جسے اگر بینکاری کہا جا سکے تو وہ ہنڈی کی صورت میں وسیع پیمانے پر جاری تھی۔ ہنڈی دراصل "بل آف ایکسچینج" Bill of Exchange کا نعم البدل تھی اور اس کے موثر ہونے کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کے مغربی ساحلوں پر اچھی ساکھ رکھنے والے تجارتی اداروں کی ہنڈی کو تبریز' ہرات اور کابل جیسے دور دراز شہروں میں بھنایا جا سکتا تھا۔ باری علیگ کی تحقیق ہمیں بتاتی ہے کہ اورنگ زیب کے زمانے میں سورت اور احمد آباد سے برآمدات پر محصول کی مد میں حکومت کو بالترتیب تیرہ لاکھ اور ایک کروڑ تیرہ لاکھ روپے کی خطیر رقم حاصل ہوتی تھی۔ لیکن یہ دعویٰ کرتے ہوئے باری یقیناً جذبات کی رو میں بہہ گیا ہے کہ انیسویں صدی تک ہندوستان باقاعدہ ایک صنعتی ملک تھا' دنیا بھر سے جس کے تجارتی روابط تھے۔ اس کے نزدیک قبل از صنعتی دور کی معیشت اتنی ترقی یافتہ ہو چکی تھی کہ ہندوستان عالمی سرمایہ دارانہ نظام کا حصہ بننے کے لئے پر تول رہا تھا اور نہرو سمیت دور جدید کے کئی اور تجزیہ نگار بھی اس پر متفق ہیں۔

یورپ میں بورژوازی انقلابات

لیکن یہ تجزیہ نگار ایک اہم پہلو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ ان کی یہ رائے کہ ہندوستان ایک انتہائی ترقی یافتہ قبل از صنعتی معیشت تھا' خود اپنی جگہ اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ یہ ایک صنعتی ملک نہیں تھا۔ نہ ہی یہاں کسی ایسے طبقے کا وجود تھا جسے مقامی بورژوا کہا جا سکتا۔ یہ درست ہے کہ مغل دور میں ستنامیوں کی بغاوت ابھری تھی اور ایک ہم عصر نے اسے سنار' بڑھئی' چمڑا رنگنے والوں اور خاکروبوں جیسے کمی کمینوں کے وحشی ٹولے سے تعبیر کیا تھا لیکن اپنی ماہیت کے اعتبار سے ان کا شمار کسی طور بھی ابتدائی دور کے بورژوازیوں میں نہیں کیا جا سکتا۔ نہ ہی وہ صنعتی پرولتاریہ تھے۔

ہندوستان میں ایسا کوئی طبقہ وجود نہیں رکھتا تھا جسے لوتھر سے قبل یا بعد کے یورپ کے کسی ایسے طبقے سے تشبیہ دی جا سکے جو سیاسی قوت بن کر پہلے تو 17 ویں صدی کے انگلستان میں مزدور ابھار اور پھر

18ویں صدی کے انقلاب فرانس کا باعث بنا۔ باری اور نہرو جس تجزیئے پر متفق ہیں کہ جب برطانوی سامراج نے ہندوستان کو اپنا محکوم بنایا تو ہندوستان اس وقت زرعی پیداواری روابط سے صنعتی پیداواری عمل میں داخل ہونے کے فیصلہ کن مرحلے میں تھا لیکن تاریخی حقائق اس نظریئے کے حق میں کوئی ٹھوس شواہد فراہم نہیں کرتے۔ یہاں کسی مقامی بورژوا طبقے کی نمود ہی نہیں ہوئی جو نئے سیاسی تناظر میں اپنے لئے اختیارات کے حصول یا ان کی تقسیم کا مطالبہ کرتا۔ جب یورپ میں بورژوازی کا جنم ہوا تو اس کے بڑے واضح آثار و قرائن تھے۔ ہندوستان میں ایسی کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی۔

ہندوستان اور وادی سندھ کا المیہ ہی یہ ہے کہ جب فاضل پیداوار کے حصول سے اشیائے صرف کی طلب میں کچھ اضافہ ہوا تو بھی دیہی ہندوستان کی حالت میں بہتری کے آثار پیدا نہیں ہوئے۔ دیہی معاشرے پر بدستور جمود طاری رہا اور بالائے ستم یہ کہ ذات پات کی تقسیم سے ابھرنے والے افرادی قوت کے نظام نے معاشرے کو گھن کی طرح چاٹ کر اندر سے اتنا کھوکھلا کر دیا تھا کہ وہ گنٹھیے کے مریض کی طرح اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل نہیں رہ گیا تھا۔

ذات پات کا ناسور

ازمنہ قدیم کے تناظر میں ہندوستان کا نظام اپنی طبقاتی تقسیم کے حوالے سے اچھوتا نہیں تھا۔ دنیا بھر میں قدیم غلام داری سماج اسی طرح کی طبقاتی تقسیم سے عبارت تھا۔ مصر کی تاریخ اور دیومالائی داستانیں غلاموں کی ناگفتہ بہ حالت اور فراعین کے خلاف ان کی بغاوتوں کے تذکروں سے بھری پڑی ہیں۔ اہرام مصر جیسی عظیم الشان یادگاروں کی تعمیر حکمران طبقوں کی طرف سے دولت کے بے دریغ استعمال اور اپنی شان و شوکت کے اظہار کے لئے غلاموں پر وحشیانہ ظلم کی نشانیاں ہی تو ہیں۔

یونانی اکابرین حکومت اپنے ''جمہوری'' عروج میں غلاموں کی مشقت سے حاصل ہونے والی فاضل پیداوار کے بل بوتے پر شاہانہ ٹھاٹ سے زندگی گزار رہے تھے حتیٰ کہ یونان کی ''جمہوری ریاستوں'' میں بھی غلام محض ایک اثاثہ تھا' عام استعمال کی ایک معمولی سی شے جس کی خرید و فروخت ہو سکتی تھی۔ اس کی حیثیت مال مویشی سے زیادہ نہیں تھی بلکہ رہن سہن اور راحت و آرام کے حوالے سے بعض اوقات جانوروں سے بھی بدتر۔ یونان اور روم کے باشندوں کی اکثریت حق شہریت سے محروم تھی اور نظام سلطنت میں اس آبادی کا کیا عمل دخل ہو سکتا تھا؟ یہ وہ اکثریتی آبادی تھی جس کے افراد کو خریدا اور بیچا جا سکتا تھا' ان پر کوڑے برسائے جا سکتے تھے یہاں تک کہ بلاخوف تعزیر انہیں قتل بھی کیا جا سکتا تھا۔

روم کے سینیٹ اور ایتھنز کی جمہوری چکا چوند کے پیچھے انتہائی ظالمانہ طبقاتی سماج کا اژدہا پل رہا تھا۔ نہ صرف شہریوں کے درمیان آپس میں بلکہ شہری اور غیر شہری کے درمیان بھی طبقاتی تقسیم کی واضح حدود متعین تھیں۔ راہب ' سیاستدان' حکمران ' سپاہی اور جنگجو ' تاجر اور سوداگر یہ سب شہری تھے اور اس زمرہ بندی سے نیچے سب کے سب غلام جن کی حیثیت قدیم اور قرون وسطی کے ہندوستان کے شودروں اور اچھوتوں جیسی تھی۔ اسی اکثریت کی جبری محنت سے ان جمہوریتوں اور جمہوریاؤں کی سطوت کے انمٹ نقوش کی یادگاریں قائم کی گئیں۔

روم اور یونان میں انسانی آبادی کی درجہ بندی جسے دوسرے لفظوں میں ذات پات کا ابتدائی یورپی نظام کہا جاسکتا ہے ' صدیاں گزرنے کے ساتھ بتدریج تبدیل ہوتا ہوا جاگیردارانہ طبقاتی سماج کی شکل میں سامنے آیا اور اپنے پیشرو نظام کی طرح اس نظام کی بنیاد بھی طبقات کی سخت گیر اور غیر منصفانہ تقسیم پر رکھی گئی تھی۔

افلاطون سے روسو تک دو ہزار سال پر محیط اس طویل عرصے میں یورپ نے عظیم اور دوررس تبدیلیوں کے بہت سے ادوار دیکھے۔ غلام داری سماج ' جاگیردارانہ نظام میں بدلا۔ پاپائیت کی آفاقی ریاست کا تسلط قائم ہوا جسے عالمی سرمایہ دارانہ نظام نے شکست سے دوچار کر کے یورپ کو ہم خیال قومی ریاستوں میں تقسیم کر دیا۔

اس تمام عرصے کے دوران وادی سندھ اور ہندوستان مکمل طور پر غیر متغیر اور جمود کا شکار تھے۔ اگرچہ ان کے نظام کی کارکردگی مسلسل زوال کا شکار تھی لیکن وہ پھر بھی دیہات اور ذات پات کے اس نظام سے چمٹے رہے۔ اس دوران قصباتی سطح پر گلڈ مصروف عمل تھیں۔ عوام کی اکثریت ویدانیت کے روحانی عقیدے سے وابستہ رہی۔ اسی عقیدے کے پیروکار بعد میں ہندو کہلائے۔ زراعت اور جاگیرداری کا آغاز ہوا تو اس مذہب کو متعدد کم اہمیت کے حامل دیوی دیوتاؤں سے نجات ملی اور اس میں وحدانیت کا عنصر شامل ہوا۔ ہر علاقے کا اپنا الگ دیوتا تھا۔ خانہ بدوش گلہ بان آریائی جب مستقل زرعی بستیاں آباد کرنے لگے تو قبیلے کی جگہ خاندان نے لی خاص طور پر لوہے کی دریافت کے بعد تو قبائلی نظام تیزی سے انحطاط کا شکار ہوا اور خاندان کے تصور کو فروغ ملا لیکن اس دوران ذات پات کے سفاک نظام نے غلام داری سے لے کر جاگیرداری ' قبیلے سے لے کر خاندان اور سردار سے لے کر تاجر تک بدستور اپنی بالادستی قائم رکھی اور یہ معاشرے کے لئے مسلسل سوہان روح بنا رہا۔

یورپی طبقاتی نظاموں کے مقابلے میں برصغیر میں ذات پات کا نظام تنزل کا شکار ہو کر بھی' معاشرتی ترقی کی راہ میں مستقل اور زیادہ بڑی رکاوٹ ثابت ہوا۔ بے لچک ہونے کے باوجود اس کا اثر و رسوخ قائم

رہا۔ ذات سے باہر شادی کی ممانعت اور اپنی ذات میں ہی شادی کی جبری پابندی کاروباری سرگرمیوں' نت نئے خیالات و تصورات کے فروغ' ایجادات اور پہل کاری کی راہ میں فطری رکاوٹ کا باعث بنی۔

اگرچہ نہرو جیسے روشن خیال لوگوں سمیت ذات پات کے نظام کے بہت سے عذر خواہ سامنے آئے لیکن ان میں سے کوئی بھی اس سوال کا تسلی بخش جواب نہیں دے پایا کہ یہ سلسلہ دور جدید تک جاری رہنے کا جواز کیا تھا؟

اس کی ایک اہم وجہ غالباً یہ ہو سکتی ہے کہ دیہی ہندوستان میں کبھی حقیقی معنوں میں یورپی انداز کا جاگیرداری نظام قائم نہیں ہوا۔ یورپی نظام میں جاگیر موروثی ہوتی تھی اور جاگیردار کا تسلط اور اقتدار براہ راست مزارع پر ہوتا تھا۔ جاگیردار اور مزارع کے تعلق میں بادشاہ یا گاؤں والوں کا عمل دخل ثانوی حیثیت رکھتا تھا اور اسی لئے طبقاتی کشمکش میں شدت بھی زیادہ تھی۔

برصغیر میں جاگیرداری نظام کی شکل مختلف تھی۔ یہاں دیہات خود مختار تھے اور زیادہ تر زمین مشترکہ ملکیت میں ہوتی تھی۔ دیہی پنچائیت زمین پر کاشت کے سلسلے میں ہدایات جاری کرتی تھی اور اس کی منتظم بھی وہی تھی بظاہر تو یہ نظام جمہوری نوعیت کا تھا مگر دیہی سطح پر خود مختاری بڑھتی ہوئی تجارت اور آمدورفت کے راستے میں حائل ہونا شروع ہو گئی جس کے نتیجے میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ توانائی سے بھرپور اور زندگی سے سرشار گاؤں' جس نے نسل در نسل اپنی فاضل پیداوار سے فوجوں کی کفالت کی تھی' قرون وسطیٰ کے اختتام پر وہی گاؤں بے عملی اور خوابیدگی کا شکار ہو چکا تھا۔ اس کی خود مختاری اور خود کفالت نہ صرف تجارت اور بیوپار کی راہ میں حائل تھی بلکہ تاجر اور گلڈ کو نقصان پہنچانے کا باعث بن رہی تھی۔

چھٹی صدی عیسوی کے بعد جاگیرداری نظام کو فروغ ملا تو تنخواہ دار مرکزی افسر شاہی کی ضرورت بھی ختم ہو گئی لیکن لگان اور فاضل پیداوار کی وصولی کے لئے گاؤں اور ذات پات کے نظام پر انحصار جاری رہا۔ جاگیردار کی موجودگی میں گاؤں کی مجلس کی حیثیت ختم ہو گئی۔ کسان سے حاصل ہونے والی فاضل پیداوار تباہ کن باہمی لڑائیوں اور راجوں مہاراجوں کی بے جا نمود و نمائش پر صرف ہونے لگی۔ ذات پات کا نظام اس طرح زندگی کا جزو لاینفک بن چکا تھا کہ تھیلی مہاجن بھی جانتا تھا کہ برہمن کو دیئے گئے قرض پر صرف دو فیصد سود وصول کرتا ہے جب کہ اسی رقم پر شودر سے کئی گنا زیادہ سود جبراً وصول کیا جا سکتا ہے۔

ذات پات کے نظام نے گاؤں کی ہئیت اجتماعی کے اشتراک سے اس انقلابی لہر کو نمودار ہونے سے روکا جو سماجی نظام میں بتدریج لیکن یقینی تبدیلی کی ضامن بن سکتی تھی۔ دو ہزار سال تک پیداواری روابط

اسی مخصوص جمود کا شکار رہے جسے ''انڈین یا ایشیائی طرز پیداوار'' کہا جاتا ہے۔

یہاں موج در موج حملہ آور بھی آئے اور حکمرانوں کے بہت سے سلسلہ ہائے نسب بھی اقتدار اعلیٰ پر قابض ہوئے۔ انہوں نے ظلم و تشدد کیا' مال و متاع غصب کیا اور ختم ہو گئے لیکن برصغیر کا گاؤں غالباً ذات پات کے تحفظ کے باعث جوں کا توں رہا۔ ایک متلاطم اور ہر دم تبدیلیوں کی زد میں رہنے والی دنیا میں گاؤں نے ترقی کے بجائے تحفظ کو ترجیح دی اور ہندوستان کو اس انتخاب کی بھاری قیمت چکانا پڑی۔

ذات پات کا نظام جو سرطان کی شکل اختیار کر چکا تھا اس نے برصغیر کے سماج کی بنیادیں کھوکھلی کر دی تھیں۔ یہ ظالمانہ نظام فطری صلاحیتوں کی برجستگی اور عمل کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ یہ نظام بتدریج جسم کے جوڑوں کا وہ مرض بن گیا تھا جس نے ہر جوڑ کو' جہاں لچک اور حرکت کی ضرورت ہوتی ہے' اپنی موذی گرفت میں لے کر بے جان کر دیا تھا۔ ہندوستان کے گاؤں کی ترقی پسندی اور اس کے جمہوری مزاج اور اس کی زندگی بخش توانائی کو ذات پات کا روگ چاٹ گیا تھا۔ جب برطانیہ نے اس کے جسد خاکی پر قدم رکھا تو ہندوستان محض ایک جسم تھا جس کی روح پرواز کر چکی تھی اس کے علاوہ اور بہت سے عوامل بھی تھے جو وادی سندھ اور ہندوستان میں بورژوازی کے فروغ میں سدراہ ثابت ہوئے۔

مغلوں کا طرز حکومت بھی ان عوامل میں سے ایک تھا۔

18

بے چین تاج اور تخت طاؤس

شاہی استحقاق

مغل شہنشاہ کا دربار' بر صغیر میں اقتدار کا منبع اور اختیارات کا مرکز تھا۔ مغلوں کے پورے عہد اقتدار میں ان کا تنظیمی ڈھانچہ اور انداز کار غیر متغیر' مائل بہ مرکز اور جاگیر دارانہ رہا۔ اور اس کی شہادت باری علیگ کی تحقیق کا وہ حصہ ہے جہاں اس نے اورنگ زیب دور کے روزنامچوں سے اقتباسات پیش کئے ہیں۔ ان میں کہیں بھی' اپنی ابتدائی اور انتہائی غیر ترقی یافتہ شکل میں بھی پارلیمان کی طرز پہ کسی قسم کی مجلس کی تشکیل کا شائبہ تک نہیں ملتا۔ شہنشاہ کے دربار عام میں عوامیت بس نام کی تھی اس کا عوام سے براہ راست کوئی تعلق نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ایک ایسا اجتماع تھا جہاں چند خاص لوگ رسمی طور پر اپنی درخواستیں پیش کر سکتے تھے۔ داخلہ محدود تھا' بحث کی گنجائش نہیں تھی اور شہنشاہ درخواست گزار کی بات سننے کا پابند نہیں تھا۔ یہ ایک غیر معمولی عنایت- اور مکمل طور پر شہنشاہ کا صوابدیدی اختیار تھا۔ اپنے صوبیداروں' جرنیلوں سے لے کر چالیس گھڑ سواروں کے معمولی سالار تک کا انتخاب بھی شہنشاہ خود کرتا تھا۔ مغل دربار کے ان حوالوں میں ایک جگہ شہنشاہ ہمیں محض چار گھوڑوں کی چوری کی تحقیقات کا حکم دیتا ہوا بھی نظر آتا ہے اور سڑکوں' عمارتوں' کیمپوں' کھیلوں اور باغات کے بارے میں تو احکامات براہ راست وہی جاری کرتا تھا۔

مغلوں کے زیر سایہ کسی آزاد عدلیہ کا وجود نہیں تھا' بادشاہ کسی رسمی طریق کار کو اپنائے بغیر مقدمات کو خود اپنی عدالت میں منتقل کر کے من مانے فیصلے دینے پر قادر تھا۔ مثلاً تین مئی 1730ء کے

روزنامچے کے تحت شہنشاہ محمد شاہ نے محصول چنگی کے ایک معمولی تنازعے میں دکن کے صوبیدار کو حکم دیا کہ وہ اپنی سفارشات مہر مند لفافے میں براہ راست شہنشاہ کو ارسال کرے۔

شہنشاہ کے اختیارات کی حدود بھی متعین نہیں تھیں۔ جس کے باعث اس پر کام کا بہت بوجھ تھا۔ اگرچہ بعض اوقات بادشاہ کی خواہش ہوتی تھی کہ انصاف مہیا کیا جا سکے لیکن تمام مقدمات اور تنازعات کو بھگتانا اس کے لئے ممکن نہیں ہوتا تھا۔ 3 اپریل 1696ء کے شاہی فرمان کے ذریعے 25 دیوانی مقدمات بادشاہ کی عدالت میں منتقل کئے گئے لیکن ان میں سے صرف 12 مقدمات کا فیصلہ سنایا جا سکا اور وہ بھی بہت تاخیر کے ساتھ۔

دوسری طرف برطانیہ میں پارلیمنٹ اور عدالتوں کے بتدریج ارتقاء کے باعث بادشاہ کے صوابدیدی اختیارات پر پابندیاں عائد کرنے کا عمل بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔ جب برصغیر میں اکبر اور جہانگیر کا دور تھا اس وقت ان کے ہم عصر برطانیہ کے کسی بادشاہ کو مغل فرمانرواؤں جیسے مطلق صوابدیدی اختیارات حاصل نہیں تھے۔

برطانوی پارلیمنٹ، جس نے بادشاہ کے استحقاق اور صوابدیدی اختیارات کو محدود کیا، اس کی بنیاد کئی صدیاں پہلے قرون وسطیٰ میں رکھی جا چکی تھی۔ سن 1215ء میں بادشاہ جان نے یہ اصول تسلیم کر لیا تھا کہ "نمائندگی کے بغیر کوئی ٹیکس نہیں لیا جائے گا" اور برطانوی اشرافیہ کے ساتھ معاہدے کے تحت اسے میگنا کارٹا Magna Carta، میں بھی شامل کر لیا گیا تھا۔ 1215ء کے بعد سے ٹیکس لگانے کا اختیار صرف ایک نمائندہ ادارے کو حاصل ہو گیا۔ (ہمارے ہاں تو یہ اختیار شائد آج بھی منتخب نمائندوں کو حاصل نہیں ہو سکا اور غیر نمائندہ افسر شاہی آج بھی ٹیکس تجویز کرتی ہے۔ (کلچر اور سیاست کا فرق ملاحظہ فرمایئے) سولہویں صدی میں انگلستان کے ٹیوڈر حکمرانوں کے عہد تک تو یہ حقیقت کم و بیش تسلیم کی جا چکی تھی کہ "حکومت بادشاہ کی ہو گی لیکن ٹیکس پارلیمنٹ عائد کرے گی" لٰہذا سر پر حق حکمرانی کا مسئلہ عدالت میں آیا تو بادشاہ کی ذاتی اور سیاسی حیثیت کے مابین حد فاصل کا تعین کیا جانے لگا۔ اپنی ذاتی حیثیت میں تو بادشاہ کلی اختیارات کا مالک تھا جب کہ سیاسی حیثیت میں اس پہلے اختیار نفی ہوتی تھی۔ اور یوں بادشاہ کی پہلی اور صوابدیدی حیثیت کا دائرہ سکڑنے لگا۔

سٹوارٹ خاندان نے اگلی صدی میں ان سکڑتے ہوئے صوابدیدی اختیارات کو وسعت دینے کی کوشش کی مگر انہیں اپنے شاہی اختیارات کی مدافعت میں شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ بادشاہ کی ذاتی اور سیاسی حیثیتوں کے درمیان ایک واضح فرق تلاش کر لیا گیا۔ اب ذاتی اختیارات صرف وراثتاً مطلق تھے لیکن سیاسی حیثیت میں یہ اختیارات معمول کے مطابق تھے، اس طرح بادشاہ کے اول الذکر

اختیارات کے دائرہ کار اور تنوع کو دائمی طور پر محدود کر دیا گیا۔

پھر ایسا ہوا کہ بیٹ Bate نامی ایک تاجر نے کشمش کی درآمد پر محصول دینے سے انکار کر دیا۔ بادشاہ جیمز اول نے یہ محصول اپنے استحقاقی اختیارات کے تحت عائد کیا تھا۔ بیٹ نے اس کے خلاف خزانہ عامرہ کی عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا۔ فیصلہ بادشاہ کے حق میں ہوا لیکن 1606ء میں دیئے گئے اس فیصلے میں عدالت نے قرار دیا کہ اس (مخصوص) مقدمے میں بادشاہ کا اختیار صرف اس لئے 'مطلق' ہے کہ یہ معاملہ خارجہ تعلقات کے زمرے میں آتا ہے گویا اس حقیقت کو تسلیم کر لیا گیا تھا کہ داخلی معاملات میں بادشاہ کے اختیارات 'کلی' نہیں تھے۔

چار سال بعد ' یہ 1610ء کی بات ہے جب ''فرمان شاہی'' کے مقدمے میں دو چیف جسٹس صاحبان ' چیف بیرن Chief Baron اور بیرن ایلتھم Baron Althum نے پریوی کونسل کے لارڈز کی مشاورت سے طے کر دیا کہ بادشاہ اپنے کسی فرمان کے ذریعے کسی ایسے عمل کو جرم قرار نہیں دے سکتا جو اس سے پہلے جرم کے زمرے میں نہ آتا ہو کیونکہ اس طرح اپنے فرمان کے ذریعے وہ ملک کا قانون تبدیل کر رہا ہوتا ہے اور یہ کہ بادشاہ کو اس سے زیادہ کوئی اختیار نہیں جتنا کہ ملک کا قانون اسے اجازت دیتا ہے ' اس طرح بادشاہ کی ذات اور سیاست قانون کے تحت آ گئے۔ (اس وقت برصغیر پر مغلوں کی مطلق العنانی اپنی تمام تر شدت اور جبر کے ساتھ قائم تھی)

بہر حال سٹووارٹ بادشاہ مسلسل تصادم کے راستے پر گامزن رہے حتیٰ کہ 1640ء کی خانہ جنگی اور 1688ء کے ''شاندار انقلاب'' نے ہمیشہ کے لئے بادشاہ کے استحقاقی اور صوابدیدی اختیارات کی حدود کا تعین کر دیا۔ 1703ء میں پالیمان نے برطانیہ میں حق رائے دہی کو بنیادی حق کے طور پر تسلیم کر لیا اور 1708ء میں پارلیمان ہی نے ایک اور ایکٹ کے ذریعے ہمیشہ کے لئے طے کر دیا کہ آئندہ صرف شہزادی صوفیہ کی اولاد اور اس کے وارث ہی تاج شاہی کے حقدار ہوں گے۔ اس طرح پرامن انتقال اقتدار کی مسلمہ روایت جس کا سلسلہ صرف 1640ء کی خانہ جنگی میں ٹوٹا تھا ' اب ہمیشہ کے لئے ایک مستقل اور باقاعدہ شکل اختیار کر گیا۔

یہ کم و بیش وہی زمانہ تھا جب ادھر برصغیر میں اورنگ زیب کے وارث اپنے بوڑھے بادشاہ کی متوقع موت کے پیش نظر ایک دوسرے پر جھپٹنے ' ایک دوسرے کو قید کرنے ' اندھا کرنے یا قتل کرنے کے لئے پر تول رہے تھے۔

یورپ میں نظام عدل کا ارتقاء ' اس کے دائرہ اختیار و عمل کا تعین اور بادشاہ کے انتظامی اختیارات سے عدلیہ کی آزادی کا تصور بھی انہی اقدامات کے سلسلے کی مختلف کڑیاں تھیں جن سے پارلیمان کی

اہمیت اور عزت و وقار میں اضافہ ہوا تھا۔ عدالتی فیصلوں کو آئندہ مقدمات میں ایک نظیر کے طور پر قبول کرنے کی روایت بتدریج فروغ پا رہی تھی جس نے قانون کی عملداری کو استقامت اور تسلسل عطا کیا تھا۔

قانون کی توجیہہ کا ذمہ دار کون تھا' بادشاہ یا عدلیہ؟ دہلی کے سلاطین اور مغل کبھی کبھار اپنے فیصلوں پر عملدر آمد روک دیتے تھے لیکن ایسا بہت کم ہوتا تھا۔ وہ ہمیشہ اس نظریئے پر قائم رہے کہ بادشاہ کبھی غلطی نہیں کرتا۔ دوسرے لفظوں میں بادشاہ اپنے کسی عمل پر نہ تو قابل مواخذہ تھا اور نہ ہی کسی عدالت کے سامنے جواب دہ۔ غلط کیا ہے اور درست کیا' اس کا فیصلہ کرنا صرف بادشاہ کے اختیار میں تھا۔ گویا بادشاہ خود ہی اپنی اہلیت اور اپنے اختیارات کا منصف بھی تھا۔

احکامات شریعت کے سوا' جن پر شاذ ہی کبھی عمل ہوا تھا' کوئی دستاویز یا کوئی معاہدہ سلاطین دہلی یا مغل بادشاہوں کی مطلق العنانی کو اس طرح پابند نہیں کر سکتا تھا جیسا کہ میگنا کارٹا کے تحت 1215 عیسوی میں شاہان برطانیہ کر دیئے گئے تھے۔

> ''نہ تو کسی آزاد شہری کو گرفتار یا قید کیا جائے گا اور نہ ہی اسے زمین یا جائیداد سے محروم کیا جائے گا۔ نہ تو اسے مجرم قرار دیا جائے گا اور نہ ہی اسے جلاوطن یا کسی اور طریقے سے ہراساں کیا جائے گا۔ نہ تو (بادشاہ) کوئی حکم جاری کر سکے گا اور نہ ہی اسے کسی (شہری) پر لاگو کر سکے گا۔ جب تک کہ اسے مجاز حکام کے قانونی فیصلوں یا ملکی قانون کا تحفظ حاصل ہو۔''

اگرچہ عدلیہ کی آزادی اور اس کا اختیار ٹیوڈر دور میں کورٹ آف سٹار چیمبر کے باعث کم ہوا تھا لیکن سٹوورٹ عہد کے دوران چیف جسٹس کوک Coke کی سربراہی میں عدالتوں نے اپنی آزادی اور اپنے اختیارات کو بالاصرار منوانے کا آغاز کر دیا تھا۔ انہوں نے ''تاجر بیٹ اور شاہی فرمان'' کے مقدمات میں بادشاہ کے استحقاق کو محدود کر دیا تھا۔ 1627 عیسوی میں عدالت نے پانچ امراء کو رہا کر دیا جنہیں بادشاہ کے 'خاص حکم' کے تحت لندن کی فلیٹ Fleet جیل میں قید رکھا گیا تھا کیونکہ انہوں نے بادشاہ کی سرکاری مہر سے جاری ہونے والے اس حکم نامے پر عملدر آمد سے انکار کر دیا تھا جس میں ان سے جبری قرضے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

عدالت کا یہ فیصلہ ثابت کرتا ہے کہ 1627ء تک انگلستان میں حبس بیجا کے خلاف رٹ کا قانون اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نافذ ہو چکا تھا اور شہنشاہ کے اپنے خصوصی قیدیوں کو بھی عدالتی حکم سے رہائی مل سکتی تھی اور یہ بھی کہ بادشاہ ایسے عدالتی احکامات کے سامنے بے بس ہو چکا تھا۔'' قانون کی نظر

میں کیا غلط ہے اور کیا صحیح'' اس فیصلے کا اختیار اب بادشاہ کے بجائے عدالتوں کے پاس تھا۔
برصغیر میں ابھی تک ایسی کوئی پیش رفت نہیں ہوئی تھی۔ یہاں اس زمانے میں جہانگیر کی علالت کے باعث شاہزادے آپس میں برسرپیکار ہونے کی تیاری کر رہے تھے اور شاہجہان کے عہد کا آغاز ہونے والا تھا۔ ایک مطلق العنان باپ کے تخت پر ایک اتنا ہی مقتدر بیٹا براجمان ہونے کو تھا جسے نہ صرف تاج محل جیسے بیش قیمت منصوبوں کے لئے ٹیکس وصول کرنے اور ہزاروں یا لاکھوں مزدوروں سے بیگار لینے کا مکمل اختیار حاصل تھا بلکہ بھائیوں کو قتل کرنے کے بعد کسی دنیاوی عدالت کے سامنے جوابدہی سے استثنیٰ کی سہولت بھی حاصل تھی۔ اس وقت انگلستان کا کوئی بادشاہ ایسی مطلق العنانی کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ بادشاہوں کے اختیارات بتدریج پارلیمان اور عدلیہ کو منتقل ہو رہے تھے۔

جانشینی کا تذبذب

یورپ اور بالخصوص انگلستان میں 17ویں اور 18ویں صدی عیسوی کے دوران تاجروں اور صنعتکاروں پر مشتمل ایک ایسا بورژوازی طبقہ وجود میں آچکا تھا جس کا معاشی مفاد واضح طور پر مستحکم حکومت، پرامن انتقال اقتدار اور حکومت کے بورژوائی اداروں مثلاً پارلیمان اور آزاد عدلیہ کے تسلسل سے وابستہ تھا۔ برصغیر میں ایسے کسی طبقے کا وجود میں نہ آنا ہمیں خاصا مہنگا پڑا۔ پارلیمنٹ اور آزاد عدلیہ جیسے استحکام بخش اداروں کی عدم موجودگی کے باعث مغل دور کے عروج میں بھی وادی سندھ اور ہندوستان وراثت کی جنگوں اور باہمی تنازعات کے نتیجے میں مسلسل افراتفری کا شکار رہے۔
اکثر یورپی ریاستوں کے برعکس یہاں انتقال اقتدار غیر یقینی تھا۔ جونہی کوئی بادشاہ یا شہنشاہ قریب المرگ ہوتا، ہر شہزادہ اپنے بھائیوں کو جانی دشمن سمجھنے لگتا۔ ہر ایک کا تخت پر اتنا ہی حق ہوتا تھا جتنا کہ اس کے بھائیوں کا، کیونکہ مغلوں میں جانشینی کا کوئی قانون موجود نہیں تھا، بعض اوقات تو شہنشاہ کی فعال حکمرانی کے دوران ہی بغاوتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ جانشین کو ہمیشہ تصادم بلکہ الٹے کا سامنا کرنا پڑا۔
اتفاق بابر نے ہندوستان پر صرف چار سال حکومت کی تھی کہ اسے موت نے آن لیا۔ بیٹا ہمایوں جانشین ہوا لیکن شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر، پندرہ سال تک مارا مارا پھرنے کے بعد کہیں جا کر دوبارہ اسے تخت نصیب ہوا۔
شہنشاہ بابر کی موت کے چند ہی دنوں بعد 1530 عیسوی کے موسم سرما میں اس کے بیٹوں میں سے ایک مرزا کامران جس کے پاس کابل اور قندھار کی صوبیداری تھی، دہلی کے تخت پر قبضے کے لئے

نکل کھڑا ہوا اور ہندوستان کے نئے حکمران ہمایوں کے سنبھلنے سے پہلے ہی لاہور پر قابض ہو گیا۔ ہمایوں نے اس خودسری کو شفقت سے درگزر کرتے ہوئے شہر پہ چھوٹے بھائی کے قبضے کی توثیق کر دی۔ دس سال بعد جب شیر شاہ سوری نے ہمایوں سے سلطنت چھین لی تو وہ پناہ لینے کے لئے اپنے خاندان سمیت لاہور پہنچا یہاں ہمایوں نے اپنے مصاحبین کو مرزا کامران کے تعمیر کردہ باغ میں (جس کے آثار آج بھی لاہور سے باہر دریائے راوی میں ایک چھوٹے سے جزیرے کی صورت میں باقی ہیں اور جسے کامران کی بارہ دری کہا جاتا ہے) جمع کیا اور شہر کے سات سے ستر سال کے تمام اہم شہریوں کو وہاں حاضر کرنے کی ہدایات جاری کیں لیکن ہمایوں تو کیا کسی کو بھی اس امر پر حیرت نہیں ہوئی جب انہیں پتہ چلا کہ مرزا کامران نے شیر شاہ سے خفیہ معاہدہ کر کے پنجاب اپنے بھائی کے دشمن کے حوالے کر دیا تھا۔

اکبر اعظم، معزول ہمایوں کے ہاں امر کوٹ میں پیدا ہوا اور تیرہ سال کی عمر میں گورداسپور کے مقام پر اس کی تخت نشینی ہوئی لیکن اس کم سنی میں اسے جنگ لڑنا پڑی۔ پانی پت کے میدان میں ایک خونریز جنگ کے بعد وہ دہلی کے تخت پر قابض ہو سکا۔ سلطنت مستحکم ہوئی تو اس کا بیٹا سلیم، جو بعد میں شہنشاہ جہانگیر ہوا، اپنے باپ کے مقابلے پر آن کھڑا ہوا۔ کشت و خون ہوا اور بہت سی انسانی جانیں ضائع ہو جانے کے بعد باپ بیٹے میں مفاہمت ہو گئی۔

جہانگیر کو بھی اپنے بڑے بیٹے خسرو کی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا تھا اور اس کے جانشین شاہجہان نے اپنے بیٹوں کو اس تخت کی خاطر جنگیں کرتے دیکھا جس پر ابھی وہ خود براجمان تھا۔ بالآخر باپ اپنے سب سے قابل اور منصوبہ ساز بیٹے کے ہاتھوں گرفتار ہوا اور باقی عمر قید تنہائی میں کاٹی۔ اورنگ زیب اپنی ہی قائم کردہ مثال سے خوفزدہ تھا۔ اس نے اپنے تمام بھائیوں، ایک بیٹے اور بھتیجے کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

1707ء میں اورنگ زیب کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا معظم شاہ سلطنت پر قبضہ کرنے کابل سے فوراً دہلی پہنچا۔ پہلے آگرہ کے قریب اس نے اپنے بھائی اعظم کو شکست دی اور قتل کر دیا۔ پھر جنوب کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے دوسرے بھائی کام بخش کا بھی کام تمام کر دیا۔ تب کہیں جا کر وہ اس قابل ہوا کہ بہادر شاہ کے لقب سے ہندوستان کے تخت پر جلوہ افروز ہو سکے۔

لاہور میں سن 1712 عیسوی میں بہادر شاہ کی موت کے ساتھ ہی اقتدار کے لئے ایک نئی کشمکش کا آغاز ہوا۔ بہادر شاہ کا بڑا بیٹا جہاندار شاہ تخت دہلی پر قابض ہونے میں کامیاب رہا اور پیش بندی کے طور پر اس نے بادشاہت کے ہر ممکنہ دعویدار کو قتل کرا دیا لیکن اس کا بھتیجا فرخ سیار ابھی زندہ تھا،

روایت کا تسلسل قائم رہا۔ فرخ سیار نے اگلے ہی سال جہاندار شاہ کو شکست دے کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ تخت کے دعویدار مغل شہزادوں کے درمیان اقتدار کا خونریز کھیل جاری رہا لیکن اس افرا تفری کے دوران سید برادران دہلی دربار میں سیاہ و سفید کے مالک بن گئے اور بادشاہ گر کہلائے۔ انہی سید برادران کے ہاتھوں فرخ سیار اپنے انجام کو پہنچا۔

1719ء میں سید برادران کی مدد سے شہزادہ روشن اختر تخت نشین ہوا اور محمد شاہ کا لقب اختیار کیا لیکن مشہور 'رنگیلا' کے لاحقے سے ہوا۔ وہ تیس سال تک حکمران رہا۔ اس دوران اسے کبھی اپنی سلطنت پر مکمل اختیار حاصل نہ ہو سکا۔ یہ وہی زمانہ تھا جب مغل شہنشاہوں کے دارالحکومت دہلی پر ایرانی ' افغانی ' روہیلے اور مرہٹے حملہ آور ہو رہے تھے۔ محمد شاہ کے زمانے سے ہی تخت دہلی مہم جو عناصر کے لئے دعوت عام کا منظر پیش کر رہا تھا۔ اگرچہ قومی سطح پر یہ شہر 1857ء تک ایک وسیع سلطنت کا دارالخلافہ کہلایا جاتا رہا۔

بغاوتوں کے دوران خود بادشاہ کو قید کر لیا جانا ایسا حیرت انگیز نہ تھا۔ تاریخ مغلیہ میں اس کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ مغلیہ سلطنت کے بانی ' تخت کوش بابر کے پہلے پانچ جانشین بادشاہوں میں سے دو کو قیدی بنایا گیا۔ 1626ء میں شاہی قافلہ جب کابل کی طرف رواں دواں تھا تو راستے میں بغاوت ہوئی اور شہنشاہ جہانگیر کو مہابت خان نے قید کر لیا۔ وہ ملکہ نور جہاں کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کے خلاف تھا۔ شاہی قافلہ کابل پہنچا تو جہانگیر کو رہائی ملی اور مہابت خان نے معافی مانگ لی۔

البتہ شاہ جہاں اتنا خوش قسمت نہیں تھا۔ 1657ء میں اس کی بیماری ' تخت کے متوقع جانشینوں کے درمیان ایک برادر کش جنگ کا باعث بنی۔ اورنگ زیب نے اپنی حکمت عملی سے مراد کو گرفتار کیا اور گوالیار کے قلعے میں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ دارا شکوہ کو بادشاہ کی قائم کردہ ایک تحقیقاتی مجلس کے سامنے پیش کیا گیا جہاں اسے الحاد کا مرتکب قرار دے کر' سر عام رسوائی کے بعد دہلی میں موت سے ہمکنار کر دیا گیا۔ ایک اور بھائی شجاع فرار ہو کر اراکان چلا گیا لیکن اس کا انجام بھی اپنے بھائیوں سے مختلف نہیں تھا۔ اورنگ زیب نے جب اقتدار پر قبضہ کیا تو اس کا باپ ' شہنشاہ ہندوستان ابھی زندہ تھا۔ شاہجہان آٹھ طویل سالوں تک اپنے بیٹے کے یرغمالی کی حیثیت سے آگرہ قلعے میں قید رہا اور وہیں 1666ء میں اس کا انتقال ہوا۔

شاہی تخت پر قبضے کے لئے برادر کشی کے ضمن میں اورنگ زیب کی مثال نہ تو پہلی تھی اور نہ ہی آخری ثابت ہوئی۔ ہندوستان میں جاگیرداری نظام کے مضبوطی سے قدم جمانے کے بعد دہلی نے شاذ و نادر ہی انتقال اقتدار کا اس سے مختلف انداز دیکھا ہو۔ جاگیرداری نظام کے انحطاط کے ساتھ اس کی

سفاکی اور غیر انسانی بربریت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اطاعت گزاری کی حد سے زیادہ پھیلی ہوئی سلطنت جسے محصولات کی اشد ضرورت تھی' روز بروز مائل بہ تشدد اور اختلاف رائے اور اقتدار کے متبادل دعویداروں کے معاملے میں تحمل و برداشت سے عاری ہوتی چلی گئی۔

برادر کشی اور بینائی سے محروم کر دینے کی روایت

پانی پت کے میدان میں ہندوستان کے پٹھان فرمانروا کی موت کے بعد' دو سو سال کے دوران ایک درجن سے زائد افراد کو بینائی سے محروم اور ان گنت افراد کو سفاکانہ انداز میں قتل کر دیا گیا۔ یہ وہ شہزادے تھے جو کبھی تخت دہلی کے حصول کے خواہش مند ہوئے یا جن کے بارے میں شائبہ تھا کہ ان کے نہاں خانہ دل میں ایسی کوئی آرزو جنم لے سکتی ہے۔ 1553ء میں ہمایوں نے کابل میں اپنے بھائی کامران کو شکست دینے کے بعد اسے بینائی سے محروم کر دیا۔ اسی سال دہلی میں بارہ سالہ سوری بادشاہ فیروز شاہ کی تین روزہ بادشاہت کا دردناک انجام ہوا۔ محمد شاہ سور عادلی نے فیروز شاہ کو اس کی ماں کی گود سے گھسیٹ کر پہلے تو اس کی آنکھیں نکالیں اور پھر اسے قتل کر دیا۔

اپنے جانشینوں میں جہانگیر اپنے سب سے چھوٹے بیٹے شہریار کو ولی عہد بنانے میں دلچسپی رکھتا تھا جو شیر افگن سے نور جہاں کی بیٹی لاڈو بیگم کا شوہر تھا لیکن نور جہاں کے بھائی آصف خان کی خواہش تھی کہ جہانگیر کا دوسرا بیٹا خرم (شاہجہان) ولی عہد بنے جو آصف کا داماد بھی تھا۔ آصف خان نے شہریار کو شکست دے کر گرفتار کر لیا اور رتی بھر تاسف یا تردد کے بغیر اپنی بہن کے داماد کی آنکھیں نکالیں اور اسے اندھا کر دیا۔

شاہ کشی اور برادر کشی کے اس ماحول میں جب اورنگ زیب کے پوتے جہاندار شاہ نے اقتدار پر قبضہ کیا تو اسے عافیت اسی میں نظر آئی کہ تخت کے ہر ممکنہ دعویدار کو تہ تیغ کر دیا جائے۔ جہاندار کے بڑے بھائی بدقسمت اعظم الشاہ کا بیٹا فرخ سیار ان معدودے چند شہزادگان میں سے تھا جو زندہ بچنے میں کامیاب رہے تھے۔ دسمبر 1712ء میں جب فرخ سیار نے جہاندار شاہ کو آگرہ میں شکست سے دوچار کیا تو اس کا انتقام عبرت کی مثال تھا' وحشیانہ کینہ پروری کی خوفناک مثال۔ جہاندار شاہ کو قتل کر کے سارے شہر دہلی میں اس کے مردہ جسم کی اس طرح نمائش کی گئی کہ جسم کے اوپر کٹا ہوا سر ایک نیزے میں پرویا ہوا تھا۔ جانشینی کی جنگ میں کامیاب رہنے والے نے کئی ایسے شہزادگان کی آنکھوں میں لوہے کی دہکتی ہوئی سلائیاں پھروا کے اندھا کر دیا جن سے وہ انتہائی قریبی خونی رشتوں میں منسلک تھا اور ان میں سے ایک اس کا اپنا دس سالہ سگا چھوٹا بھائی بھی تھا۔

روہیل کھنڈ کے سردار غلام قادر روہیلہ نے دہلی پر قبضے کے بعد شہنشاہ ' شاہ عالم کو آنکھوں سے محروم کردیا تھا۔ اس زمانے کے ایک راوی نے جس کا احوال یوں بیان کیا ہے۔

'' اس (روہیلہ) نے معزول بادشاہ اور شاہی خاندان کے تمام شہزادوں کو دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔ ان کی آمد پر فاتح نے بڑی درشتی کے ساتھ شاہ عالم سے اس کے خفیہ خزانوں کا پتہ پوچھا۔ شاہ نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی کہ اس کسمپرسی کے عالم میں کوئی چھوٹی سی شے چھپانے کا بھی اسے کہاں ہوش تھا لیکن وہ (روہیلہ سردار) مطمئن نہ ہوا۔ معزول بادشاہ سے انکار سن کر روہیلہ مارے غصے کے دیوانگی کی حدوں کو چھونے لگا۔ اس نے شاہ عالم کو دھمکی دیتے ہوئے کہا کہ وہ ابھی اور اسی جگہ اسے اندھا کر دے گا۔ ''کیا؟'' ستم رسیدہ بادشاہ پکار اٹھا (یہاں راوی کے بیان کا لفظی ترجمہ دیا جارہا ہے) ''کیا کہا تم نے ! ان آنکھوں کو ضائع کر دو گے جو گزشتہ ساٹھ سالوں کے دوران قرآن حکیم کے مطالعے کے لئے وقف رہی ہیں''؟

''اس دردمندانہ درخواست کو نظر انداز کرتے ہوئے غلام قادر روہیلہ نے اپنی فطری بے رحمی کے ساتھ ملازمین کو حکم دیا کہ بادشاہ کو پکڑ کر فرش پر گرادیا جائے اور پھر وہ ظالم لفنگا بادشاہ کے سینے پر چڑھ بیٹھا اور اس نے خنجر سے اپنے واجب الاحترام بادشاہ کی آنکھیں نکال ڈالیں۔ اس بہیمانہ کارروائی سے فارغ ہو کر روہیلہ نے شاہ عالم کو ایک دور افتادہ مکان میں منتقل کروادیا ' اس حال میں کہ بادشاہ کا چہرہ خوں سے تر اور اس کی حالت قابل رحم تھی اور وہ اپنی بدنصیبی اور تباہ حالی پر کڑھنے کے لئے وہاں تنہا پڑا تھا۔''

بیچارہ بادشاہ چہرے پر روہیلہ تشدد کے آثار سجائے مزید 20 سال تک زندہ رہا۔ اگرچہ اس کے مرہٹہ اتحادی 'گوالیار کے ہندو راجہ سندھیا نے مسلمان بادشاہ پر اس ظلم کا بدلہ لیا تھا لیکن شاہ عالم اپنی باقی ماندہ زندگی اس سفاک ستمگر کے ظلم کی نشانی بن کر جیا۔

یہ وہی غلام قادر روہیلہ تھا جو اپنی اذیت پسندی کی تسکین کے لئے موت کا شیطانی رقص (رقص بسمل) دیکھنے کا شائق تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ انتہائی تیز دھار کی تلوار کے ایک ہی وار سے کسی بدنصیب مظلوم کا سر تن سے جدا کر دیا جاتا اور ابلتے ہوئے خون سے تراس سوراخ پہ ' جہاں ابھی لمحہ بھر پہلے ایک سر سجا تھا ' فوری طور پر دہکتی آگ سے انگارہ بنی لوہے کی طشتری اس طرح جمادی جاتی کہ اس کی بے

پناہ حدت باقی ماندہ جسم میں خون کی تیز لہر دوڑا دیتی اور سر کٹے بد نصیب کا بدن زمین پر گرنے سے پہلے شدید کرب کے عالم میں بہت تیزی سے ایک آسیبی رقص کی صورت میں ادھر ادھر حرکت کرتا۔ مرنے والا اس "رقص بسمل" میں جتنے زیادہ ہیجانی قدم چلتا' روہیلہ سردار اس منظر سے اتنا ہی زیادہ لطف اندوز ہوتا۔

اور یہ بھی غلام قادر ہی تھا جو شاہی گھرانے کی شہزادیوں کو اپنے حضور رقص کا حکم دے کر خود سو تا بن گیا تھا۔ خنجر اس نے پہلے ہی لاپرواہی سے پرے رکھ دیا تھا۔ اسے بے حد مایوسی ہوئی جب کسی بھی شہزادی نے اپنے خوابیدہ صیاد کو' سامنے پڑے خنجر سے قتل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اسی افسوسناک صورت حال کو شعر کی زبان دے کر اقبال نے اس آزار کی نشاندہی کی ہے جس نے بابر کی نسل کو تباہی سے دوچار کیا۔

حمیت نام تھا جس کا' گئی تیمور کے گھر سے

تشدد کے خوگر

وادی سندھ اور ہندوستان میں فاتح کا انتقام ہمیشہ فوری اور سفاکانہ ہونے کی بہت سی وجوہات تھیں۔ سب سے پہلے تو یہی کہ ان علاقوں میں کسی سلسلہ نسب کے متعلقہ نظام مراتب سے وابستگی کی درجہ بندی کو یقینی بنانے کی ضمانت دینے والا کوئی قانون یا اصول موجود نہیں تھا۔ ایسے قوانین تو صرف سیاسی اور سماجی قوتیں یا وہ طبقات نافذ کر سکتے تھے جو اقتدار کے دعویداروں سے الگ اور ماورا ہوتے لیکن یہاں ایسے "ثالثوں" کا وجود نہیں تھا جو کسی جھوٹے دعویدار کے مقابلے میں جائز وارث کی حمایت کرتے۔ دوسرے لفظوں میں بورژرازی کا حمایت یافتہ سماجی عمل مفقود تھا۔ پارلیمان اور آزاد عدلیہ جیسے بورژوا ادارے بھی موجود نہیں تھے۔ برطانیہ میں ایسے اداروں کی ابتدائی شکل و صورت اٹھارویں صدی کے آغاز ہی میں ترتیب پا چکی تھی۔ پارلیمان اور عدالتوں کی طرف سے شاہی اختیارات کا بے جا استعمال پابندیوں کی زد پر تھا۔ برطانیہ میں جانشینی کے قوانین وضع کئے جا چکے تھے جب کہ برصغیر میں ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔

اور یہ بھی کیا ستم ظریفی تھی کہ عدالتی عمل سے ناآشنا برصغیر کے سماج میں قتل' سزائے موت' تصادم اور واضح طور پہ فوری اور ظالمانہ انتقام ہی بغاوت کی حوصلہ شکنی کے ذرائع تھے لیکن یہی حفاظتی اقدامات جوابی انتقام کی بنیاد بھی بن جاتے تھے۔ بیٹے تخت کی خاطر جنگ کرتے اور جیسے ہی اقتدار پر قابض ہوتے' باپ سے سیکھے ہوئے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے ظلم' تشدد اور انتقام کی آخری حدود بھی

پھلانگ جاتے۔

1606ء میں شہنشاہ جہانگیر کے ہاتھوں شہزادہ خسرو کو شکست ہوئی۔ خطاکار بیٹے کو چناب عبور کرتے ہوئے گرفتار کر لیا گیا۔ دریائے راوی کے کنارے مرزا کامران کی بارہ دری میں جب بیٹے کو زنجیروں میں جکڑ کے باپ کے سامنے لایا گیا تو اس کے مشہور سازشی ساتھی حسین بیگ اور عبدالعزیز اس کے دائیں بائیں تھے۔ شہنشاہ نے یہ واقعہ اپنی خود نوشت میں اس طرح بیان کیا ہے :

"روتا' کانپتا شہزادہ ان دونوں کے درمیان کھڑا تھا۔ حسین بیگ نے اس خدشے کے پیش نظر کہ اسے قربانی کا بکرا بنایا جائے گا' ندامت آمیز لہجے میں بولنا شروع کیا لیکن اسے خاموش کرا دیا گیا۔ خسرو کو ہم نے تحویل میں لے لیا اور اس کے بعد حکم دیا کہ دونوں بدمعاشوں کو بالترتیب گائے اور گدھے کی کھال میں سی دیا جائے۔ پھر انہیں گدھوں پر اس طرح لاد دیا گیا کہ ان کے چہرے دُموں کی طرف تھے۔ اس حال میں دونوں کو شہر میں گشت کرایا گیا۔ حسین بیگ جو گائے کی کھال میں تھا' چوتھے پہر میں ہی مر گیا کیونکہ اس جانور کی کھال جلد ہی سوکھ جاتی ہے۔ عبدالعزیز گدھے کی کھال میں تھا جو نمی کو زیادہ عرصہ برقرار رکھ سکتی ہے وہ ایک دن اور ایک رات زندہ رہنے کے بعد ہلاک ہوا.........

جب مرزا کامران کی بارہ دری سے شہر لاہور کے دروازوں تک نوکدار چوبی ڈنڈوں کی دوہری قطار بنا دی گئی تو وہ 700 غدار ان ڈنڈوں میں ترازو کر دیئے گئے جو سازش میں خسرو کے ساتھ شامل تھے۔ اس سے زیادہ اذیت ناک سزا ممکن نہیں تھی کیونکہ وہ بدبخت مرنے سے قبل بہت دیر تک اس تکلیف دہ عذاب سے دوچار رہے۔ ان کی اذیت کا منظر بہت ہولناک تھا"

افتادہ شہزادے کو ہاتھی پر بٹھا کے اس راستے سے گزارا گیا تا کہ وہ اپنے باپ کے خوفناک انتقام کا شکار ہونے والوں کی آہ و بکا اور ان کے تڑپنے کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھے اور جست لگا کر فوری اقتدار تک پہنچنے کی خواہش کے اس انجام سے عبرت پکڑے۔

شکست خوردہ دشمن کو بینائی سے محروم کرنا اور اسے نامرد بنا دینا اگرچہ سزا دینے کا انتہائی وحشیانہ انداز تھا لیکن جنگ کے بعد فاتحین ' قتل و غارتگری کا جو بازار گرم کرتے اس کی مثالیں بھی کچھ کم نہیں تھیں۔ ابراہیم لودھی ' شیر شاہ سوری ' ہمایوں کا بھائی ہندال اور سوری افغانوں کا ہندو وزیر اعظم

ہیموبقال سب اقتدار کی جنگوں میں اپنے انجام کو پہنچے۔ فروری 1629ء میں شاہجہان نے آگرہ میں اپنی تاجپوشی کے بعد دانیال' مراد اور پرویز کے بیٹوں کو سر عام سولیوں پر لٹکایا۔ اس کے بیٹے اور پوتے نے بھی تخت پر قبضے سے پہلے اور بعد اس خونی روایت کو برقرار رکھا۔

ایک فرانسیسی ڈاکٹر برنیر Bernier جس کی رسائی اورنگ زیب کے دربار تک تھی اور جس نے اقتدار کی خونچکاں جنگ میں شہنشاہ کے ہاتھوں اس کے اپنے بھائیوں کو قتل ہوتے دیکھا' یوں رقم طراز ہے:

"میرے قارئین نے بلاشبہ موجودہ مغل حکمران کے اقتدار تک پہنچنے کے طور طریقوں کی مذمت کی ہے۔ بلاشبہ یہ ظالمانہ اور غیر منصفانہ تھے لیکن انہیں اس کسوٹی پر نہیں پرکھا جانا چاہیے جو یورپی شہزادوں کے کردار کا تعین کرنے میں کام آتی ہے۔ یورپ میں جانشینی کے انتہائی مستحکم اور دانشمندانہ قوانین رائج ہیں جن کے مطابق تخت کا وارث بادشاہ کا سب سے بڑا بیٹا ہوتا ہے لیکن ہندوستان میں مرحوم شہنشاہ کے سب بیٹے تخت کے دعویدار ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے پاس صرف ایک ہی ممکنہ مگر ظالمانہ انتخاب ہوتا ہے کہ وہ اپنے اقتدار کے لئے تمام بھائیوں کو موت سے ہمکنار کردے یا خود کسی بھائی کے اقتدار کی سلامتی اور استقامت کی بھینٹ چڑھ جائے۔ اس کے باوجود اگر کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ملکی حالات' نسب اور تعلیم اورنگ زیب کے اقدامات کی سنگینی کم نہیں کرتے تو انہیں بہر صورت یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اس شہزادے کو ہمہ گیر اور نایاب صفات سے نوازا گیا ہے اور وہ باکمال سیاسی رہنما اور ایک عظیم بادشاہ ہے۔"

یہ تحریر اسی دور میں لکھی گئی اور واضح طور پر دو مختلف ثقافتوں کے علیحدہ تشخص کو اجاگر کرتی ہے۔ جب اورنگ زیب اقتدار کی برادر کش جنگوں میں ہمہ تن مصروف تھا تو یورپ میں سب سے بڑے بیٹے کی جانشینی کا قانون مسلمہ حیثیت اختیار کر چکا تھا۔

1707ء میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد' تخت کے وارث ایک دوسرے کو قتل کرنے کے درپے تھے اور انگلستان میں کم وبیش اسی زمانے (1708ء) میں "جانشینی کا قانون" منظور ہوا جس کے تحت شاہی سلسلہ نسب کا تعین اور آنے والی صدیوں میں اس قانون پر تسلسل کے ساتھ عملدر آمد کی یقین دہانی کرادی گئی۔ بورژوا اور جاگیرداری نظام کے پاس ایک ہی سوال کے دو مختلف جواب تھے۔

اورنگ زیب کا اپنے اسیر بھائی دارا شکوہ کو سرعام ذلیل و رسوا کرنے کے بعد قتل کرنا شاید اس صورت حال کی بہتر وضاحت کر سکتا ہے جس میں ایسے فیصلے کرنا ناگزیر ہو جاتا تھا:

"خلوت کی ملاقاتوں میں اورنگ زیب نے اپنے مصاحبین کو اس اقدام کی موافقت اور مخالفت میں دلائل پیش کرنے کی دعوت دی۔ غالباً یہ طے ہو چکا تھا کہ دارا کو گوالیار کی ریاستی جیل میں پہنچایا جائے گا۔ اب فیصلہ طلب بات یہ تھی کہ اسے دہلی کے بازاروں سے رسوا کرتے ہوئے لے جایا جائے یا نہیں۔ چند مصاحبوں نے محتاط رویئے کی تلقین کی۔ ان کے نزدیک شہزادے کی سرعام رسوائی شاہی خاندان کی بدنامی اور تحقیر کا باعث ہوتی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ بلوہ ہو جاتا یا اسے آزاد کرانے کی کوشش کی جاتی۔ لیکن اس تجویز کے مخالفین اپنی جاہلانہ ضد پر ڈٹے رہے کہ بادشاہ کی قوت سے مرعوب کرنے کے لئے دارا کو عوام کے سامنے نشان عبرت بنانا ضروری تھا۔ اسی سلسلے میں ایک اور دلیل یہ تھی کہ صرف آنکھوں دیکھی بات قابل اعتبار ہوتی ہے۔ اس امر میں کوئی شک و شبہ نہیں رہ جانا چاہئے کہ دارا شکوہ گرفتار ہو چکا تھا۔ اورنگ زیب کا فیصلہ بھی یہی تھا کہ مستقبل کے جھوٹے داراؤں کی ممکنہ شورشوں کا تدارک ناگزیر ہے دارا شکوہ اور اس کے بیٹے سپہر شکوہ کو غلیظ اور مکروہ حالت اور فوجی پہرے میں دہلی کی گلیوں سے گھسیٹتے ہوئے لے کر جانے کا فیصلہ ہوا تاکہ عوام خود اپنی آنکھوں سے اس ذلت کا نظارہ کر سکیں"۔

اٹھارویں صدی کے برصغیر میں صرف دہلی کا تخت ہی وجہ نزاع نہیں تھا۔ سیاسی اعتبار سے پورے کا پورا ملک ہی ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ مرکز اپنے گھمبیر مسائل کے ہاتھوں ناتواں ہو چکا تھا اور اس کے اختیار کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی تھی۔ وادی سندھ اور ہندوستان' دونوں بے شمار چھوٹی چھوٹی جاگیردارانہ ریاستوں میں تقسیم ہو چکے تھے۔ ہندوستان میں برطانوی راج کو ورثے میں ایسی چھ سو ریاستیں ملیں۔

دو وضاحتیں

لیکن یہاں دو باتوں کی وضاحت ضروری ہے اب تک کی بحث میں ممکن ہے یہ عندیہ ملے کہ برصغیر کے مسلمان اور ہندو حکمرانوں کے مقابلے میں برطانوی حکمرانوں کو بہت ہی مہربان ' خیر اندیش اور روشن خیال ثابت کیا جا رہا ہے اور یہ کہ ہندوستان کے برعکس یورپ میں انتقال اقتدار ہمیشہ پر امن رہا

ہے۔

ہندوستان میں اقتدار کے دعویداروں کے مابین وحشیانہ معرکہ آرائیوں کے تذکرے اور صنعتی یورپ میں انتقال اقتدار کے پرامن قوانین کے ارتقا سے ان کے تقابل کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ مقامی حکمرانوں کے مقابلے میں انگریزوں نے برصغیر پر بڑی شرافت اور رحمدلی سے حکومت کی۔ ایسا قطعی نہیں تھا۔ بنگال میں جولاہوں اور دہقانوں کے ابھار کا افسوسناک انجام اور 1857ء کی جنگ آزادی میں کامیابی کے بعد انگریزوں کی دہشت گردی بلکہ قتل عام' اسی نوعیت کے ان گنت واقعات میں سے صرف دو ہیں پہلا غیر ضروری تھا اور دوسرا محض وحشیانہ انتقام 'بظاہر جوابی لیکن قطعی بلاجواز۔

برطانوی راج میں توپ کے دہانے سے باندھ کر اڑا دیئے جانے کی سزائیں عام تھیں اور فوجی عدالتیں ایسی سزا سنانے میں ذرا بھی تامل نہیں کرتی تھیں۔ پھر امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں ہولناک قتل عام کی ایک الگ خونی داستان رقم کی گئی اور قید وبند' جلاوطنی اور خصوصی عدالتیں تو روزمرہ کے واقعات تھے۔

یہاں برطانیہ کی خیر اندیشی ثابت کرنا مقصود نہیں لیکن یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ برطانیہ میں بادشاہ سے اس کے جانشین اور ایک حکومت سے دوسری حکومت کو اقتدار کی منتقلی کے اصول متعین کر لئے گئے تھے۔ جانشینی کا مسئلہ طے شدہ تھا اور انتقال اقتدار پرامن ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ فرد اور ریاست کے باہمی تعلقات کے حوالے سے بھی ایک مستقل ضابطہ کار وضع ہو چکا تھا اور اس کی بنیاد وہ عمرانی معاہدہ تھا' برطانیہ میں جان لاک John Locke اور فرانس میں روسو Rouseau جس کے شارحین تھے۔ یہ بورژوا فلسفی حقوق انسانی کے علمبردار تھے۔

برصغیر میں جدوجہد آزادی شروع ہونے سے قبل سامراجی حکومت کے خلاف ایسا کوئی نظریہ یا فلسفہ منظر عام پر نہیں آیا تھا۔

اس تقابلی جائزے کو محض یہ تاثر دینے کی کوشش پر محمول نہ کیا جائے کہ یورپ میں انتقال اقتدار کا عمل اتنا موثر اور سہل تھا کہ وہاں شاہ کشی کے واقعات عنقا تھے۔ چارلس اول اور لوئی شش دہم بالترتیب 1649ء اور 1792ء میں ہلاک کر دیئے گئے لیکن یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ دونوں ہلاکتوں کا پس پردہ محرک یہ تھا کہ انتقال اقتدار کی اس روش کا سدباب ہو سکے۔ ممکن ہے یہ دلیل بعید از قیاس معلوم دے لیکن اس میں وہی منطق ہے جو "جنگ کے خاتمے کے لئے جنگ لڑنے" کا جواز مہیا کرتی ہے۔

ان واقعات کا ایک تناظر اور بھی ہے۔ چارلس اور لوئی کی موت کے پس پردہ تخت کے دعوے دار

مہم جو افراد کی باہمی چپقلش نہیں تھی۔ یہ تو جاگیردارانہ مطلق العنانیت اور بورژوائی ادارہ سازی کے مابین تصادم کا نقطہ عروج تھا۔ اس کشمکش کا فاتح کوئی فرد واحد نہیں بلکہ ایک وسیع البنیاد طبقہ تھا۔ ان بغاوتوں کے نتیجے میں حکمرانوں کی آمریت کو بتدریج محدود کر دیا گیا۔ شاہ کی صوابدید اب اس طبقے کے مفادات کے تابع تھی جو اسے اور اس کے وارث کو تخت پر بٹھانے کا ذمہ دار تھا۔

اس کے برعکس ہندوستان میں اقتدار کے جھگڑے ' گروہی مفادات پر مبنی ہوتے تھے جن کے لئے تخت کے انفرادی دعوے داروں کی سربراہی میں جنگیں لڑی جاتی تھیں۔ یہاں ہر طاقتور فریق کو مقابلے کا حق حاصل تھا۔ فاتح کسی قدغن کے بغیر من چاہے اختیارات کا حامل ہوتا تھا جو مفتوح کے ساتھ بہت ذلت آمیز سلوک روا رکھتا اور اسے انتہائی دردناک اور بھیانک موت سے ہمکنار کرتا تھا۔ جس برصغیر میں فتح یا شکست کے انجام میں اتنا بڑا فرق ہو وہاں اس پر کیا حیرت کہ جاگیرداری نظام کی رکھ رکھاؤ والی چند قدریں اور بورژوائی نظام میں تسلسل اقتدار کی روایت نہ تو قائم ہو سکی اور نہ ہی رواج پا سکی۔ ماضی کے حکمرانوں میں ان سودمند معاشرتی و سیاسی روایات کا فقدان بھی عہد حاضر کے بحران کا باعث ہے۔

یہ بات ہمارے علم میں ہے کہ یورپ میں 'گلہ ' اور 'گلہ بان' یعنی شہری اور حکمران کے درمیان تعلقات کار کی ایک عملی شکل وضع ہو چکی تھی گویا ایک معاہدہ تشکیل پا چکا تھا۔ یہ نیا عمرانی معاہدہ تھا۔ خوشحال اور محفوظ تجارت کے لئے مناسب ماحول فراہم کرنے کی ذمہ داری قومی اقتدار اعلیٰ پر تھی جس کے جواب میں تاجر اپنی دولت اور اثاثوں کا خاطر خواہ حصہ سلطنت کے دفاع اور بادشاہ کا رتبہ اور وقار قائم رکھنے پر خرچ کرتا تھا۔ بادشاہ امن قائم رکھتا تھا اور تاجر اس کی جنگوں کے مصارف برداشت کرتا تھا۔ دونوں کے باہمی مفاد کا تقاضا بھی یہی تھا۔ حکومت کے فراہم کردہ سازگار ملکی ماحول میں تاجر جو فاضل پیداوار اور جو زائد منافع کماتا وہ دونوں کی ترقی ' پائیداری اور ان کے حجم میں توسیع کی ضمانت تھا۔

یہی توسیع پسند برطانیہ خطرناک ارادوں کے ساتھ مغل شہزادوں کی باہمی رقابت کی خونی جنگوں سے چکنا چور اور نڈھال ہندوستان کے ساحلوں کا طواف کر رہا تھا۔

اپنے ارادوں کو عملی شکل دینے کے لئے برطانیہ کے پاس دور مار اسلحہ تھا ' اسے بحری برتری حاصل تھی اور وہ چھاپہ خانے ' بھاپ کے انجن اور برقی سلسلہ مواصلات جیسی عظیم سائنسی ایجادات کی برکتوں سے مالا مال ہو رہا تھا۔ برصغیر کی طرف برطانیہ کی پیش قدمی برمحل تھی۔ برصغیر کے حصے بخرے ہو رہے تھے۔ برطانیہ کو اپنے توسیع پسندانہ عزائم میں کامیابی حاصل ہوئی جس کا زیادہ تر انحصار 'نوآبادیاتی لوٹ مار اور احساس ندامت سے عاری موقعہ پرست سیاست اور کامیاب جنگی حکمت عملی پر تھا۔

19

مقابر، طمطراق اور زمین کی ملکیتی میعاد

تخت طاؤس اور تاج محل

1688ء میں انگلستان کا "شاندار انقلاب" مستقبل کے بارے میں بورژوا رجائیت کا بہت واضح اظہار تھا۔ یورپی بورژوائی اور تاجر مستقبل کو اپنے ہاتھ میں لے کر سرمایہ داری کے نئے نظام کے علم بردار بنے تھے اور سرمایہ کاری اور بچت کے فروغ کے لئے مناسب سیاسی زمین ہموار کرنے کی خاطر جانشینی کا مستقل قانون چاہتے تھے۔ اب ان کی نظریں اپنے ساحلوں سے دور کی منڈیوں پر جمی تھیں اور ان کے حوصلے بلند تھے۔

اس کے برعکس برصغیر میں آئے دن کی جانشینی کی جنگوں اور ایرانی و افغانی حملوں سے "کھادا پیتا لاہے دا' تے باقی احمد شاہے دا" کی ذہنیت اس قنوطی انداز فکر کی غمازی کرتی ہے جس نے وادی سندھ اور ہندوستان کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔

برصغیر میں زمین کی ملکیت کا ایک مخصوص دستور رائج رہا تھا جس کے تحت جاگیردار کی موت پر اس کی ملکیتی زمین اور اس کے اعزاز و خطابات منسوخ ہو جاتے تھے۔ اشرافیہ کے طرز حیات پر اس کے منفی اثرات نمایاں تھے۔ شہنشاہ کی ناراضی پر تمام دولت اور جائیداد چھن جانے کا خدشہ اور اپنے پسندیدہ یا قدرتی وارث کو اس کی عدم منتقلی کا احساس تکلیف دہ اور تباہ کن تھا۔ بیرنگٹن مور Barrington Moore نے اس صورت حال کا معروضی تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے :

"دولت بچا کر رکھنے میں مضمر خطرات اور وصیت کے ذریعے اس کی

منتقلی پر پابندی نے نمود و نمائش کے رجحانات کو فروغ دیا۔ چھت کی جائے اسراف اس دور کی نمایاں خصوصیت تھی۔ شان و شوکت کے اظہار کی یہ عادت خوف کا نتیجہ تھی۔ کسی بھی لمحے سب کچھ چھن جانے کا خوف، یہ عادت ہندوستان آنے والے غیر ملکیوں کو آج بھی اسی طرح حیران کر دیتی ہے جیسے مغلیہ دور کے یورپی سیاح حیران رہ جایا کرتے تھے۔ بادشاہ کروفر اور ٹھاٹ باٹھ کی مثالیں قائم کرتے اور درباری اس کی تقلید کرتے"۔

جاگیردار یقیناً سپیر Spear کے ان خیالات سے متفق ہوگا :

"جب آپ اپنی اگلی نسل کو کچھ منتقل نہیں کر سکتے تو نمود و نمائش اور عوامی بہبود کے کام کر کے نام کیوں نہ روشن کیا جائے۔ اسی لئے مغل اشرافیہ اپنے طمطراق اور دولت کے بے جا اسراف میں نمایاں تھی۔ مغل درباری عہدوں پر متکبر ملازمین کی کثیر تعداد، اپنے فلاحی کاموں (سرائے، مسجد اور کنووؤں کی تعمیر) اپنے باغات، موسم گرم کے محلات اور اپنے مرحومین کی یاد میں گنبدوں والے عظیم مقبروں کی تعمیر کے حوالے سے مشہور ہیں۔ مغل زعماء کی حیثیت دراصل سرکاری اشرافیہ کی تھی جہاں فرد نہیں بلکہ طبقہ موروثی تھا۔ زمینیں ان کے تصرف میں تو تھیں لیکن وہ جاگیر دار نہیں تھے"۔

حیات و موت کے مواقع پر شہنشاہ بے جا اسراف اور شان و شوکت کے اظہار کی سب سے نمایاں مثال ہوتا تھا۔ تخت طاؤس، ایک عالم میں جس کی شہرت تھی، ٹھوس سونے سے تیار کیا گیا تھا اور اس میں فیروزے، یاقوت اور ہیرے جڑے تھے۔ خالص سونے کی پرت چڑھے دو مور اپنی خوبصورت دم پھیلائے تخت کی شان بڑھاتے تھے۔ چار فٹ چوڑے اور چھ فٹ طویل صرف اس تخت کی مالیت شاہجہان کے زمانے میں چھ کروڑ روپے تھی۔ 1739ء میں نادر شاہ ہندوستان سے جو مال غنیمت لوٹ کر لے گیا اس کی مالیت کم وبیش ساٹھ کروڑ روپے تھی۔ کوہ نور ہیرا، تخت طاؤس اور بے شمار ہیرے جواہرات اس کے علاوہ تھے۔

ہنری سوم سے جارج دوم تک، گزشتہ کئی صدیوں کے دوران تخت نشین ہونے والے بادشاہ ایک ہی جگہ، یخ بستہ ویسٹ منسٹر ایبے West Minster Abbey کے قبرستان میں پڑے موت کی نیند سو رہے ہیں جبکہ مغل بادشاہوں کے جسد خاکی وسیع اور شاندار گنبدوں تلے الگ الگ کابل، دہلی، سکندرہ، شاہدرہ، اورنگ آباد اور آگرہ جیسے، ایک دوسرے سے طویل فاصلوں پر آباد شہروں میں دفن

ہیں۔

بر فاب سنگ مرمر سے آراستہ تاج محل کی تعمیر 20ہزار ہنر مند اور مزدوروں کی 22سالہ مشقت کا نتیجہ ہے۔ موجودہ معیار کے مطابق صرف راج مزدوروں کی تنخواہوں پر شاید دس ارب روپے سے زیادہ خرچ اٹھتا۔ یہ تخمینہ تعمیراتی سامان اور ان معماران اور دستکاروں پر اٹھنے والے اخراجات سے الگ ہے جنہیں دوسرے ملکوں اور دور دراز کے علاقوں سے اکٹھا کیا گیا تھا۔ دہلی کی شاندار مسجد پر پانچ ہزار افراد چھ سال تک کام کرتے رہے۔ اوپر دیئے گئے تخمینے کے مطابق صرف مزدوروں کی اجرت 80کروڑ روپے بنتی ہے۔ اورنگ زیب نے اس سے کہیں زیادہ رقم لاہور کی بادشاہی مسجد پر خرچ کردی تھی جو غالباً دنیا کی سب سے بڑی مسجد ہے۔

ایم مجیب کے الفاظ میں دو بنیادی تعمیراتی پیکر، مسجد اور مقبرہ جو ایک دوسرے کی توضیح بھی ہیں اور تقلید بھی، باہم مل کر ایک ایسی بنیادی اکائی تخلیق کرتے ہیں جس سے سچائی، خوبصورتی اور قوت کا اظہار ہوتا ہے لیکن یہاں مور Moore کے خیالات سے اتفاق کئے بغیر بھی کوئی چارۂ کار نہیں جب وہ کہتا ہے:

''افتادگان خاک کی فاضل معاشی پیداوار کو سمیٹ کر مغل حکمران اسے اپنے جاہ و جلال کی نمائش کے لئے استعمال میں لائے جس سے ان کے اقتدار پر اشرافیہ کے حملے کا خطرہ وقتی طور پر تو ٹل گیا لیکن سرمائے کے اس ضیاع سے معاشی ترقی کے وہ امکانات محدود ہو گئے تھے جس کے نتیجے میں زرعی نظام ایک نئے سماج میں ڈھل سکتا تھا۔''

تاج محل کے بارے میں انہی جذبات کا اظہار ساحر لدھیانوی نے یوں کیا ہے :

اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

پہلا مغل شہنشاہ بابر ایک نفس کش زاہد تھا حالانکہ یہ قول اسی سے منسوب کیا جاتا ہے کہ

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

بابر نے 1526ء میں دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد شراب نوشی ترک کردی تھی لیکن اس کی سلطنت کے وارث خود پہ قابو نہ رکھ سکے۔ وہ ہمہ وقت عیش و عشرت میں غرق رہنے لگے۔ ہمایوں اور جہانگیر تو شراب کے اتنے رسیا تھے کہ کثرت مے نوشی کے ہاتھوں جان سے گئے۔

شہزادگان کے چونچلے

جے پور سے مرشد آباد تک دہلی کے زیرنگیں ریاستوں کے حکمران اور امراء جاہ طلبی اور جھوٹے وقار کی خاطر بے دریغ اسراف میں اپنے شہنشاہ سے پیچھے نہیں تھے۔ اپنی ضیافتوں اور اپنے ملازمین پر وہ لاکھوں اور کروڑوں روپے اڑا دیتے تھے۔ اس کا صحیح اندازہ لگانا تو شاید ممکن نہ ہو کہ یہ نواب اور سلطان اور جاگیردار صرف منگنی اور بیاہ جیسی رسموں پر سال بہ سال مجموعی طور پر کیا خرچ کر دیتے تھے لیکن بھکر جیسی غیر اہم اور نیم صحرائی ریاست کے سلطان کی مثال، فضول خرچی کے آزار کی ہلکی سی جھلک پیش کرتی ہے۔

سلطان محمود اپنی بیٹی بھکری بیگم کی شادی کا جشن مناتے ہوئے حد سے تجاوز کر گیا۔ اس میں شک نہیں کہ اپنی بیٹی شہنشاہ اکبر کے عقد میں دینے پر سلطان پھولے نہیں سماتا تھا حالانکہ شہنشاہ کی اس سے پہلے بھی کئی بیویاں تھیں۔ سلطان شاہ محمود نے شادی کی رسومات پر جو بے پناہ اخراجات کئے وہ اس دور کی اشرافیہ کے بے جا اور بے دریغ اسراف کے رجحان کی واضح علامت ہے اور یہ سب کچھ اس عالم میں ہو رہا تھا کہ دولہا بہ نفس نفیس خود وہاں موجود بھی نہیں تھا۔

2 جولائی مطابق 20 صفر شہنشاہ اکبر کا ایلچی اعتماد خان، سلطان محمود کی بیٹی بھکری بیگم کو محافظت شاہی حرم لے جانے کے لئے سلطان کے دربار میں پہنچا۔ شہنشاہ کی طرف سے ایک خلعت فاخرہ، ہیروں سے جڑا ہوا پیش بند، زین اور لگام سے آراستہ گھوڑا اور چار ہاتھی سلطان کو تحفے کے طور پر عطا کئے گئے۔ شاہ محمود نے خوشی کے اس موقع پر پندرہ پر تکلف ضیافتوں کا اہتمام کیا۔ عقد کے روز تک یہ تقریبات اپنے عروج پر پہنچ گئیں۔ علماء، بزرگان دین اور معززین ریاست کو بیش قیمت تحائف سے نوازا گیا۔ سلطان نے اعتماد خان کو نقدی اور جنس کی صورت میں 30 ہزار روپے دیئے۔ بیٹی کو اس نے بے تحاشا جہیز اور بڑے تزک و احتشام کے ساتھ وداع کیا۔

یہ شاہانہ خبط جو بیسویں صدی میں ذہنی مرض کی کیفیت اختیار کرنے والا تھا، اس کا اندازہ ششدر کر دینے والے ان حقائق اور اعداد و شمار سے کیا جا سکتا ہے جنہیں ڈومینیک لیپر Dominique Lapierre اور لیری کولنز Larry Collins نے بیسویں صدی کے اوائل کا منظر پیش کرتے ہوئے اس طرح بیان کیا ہے :

"شہزادگان اور راجاؤں کے حصے میں اوسطاً گیارہ القابات، پانچ اعشاریہ آٹھ بیویاں، بارہ اعشاریہ چھ بچے، نو اعشاریہ دو ہاتھی، دو اعشاریہ آٹھ ریلوے کار اور تین اعشاریہ چار رولز رائس آتی تھیں۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنی زندگی میں اوسطاً بائیس اعشاریہ نو شیروں کا شکار کر رکھا تھا"

اس طرح شہزادوں اور راجگان نے اپنے آباؤ اجداد کے طبعی میلانات کو دور جدید تک پھیلا دیا تھا' ان میں سے کچھ نا قابل یقین حد تک دلچسپ واقعات کا تذکرہ یہاں نامناسب نہ ہو گا۔

ان کے خود اختیار کردہ پر شکوہ القابات صرف ان کی خود ساختہ عظمت ہی کے ہم پلہ ہو سکتے تھے۔ مثال کے طور پر حیدر آباد کے ساتویں نظام کے القابات کچھ اس طرح تھے ''رستم دوراں' ارسطوئے زمان والممالک' آصف جاہ نواب میر عثمان علیخاں بہادر' مسفر الملک نظام الملہ' سپہ سالار فتح جنگ' بلند مرتبت اور برطانیہ کا سب سے وفادار اتحادی۔''

یہ لوگ ہر قیمتی شئے کے سحر کا شکار ہو جاتے تھے مثلاً مہاراجہ بڑودہ سونے کا اس قدر شیدائی تھا کہ ''اس کی درباری عبا بھی سونے کے تاروں سے بنی گئی تھی۔ ریاست میں صرف ایک گھرانے کو سونے کا دھاگا بنانے کی اجازت تھی۔ اس خاندان کا ہر فرد اپنے ناخن غیر معمولی طور پر لمبے رکھتا تھا جن کے اوپری سرے کنگھی کے دندانوں کی طرح کاٹ لئے جاتے تھے تاکہ سونے کے دھاگے کو ہموار عمودی شکل میں ڈھالا جا سکے''۔

قیمتی پتھروں سے شہزادوں کا لگاؤ بھی افسانوی تھا۔ بڑودہ کا مہاراجہ دنیا کے ساتویں بڑے ہیرے 'جنوب کا ستارہ' کی ملکیت پر فخر کرتا تھا۔ ''دنیا کا سب سے بڑا یاقوت کپور تھلہ کے سکھ مہاراجہ کی پگڑی میں سائیکلوپ Cyclope کی اکلوتی آنکھ کی طرح دمکتا تھا اور اس کی خوبانی کی رنگت والی تابانی کے گرد مزید تین ہزار ہیرے اور موتی جھلملاتے تھے۔ جے پور کے مہاراجہ کا بے بہا خزانہ راجستھان کی ایک پہاڑی کے دامن میں دفن کیا گیا تھا اور راجپوتوں کا ایک جنگجو قبیلہ نسل در نسل اس کی حفاظت پر معمور رہا۔ اس خزانے کی نادر الوجود اشیاء میں ایک نیکلس تھا جس میں یاقوت کی تین لڑیاں تھیں اور لڑی کا ہر یاقوت حجم میں کبوتر کے انڈے کے برابر تھا۔ نیکلس میں تین فیروزے بھی جڑے تھے' سب سے بڑا فیروزہ نوے قیراط کا تھا۔ پٹیالہ کے سکھ حکمران کے خزانے کا افتخار موتیوں کا وہ ہار تھا' لائیڈز بینک نے جس کی انشورنس دس لاکھ ڈالر میں کی تھی۔

لیکن سونے اور قیمتی پتھروں کا سب سے بڑا اور بیش بہا ذخیرہ نظام حیدر آباد کی ملکیت تھا۔ ''جیکب نام کا ہیرا تو نظام پیپرویٹ کے طور پر استعمال کرتا تھا' اس کا حجم ایک بڑے لیموں کے مساوی اور وزن' جگمگ کرتے 280 بیش قیمت قیراط تھا۔ جھاڑ جھنکار سے اٹے ہوئے باغ میں درجنوں ٹرک' ٹھوس سونے کی ڈلیوں کے بوجھ سے ایکسل تک کیچڑ میں دھنسے کھڑے رہتے۔ ہیروں کی تعداد اتنی تھی کہ پکاڈلی سرکس کی تمام روشوں کو ڈھانپ لیتے۔ یہ ہیرے تہ خانوں کے فرش پر انگیٹھی میں دہکتے ہوئے کوئلوں کی طرح پڑے رہتے اور ان میں فیروزہ' نیلم' یاقوت اور ہیرے آپس میں خلط ملط ہوتے اور

انہیں الگ الگ کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ پونڈ اور روپے کے کرنسی نوٹ پرانے اخبارات میں لپیٹ کر محل کے تہ خانوں اور نیم چھتیوں کے کونے کھدروں میں اڑس دیئے جاتے جہاں چوہوں کو نظام کے ہزاروں پونڈ کترکے 'اپنے لئے راستہ بنانا پڑتا تھا۔''

جنوبی ہندوستان کے ایک مہاراجہ کا قصہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ ''اولین دور کے میسور میں ایک مہاراجہ کو کسی چینی دانائے راز سے خبر ملی کہ قوت مردمی بڑھانے کا سب سے مجرب نسخہ پسے ہوئے ہیروں سے بنتا ہے۔ بس پھر کیا تھا اس منحوس انکشاف نے سرکاری خزانے کو بڑی تیزی سے خالی کر دیا' سینکڑوں قیمتی اور نایاب پتھر شاہی ملوں میں پیس کر خاک کر دیئے گئے' بعد ازاں انہی رقاصاؤں کو' جن کی خاطر اس باہ انگیز نسخے کی ضرورت پیش آئی' ہاتھیوں پر بٹھا کر فخریہ انداز میں پوری ریاست میں پھرایا گیا۔ ان ہاتھیوں کی سونڈیں اور کان مہاراجہ کے باقی ماندہ ہیرے جواہرات سے مزین تھے۔''

''مہاراجہ بڑودہ جس ہاتھی پر سواری کرتا تھا وہ انتہائی بد ذوقی سے سجا ہوتا۔ سو سالہ 'اس عفریت نما ہاتھی کے بڑے بڑے دانت 20 معرکوں میں کم و بیش 20 ہاتھیوں کو چھید چکے تھے۔ اس کی آرائش کا سارا سامان سونے کا تھا۔ مہاراجہ کے ہودے سے لے کر ہاتھی کی کمر کے گرد لپٹی ہوئی زین کے کپڑے تک سب کچھ سونے کا بنا ہوا تھا۔ سونے کی دس دس زنجیریں ہاتھی کے دونوں کانوں میں آویزوں کے مانند جھولتی تھیں' ان میں سے ہر ایک کی مالیت 25 ہزار پونڈ سے کم نہیں تھی اور ہر ایک اس کی ایک فتح کی علامت تھی''

اگرچہ ہاتھی بدستور شاہانہ کروفر کی علامت تھا لیکن بیسویں صدی کے آغاز میں شہزادے کاروں کی طرف مائل ہونے لگے تھے اور رولز رائس اس زمانے کی سب سے پسندیدہ کار تھی۔ ریاست پٹیالہ میں ایسی 27 کاریں تھیں۔ بھرت پور کی خوبصورت کنورٹیبل Convertable رولز رائس پر چاندی کی ملمع کاری تھی لیکن ہندوستان کی سب سے غیر معمولی اور شاہانہ کار الور کے مہاراجہ کی لنکا سٹر Lancaster تھی جسے مہاراجہ کے خصوصی اور منفرد ڈیزائن کے مطابق تیار کیا گیا تھا۔ گاڑی کا سٹرنگ ہاتھی دانت اور شوفر کا کشن سونے کا تھا۔ باقی تمام گاڑی ہو بہو اس کوچ کی نقل تھی جو انگلستان کے بادشاہوں کی رسم تاجپوشی کے لئے مخصوص تھی۔ یہ کوئی میکانکی معجزہ ہی تھا کہ اس بھاری بھر کم گاڑی کا انجن اسے 70 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھگا لیتا تھا۔

دولت کے بل بوتے پر نمائشی رنگ رلیوں کی ایک مثال مہاراجہ جونا گڑھ بھی ہے جس نے اپنی چہیتی کتیا کی 'شادی' پر لاکھوں روپے لٹا دیئے۔ شاہی ہاتھی اور مہاراجہ کے محافظ مکمل شاہانہ تزک و احتشام کے ساتھ عروسی جلوس کی قیادت کر رہے تھے اور راستے کے دونوں جانب کم و بیش ڈیڑھ لاکھ

افراد اس ''رسم عروسی'' کے تماشائی تھے۔ جلوس کے اختتام پر خوش قسمت ''کلبی جوڑے'' کے اعزاز میں پر تکلف ضیافت کا اہتمام تھا جس کے بعد انہیں خوبصورتی سے سجائے گئے حجلہ عروسی میں پہنچا دیا گیا۔ اس شاہی ڈھکوسلے پر اٹھنے والے اخراجات سے ' چھ لاکھ بیس ہزار آبادی کی اس ریاست کے کم و بیش 12 ہزار غریب عوام کی بنیادی ضروریات سال بھر کے لئے پوری ہو سکتی تھیں۔

شاہی محلات بھی وسیع و عریض ' شاندار اور انتہائی قیمتی سامان آرائش سے لدے ہوئے تھے۔ میسور کا شاہی محل چھ سو کمروں پر مشتمل تھا۔ جے پور کے ہوا محل کے صرف سامنے کے حصے میں 953 کھڑکیاں تھیں جن کے چوکھٹ سنگ مرمر کے تھے اور جنہیں ہاتھ سے تراش کر ' ان پہ خوبصورت کندہ کاری کی گئی تھی۔ اودے پور کا سفید سنگ مرمر کا محل جھلملاتی جھیل کی دھند میں کسی خوبصورت خواب کا منظر دکھائی دیتا تھا۔ ہمالیہ کی ترائیوں میں آباد ایک چھوٹی سی ریاست کپور تھلہ کے مہاراجہ کا محل فرانس کے شہر ورسیلز Versailles کے شاہی محل کی ہو بہو نقل تھا۔

بے لچک اور لاحاصل ذخیرہ اندوزی

کسی بھی معاشرے میں بورژوازی انداز عمل کے فروغ کے لئے ایسے معاشی اور سماجی محرکات ناگزیر ہیں جو بچت کی حوصلہ افزائی کریں اور اس طرح حاصل ہونے والے فاضل وسائل کا رخ تجارتی اور کاروباری سرگرمیوں کی طرف موڑ دیں۔ اس نظام کا تقاضا ہے کہ سرمایہ کاری کے ایسے ذرائع تلاش کئے جائیں جو زمین اور کھیتی باڑی سے کہیں زیادہ منافع دے سکیں تاکہ یہ احساس اجاگر ہو سکے کہ زمین کی ملکیت کے علاوہ بھی کچھ ایسے منافع بخش ذرائع آمدن موجود ہیں جو نئے ہونے کے باوجود معاشرے میں عزت اور وقار کا سبب بن سکتے ہیں۔ اسراف اور ذخیرہ اندوزی کے مقابلے میں بچت اور سرمایہ کاری اس نظام کے فروغ کی بنیادی شرط ہے لیکن اس معاملے میں بھی برصغیر ہند نے انوکھے اور انتہائی رجعت پسندانہ انداز فکر کا مظاہرہ کیا۔

شہزادگان نے جس طرح دولت سمیٹی اور اپنے محلات اور مقبروں کی تعمیر میں شان و شوکت کے اظہار کے لئے جس طرح اسے لٹایا ' برصغیر کی معیشت پر اس کے انتہائی مہلک اثرات مرتب ہوئے۔ ان کے پاس سونے ' کرنسی اور قیمتی پتھروں کے بے پناہ ذخائر تھے لیکن یہ بچت نہیں ذخیرہ اندوزی تھی جو معاشی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوئی۔ یہ جامد بچت ' جو تہ خانوں میں چھپائی گئی تھی ' تاجر کے کسی کام نہ آئی۔ اس دولت سے نہ تو معاشی ' کاروباری اور صنعتی سرگرمیوں کو فروغ ملا اور نہ ہی کبھی اس نے مال تجارت کی شکل اختیار کی۔ یہ منجمد سرمایہ تجارتی گردش سے ہمیشہ ناآشنا ہی رہا۔ اس لئے یورپ کے

مقابلے میں ہندوستان اور وادی سندھ کے سوداگر اور صنعتکار ہمیشہ سرمائے اور وسائل کی قلت سے دوچار رہے۔

کاروباری طبقات کے فروغ کے لئے ایسی شہری آبادیوں کا ارتکاز بھی ضروری ہے جن کا انحصار ان اشیائے صرف اور ضروریات زندگی کی ترسیل اور نقل و حمل پر ہوتا ہے جو شہری مراکز میں دستیاب نہیں ہوتیں لیکن ذات پات کا نظام' حرکت اور تغیر کا مخالف تھا اس لئے شہری آبادیاں فروغ نہ پا سکیں اور وادی سندھ اور ہندوستان کا تاجر اس فائدے سے بھی محروم رہا اور وہ محض فوج اور شاہی دربار کی نقل و حرکت کا محتاج بن کر رہ گیا۔

مضافات میں حکومتی اختیار کی عدم موجودگی نے سفر کی خواہشات کا گلا گھونٹ دیا۔ حکومتیں ڈاکوؤں راہزنوں اور ٹھگوں کا خاتمہ نہیں کر سکتی تھیں لہذا تاجر انجان جگھوں کی بے یقینی کے خوف سے اپنے گاؤں کی جانی پہچانی جگہ کے تحفظ کو چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوا۔ اس طرح تمام برصغیر پر پھیلا ہوا دیہات کا منجمد اور ساکت نظام مزید منجمد اور ساکت ہو گیا کہ اسی سکوت میں اسے سالمیت نظر آئی۔ کیا طرفہ تماشا ہے کہ مضافات کی جس 'بے حکومتی' اور انارکی نے ہندوستان کو مروجہ نظام کے تحفظ پر مجبور کیا' اسی نے مزید بے حکومتی کو جنم دیا۔

فاضل معاشی پیداوار کا ترقیاتی سرمایہ کاری سے گریز' بچت کے لئے سماجی دباؤ کی عدم موجودگی' 'خوابیدہ گاؤں' اور ذات پات کے نظام کی مضبوط' غیر متغیر اور دم گھونٹنے والی گرفت کے باعث برصغیر 'مرکزی حکومت کی بے اختیاری اور معاشرے کی افراتفری کے عذاب سے جان نہ چھڑا سکا۔ اس صورت حال نے یہاں کوئی ایسا طبقہ نہ ابھرنے دیا' جو اپنے وسائل اور مفادات کے تحفظ کے لئے طویل المیعاد اور ہمہ گیر امن و سکون کا داعی ہو۔ کسی طبقے اور کسی معاشی مفاد نے پارلیمان اور عدلیہ جیسے اداروں کے قیام کی کوشش نہیں کی تاکہ مطلق العنان بادشاہ کے یکطرفہ اور بے مہار اختیارات پر قدغن لگائی جا سکتی۔ پرامن انتقال اقتدار کا تسلسل بھی کسی طبقے کی ضرورت نہ بن سکا۔ پرشکوہ اور طاقتور مغل بادشاہوں کا مسلط کیا ہوا عارضی امن بھی ہربار جانشینی کی خونریز جھڑپوں کی بھینٹ چڑھتا رہا اور معاشرہ مستقل افراتفری کا شکار ہوتا چلا گیا۔

منصب کی غیر موروثیت

خود اپنی اور اپنے اجداد کی مثال سے خوفزدہ مغل' ممکنہ بغاوت کے تدارک کے لئے بہت سے حربے اختیار کرتے تھے۔ بادشاہ کے مصاحبین کی تقریباً 33 مختلف درجہ بندیاں تھیں جن میں صرف

دس سے دس ہزاری تک کے منصب دار تھے۔ پنج ہزاری یا اس سے بڑے منصب داروں کا شمار اکابرین حکومت میں ہوتا تھا لیکن یہ عہدے یا منصب موروثی نہیں تھے۔ اکبر تو ان منصب داروں کو نقدی کی صورت میں مشاہرہ بھی دیتا تھا جب کہ اکبر کے جانشینوں نے مشاہرے کی یہ گراں بار روایت ختم کر کے لگان کی وصولی کا نظام بحال کر دیا۔ اس نظام کا سقم یہ تھا کہ محصولات کی وصولی کو شاطرانہ انداز میں منظم کر کے اکثر اکابرین بہت مضبوط اور طاقتور ہو جایا کرتے تھے۔

قلاش کے مقابلے میں متمول جاگیردار آسانی سے بغاوت پر آمادہ ہو جاتا تھا۔ امیر جاگیردار زیادہ افراد ملازم رکھ سکتا تھا اور طویل عرصے تک مہم جوئی کے اخراجات برداشت کر لیتا تھا۔ جاگیر اسے علاقائی مستقر بھی فراہم کرتی جو مہم جوئی کی بنیادی ضرورت تھی لیکن وہ بادشاہ جن کی جانیں داؤ پر لگی ہوتیں وہ ان خطرات سے لاعلم بھی نہیں تھے۔

مغل بادشاہ ان خطرات کا تدارک دو طریقوں سے کرتے تھے۔ ایک تو افسران کے تبادلے کا طریق کار تھا جس کے تحت صوبیدار اور دوسرے اعلیٰ سرکاری عہدے دار شاذ و نادر ہی کسی ایک جگہ پر تین یا چار سال سے زیادہ عرصے تک تعینات رہ سکتے تھے۔ اکبر اپنے منصب داروں کو بغاوت میں کام آنے والے علاقائی مستقر سے محروم کرنے کے لئے ان کی جاگیریں بھی تبدیل کر دیتا تھا اور یورپی جاگیرداروں کے برعکس برصغیر کے جاگیردار اکثر اوقات ملک کے مختلف حصوں اور دور دراز علاقوں میں منتقل ہوتے رہتے۔

دوسرا طریقہ کار زیادہ اہم تھا جس میں منصب دار کی موت پر اس کی زمین اور جائیداد واپس سرکار کی تحویل میں چلی جاتی تھی۔ زمین کی ملکیت صرف اہل کار کی زندگی تک محدود ہوتی تھی اور نئی نسل کو بادشاہ کی خدمت کا سفر بھی نئے سرے سے شروع کرنا پڑتا تھا۔

جاگیردار کی زندگی میں اس کے واجب الوصول کی ادائیگی ہمیشہ بقایاجات کی صورت میں رکی رہتی جس کے باعث بہت سے منصب دار گزر اوقات کے لئے شاہی خزانے سے رقم بطور پیشگی وصول کرنے پر مجبور ہوتے۔ ہر جاگیردار کی موت پر اس کی جائیداد بحق سرکار ضبط کر لی جاتی اور سرکار کے تمام بقایاجات اور پیشگی ادائیگیاں وصول کرنے کے بعد ہی کچھ بچا کھچا واگزار کرنے کی نوبت آتی۔

اس سلسلے کی ایک نمایاں مثال آصف خان ہے جو شاہجہان کی محبوب ملکہ ممتاز محل کا باپ تھا۔ شہنشاہ نے اپنی ملکہ کے لئے پر شکوہ اور حسین تاج محل تو بنا دیا لیکن اس نے محبوب ملکہ کے مرحوم باپ اور اپنے لائق وزیر کی جاگیر کو نہیں بخشا۔ 1641ء میں شہنشاہ کے سسر کی موت پر اس کے کروڑوں روپے کے اثاثے بحق سرکار ضبط کر لئے گئے اور صرف دو لاکھ روپے اس کی بیوہ اور بچے کے پاس رہنے

دیئے گئے۔

مندرجہ بالا عوامل کے باعث عوام اور خواص دونوں ہی اپنی تمام ممکنہ بچت بھی خرچ کرنے کے درپے ہوتے تھے۔ عوام حملہ آوروں اور نئے نئے جاگیرداروں کی ہوس کے ڈر سے اور جاگیردار بادشاہ کے خوف اور ورثا کے لئے کچھ نہ چھوڑ سکنے کے قانون کے باعث اپنی زندگی میں ہی اپنا سب کچھ خرچ کر دینے پر مائل رہتے۔ ان حالات میں سرمائے کے یکجا ہونے کی توقع عبث تھی اور یہی وہ حالات تھے جو تاجر طبقے یا بورژوازی کے فروغ کی راہ میں رکاوٹ بنے۔ جہاں کہیں مٹھی بھر تاجر موجود بھی تھے تو ان کا احوال درباری امراء اور جاگیرداروں سے بہتر نہ تھا۔ بیرنگٹن مور Barrington Moore نے اس صورت حال پر خاصا چبھتا ہوا تبصرہ کیا ہے۔

> ''تاجر کے بارے میں ہندوستان کی سیاسی قیادت کا عمومی رویہ وہی تھا جو مکڑی کا مکھی کے بارے میں ہوتا ہے جب کہ یورپ اپنے تاجر کے لئے وہ جذبات رکھتا تھا جو ایک چرواہا اپنی گائے کے لئے رکھتا ہے۔ حالانکہ اکبر سب مغل شہنشاہوں سے زیادہ روشن خیال تھا لیکن اس کے نورتنوں میں بھی کوئی کولبرٹ Colbert نہیں تھا۔ ہندو علاقوں میں صورت حال غالباً زیادہ ابتر تھی۔ مقامی حکام میں سے اگر کسی کا انداز فکر کچھ مختلف بھی تھا پھر بھی وہ جلد دولت حاصل کرنے اور اسے جلد خرچ کر دینے پر مجبور تھا۔ ان سب باتوں کے پیش نظر، میرے نزدیک یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ ایک مخصوص قسم کے مسلط کردہ امن و سکون نے وہ حالات ہی پیدا نہیں ہونے دیئے کہ جاپان کی طرح ہندوستان بھی مروجہ زرعی نظام پر تجارتی رجحانات غالب آ سکتے۔ مغلوں کا نظام ایسی کسی بھی صورت حال کا متقل ثامت ہوا تھا''

اس صورت حال کے پیش نظر برصغیر میں بورژوازی اور پارلیمنٹ و آزاد عدلیہ جیسے بورژوا جمہوری اداروں اور بورژوا قوم پرستی کا معرض وجود میں آنا محال تھا اور یہ وہ مرحلہ تھا جب 1757ء میں پلاسی کا میدان جنگ ہندوستان پر برطانوی سیاسی بالادستی کا پہلا سنگ میل ثابت ہوا۔

ترقی کے مسدود راستے

راج کے عذر خواہ، پرسیوال سپئیر Percival Spear کا نام جن میں سب سے نمایاں ہے، اپنی تحریروں میں ہمیشہ یہ جواز پیش کرتے رہے ہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا بنگال پر قبضہ تجارتی اعتبار سے منافع

حش نہیں تھا اور کمپنی کے لئے ضروری تھا کہ وہ بنگال پر اپنے تسلط کے استحکام اور منافع حش تجارت کے فروغ کی خاطر مزید علاقے فتح کرے، مگر حقیقت میں یہ اس کی مجبوری نہیں بلکہ ہوس تھی۔

انگلستان اپنے برتر وسائل اور جدید ٹیکنالوجی کے ساتھ جب ہندوستان میں وارد ہوا تو یہ اس خطے کی سب سے بڑی بدنصیبی تھی۔ سماجی اور معاشی ترقی کی راہ میں برصغیر بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ یہاں تو ابھی قبل از صنعتی دور کا معاشرہ بھی وجود میں نہیں آسکا تھا کہ نوآبادیاتی تسلط کا آغاز ہو گیا جس کے نتیجے میں 18ویں اور 19ویں صدی کے دوران یہاں ترقی کی تمام راہیں مسدود کر دی گئیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یورپ اب تک بہت آگے نکل چکا تھا لیکن اس کے باوجود یہ ممکن تھا کہ اگر اپنے وسائل کو پوری طرح بروئے کار لایا جاتا' یہاں کی محنتی اور ہنرمند افرادی قوت خود اپنی ترقی کے حصول کے لئے کام کرتی' اس زمین سے لگاتار لہلہاتی فصلیں اٹھائی جاتیں اور ملکی مصنوعات دور دراز منڈیوں تک پہنچ سکتیں تو آزاد وادی سندھ اور ہندوستان بھی جدید معاشی دوڑ میں شامل ہوتے لیکن اس بدقسمت خطے کو ابھی طویل عرصے تک سامراجی غلامی کا طوق اپنے گلے میں سجائے رکھنا تھا' اسے ابھی دیر تک یورپی استعمار کی لوٹ کھسوٹ کا شکار ہونا تھا اور آئندہ دو صدیوں تک برطانوی سامراج کا زرعی لاحقہ بن کے رہنا تھا۔

مگر یہ مقابلہ مساوی سطح پر نہیں تھا۔ یورپ کے وسائل اس کی مادی اور سائنسی ترقی سے جلا پا رہے تھے اور سمندر پار کی بہت سی نوآبادیوں کے وسائل بھی اس کے تصرف میں آچکے تھے۔ وادی سندھ اور ہندوستان کے قبل از صنعتی دور کے معاشرے میں اتنی سکت نہیں تھی کہ یورپ کی اس دہری برتری کا مقابلہ کر سکتا۔

20

بحری قوت اور عسکری حکمت عملی

ساحلوں کا تضاد

ہندوستان پر یورپ کی برتری قائم رکھنے میں کئی اور عوامل بھی فیصلہ کن ثابت ہوئے اور بحری قوت کا تفاوت ' ان میں نمایاں ترین تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مغلوں کے زیر نگیں سبھی علاقے چاروں طرف سے خشکی میں گھرے ہوئے تھے۔ بحری سفر کا ذکر ہی کیا' اکثر مغل شہنشاہوں نے تو کبھی سمندر دیکھا بھی نہیں تھا۔ بحر اس بحر کی وسعتوں کا ادراک ان کی فہم سے بالاتر تھا۔ برصغیر ' خشکی پر محیط ایک ایسا وسیع و عریض خطہ تھا کہ جنوب کے دور افتادہ ساحلوں تک پہنچتے پہنچتے مغل فرمانروائی کی سانس اکھڑ جاتی۔ اس کے بعد سمندر پار کے سفر کی توانائی ہی کہاں باقی بچتی تھی۔

مغلوں کے پیشرو بھی بحری سفر یا بحریہ کی اہمیت سے قطعی نا آشنا تھے۔ خاص طور پر افغان اور وسطی ایشیائی اقوام تو صرف خشکی تک محدود تھیں ' انہیں کسی سمت میں بھی سمندر تک رسائی حاصل نہیں تھی۔ برصغیر میں ان کی آمد کے مقاصد محدود تھے اور ان کے لئے بحریہ کا تصور بے معنی تھا۔ لیکن سمندر سے ناآشنائی کے باوجود مغل دربار کے حوصلے کی داد دینا پڑتی ہے کہ جب افغان جرنیل قاسم خان نے 1586ء میں شہنشاہ اکبر کے لئے کشمیر فتح کیا تو اسے "امیر البحر" کے خطاب سے نوازا گیا حالانکہ اس بچارے نے بحری جہاز تو کیا دیکھا ہو گا' وہ تو شاید اس کے اگلے اور پچھلے حصے میں تمیز کرنے کی اہلیت بھی نہ رکھتا ہو۔

جہاز رانی کا پیشہ حکومتی سطح پر کبھی اتنی اہمیت حاصل نہ کر سکا کہ دہلی کے سلاطین یا شہنشاہ اس کی

سرپرستی کرتے۔ اس زمانے میں یہی بہت تھا کہ مشرق وسطیٰ، خلیج فارس اور خلیج بنگال کے درمیان تجارتی راستوں کو کھلا رکھا جاتا اور ان کی مناسب نگہداشت ہوتی کیونکہ بحری قطب نما Mariner's Compass کے بغیر جہاز رانی صرف ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ ہی ممکن تھی اور جزیرہ نما ہندوستان کے طویل ساحلی راستے ہندوستان سے آگے کہیں اور نہیں لے جاتے تھے کیونکہ اس رودبار کے پار مزید ریاستیں نہیں تھیں اس لئے سمندر سفر کے لئے کوئی ترغیب اور مجبوری بھی نہیں تھی۔

ہندوستان کے طویل ساحل کے آس پاس بہت کم جزائر ہیں حالانکہ جزیرہ نما ہندوستان جنوب میں بحر ہند کے اندر بہت دور تک چلا گیا ہے۔ برصغیر بے پناہ خشکی پر مشتمل ایک ایسا خطہ زمین ہے جس کا ساحل نسبتاً مختصر ہے۔ اس کے برعکس یورپی ریاستیں رقبے میں چھوٹی ہیں، زمین کی رسائی بھی سمندر میں زیادہ دور تک نہیں ہے لیکن زمینی علاقے کی وسعت کی نسبت ان کے ساحلوں کی طوالت بے پناہ ہے۔

دہلی ہر سمت میں سمندر سے کم و بیش ایک ہزار میل دور ہے جبکہ انگلستان کے کسی شہر کا فاصلہ سمندر سے ایک سو میل سے زیادہ نہیں۔ اسی لئے انگریز کے نزدیک بحری جہاز اتنا ہی اہم تھا جتنا وسطی ایشیائی منگول کے لئے گھوڑا۔ بحری قطب نما کی ایجاد نے یورپی جہازران کو ساحل سمندر کی احتیاج سے بھی آزاد کر دیا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ کسی زمانے میں برصغیر کے بعض علاقوں میں جہاز سازی ایک اہم صنعت تھی۔ جب بنگال بہت سے بحری بیڑوں کو جہاز فراہم کر رہا تھا تو اس وقت ملتان میں مضبوط ترین لنگر ڈھالے جا رہے تھے موریا اپنے دارالحکومت پاٹلی پتر سے پرے ٹھاٹھیں مارتے سمندر کو بڑی حسرت سے دیکھا کرتے تھے اور وہ ہمیشہ اسی تگ و دو میں رہے کہ ایک شاندار بحری بیڑا تشکیل دے سکتے۔ پھر جنوبی ہندوستان کی ریاستوں کے پاس بھی قابل ذکر تجارتی اور جنگی بحری بیڑے موجود تھے اور کول تو تھے ہی سمندر کے باسی جب کہ ان کے جانشین پلادی، چالکیہ اور پانڈویوں نے آپس میں بحری جنگیں بھی لڑیں اور اپنی افواج اور تجارتی سامان کی نقل و حرکت کے لئے بحری جہاز بھی استعمال کرتے رہے۔ وجے نگر کی ساحلی ریاست کے پاس بحری جہاز بھی تھے اور بندرگاہیں بھی۔

ہندوستان کا جنوبی جزیرہ نما کبھی سلطنت دہلی کا مطیع نہیں رہا لیکن بالآخر جب یہ علاقہ مغلوں کے زیر تسلط آیا تو یوں لگتا ہے جیسے انہوں نے باقاعدہ کسی حکمت عملی کے تحت، جنگ یا نقل و حمل کے لئے بحریہ کے استعمال کو ترک کر دیا تھا۔ وجہ کچھ بھی رہی ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ مغلوں نے کبھی اس معاملے کو اہمیت ہی نہیں دی اور ان کا اقتدار برصغیر کے ساحلوں تک ہی محدود رہا۔

سمندروں پر فیصلہ کن دسترس

بحری بیڑے کی عدم موجودگی نے حالات کی سنگینی کو بہت جلد واضح کر دیا۔ بحر ہند میں طاقت کا توازن بگڑ گیا۔ یورپی بحری قزاق ہندوستان کے سمندروں پر راج کرنے لگے۔ جزیرہ عرب کے راستے مکہ جانے والے زائرین بھی ان کی چیرہ دستیوں سے محفوظ نہیں رہے تھے۔ جہازوں کی لوٹ مار اور مسافروں کا قتل عام ایک معمول بن گیا۔ اس ظلم و تشدد میں پرتگالی سرفہرست تھے۔ اپنی اسی حیثیت کے باعث انہیں ہندوستان کی ساحلی ریاستوں کے درمیان طاقت کا توازن تشکیل دینے میں کلیدی اہمیت حاصل ہوگئی۔ مثال کے طور پر وجے نگر کی ہندو ریاست نے پرتگالیوں کے ساتھ دوستانہ روابط استوار کر لئے اور ان کے تعاون سے اپنی افواج کے لئے عربی اور ایرانی گھوڑے درآمد کرنے لگے۔ دوسری طرف پرتگالی جہازرانوں نے دکن کی مسلم ریاستوں کو یہی گھوڑے مہیا کرنے سے انکار کر دیا جس کے نتیجے میں دکن کے توسیع پسند غیر مسلم ہمسایوں کو فوجی برتری حاصل ہوگئی۔

اور پھر 1612 عیسوی میں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے دو جنگی جہازوں نے بحر ہند میں پرتگالی بحری قوت کو شکست سے دوچار کیا اور اس کے ساتھ ہی ہندوستان کے ساحلوں پر کمپنی کی برتری کا آغاز ہوا اور بے پناہ طاقت کی حامل اسلامی ریاست نے زائرین اور حاجیوں کی حفاظت کی ذمہ داری بھی کمپنی کو ہی تفویض کر دی۔

اس بات کا تو پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے مغلوں کی بحری تجارت اور آمدورفت کو پرتگالی قزاقوں کی دستبرد سے محفوظ رکھنے کے لئے ہندوستان کے مغربی ساحل پر سورت کی بندرگاہ حاصل کر لی تھی۔ سپئیر Spear نے اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے "کمپنی غیر اعلانیہ طور پر مغل سلطنت کی بحریہ کا کردار ادا کر رہی تھی" برطانیہ نے کس شاطرانہ انداز میں اپنے تیروں کا رخ سلطنت کے کمزور ترین حصے کی طرف موڑ دیا تھا اور یہ کیسی کامیاب حکمت عملی تھی۔

اورنگ زیب کے عہد حکومت میں '17ویں صدی کے اختتام سے پہلے اپنی اس یقین دہانی کے بدلے کہ ساحلی تجارت کی حفاظت ہوگی اور حاجیوں پر حملوں سے اجتناب کیا جائے گا۔ انگریزوں نے بنگال اور بنگال کے دوسرے علاقوں سے بہت سی رعایتیں حاصل کر لیں اور یوں چور 'چوکیدار' بن بیٹھا تھا اور کیا ستم ظریفی تھی کہ اس خطہ زمین پر قدرت کاملہ کے مالک 'دنیا بھر کی آسائشوں سے مالا مال اور بزعم خود زمین پر خدا کا سایہ کہلانے والے مغل اپنی سلطنت کی بحری حدود میں کتنے بے بس اور لاچار تھے۔

مغل بحری تجارت اور آمدورفت صرف یورپی جنگی جہازوں کی زد میں ہی نہیں تھی بلکہ مرہٹہ

لیڈر شیواجی نے بھی مغل سلطنت کے غیر محفوظ ساحلوں کو تختہ مشق بنا رکھا تھا۔ایک مختصر سے ہلکے پھلکے بحری بیڑے کے ساتھ وہ بیک وقت یورپی اور مغل بحری تجارت کو زک پہنچانے میں کامیاب تھا۔ شیواجی کی کارروائیوں سے مغلوں کا ناک میں دم آگیا تو اورنگ زیب نے اپنے سپہ سالار مرزا جے سنگھ کو ' جسے مرہٹہ سردار کی سرکوبی کے لئے بھیجا گیا تھا ' حکم دیا کہ وہ شیواجی کو مغل دربار میں آنے اور مرہٹہ قذاقی کے سلسلے میں گفت وشنید پر آمادہ کرے۔ شیواجی کو قائل کرنے کی کوشش کی گئی لیکن کھلے سمندروں میں مرہٹہ سردار کے مقابلے میں اپنی حکومت کی واضح لاچاری پر بادشاہ اس قدر برافروختہ تھا کہ اس نے مزید انتظار کئے بغیر شیواجی اور اس کے بیٹے کو گرفتار کرنے کا حکم دے دیا۔ دونوں گرفتار ہوئے تو اورنگ زیب اپنے سپہ سالار جے سنگھ کی کارکردگی پر اتنا ممنون ہوا کہ اسے جے پور کی موروثی جاگیر عطا کی۔

لہروں پر حکمرانی کے ناطے جنگوں کے فیصلہ کن مرحلے میں برطانیہ کو اکثر برتری حاصل ہوتی رہی۔ جنگ کے دوران خشکی پر نصب دشمن کی توپوں کی مار سے پرے ' کھلے سمندر میں انہیں گویا ایک محفوظ پناہ گاہ مل جاتی تھی۔ جب سراج الدولہ نے کلکتہ پر قبضہ کیا تو کمپنی کی بیشتر افواج سمندر کی جانب پسپا ہو گئیں۔ یہاں وہ سراج کی توپوں کے گولوں کی زد سے باہر اور محفوظ تھیں۔ سراج کے فوجی بے بس ہو کر دیکھتے رہے کہ برطانوی بحریہ پانیوں پر پڑاؤ ڈالے مدراس سے کمک کی منتظر رہی اور یہ کمک بھی سمندر کے راستے کسی رکاوٹ کے بغیر پہنچ گئی۔

اس طرح کمپنی کی مدراسی اور بنگالی فوجوں نے مل کر پلاسی کی جنگ میں نواب کو شکست دے دی۔ بعض مواقع پر ایسا بھی ہوا کہ بحری جہاز دریائی راستوں کے ذریعے خشکی سے محصور علاقوں میں پہنچ کر اچانک دشمن کو جا دبوچتے۔ 1840ء میں پنجاب پر بالادستی کی جدوجہد میں بھی برطانوی بحری جہازوں نے دریائے سندھ سے راوی کے راستے لاہور پہنچ کر شہر پہ گولہ باری کی۔

بحری بالادستی کے نتیجے میں حاصل ہونے والی برطانوی افواج کی سریع الحرکتی ہندوستان کے حکمرانوں کے لئے حیران کن تھی۔ بمبئی ' مدراس اور کلکتہ برطانوی کمپنی کے زیر تسلط تھے۔ ان کے درمیان وسیع علاقے برسرپیکار دشمن حکمرانوں کے قبضے میں ہونے کے باوجود برطانوی فوجوں اور جہازرانوں کے لئے سمندر ایک غیر متنازعہ اور آزاد راستہ تھا۔ ہندوستانی بحریہ کی عدم موجودگی کا مطلب یہ تھا کہ کوئی دشمن فوج ' کوئی دشوار گزار علاقہ اور کوئی اجنبی سرزمین برطانیہ کی راہ میں حائل نہیں تھی۔ برطانوی بحری جہاز بلا روک ٹوک برصغیر کے سمندروں میں رواں تھے ' وسائل کا حصول حسب خواہش اور حسب ضرورت ممکن تھا۔ مختلف محاذوں پر تعیناتی آسان تھی۔ سازوسامان اور افواج کی نقل وحمل

میں کسی قسم کے نقصان کا احتمال نہ تھا جب کہ خشکی کے راستے پیش قدمی میں جگہ جگہ تازہ دم اور جنگجو دشمنوں کا سامنا ناگزیر تھا کیونکہ 18 ویں صدی کے اختتام کے قریب برصغیر میں کسی ایک متحد سلطنت کا وجود نہیں رہا تھا۔

اٹھارویں صدی میں مغل اثر و رسوخ کے زوال کے ساتھ ہی برصغیر میں بے شمار چھوٹی چھوٹی ریاستیں نمودار ہونے لگیں۔ ان میں سے اکثر مغل بادشاہوں کی محض واجبی سی بالادستی قبول کرتی تھیں۔ کیونکہ ان کے پاس اپنی افواج تھیں اور اپنے تمام معاملات میں وہ قطعی خود مختار تھیں۔ سراج الدولہ اور علی وردی خان کا بنگال ' شجاع الدولہ کا اودھ ' ضابطہ خان اور اس کے بیٹے غلام قادر کا روہیل کھنڈ ' مرہٹوں کا مہاراشٹر ' کلہوڑوں اور تالپوروں کا سندھ ' نڈر حیدر علی اور جری ٹیپو کا میسور اور حیدر آباد کا نظام الملک جو میسور کے شمال میں اپنی باری کا منتظر تھا اور وادی سندھ کے علاقے میں سکھوں کی ابھرتی ہوئی قوت' برصغیر کی ان گنت چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں یہ اہم ' طاقتور اور قابل ذکر نام تھے۔ دوسری طرف سمندر میں نقل و حرکت کی آزادی کے باعث انگریزوں کو فیصلہ کن برتری حاصل تھی۔ مختصر اور درمیانے حجم کی حکومتوں کے زیر تسلط علاقوں سے گزرے اور ان سے الجھے بغیر انگریز ہر ساحلی ریاست اور دشمن تک پہنچ سکتے تھے۔ ہندوستان کا جنوبی جزیرہ نما ساحل اور اس جزیرہ نما کے بہت سے دریا انگریزوں کو خشکی میں بہت دور تک ' بے خبر ریاستوں پر حملہ آور ہونے کے نسبتاً محفوظ مواقع فراہم کرتے تھے۔ یوں سمندر سے اچانک حملہ آور ہونے کا عنصر اکثر اوقات فیصلہ کن ثابت ہوتا تھا۔

بحری بالادستی سے سفارت کاری اور سامراجی توسیع پسندی کو بہت مدد ملی۔ کسی قسم کی سودے بازی اور اتحاد قائم کئے بغیر ' موقع محل کی مناسبت سے دشمنوں کو چن چن کر تنہا کرنے کے بعد ایک ایک کر کے ختم کیا جا سکتا تھا۔ ہندوستان کے ساحلوں پر لنگر انداز ہونے سے پہلے ہی یورپ کو بحری برتری حاصل تھی۔ برصغیر میں داخل ہونے کے بعد انہوں نے جو حکمت عملی اختیار کی وہ معروضی اور ٹھوس سائنسی بنیادوں پر استوار ہونے کے باعث زیادہ کامیاب ثابت ہوئی۔

توہم پرستی بمقابلہ حربی سائنس

یورپ میں سائنسی ایجادات کے عہد نے مادی زندگی کے ہر شعبے کو اوج کمال کے حصول پر اکسایا۔ یہ دور تحقیق اور فنی مہارتوں کو بروئے کار لانے کا دور تھا۔ تحقیق کے نتیجے میں اجتماعی معاشرتی سرگرمیوں میں ایک نیا بانکپن پیدا ہوا اور انسانی جدوجہد کے نت نئے انداز روشناس ہوئے۔ صاف ظاہر ہے کہ تحقیق انہی شعبوں پہ مرکوز رہی جہاں بہت کچھ داؤ پر لگا تھا اور منافع کی شرح بھی زیادہ تھی کیونکہ

سرمایہ کاری تو وہیں ہوتی تھی جہاں سے مزید دولت اور مزید سرمائے کا حصول متوقع تھا اور جنگ ایسا ہی ایک شعبہ تھا۔

یورپ میں جنگ اور اس سے متعلقہ تمام شعبے سائنس کی برکات سے فیض یاب ہو رہے تھے اور ہندوستان ابھی تک قرون وسطیٰ کے جنگی رموز ہی آزما رہا تھا۔ سائنسی اصول اور ضابطے تو بہت دور کی بات ہے یہاں تو جنگی 'حکمت عملی' کے ماہرین بہت سے اہم اور نازک فیصلوں کے لئے توہم پرستی کا سہارا لیتے تھے۔

شہنشاہ ہمایوں 1540 عیسوی میں ہندوستان سے فرار ہونے پر مجبور ہوا اور ایران میں صفوی بادشاہ طہماسپ کا مہمان رہا۔ مگر 1553ء میں جب شیر شاہ کا انتقال ہوا تو ہمایوں کے حوصلے بلند تھے۔ وہ اپنے بھائی کامران مرزا سے کابل اور قندھار چھین چکا تھا۔ اس کے تمام مدمقابل بھائی راستے سے ہٹ چکے تھے۔ عسکری مرزا جلاوطن ہوا اور مکہ جاتے ہوئے راستے میں انتقال کر گیا۔ ہندال مرزا لڑائی میں مارا گیا اور کامران کو بینائی سے محروم کر دیا گیا۔ شیر شاہ کے جانشینوں کی پھیلائی ہوئی افراتفری کے نتیجے میں ہندوستان سسک رہا تھا اور ہمایوں بہت محفوظ اور طاقتور ہو چکا تھا لیکن اس کے باوجود توہم پرستی ہمیشہ اس کی جنگی حکمت عملی اور منصوبہ سازی کی بنیاد ٹھہرتی۔

جب اسے ہندوستان سے حملہ آور ہونے کی دعوت ملی تو کسی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے اس نے قندھار شہر سے باہر تین مختلف سمتوں میں تین گھڑ سوار روانہ کئے تاکہ وہ اپنے راستے میں آنے والے سب سے پہلے شخص کا نام پوچھ کر آئیں۔ اس طرح جو نام حاصل ہوئے وہ دولت ' مراد اور سادات تھے جنہیں نیک شگون قرار دیتے ہوئے دہلی پر حملہ کرنے کا فیصلہ ہوا۔ (سوچئے تو کہ چوں کو ماں باپ کے دیئے ہوئے نام کبھی برے شگون کے مظہر ہو سکتے ہیں؟) گویا اس عہد میں جب یورپ نے جدید ترین سائنسی ایجادات کی بدولت انتہائی موثر جنگی حکمت عملی وضع کر لی تھی' ہندوستان میں اہم نوعیت کی حربی منصوبہ بندی کے لئے ابھی تک محض اتفاقات کو بنیاد بنایا جا رہا تھا۔

یورپ میں جدید جنگی منصوبہ سازی پر موثر عملدرآمد کے لئے فنی مہارت کے حصول پر توجہ دی جا رہی تھی۔ ایسی صف بندیاں وضع کر لی گئی تھیں جن پر عمل پیرا ہو کر دشمن کو زیادہ سے زیادہ زک پہنچاتے ہوئے اپنی افواج کے نقصان کا احتمال کم تھا۔ ہندوستان میں مرہٹہ صف بندی ہی جنگ لڑنے کا ایک انوکھا انداز تھا۔ مرہٹے عام طور پر گوریلا جنگ کو فوقیت دیتے لیکن جب کبھی وہ میدان جنگ میں صف آراء ہوتے تو اپنی تمام تر توانائی کے ساتھ 'بالکل سامنے سے لگاتار اور غول در غول حملہ آور ہو کر کٹتے اور کاٹتے چلے جاتے لیکن اس مقبول حکمت عملی کو انگریز کی جدید ترین اور انتہائی موثر صف

مدیوں کا سامنا تھا۔

کمان داری کے نظام اور مواصلاتی رابطے سے گھڑ سواروں کی پیش قدمی اور توپ خانے کی ترتیب تک ' فن حرب کے تمام شعبوں میں انگریز اپنے ہندوستانی ہم عصروں سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ اس دور میں جب توڑے دار بندوق سے ایک بار فائر کر کے اسے دوبارہ لوڈ کرنا وقت طلب اور صبر آزما تھا ' انگریز فوجیوں کی صف آرائی کا انداز بہت موثر ثابت ہوا۔ انہوں نے فائر اور لوڈ کے درمیانی فاصلے کے پیش نظر اپنی افواج کو اس طرح ترتیب دیا کہ میدان جنگ میں غنیم پر گولیوں کی بوچھاڑ مسلسل جاری رہتی۔

توپ بردار گھڑ سوار دستے یورپ کی ایک اور اہم اختراع تھے۔ اب تک توپیں گھڑ سوار تو کیا پیادوں کی رفتار کا ساتھ دینے سے بھی قاصر تھیں۔ میدان جنگ کی نئی صف بندی کا تقاضا تھا کہ توپ خانہ 'گھڑ سوار دستوں کے حملے سے پہلے کارروائی کرے۔ جب چھ پونڈ وزنی گولہ داغنے والی توپ اور توپخانے کا عملہ دونوں گھوڑے کے ہمرکاب ہوئے اور انہیں گھڑ سوار دستوں کی رفتار ملی تو یہ ہلکی مگر سبک رفتار توپیں ہندوستان کی ان بھاری بھرکم توپوں سے کہیں زیادہ موثر ثابت ہوئیں جنہیں ست رفتار بیل ہانکتے تھے۔ یورپی افواج نے گولہ باری کی صلاحیت میں نپی تلی کمی کر کے مجموعی لحاظ سے اپنے توپ خانے کو سبک رفتار بنا لیا تھا۔ دشمن کے مقابلے میں یہ ایک واضح برتری تھی۔

جدید تربیت اور تن آسانی کا عارضہ

یورپ میں فوج کی تنظیم و تربیت کو جدید خطوط پر استوار کیا جا رہا تھا۔ سینڈھرسٹ Sandhurst کی معروف عالم فوجی تربیت گاہ قائم ہو چکی تھی جہاں سے سال بہ سال فارغ التحصیل ہونے والے طالب علموں کی اچھی خاصی تعداد دنیا بھر کے جنگی میدانوں میں داد شجاعت دے رہی تھی۔ فرانسیسی اشرافیہ کی مخصوص فوجی اکادمی ایکو۔ل ملی تیغ Ecole Militaire میں 1751ء سے فوجی تربیت دینے کا آغاز ہو چکا تھا۔ کچھ ہی سال بعد اس ادارے کا ہونہار اور ممتاز ترین طالب علم نپولین بوناپارٹ یہاں سے فارغ التحصیل ہوا۔

نئی صدی کے ساتھ ہی انگلستان میں ڈیوک آف یارک کے ہاتھوں "رائل ملٹری اکیڈیمی" کا آغاز ہوا۔ یہ اکادمی بھی 1812ء میں سینڈھرسٹ منتقل ہو گئی۔ چند سال بعد ایڈیس کومب Addiscombe کے مقام پر ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک کالج قائم کیا جو توپچیوں اور انجینئروں کی خصوصی تربیت کے لئے مخصوص تھا۔ جب یہ افسران ہندوستان پہنچتے تو انہیں ایک اور سلسلہ امتحانات

سے گزرنا پڑتا تھا جس میں ریاضی سے متعلقہ مضامین مثلاً لوگار تھم Logarithm ' عملی جیومیٹری Practical Geometry ' پلین ٹرگنو میٹری Plain Trignometry کو خصوصی اہمیت دی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ عملی تربیت کے مختلف شعبوں میں 'چین باکس' 'بلندی پیا' 'زاویہ پیا' دوربین کے استعمال اور راستے کا نقشہ بنانے کی اہلیت جانچنے کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ میسن Mason لکھتا ہے کہ "فوج میں شمولیت اختیار کرنے کے بعد 14 مہینوں کے دوران نوجوان افسر کے لئے ضروری تھا کہ وہ تمام تر جزئیات کے ساتھ قلعہ بندی کی منصوبہ سازی میں جامع اہلیت کا مظاہرہ کر سکے اور اس کے لئے 'وا بان' Vauban کے نظام قلعہ بندی پر مبنی امتحان میں کامیابی حاصل کرنا بھی لازمی تھا"۔

کیا ہندوستان یا وادی سندھ کی فوج کا کوئی جوان یا افسر اس وقت تک کبھی ایسی مختلف النوع تربیت حاصل کرنے کا سوچ بھی سکتا تھا؟

اور بھی کئی عوامل تھے جن کی بناء پر ہندوستان کا نظام حرب انحطاط پذیر تھا۔ بابر سے اورنگ زیب تک ' چھ نسلوں کے دوران نہ تو مادی اور فنی اعتبار سے کوئی پیش قدمی ہوئی اور نہ ہی جنگی حکمت عملی اور آلات حرب میں کوئی بنیادی تبدیلی آئی ' اگر کچھ فرق پڑا بھی تھا تو صرف اتنا کہ مغل افواج پہلے سے کہیں زیادہ کمزور اور غیر موثر ہو چکی تھیں۔

بابر کی فوج حیران کن حد تک سبک رفتار تھی۔ وہ اور اس کے جرنیل شہسوار تھے جو ہاتھی پہ سوار ہو کر جنگ نہیں لڑتے تھے۔ اورنگ زیب کے عہد تک پہنچتے پہنچتے شاہی فوج تن آسان اور ست ہو چکی تھی۔ شہنشاہ اور اس کے جرنیل جنگ کے دوران گھوڑوں کے بجائے اب ست رفتار ہاتھیوں کے پر تکلف لیکن غیر محفوظ ہودوں میں بیٹھ کر جنگوں میں شریک ہوتے تھے۔

بابر نے جب ہندوستان فتح کیا تو اپنے راستے میں آنے والے تمام دریاؤں کو تیر کر عبور کیا۔ اکبر ایک انتھک شہسوار تھا اور وہ پیدل بھی میلوں تک ستائے بغیر سفر کر لیتا تھا۔ اس کے برعکس ' 18ویں صدی میں ان کے جانشین میدان جنگ میں بھی پالکی پہ سوار ہوتے تھے اور اکثر و بیشتر ان کی پسندیدہ خواتین بھی ساتھ ہوتی تھیں۔ جاہ و جلال اور شان و شوکت کی نمائش کے لئے بھی بہت سا غیر ضروری سازو سامان ان کے ساتھ ہوتا تھا جس سے ان کی حرکت پذیری میں مزید کمی آجاتی تھی۔

جفاکش بابر کی سریع الحرکتی اس کے پڑپوتے جہانگیر کی تن آسانی اور نمود و نمائش کے سامنے دم توڑ چکی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایک بڑے شہر کے مساوی آبادی شہنشاہ کی ہم سفر ہوتی تھی لیکن اس انبوہ کثیر میں لڑنے والے افسر اور سپاہی بہت کم ہوتے تھے۔

جیمز اول کے دور میں برطانیہ کے سفیر سر ٹامس رو Sir Thomes Roe نے اپنی تحریر میں

لام پر روانہ ہونے والے بادشاہ جہانگیر کے جس پڑاؤ کا نقشہ کھینچا ہے اس کے مطابق خیموں کا یہ شہر 20 میل قطر میں پھیلا ہوا تھا جس کے مرکز میں اک ترتیب کے ساتھ بازار اور دکانیں تھیں۔ ہر نئے پڑاؤ کے لئے خیموں کی تنصیب کا نظام اتنا مستقل تھا کہ ہر شخص جانتا تھا اسے کس ضرورت کے حصول کے لئے کس طرف جانا ہے۔ شہنشاہ کا خیمہ بہت سے حصوں پر مشتمل گویا ایک مختصر سا محل ہوتا تھا۔ اور تنصیب سے پہلے خندقوں اور دوسری رکاوٹوں کے ذریعے اس کی باقاعدہ قلعہ بندی کی جاتی تھی۔ ہر خیمے کے ساتھ بالکل اسی جیسا ایک اور خیمہ بھی ہوتا تھا۔ ایک زیر استعمال ہوتا اور دوسرے کو ہراول دستہ اگلے پڑاؤ پر نصب کر رہا ہوتا۔

اتنا بڑا لاؤ لشکر اپنے بے شمار لوازمات کے ساتھ جنگی رفتار سے کیسے سفر کر سکتا تھا؟ ظاہر ہے قافلہ اپنے سب سے سست حصے کی رفتار کے مطابق ہی آگے بڑھ سکتا تھا۔

شاہجہان کے عہد میں عددی لحاظ سے تو مغل فوج بہت زیادہ تھی لیکن اس کی حربی استعداد ماضی کے مقابلے میں کمتر تھی۔ جنگی مہمات کے دوران ملازمین اور خدام خاص کی تعداد' سپاہیوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوتی تھی۔ جنگ میں پیادہ اور گھڑ سوار دستوں کے بجائے ہاتھیوں پر زیادہ انحصار کیا جاتا تھا جو دشمن فوج کو پیچھے دھکیلنے اور کچلنے کے لئے استعمال ہوتے تھے۔

اورنگ زیب کے زمانے میں تو شاہی خزانہ بھی شہنشاہ کے ساتھ چلتا تھا۔ ایک سو اونٹ سونے اور دو سو چاندی سے لدے ہوتے تھے۔ تمام سرکاری دستاویزات اور شکار کے لوازمات (باز اور چیتے) بھی ساتھ ہوتے تھے۔ پچاس اونٹ اور ایک سو بیل گاڑیوں پر شہنشاہ' درباری مقربین اور بیگمات کے ملبوسات اور تیس ہاتھیوں پر ان کے زیورات اور وہ تحائف ہوتے جو فتح مندی کی صورت میں بہادری کا مظاہرہ کرنے والے فوجی کمانداروں کو انعام و اکرام کے طور پر عطا کئے جاتے تھے۔ عالمگیر کا صرف متحرک دارالخلافہ ہی 30 میل پر محیط ہوتا تھا۔ خیموں کے اس شہر میں کم و بیش 5 لاکھ افراد' 50 ہزار اونٹ' 30 ہزار ہاتھی اور 250 بازار ہوا کرتے تھے۔ ان سب کے خور و نوش کا انتظام بھی ساتھ ہی تھا۔ یہی کثیر و متحرک آبادی جنوبی جزیرہ نما ہندوستان میں عالمگیر کے 25 سالہ قیام کے دوران تمام فاضل غلہ اور دولت چاٹ گئی۔

اس طرح وجود میں آنے والے فوجی ڈھانچے کا ایک اور مہلک اثر یہ ہوا کہ متعاقبین شاہی کی ثقافت نے رواج پایا۔ جب تک کوئی شہنشاہ کے قرب و جوار میں ہوتا یا شاہی اثر و رسوخ موثر ہوتا' لوگ شہنشاہ کے حامی و موئد ہوتے لیکن بادشاہ کی پہنچ سے باہر ہوتے ہی یا اس کے قریب رہتے ہوئے بھی اگر انہیں بادشاہ کے اقتدار میں ذرا سی کمزوری کا شائبہ ہوتا تو بڑی آسانی سے وہ اپنی وفاداریاں تبدیل کرنے یا

غداری پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ لہٰذا حالات سے قطع نظر' مسند اقتدار پر فائز یا اس کے متمنی کے لئے شاہی ہاتھی سے اترنا انتہائی مہلک غلطی ثابت ہوتا۔

ساموگڑھ کے معرکے میں ایک ایسے مرحلے پر جب اورنگ زیب کو تقریباً شکست ہو چکی تھی' دارا ہاتھی کے ہودے سے اتر کر دہلی کا تخت اور اپنی جان دونوں گنوا بیٹھا۔ حالانکہ دارا گھمسان کی لڑائی میں ذاتی طور پر شریک ہونے کے لئے ہودے سے اتر کر خود گھوڑے پر سوار ہوا تھا لیکن اس کی طرف سے لڑنے والوں نے خالی ہودے سے یہ مطلب اخذ کرنے میں دیر نہیں لگائی کہ شہزادہ فرار ہو گیا ہے۔ چند ہفتوں بعد کھجوہ کی لڑائی میں شجاع نے بھی یہی غلطی دہرائی اور شکست اس کا مقدر ہوئی۔

شاہی قیادت کی معمولی سی کمزوری پوری ہندوستانی فوج پر کس طرح فوری اثرات مرتب کرتی تھی' دارا شکوہ اور شجاع سے سرزد ہونے والی ڈرامائی لغزشوں سے اس کا اندازہ بڑی آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ شجاع ہاتھی پر اپنی واضح موجودگی کی اہمیت نظر انداز کر کے گھوڑے پر سوار ہوا اور ساموگڑھ میں دارا کی شکست کی طرح' یہاں بھی کھیل فوراً ہی ختم ہو گیا۔ شجاع کا خالی ہودہ اجتماعی پسپائی کا اشارہ ثابت ہوا' اس کے مقربین یکایک تتر بتر ہو گئے۔ شجاع مایوسی کے عالم میں چلاتا رہا کہ وہ مرا نہیں زندہ ہے لیکن اس کے بہت سے ساتھی تو غنیم کو گلے بھی لگا چکے تھے۔

اورنگ زیب ایک اچھا قیافہ شناس اور کہیں بہتر جرنیل تھا۔ وہ بدترین حالات میں بھی ہمہ وقت اپنی فوج کی نگاہوں کے سامنے رہنے کی اہمیت سے آگاہ تھا۔ ساموگڑھ کی لڑائی میں اس نازک مرحلے پر جب یوں لگتا تھا کہ قسمت اس کا ساتھ چھوڑ چکی ہے اور بمشکل ایک ہزار افراد اس کے ساتھ رہ گئے تھے۔ اورنگ زیب نے حکم دیا کہ اس کے ہاتھی کی ٹانگوں کو زنجیروں سے جکڑ دیا جائے تاکہ پسپائی کا کوئی امکان ہی باقی نہ رہے۔ اس حکمت عملی کا نتیجہ یہ نکلا کہ بادشاہ کے جانثاروں نے جنگ کا پانسہ پلٹ کے رکھ دیا لیکن اس سے ہندوستانی فوج کے سلسلہ کمانداری کی ایک نمایاں کمزوری بھی واضح ہو کر سامنے آئی۔

مغلوں کی فوج ایک ایسے سیل انگیز' سست رو اور بھاری بھرکم عفریت کا روپ دھار چکی تھی جس کے وجود کا سارا دارومدار صرف ایک شخص کی سلامتی اور اس کی موجودگی سے مشروط تھا' اس میں مرہٹوں کی سبک رفتاری کی مزاحمت یا ان کے حملوں کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں تھی اور جہاں تک انگریزوں کا تعلق ہے تو یہ قطعی طور پر ایک مختلف کھیل تھا۔

فطری شجاعت بمقابلہ نظم و ضبط

چونکہ انگریزوں نے برصغیر پر برطانوی راج فوج کے بل بوتے پر حاصل کیا تھا اور فوجی ہی اس کی سرحدوں کے ضامن تھے اس لئے سپاہی کی زندگی راج کا اعصابی مرکز بن چکی تھی۔ انگریز جہاں بھی پہنچے انہوں نے سبز چھاؤنیوں کا جال بچھا دیا۔ ان چھاؤنیوں میں وہ پوری منصوبہ بندی کے ساتھ سپاہیوں کے بیرک 'افسروں کے بنگلے' قبرستان 'گرجے' ڈیری فارم 'مذبحہ خانے' فوجی ہسپتال اور افسران کے لئے کلب تعمیر کرتے۔ فوجی رسومات بھی انہیں مقامی آبادی کے مقابلے میں منفرد و ممتاز کرتی تھیں۔ رات کے پچھلے پہر سنتری کی تبدیلی کسی مقدس رسم کی طرح بگل بجا کر ادا کی جاتی تھی۔ فوجیوں کو عام شہریوں سے الگ تھلگ رکھا جاتا تھا۔ یہ ماہرین کا شاہی مراعات یافتہ طبقہ تھا۔ ورزش اور تنظیم کا انہماک اور تربیت و مہارت کا حصول ان کے فرائض میں شامل تھا۔ یہاں مرتبے اور مراعات کا تعین غیر مبہم اور واضح تھا۔ ضابطوں پر مکمل انصاف اور سختی سے عملدرآمد کرایا جاتا۔ مقامی حکمرانوں کے جز وقتی اور مال غنیمت کے متلاشی فوجیوں کے مقابلے میں یہ ایک قطعی مختلف صورت حال تھی۔

کالی کرنجن قانونگو نے ایک لڑائی کا احوال بیان کرتے ہوئے ان دو متضاد جنگی حکمت عملیوں کے فرق کو بڑی وضاحت سے نمایاں کیا ہے جس میں بھرت پور کی فوج اپنے بہادر اور ولولہ انگیز سپہ سالار کی قیادت میں انتہائی دلیرانہ انداز میں ایک بے سود جنگ لڑی۔

> "بہادر گجر سردار اپنے دلیر ساتھیوں کو جوش دلاتا پوری برق رفتاری کے ساتھ دشمن کے توپ خانے پر حملہ آور ہوا لیکن گولیوں کی بوچھاڑ اور توپوں کی مسلسل گولہ باری نے حملہ آور کی صفوں کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ زخمی سردار کی قیادت میں بھرت پور کے فوجیوں کی ایک قلیل تعداد دشمن کی صف بندیوں کو چیرتی ہوئی دور تک اندر چلی گئی اور شجاعت کا روح پرور مظاہرہ کرتے ہوئے دشمن کی سنگینوں کا شکار ہو گئی۔ یہ جنگ صرف 2 یا 3 گھنٹے جاری رہی۔ سائنس اور منظم منصوبہ بندی کے خلاف یہ مقامی آبادی کی جرات مندانہ جدو جہد کی افسوسناک مثال تھی۔"

اس تفاوت کو ولپرٹ Wolpert نے سینٹ ٹوم St. Thome کی لڑائی (1746ء) کے احوال میں اس طرح بیان کیا ہے کہ "ہندوستانی فوج کو 230 فرانسیسیوں نے اپنے تربیت یافتہ 700 مقامی سپاہیوں کی مدد سے شکست دی۔ وہ توپ خانہ' توڑے دار بندوق اور یورپی طرز حرب کی منظم قوت تباہ کن مہارت کے ساتھ کام میں لائے"

اس لڑائی کے تقریباً ایک سو سال بعد جیمز برنز James Burnes نے ایک اور جنگ کا احوال بیان کرتے ہوئے جو انداز اختیار کیا ہے اس سے تو یہی معلوم دیتا ہے کہ سندھی حکمرانوں نے ایک صدی گزر جانے کے باوجود بھی جدید طرز کو نہیں اپنایا تھا۔ برنز لکھتا ہے "سندھی حکمرانوں کی آہنی گرفت نے اگرچہ عوام کے جنگجو طبقے کی دلیرانہ خو کو سختی سے کچل دیا تھا اور سندھ کے عمومی سکوت میں ان کی توانائیاں بجھی ہوئی راکھ کا ڈھیر بن گئی تھیں لیکن اس کے باوجود انہیں لٹیرے ہی قرار دیا جاتا تھا۔ جو کسی بھی ایسے مقصد کے لئے ہتھیار بند ہو سکتے تھے جس سے انہیں نئی توانائی یا لوٹ مار کے مواقع حاصل ہوں...... میدان جنگ میں سندھی سپاہی کسی ضابطے کا پابند نہیں ہوتا۔ اس کی تنخواہ شرمناک حد تک قلیل اور اس کا حصول بھی عام طور پر غیر یقینی ہوتا ہے اس لئے مہم جوئی کے دوران 'راستے میں آنے والی دیہی آبادیوں سے اپنی ضروریات پوری کرنے میں وہ خود کو مکمل طور پر حق جانب سمجھتے ہیں .... سندھ کے امیر جب لام بندی کرتے ہیں تو ان کی فوج مختلف طبقوں اور بھانت بھانت کے بد لباس کرائے کے فوجیوں کا ٹولہ نظر آتی ہے۔ ان میں سے بیشتر وہ مہم جو ہوتے ہیں جو بلوچستان کے پہاڑوں سے اتر کر نیچے آتے ہیں۔ رند بھی ایک ایسا ہی قبیلہ ہے' موجودہ حکمران خاندان نسلی اعتبار سے خود کو اسی قبیلے سے منسلک گردانتا ہے"

اور سولہ سال بعد اسی 'فوج' نے میانی کے مقام پر انگریزوں کا مقابلہ کیا۔

میانی کی جنگ کے واقعات ایک بار پھر وادی سندھ اور ہندوستان کی افواج کے مقابلے میں برطانیہ کی سائنسی اور تنظیمی برتری کو اجاگر کرتے ہیں۔ ایک ایسے ہی واقعے کے بارے میں سیٹھ نومل اس طرح رقم طراز ہوتا ہے کہ "سر چارلس نیپئر Sir Charles Napier ہالہ تک پہنچ چکا تھا۔ اس کی پیش قدمی روکنے کے لئے تالپور سردار اپنی فوج کے 30 ہزار جوانوں کے ساتھ میانی کی طرف روانہ ہوئے جو حیدرآباد سے چار کوس (12 میل) کے فاصلے پر ہے۔ سر چارلس کی کمان میں صرف دو ہزار پانچ سو فوجی تھے لیکن سب کے سب بے حد منظم اور اعلیٰ تربیت یافتہ۔ اس کے برعکس تالپوروں کی فوج ' عجلت میں اکٹھے کئے گئے ناتجربہ کار بلوچوں کا ایسا اجتماع تھا جس کی قیادت ' جنگی حکمت عملی سے ناآشنا اور غیر تربیت یافتہ جرنیلوں کے ہاتھ میں تھی۔ میانی کی جنگ میں تالپوروں نے شکست کھائی اور وہ میدان جنگ سے فرار ہو گئے۔ بلوچوں نے بڑی بے جگری سے تلوار کے جوہر دکھائے لیکن بنیادی طور پر وہ سب غیر تربیت یافتہ ہی تو تھے"

ایک اور راوی جو 1843ء میں ہونے والی میانی کی اس جنگ کا غالباً عینی شاہد تھا۔ اس کا بیان ایچ ٹی لیمبرک H.T.Lambrick نے 1907ء کے سندھ گزیٹئر میں رقم کیا ہے "یہ جنگ .... ایک بڑے ہجوم سے کچھ زیادہ منظم گروہ کو تتر بتر کرنے کے مترادف تھی..... ان میں تنظیم کا فقدان تھا۔

بیک وقت ان کے 20 فوجی ' برطانوی سنگینوں میں پروئے جانے یا توپ کے گولے کی زد میں آنے کے لئے حملہ آور ہوتے تھے" ایک اور تجزیہ نگار کی رائے ہے کہ "اگر بلوچوں کے پاس تنظیم ہوتی اور ان کے سرداروں پر اعلیٰ قیادت کو مکمل اختیار حاصل ہوتا اور دلجمعی کے ساتھ مقصد کے حصول کی منصوبہ بندی ہوتی تو ان کا لشکر جیت سکتا تھا ' لیکن یہاں تو یہ تینوں عناصر ناپید تھے۔ پھلیلی نہر کے کنارے کنارے ' کندھے سے کندھا ملائے بلوچ صرف سامنے کی طرف دیکھتے تھے۔ ان کی بے خوف لیکن غیر منظم شجاعت اکارت گئی۔ ان کے حملوں میں کوئی ربط نہ تھا اور ان کا یہ ناکام معرکہ صرف وفادار قبائلی سرداروں کی انفرادی کوششوں کا نتیجہ تھا۔

اصل میں نظم وضبط ایک بہت بڑی فوقیت تھی۔ یہ حیران کن امر ہی تو تھا کہ اسی نسل کے افراد انگریزوں کی کمان میں بہت منظم فوجی ثابت ہوئے جب کہ مقامی کمان داروں کے تحت لڑتے ہوئے ان میں نظم وضبط نام کی کسی شے کا وجود نہیں تھا۔ سکھوں کے ساتھ پہلی جنگ کے بعد 1846ء کے معاہدۂ کشمیر کے مطابق ہنری لارنس Henry Lawrence نے گلاب سنگھ کو کشمیر کا راجہ مقرر کر دیا۔ لارنس 10 ہزار منظم سکھ فوج کی قیادت کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ صرف ایک انگریز اور تھا اور گلاب سنگھ بھی سکھ نہیں ہندو تھا۔ اس کے باوجود سکھوں نے ' کسی سکھ کمان دار کے مقابلے میں اپنے انگریز جرنیل کی اطاعت میں زیادہ سرگرمی کا مظاہرہ کیا۔

جب ہربرٹ ایڈورڈز Herbert Edwardes سکھوں کی فوج لے کر تن تنہا بنوں کے جنگجو قبائل کی سرکوبی کے لئے روانہ ہوا تو اس نے چند ایسے ضابطوں پر عملدرآمد کا حکم دیا جو سکھ فوجیوں کے لئے نامانوس تھے لیکن ان سکھوں نے جو ابھی چند ماہ پہلے تک انگریزوں کے خلاف برسرپیکار تھے ' ایڈورڈز کے ضابطوں پر عمل پیرا ہوتے ہوئے نہ تو کھڑی فصلوں سے اپنے گھوڑوں کے لئے چارہ کاٹا اور نہ ہی اپنی ضروریات کے لئے دیہاتیوں کا اناج لوٹا۔

برطانوی افواج کو ہندوستان میں اتنی واضح برتری حاصل ہو گئی تھی کہ اپنے ابتدائی دور مثلاً وارن ہسٹنگز Warren Hastings کے زمانے میں انگریزوں نے اپنی مہارت ' تجربے اور تنظیم کو دہرے مقاصد کے لئے استعمال کیا۔ ظاہر ہے ان کا پہلا مقصد تو اپنے توسیع پسندانہ عزائم اور دوسرے فوجی منصوبوں میں کامیابی کا حصول تھا لیکن اسی کے پہلو بہ پہلو وہ اپنی تربیت یافتہ اور ماہر افرادی قوت ہندوستان کی مختلف ریاستوں کو بھاری معاوضے میں فراہم کرتے رہے مثلاً اودھ کے شجاع الدولہ نے 1773ء میں معاہدۂ بنارس کے تحت روہیل کھنڈ کے خلاف کمپنی کی فوج استعمال کی اور اس کے عوض 40 لاکھ روپے وارن ہسٹنگز کو ادا کئے۔

قوم پرستی: ایک فیصلہ کن عنصر

ہندوستان میں یورپی اقوام کو واضح فوجی برتری تو حاصل تھی لیکن اس کے ساتھ ان کی قوم پرستی کو بھی ایک اہم اور فیصلہ کن حیثیت حاصل رہی۔ جب ہندوستان کے مختلف علاقے ' ریاستیں ' راجدھانیاں اور جاگیریں باہم دست و گریبان تھیں ' جب کرائے کے فوجی اور کمان دار پلک جھپکتے میں وفاداریاں تبدیل کر لیتے تھے تو یورپی اقوام میں سے ہر ایک نے اپنے مادر وطن سے وفاداری کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ اپنے مادر وطن کے مفاد میں جب اور جہاں ضرورت پڑی انہوں نے اپنے مقامی آقاؤں سے ترک تعلق میں تامل نہیں کیا۔ مثال کے طور پر فرانسیسی مہم جو ایم مادیک M. Madec نے بھرت پور کے راجہ نول سنگھ کی انتہائی پرکشش ملازمت عین اس نازک مرحلے پر ترک کر دی جب مرہٹوں اور روہیلوں سے نبرد آزما ہونے کے لئے راجہ کو اس کی جنگی مہارت کی اشد ضرورت تھی۔ پانڈی چری کے فرانسیسی گورنر نے وسیع تر قومی مفاد میں مادیک سے کہا کہ وہ شاہ عالم کی ملازمت اختیار کر لے اور کرائے کے اس فوجی نے کسی توقف کے بغیر ' بھرت پور سے حاصل ہونے والی پرکشش تنخواہ اور بے پناہ مراعات کو خیرباد کہتے ہوئے اپنے گورنر کی ہدایات پر عمل کیا۔

اس کے برعکس مغل فوج کا حال یہ تھا کہ وہ سپاہیوں کے مختلف گروہوں پر مشتمل ہوتی تھی جن میں باہمی ربط مفقود تھا۔ کسی ایک گروہ کے فوجیوں کا آپس میں تعلق بھی محض اس شخص سے ذاتی وفاداری کا رہین منت ہوتا تھا جو انہیں ملازمت دلوانے کا ذمے دار تھا۔ کسی قومی جذبے سے وابستگی یا اسلام سے اجتماعی وفاداری کے کسی تصور سے وہ قطعی عاری تھے۔ اکثر اوقات دشمن مسلمان ہوتا اور ہندو شہزادے عموماً شہنشاہ کے اتحادی ہوتے لیکن انہیں شہنشاہ سے کوئی ذاتی تعلق نہیں ہوتا تھا۔ بادشاہ کے مصاحب اور مقربین کا زیادہ وقت حسد و فساد میں گزرتا۔

اس زمانے میں شاید ہی کوئی ایسی لڑائی رہی ہو جس میں کوئی بڑا سردار اس سے لاتعلق نہ ہوا ہو یا غنیم سے نہ مل گیا ہو۔ اوپر سے نیچے تک سب کو احساس تھا کہ یہاں کچھ بھی مستقل نہیں۔ شاہی خاندان میں بیٹا باپ کے مقابلے میں اور بھائی بھائی سے نبرد آزما تھا۔ تخت کا ہر جانشین اپنے پیشرو کے ذوق سے اختلاف ظاہر کرتے ہوئے اپنے لئے نیا محل بلکہ نیا دارالخلافہ تعمیر کر لیتا تھا۔ جب بیٹا اقتدار میں آتا تو باپ کے منظور نظر افراد روپوش ہونے میں عافیت جانتے تھے۔ آج کا پسندیدہ فرد اگلے ہی روز راندۂ درگاہ اور مجرم قرار پاتا تھا۔

ہمیں یقیناً اس امر پہ بھی غور کرنا چاہئے کہ آخر وہ کونسی وجوہات تھیں جو یورپی اقوام میں تو قومیت کے فروغ کا باعث ہوئیں لیکن ہم عصر ہندوستان ان سے محروم رہا۔ اس حوالے سے کئی عوامل ذہن

میں آتے ہیں۔ اس کی پہلی وجہ غالباً وہی ہے جو ہمارے موجودہ تجزیے کی بنیاد ٹھہرتی ہے۔

یورپ سے آنے والے ایک قطعی مختلف دنیا کے باسی تھے۔ ترک ' افغان اور مغل فاتحین نے ہندوستان کو اپنے مستقل وطن کے طور پر اپنا لیا تھا اور وہ یہاں کے ماحول میں رچ بس گئے تھے۔ ہندوستان نے بھی انہیں بطور ''مقامی'' حکمران قبول کر لیا تھا لیکن یورپیوں کی بات اور تھی ' ان کا تعلق سراسر ایک مختلف نظام سے تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ ایک علاقے یا خطے کے جاگیردار کسی دوسرے علاقے یا خطے کے جاگیرداروں پہ حاوی ہو گئے اور انہیں اپنا محکوم بنا لیا بلکہ یورپی اقوام کے روپ میں سمندر پار سے ایک نیا سیاسی اور معاشی نظام ہندوستان اور وادی سندھ پر قبضہ جمانے آیا تھا۔ یہ زرعی ہندوستان پر عالمی سرمایہ دارانہ نظام کا غلبہ تھا۔ یہاں نیا نظام پرانے نظام میں جذب ہونے نہیں آیا تھا۔ عالمی سرمایہ داری کے زیادہ ترقی یافتہ نظام میں ' ہندوستان کی نو آبادی کو اپنی مخصوص ضروریات اور معیار کے مطابق ڈھالنے کی پوری پوری اہلیت تھی۔

فاتحین کی یہ نئی نسل ہمیشہ الگ تھلگ رہی حتیٰ کہ گھمسان کی جنگ کے دوران بھی وہ یہاں کے عمومی ماحول سے دور ہی رہتے۔ ہندوستان کے سماجی اور سیاسی منظر نامے کا حصہ ہونے کے باوجود انہوں نے اپنی انفرادیت برقرار رکھی۔ ایک الگ دنیا اور ایک مختلف عہد ' ان کی سوچ اور اقتدار کا حوالہ تھا۔ یورپ اور اس کی مطیع اقوام کے درمیان کوئی مطابقت نہیں تھی اور نہ ہی وہ مقامی معاشرے کے ساتھ شیر و شکر ہوئے۔

یورپی قوم پرستی کی دوسری توجیہہ ان کے مادر وطن کے ترقی پسند اور متمول ہونے میں تھی جو روبہ زوال جاگیردارانہ سماج کے مقابلے میں کہیں زیادہ دولت اور خوشحالی کی ضمانت دے سکتا تھا۔ برصغیر کے جاگیردار انہیں پرکشش ملازمتوں کی پیشکش تو کر سکتے تھے لیکن ان کے حتمی معاشی مفادات یورپ ہی سے وابستہ تھے۔ گویا قوم پرستی میں آم بھی تھے اور گٹھلیوں کے دام بھی۔

ایک آخری وجہ یورپی اقوام کا یہاں اقلیت میں ہونا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ یورپ میں ہونے والی جنگوں کا دائرہ برصغیر تک پھیل جاتا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو برصغیر میں موجود مختلف یورپی اقوام کے درمیان زیادہ گرم جوشی اور خیر سگالی دیکھنے میں آتی کہ اقلیت میں ہونا جائے خود ایک اتصالی مظہر ہے۔

برصغیر کے بعض شہزادگان نے بھی یورپ کی جنگی حکمت عملی کو اپنا لیا تھا۔ میر قاسم تو بہت پہلے 1763ء میں ہی اپنی افواج کو یورپی خطوط پر منظم کر چکا تھا اور علاقے میں اس فوج کی اہمیت اور وقار تھا۔ اگر جلد بازی میں نیپال پر ناکام فوج کشی نہ کی جاتی تو یہ فوج بکسر میں انگریزوں پہ کاری ضرب لگا کر جنگ کا پانسہ اپنے حق میں پلٹ سکتی تھی۔ گوالیار کے مہاجی سندھیا کی فوج بھی یورپی انداز میں تربیت یافتہ تھی۔

ڈی بوئن De Boigne اس کا سپہ سالار تھا۔ اس فوج کو اگر شکست ہوئی تو اس کے پیچھے کمزور فوجی حکمت عملی کے علاوہ کئی اور عوامل بھی کار فرما تھے۔

رنجیت سنگھ کی افواج بھی بہت منظم اور اعلیٰ تربیت یافتہ تھیں اور انہیں ہر لحاظ سے کمپنی کی فوج کے ہم پلہ قرار دیا جا سکتا تھا۔

21

سکھ اور زیر کفالت ریاستیں

سکھیر چکیا قبیلے کا سردار

1799ء میں میسور کے سلطان ٹیپو کو شکست ہوئی' فرانس میں نپولین اقتدار اعلیٰ کا تختہ الٹنے میں کامیاب رہا اور گوجرانوالہ کے سردار مہان سنگھ سکھیر چکیا کا بیٹا رنجیت سنگھ لاہور پر قبضہ کرنے کے بعد پنجاب کا فرمانروا ان گیا۔

2 اپریل 1801ء کے شاندار جشن تاجپوشی کے ساتھ پانچ دریاؤں کی اس سرزمین پر گویا ایک ایسی حکومت کی بنیاد پڑی جسے بہت جلد پنجاب کی تاریخ کی اہم ترین حکومتوں میں شمار کیا جانے والا تھا۔ یہ رنجیت سنگھ کی سلطنت کا عروج تھا جب بہادر سکھ جرنیل ہری سنگھ نلوا جو دشمن کے لئے دہشت کی علامت بن چکا تھا' جمرود کے مقام پر بارک زئی افغان قبائل کے ساتھ جنگ کے دوران مارا گیا اور شمال کی جانب سکھ ریاست کی مزید توسیع رک گئی تو ستلج سے خیبر اور شمال میں کشمیر اور لداخ تک رنجیت سنگھ کی فرمانروائی تھی۔ جنوب میں یہ سلطنت ملتان تک پہنچتی تھی اور نوجوان سکھ حکمران کی نظریں اس سے بھی آگے شکارپور پر گڑی تھیں جو اس وقت سندھ کے تالپور حکمرانوں کی عملداری میں تھا۔

1809ء میں رنجیت سنگھ اور سر ڈیوڈ اوکٹرلونی Sir David Ochterlony کے درمیان معاہدہ امرتسر طے پایا جس کی بناء پر ستلج سے پرے سکھ ریاست کی توسیع رک گئی۔ اس سے پہلے برطانیہ سکھی ریاستوں کو اپنے زیر حفاظت علاقہ قرار دے چکا تھا اور اس معاہدے کے مطابق دریائے ستلج کو سکھ ریاست اور برطانوی ہندوستان کے درمیان باقاعدہ سرحد تسلیم کر لیا گیا تھا۔

بتدریج بڑھتی ہوئی سکھ مقبولیت کے نتیجے میں رنجیت سنگھ کے اقتدار کو بھی عروج حاصل ہوا۔ اس حوالے سے گفتگو پہلے بھی ہو چکی ہے کہ دراصل سکھ مذہب بنیادی طور پر ''امتزاج ضدین'' کے خمیر سے اٹھنے والی بھگتی تحریک کا تسلسل تھا جو نئی فکری جہت 'بے شمار قربانیوں اور فوجی مہم جوئی کے نتیجے میں جنگجو قبائل کے ایک طاقتور اور منظم گروہ کی شکل اختیار کر گیا۔ قبول عام حاصل کرتے ہوئے اس مذہب کے پیروکار قبائل یا مسلوں کی تعداد جب 12 تک جا پہنچی تو یہ گروہ قبائلی سرداروں کا ایسا اتحاد بن گیا جسے پنجاب کے ستم رسیدہ کسانوں کی وسیع حمایت حاصل تھی۔ مغل جانشینی کی جنگیں' ایران کے نادر شاہ کی قتل و غارت گری' افغان احمد شاہ اور شاہ زمان کی سفاکی' مختلف وقفوں سے مرہٹوں کے حملے اور ان حملوں کے مستقل اندیشے نے پنجابی دیہات اور دہقان کو مضمحل کر دیا تھا۔

مغلوں کے شدید مظالم سکھوں کو پنجاب سے پرے کشمیر کی وادیوں میں دھکیلنے کا باعث بنے لیکن جب مغل سلطنت کا زوال شروع ہوا تو سکھوں کی طرف سے مضبوط کاٹھی کے افراد کے لئے روزی کمانے کے ''واحد پیشے'' میں شمولیت کی کھلی دعوت تھی اور یہ پیشہ افغان حملہ آوروں' شاہی فوج اور مغل قافلوں پر گوریلا حملوں کے ذریعے مال و اسباب لوٹنا تھا۔ لوٹ مار کی یہ کارروائیاں جب بالائی سندھ سے لے کر کوہستان نمک اور دہلی کے مضافات تک پھیل گئیں تو سکھوں نے بتدریج اس علاقے کو مختلف سرداریوں میں بانٹ لیا۔ ان میں سے ایک مختصر سی ریاست گوجرانوالہ کی سکھیر چکیا مسل تھی جو رنجیت سنگھ کو اپنے باپ سے ورثے میں حاصل ہوئی۔

نوجوان رنجیت کی خت آور شادی کا مدھن قبائلی بساط پر اس کی سیاسی قوت میں اضافے کا موجب ہوا۔ اگرچہ اس کے نتیجے میں سردار کی پر عزم اور بلند حوصلہ خوش دامن کو عوامی سطح پر ایک بے تاج ملکہ کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ 1799ء میں رنجیت سنگھ نے لاہور پر قبضہ کر لیا اور پنجاب اس کی سلطنت ٹھہرا۔ رنجیت ایک قابل منتظم تھا۔ برطانوی مخالفین اس کے بارے میں عجیب و غریب احمقانہ قصے اور لطیفے پھیلانے میں بہت پیش پیش رہے لیکن رنجیت سنگھ نے 1839ء میں اپنی موت تک 40 سال بڑی مضبوطی' فراخدلی اور انصاف پسندی سے حکومت کی۔

رنجیت' شمال مغرب کی جانب انگریز راج کی بے رحمانہ توسیع پسندی کے خدشات سے آگاہ بھی تھا اور اس بارے میں اسے تشویش بھی لاحق رہتی تھی۔ اس کے اپنے بھی کچھ خواب تھے جنہیں حقیقت کا روپ دینے کے لئے وہ اپنی فوج کو جدید اسلحے اور فوجی مہارت سے لیس کرنے میں ہمہ وقت کوشاں رہتا۔ ہم عصر یورپ میں ہونے والی جنگوں میں اس کی دلچسپی غیر معمولی تھی اور متحاربین کی جنگی حکمت عملی کا جائزہ لینے اور ان سے کچھ سیکھنے کی خواہش بھی اس میں شدید تھی وہ نپولین سے بہت متاثر تھا اور

اس فرانسیسی جرنیل اور رہنما کی پیشہ ورانہ زندگی ہمیشہ اس کے پیش نظر رہتی۔ وہ اپنے دربار میں آنے والے ہر شخص سے فرانسیسی مہمات اور ان کی جنگی حکمت عملی کے بارے میں گفتگو کرنے پر ہمہ وقت تیار ہوتا۔ 1837ء میں نوجوان شہزادے نونہال سنگھ کی شادی پر سر ہنری فین Sir Henry Fane کے وفد میں ایک کرنل والس Colonel Wallis بھی تھا جس نے واٹرلو Waterloo کی جنگ میں شرکت کی تھی۔ مہاراجہ نے اس لڑائی کے بارے میں کرنل والس سے بہت دیر تک اور بڑی تفصیلی بات چیت کی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اتنے سال گزر جانے کے باوجود رنجیت سنگھ واٹرلو کے انجام اور فرانس کی شکست پر رنجیدہ تھا اگرچہ دانشمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے باقاعدہ افسوس کا اظہار نہیں کیا۔

فنی استعداد اور آلات حرب میں ہونے والی پیش رفت سے ہمہ وقت آگاہ رہنے میں بھی مہاراجہ بہت دلچسپی رکھتا تھا۔ جنگ کا یورپی انداز اپنانے میں اسے ہندوستان کے تمام حکمرانوں پر سبقت حاصل تھی۔ اس نے انگریزوں اور فرانسیسیوں سے بہت کچھ سیکھا اور غالباً فرانس سے استفادہ زیادہ کیا۔ تربیت، آلات حرب، تنظیم، حکمت عملی، وردی، تنخواہ کا نظام، کیمپ کی تربیت اور فوجی پریڈ کے انداز میں باقاعدہ سکھ افواج اپنے مخالفین سے ممکنہ حد تک مماثل تھیں۔ میدان جنگ میں سرخ کوٹ میں ملبوس انگریزوں کے ماتحت بنگالی اور سکھ فوج میں تمیز صرف ان کی پیٹی کے مختلف رنگ سے ہوتی تھی۔

1822ء میں دو فرانسیسی ماہرین ونتورا Ventura اور آلاغ Allard کی آمد سے سکھ پیادہ فوج میں اصلاحات کے عمل کا آغاز ہوا۔ چند انگریز جنہیں سکھ فوجی مشقیں دیکھنے کا اتفاق ہوا، وہ ان کے نظم و ضبط اور استعداد کار سے بہت متاثر ہوئے، ان کا مارچ پاسٹ شاندار، ان کی صفیں سیدھی اور نشانے درست تھے۔ پھر انہوں نے گھڑ سواروں کے مقابلے کے لئے مربع نما قلعہ بندی کی، مربع کے ہر کونے پر ایک توپ ایستادہ کی گئی اور ایک بار جب گولہ باری شروع ہوئی تو تسلسل سے جاری رہی۔

رنجیت سنگھ غالباً واحد ہندوستانی حکمران تھا جو یورپی ذہن کو اچھی طرح سمجھتا تھا، اسے یہ بھی احساس تھا کہ اس کے یورپی کمان داروں کی وفاداری شک و شبے سے بالاتر نہیں۔ ایک مبصر نے رنجیت سنگھ کے دربار اور فوجی تنظیم میں اس کے مشیر آلاغ کی حیثیت کے بارے میں لکھا ہے۔ ''آلاغ بہت اچھی تنخواہ پاتا ہے تقریباً ایک لاکھ فرانک سالانہ لیکن اس کی حیثیت رنجیت سنگھ کے نیم قیدی جیسی ہے۔ مہاراجہ اس بات کا پورا پورا اہتمام کرتا ہے کہ آلاغ اپنی تمام تنخواہ خرچ کر ڈالے تاکہ اس کے ذہن میں ملازمت چھوڑنے کا خیال ہی نہ آئے، دوسرے یورپی ماہرین کے لئے بھی رنجیت کی حکمت عملی یہی ہوتی ہے۔''

دوسری طرف رنجیت سنگھ کی بھرپور خواہش تھی کہ یورپی ٹیکنالوجی حاصل کر کے مصنوعات کو مقامی طور پر تیار کیا جائے اس نے جست کے سانچوں میں ڈھالے گئے 'سلیکون شرپنل Silicon Shrapnel کی ٹیکنالوجی میں بہت دلچسپی لی۔ اس مقصد کے لئے مہاراجہ نے 1812ء میں ہی انگلستان ساختہ 500 توڑے دار بندوقیں خریدی تھیں تاکہ شرپنل میں استعمال ہونے والی دھات کے اجزاء کا صحیح تعین کر کے اسی معیار کی دھات لاہور کی آہنی بھٹیوں میں ڈھالی جا سکے۔ رنجیت سنگھ نے ایک بڑی توپ کی تیاری کے تمام مراحل بھی اپنی ذاتی نگرانی میں مکمل کرائے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ برطانوی فوج کے ہندوستانی سپاہیوں کو تنخواہ کی ادائیگی کے طریق کار اور کمپنی کی طرف سے تشکیل دیئے گئے کورٹ مارشل کے قوانین و ضوابط کی نقول حاصل کرنے میں بھی کوشاں رہا۔ مہاراجہ میں یورپ کی جنگی ٹیکنالوجی کے حصول کی خواہش اتنی شدید تھی کہ وہ توپچیوں کو لدھیانہ کے برطانوی آرٹلری سکول میں تربیت دلوانے کے لئے اپنے ازلی دشمن انگریز سے رابطے پر بھی آمادہ ہو گیا۔

فتوحات کا تسلسل' کاروباری احتیاج

برطانیہ کی نوآبادیاتی حکمت عملی اب یکسر تبدیل ہو چکی تھی۔ انگریز پنجاب سے حاصل ہونے والے ممکنہ فوائد سے پوری طرح آگاہ تھے لہٰذا جب لارڈ ولزلے Lord Wellesley 1802ء میں بنارس کے مقام پر' مہم جو جارج تھامس George Thomas سے ملا' جسے کمپنی کے فوجی اب تک اپنے نظم و ضبط کا پابند بنا چکے تھے' تو گورنر جنرل کے پیش نظر اس ملاقات کا واحد مقصد یہ تھا کہ پنجاب کو برطانوی جھنڈے تلے لانے کے امکانات پر' اس نامور شخصیت سے مشورہ کیا جائے۔ 1812ء میں الیگزینڈر برنز Alexander Burnes کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے سیاسی شعبے میں منتقل کیا گیا' وہ بہت سی زبانوں کا ماہر تھا اور اس سے پہلے بھی' نیٹو انفنٹری 'Native Infantry میں خدمات سرانجام دے رہا تھا۔

الیگزینڈر دریائے سندھ کے راستے رنجیت سنگھ کے دربار میں پہنچا۔ کمپنی کی طرف سے راجہ کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے وہ اپنے ساتھ 6 برطانوی گھوڑے بھی لایا تھا لیکن اس سفر کے پیچھے اصل مقصد دریائے سندھ میں جہاز رانی کے امکانات کا جائزہ لینا تھا۔ اس منصوبے میں انگریزوں کی دلچسپی مسلسل بڑھتی جا رہی تھی جس کی تصدیق الیگزینڈر کے بڑے بھائی ڈاکٹر جیمز برنز Dr. James Burnes کے تجزیئے سے بھی ہوتی ہے۔

1827ء میں ڈاکٹر جیمز' تالپور امیران سے دورۂ سندھ کی دعوت حاصل کرنے میں کامیاب رہا

تھا دورے کے بعد اپنی جامع تجزیاتی رپورٹ میں اس نے لکھا کہ ''دریائے سندھ ایک بار پھر ہندوستان کے جزیرہ نما اور اندرون ایشیا کے درمیان آمدورفت اور تجارتی سامان کی ترسیل کا ذریعہ بن سکتا ہے'' سندھ کے بارے میں اس کی رائے تھی کہ ''دریائے سندھ کی شکل میں قدرت نے اسے ایک ایسی مستقل نعمت سے نوازا ہے جس کے فضائل کبھی ختم نہیں ہوتے۔ یہ تجارت اور زرخیزی کا ایسا خزانہ ہے جسے کوئی جابرانہ حکومت نہیں چھین سکتی۔ یہ کاشتکار کو نہ صرف سہولت اور کفائت کے ساتھ کھیتی باڑی کے مواقع مہیا کرتا ہے بلکہ معلوم وقت پر فصل کے حصول کا یقین بھی دلاتا ہے اور اگر کاشتکار چاہے تو اپنی فاضل پیداوار اسی دریا کے ذریعے دوسرے ملکوں تک پہنچا کر مزید منافع بھی حاصل کر سکتا ہے''

بمبئی' کلکتہ اور لندن میں یہ رپورٹ غیر معمولی دلچسپی کے ساتھ پڑھی گئی۔ ڈاکٹر جیمز نے اپنی رپورٹ کے بین السطور یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ امیران سندھ کے پاس حملہ آوروں کی مزاحمت یا انہیں پسپا کرنے کے وسائل محض واجبی سے ہیں اور دریائے سندھ پر ایک نظر ڈالنے سے یہ حقیقت بھی کھل کر سامنے آتی ہے کہ کسی بحری قوت کے لئے اس دریا کے راستے ان ریاستوں کے قلب تک پہنچنا کس قدر آسان ہے۔ ''وہ سرکاری بجرا جو مجھے ستیاہ تک لے گیا اس کا پیندہ اگرچہ ہموار تھا لیکن اس کے باوجود میری رائے میں ایسا بجرا ابھی کم و بیش نصف رجمنٹ کے ساتھ خوبی آگے بڑھ سکتا ہے''۔

ابتدا میں تو دریائے سندھ اور ستلج میں جہاز رانی کے روشن امکانات نے انگریزوں کو آبی راستوں سے حملہ آور ہونے اور منفعت بخش تجارت کی راہ بجھائی لیکن برطانوی گورنر جنرل بینٹک Bentick بالخصوص اس بات پر مصر رہا کہ سندھ کے تالپوروں اور پنجاب کے سکھوں کے ساتھ صرف تجارتی روابط پر اکتفا کیا جائے۔ اس موضوع پر اپنے مباحث کے دوران انگریز ان آبی راستوں کے ذریعے' شمالی ہندوستان پر شمال ہی سے فرانسیسی اور روسی حملوں کے امکان اور خدشات کا جائزہ بھی لیتے رہے۔

اس خطے میں انگریز کی دلچسپی کا محور کلیتاً معاشی تھا۔ لنکاشائر میں کپڑے کی ملوں کو سستی خام کپاس کی ضرورت تھی۔ امریکہ کی آزادی کے بعد برطانوی صنعت امریکہ کی جنوبی ریاستوں میں غلاموں کی سستی محنت سے پیدا کی جانے والی کپاس کی بہت بڑی مقدار سے محروم ہو چکی تھی۔

1815ء سے 1820ء کے دوران تجارت میں مندے کا رجحان برطانیہ کی صنعت پارچہ بافی کے لئے تباہ کن ثابت ہوا تھا اور صاحب بصیرت برطانوی نوسامراجیوں کا خیال تھا کہ جس طرح شمالی افریقہ کے صوبے' روم کو خوراک مہیا کرتے تھے اسی طرح پنجاب پورے یورپ کے لئے غلہ خیز خطہ ثابت

ہو گا۔

1790ء کے بعد سے سوت کاتنے اور 1815ء کے بعد پارچہ بانی کے کارخانے قائم کرنے میں کم لاگت آ رہی تھی۔ طریق کار بہت سادہ لیکن ظالمانہ تھا۔ پہلے تو افریقہ سے اغوا کر کے سیاہ فام غلام امریکہ کے کپاس پیدا کرنے والے علاقوں تک پہنچائے جاتے تھے پھر امریکی نو آبادیوں سے کپاس در آمد کی جاتی تھی اور آخر میں کپاس کی مصنوعات ہندوستان' افریقہ اور براعظم امریکہ کے ممالک کو بر آمد کر دی جاتی تھیں۔ انگلستان کی طرف سے غلاموں کی تجارت پر سخت پابندیاں عائد ہونے سے یہ سلسلہ منقطع ہو گیا تھا کیونکہ وہ ممالک جہاں خام مال کی بہتات تھی' اپنے شہریوں کے اغواء کئے جانے کے خلاف پوری قوت سے سرگرم ہو گئے تھے ان کی دلجوئی اور ان کے غصے کو فرو کرنا ضروری تھا۔ اس کے علاوہ 19ویں صدی کے پہلے عشرے میں امریکہ کی جانب سے خام کپاس کی بر آمد اور اس کی مصنوعات کی در آمد پر بہت سی پابندیوں کے باعث بھی کپڑے کی صنعت بحرانی کیفیت سے دوچار ہو گئی تھی۔

برطانیہ کی سامراجی قوت کے لئے خام کپاس ایک اہم اور ناگزیر ضرورت بن چکا تھا اگر فوری طور پر کپاس کی بہم رسانی کے نئے ذرائع تلاش نہ کئے جاتے تو برطانیہ کی صنعتی سرگرمیوں کے معطل ہو جانے کا خدشہ تھا۔ دریائے نیل اور دریائے سندھ کے طاس کے علاقے خام کپاس کے اہم پیداکار تھے۔ وادی نیل تو 1882ء تک برطانیہ کے زیر تسلط نہ آ سکی لیکن 1882ء کے بعد بھی وہ برطانوی سلطنت کا حصہ نہیں بنی۔ نہر سویز کا آبی راستہ تعمیر ہونے کے بعد بھی وادی نیل کی وفاداریاں ترکی کے سلطان کے ساتھ رہیں۔ مزید برآں نپولین کی قیادت میں 90-1789ء کی فرانسیسی مہم جوئی کی یاد بھی برطانوی ذہن سے ابھی محو نہیں ہوئی تھی اس لئے مصر' انگریزوں کو نسبتاً غیر محفوظ جگہ دکھائی پڑتی تھی لہٰذا وادی سندھ ہی برطانوی استعمار کے لئے تختہ مشق ٹھہری۔

خام کپاس کا حصول' سامراج کی اشد ضرورت تھا اور وادی سندھ میں یہ ضرورت پوری کرنے کی مکمل اہلیت تھی۔ اس کے وسیع و عریض ہموار میدانوں کے سلسلے غیر محسوس انداز میں جنوبی سمندری ڈھلوان کی طرف اترتے چلے گئے تھے جنہیں دریاؤں کا وسیع نظام سیراب بھی کرتا اور زرخیز مٹی کی تہہ بھی مہیا کرتا تھا۔ آب پاشی کی سہولتوں کے ساتھ یہ خطہ کپاس کی کاشت کے لئے مثالی تھا۔ اس کا معتدل سرمائی موسم صدیوں سے دریاؤں کے ارد گرد کے سیلابی خطوں میں کپاس کو پروان چڑھاتا رہا تھا۔ بلاشبہ یہ خطہ امریکہ اور مصر کے مقابلے میں دور تھا لیکن 1807ء میں فلٹن Fulton کے دخانی جہاز اور 1814ء میں سٹیفن سن Stephenson کے بھاپ کے انجن کی ایجاد نے فاصلوں کو نسبتاً

غیر اہم اور یقیناً قابل عبور بنا دیا تھا۔

پنجاب کی زرعی اہلیت روز روشن کی طرح عیاں تھی۔ یہ خطہ برصغیر کے ایک لاکھ مربع میل کے انتہائی زرخیز علاقے پر مشتمل تھا اور برطانوی سلطنت کا توشہ دان بننا جس کا مقدر تھا' اگرچہ سکھوں کے ساتھ دوستی اور بقائے باہمی کے معاہدے موجود تھے لیکن کمپنی کی حکومت' پنجاب پر قبضے کی اونچ نیچ اور اس راہ میں حائل مشکلات کا جائزہ لینے میں مصروف تھی۔ اس میں شک نہیں کہ کپاس کی رسد میں اضافے کے لئے پنجاب پر قبضہ ناگزیر تھا' صرف پنجاب ہی لنکا شائر کو اس بحران سے نجات دلا سکتا تھا۔ راج کے لئے اس کے تجارتی مفادات ہی سب سے اہم تھے اور پنجاب پر قبضے کی کوششوں کو 19ویں صدی کے اوائل میں ہی بنیاد فراہم کی جا چکی تھی۔

جب برطانیہ وادی سندھ کی طرف مائل ہوا تو ہندوستان حتمی طور پر فتح ہو چکا تھا اور 19ویں صدی کا پہلا ربع مکمل ہونے سے قبل ہی برطانوی استعمار چھ قضیئے بھی نبٹا چکا تھا۔ گورکھوں کے ساتھ 16-1814 میں پنجہ آزمائی ہو چکی تھی اگرچہ باہمی احترام پر مبنی امن ہی وہ زیادہ سے زیادہ رعائت تھی جو مارکوئیس آف ہیسٹنگز (ارل موئرا) Marquis of Hastings-Earl Moira گورکھوں سے حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکا تھا۔ گوالیار کے سندھیا کو راجستھان کے امور سلطنت سے دست کش ہو کر ریاست کا سربراہ بنے رہنے کی پیشکش زیادہ پرکشش نظر آئی۔ سابقہ باغی اتحاد کے واجب الاحترام فرمانروا' پونا کے پیشوا' ناگپور کے نڈر جنگجو بھونسلا اور اندور کے پرجوش ہولکر نے برطانوی استعمار کے خلاف انفرادی طور پر ہتھیار اٹھائے لیکن شکست سے دوچار ہوئے۔ 1818ء تک مرہٹے بھی فیصلہ کن نقصانات اٹھاتے رہے اور بالآخر انہوں نے بھی حوصلہ ہار دیا۔

اب ایک نیا مرحلہ شروع ہو رہا تھا۔ سپئر Spear اس دور کے برطانوی حکمرانوں کا ذہن پڑھنے میں کافی حد تک کامیاب نظر آتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "1815ء میں نپولین کو حتمی شکست ہوئی۔ جب 1813ء میں برطانوی حکومت نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو نیا چارٹر دیا تو برطانیہ کے تجارتی اداروں میں مفادات کا ٹکراؤ اتنا شدید ہو چکا تھا کہ ہر کوئی کمپنی کی اجارہ داری توڑنے کے درپے تھا۔ یہ تصور عام تھا کہ ہندوستان سونے کی چڑیا ہے اور آزاد تجارت کے اصولوں کے تحت کسی ایک کی اجارہ داری دوسروں کے لئے ہندوستان کے وسائل کے استحصال کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوتی اور اس اصول کا قدرتی ماحصل کاروباری ناگزیریت کے پیش نظر' برطانوی بالادستی کے حصول کی تکمیل اور ترقی کے لئے ایک عملی اور باکفایت راستے کا انتخاب بھی تھا۔ ستلج پر فوج تعینات کر کے بقیہ ہندوستان کی نگرانی کرنا کم خرچ اور بالانشین ثابت ہوتا' اس کے مقابلے میں لاقانونیت کے ایک مرکز کے گرد افواج کا مسلسل ڈیرے

ڈالے رہنا یا طویل اور پیچیدہ سرحدوں پر انہیں مستقل تعینات کئے رکھنا بہت زیادہ مہنگا پڑتا تھا۔ تجارت کے اندرونی بہاؤ کے لئے بالادستی کے حصول کے فوائد اتنے واضح ہیں کہ انہیں مزید اجاگر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ہندوستان کے حالات اور برطانوی سوچ دونوں فوری عمل کے متقاضی تھے اور یورپ کا مطلع صاف ہونے سے یہ موقعہ بھی جلد ہاتھ آگیا۔"

شاہی شادی اور نقشہ

یورپی استعمار کی نظریں اب وادی سندھ پر مرکوز تھیں۔

چونکہ برطانوی کاروباری مفادات کا دارومدار بھی رنجیت سنگھ کی سلطنت پنجاب پر تھا اور دونوں ریاستوں کی سرحدیں بھی دریائے ستلج پر ملتی تھیں اس لئے انگریزوں اور سکھوں کے تعلقات ایک ایسی کشاکش سے دوچار تھے جو مسلسل تیس سال تک غیر یقینی انداز میں جاری رہی۔ اس دوران رنجیت سنگھ کی حکومت بے حد مستحکم تھی اور وہ اپنی رعایا میں اچھا خاصا مقبول بھی تھا اس لئے انگریزوں کے نزدیک یہ وقت اس سے پنجہ آزمائی کا نہیں تھا۔ انگریز اس کے مقام اور مرتبے کا احترام کرتے رہے یہاں تک کہ سن 1837ء آن پہنچا۔ رنجیت سنگھ اب بوڑھا ہو چکا تھا۔

اس سال پنجاب میں شاہی شادی کی ایک دلکش اور شاندار تقریب منعقد ہوئی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے پوتے نونہال سنگھ کی شادی ہر لحاظ سے ایک اہم سیاسی واقعہ تھا لیکن مورخین کے لئے اس کی اہمیت شاہی شادی ہونے کی وجہ سے نہیں تھی اور نہ ہی اس لئے کہ دلہن پنجاب کے ایک انتہائی اہم سردار شام سنگھ اٹاری والا کی بیٹی تھی۔ گورنر جنرل آک لینڈ Auckland اور آگرہ کے گورنر چارلس مٹکاف Charles Metcalfe کا اس تقریب کی شان بڑھانے سے معذرت کر لینا' ایک قابل ذکر واقعہ تو تھا لیکن اس کی حیثیت بھی محض ثانوی تھی۔ یہ شادی جس تاریخی حوالے سے سازش کا پیشہ خیمہ ثابت ہوئی وہ ایک انگریز سر ہنری فین Sir Henry Fane کی اس تقریب میں بظاہر بے ضرر سی موجودگی تھی۔

ہنری فین فوجی اہمیت کی جزئیات کا بڑی باریک بینی سے مشاہدہ کرنے اور انہیں تفصیل کے ساتھ اپنے ذہن میں محفوظ کر لینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ 1837ء میں جب دونوں فریق ابھی 1809ء کے معاہدے کے پابند تھے' فین نے اس فوجی قوت کا تخمینہ لگا لیا تھا جو پنجاب پر قبضے کے لئے درکار تھی' اس کا حافظہ اور اس کا مشاہدہ اتنا بھرپور تھا کہ اس نے اپنے دہلی سے لاہور کے سفر کی روداد میں فوجی نوعیت کی تفصیلات' ان کے محل وقوع اور زمین کی ساخت اور فاصلوں کے بارے میں اتنا مواد مہیا کر

دیا کہ نقشہ نویسی کے ماہر کرنل گارڈن Colonel Garden نے اس کی مدد سے پنجاب کا تفصیلی نقشہ تیار کر لیا جو بعد میں ایسے تمام نقشوں کی بنیاد بنا جنہیں پنجاب کی ریاست اور سکھ خالصہ کے خلاف فوجی کارروائیوں کے دوران کمپنی کے جرنیلوں نے بڑی کامیابی اور مہارت سے استعمال کیا۔

افغانستان کے معاملات میں ملوث ہونے کے باعث کمپنی پنجاب کے بارے میں بہت محتاط رویہ اپنائے ہوئے تھی۔ سکھوں کے معاملات میں براہ راست دخل اندازی کئے بغیر اور ان سے مناسب فاصلہ برقرار رکھتے ہوئے ایسٹ انڈیا کمپنی کو ایک بفر زون Buffer Zone کی حیثیت سے سکھ ریاست کا عملی تعاون حاصل تھا۔ انگریزوں کی پہلی ترجیح یہی تھی کہ وہ کسی صورت بھی پنجاب میں حاصل ہونے والی راہداری کی سہولت سے محروم نہ ہونے پائیں کیونکہ 1809ء کے معاہدہ امرتسر میں بھی یہ معاملہ مستقل بنیاد پر طے نہیں ہوا تھا۔ سندھ میں تالپوروں کے زیر تسلط علاقے سے درۂ بولان اور ڈیرہ اسماعیل کے جنوبی دروں تک رسائی ممکن تھی لیکن ڈیرہ اسماعیل خان سے گزرنے کی اجازت ملنے کے باوجود برطانوی فوجی پنجاب کو عبور کرتے ہوئے دارالحکومت لاہور سے کترا کر گزرتے تھے۔ ایک زمانے میں مورکرافٹ Moorcroft اور پھر کیپٹن ویڈ Captain Wade نے دبے لہجے میں پنجاب کے راستے تجارتی سہولتیں حاصل کرنے کی اجازت چاہی تھی اگرچہ بعد میں اس مطالبے پر مزید اصرار نہیں کیا گیا۔ البتہ کئی اور سمتوں سے زیادہ محتاط لیکن مختلف اور یقینی انداز میں پنجاب کی طرف برطانوی پیش رفت جاری تھی۔

سکھی ریاستوں کو یکطرفہ اعلان کے ذریعے ''حکومت برطانیہ کے زیر حفاظت'' علاقے قرار دے دیا گیا۔ 1835ء میں لاہور سے صرف 40 میل کے فاصلے پر واقع فیروز پور کی چھوٹی سی ریاست لاہور کے علاوہ تمام سکھ ریاستوں کو حفاظتی تحویل میں لینے کی خود ساختہ ذمہ داری کے تحت 'کمپنی کی حکومت میں ضم کر لی گئی۔ اس تمام عرصے کے دوران رنجیت سنگھ نے بڑے تدبر اور حوصلے سے کام لیا اور ساری توجہ خود کو مزید طاقتور بنانے پر مرکوز کئے رکھی تاکہ انگریز اس کا احترام کرنے پر مجبور ہوں۔ رنجیت سنگھ نے براہ راست تصادم اور بزدلانہ تابعداری دونوں سے گریز کیا اور اس حکمت عملی میں وہ غیر معمولی طور پر کامیاب رہا۔

لیکن 1839ء میں رنجیت سنگھ کا انتقال ہو گیا اور اس کی موت کے ساتھ ہی سکھوں میں اقتدار کی تباہ کن باہمی کشمکش کا آغاز ہوا۔ پنجاب میں افراتفری پھیل گئی۔ اس مرحلے پر انگریز اپنی عملداری کی حدود کو پنجاب کے جنوب میں سندھ تک وسعت دینے میں کامیاب رہے۔

''اعتراف گناہ''

1783ء میں تالپوروں نے سندھ کے حکمران کلھوڑا خاندان کو اقتدار سے محروم کر دیا اور ریاست تین تالپور خاندانوں نے آپس میں بانٹ لی۔ خیر پور' حیدر آباد اور میر پور ان کے دارالحکومت تھے۔ حیدر آباد کے حکمرانوں کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی' میر فتح علی خان جس کا سربراہ تھا اس حکومت کے اوائل ہی میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے بمبئی سول سروس کے ناتھن کرو Nathan Crowe کو سندھ میں مختلف نوعیت کی صنعتیں لگانے کے لئے بھیجا۔ کہا جاتا ہے کہ ایرانی اور فرانسیسی خفیہ اداروں نے انگریزوں کی بڑھتی ہوئی قوت کے بارے میں تالپور حکمرانوں کو تشویش میں مبتلا کر دیا جس کے نتیجے میں ناتھن کرو 1780ء میں سندھ سے نکال دیا گیا۔ کمپنی مرہٹوں سے الجھے ہونے کے باعث اس توہین کو نظر انداز کرنے پر مجبور تھی۔

دوسری طرف سمندری راستوں پر اقتدار اور عالمی منڈیوں تک رسائی کے لئے انگریز' عہد نپولین کے فرانس سے برسرپیکار تھے۔ انہیں اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کی ضرورت تھی لہٰذا وہ سندھ سے اتحاد میں کوشاں رہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اتحاد باہمی احترام سے زیادہ خود غرضانہ مقصد براری پر مبنی تھا۔

سندھ کے میر کچھ ایسے روشن خیال یا معاملہ فہم نہیں تھے۔ برنز Burnes لکھتا ہے کہ ''مکمل طور پر حکمرانوں کے رحم و کرم پر ہونے کے بعد' عوام کی دوسری بڑی بدنصیبی حکمرانوں کا اس حقیقت سے بے خبر ہونا ہے کہ نظم و ضبط کی حامل کسی بھی سلطنت میں عوام اور شہزادوں کے مفادات یکساں ہوتے ہیں۔ دوسرے ایشیائی حکمرانوں کی طرح میر بھی اپنے معمولی اور فوری مفادات کو مستقبل کے اہم فوائد پر قربان کر دینے کی اہمیت سے ناآشنا ہیں۔ بدقسمتی سے وہ بھی اپنے اقتدار کے استحکام اور اپنی شان و شوکت کے اظہار کے لئے دولت کا حصول ناگزیر سمجھتے ہیں۔ ان کی تمام تر توانائیاں صرف اسی ایک مقصد کے لئے وقف ہوتی ہیں اور جس انداز میں وہ اس راہ پر گامزن ہوتے ہیں اس سے خود حکمرانوں کا فائدہ کم اور عوام کی بدحالی میں اضافہ زیادہ ہوتا ہے۔''

کرو نے اس صورت حال کو بڑے بامعنی انداز میں یوں بیان کیا ہے کہ ''سوائے اعتقاد کی ترویج کے یہاں کوئی جذبہ نہیں' عید منانے کے سوا یہاں کوئی جوش و خروش نہیں' کاہل سیدوں کا پیٹ بھرنے کے علاوہ کسی چیز کی آزادی نہیں اور پرانے مقبروں کی تزئین و آرائش کے علاوہ کوئی اور ذوق لطیف نہیں''۔

ترقیاتی اور عوامی بہبود کے کاموں سے پہلو تہی کے باعث سندھ کے حالات بدتر ہوتے چلے گئے۔

17ویں صدی میں ٹھٹھہ ایک پر رونق اور خوشحال تجارتی و صنعتی مرکز تھا جہاں کپڑا بننے کی تین لاکھ کھڈیاں تھیں لیکن 1809ء تک یہاں کی آبادی کم ہو کر 20 ہزار اور 1851ء میں صرف 7 ہزار رہ گئی۔ سندھ کی اہم بندرگاہ کراچی اور بالائی سندھ کے سب سے اہم تجارتی مرکز شکار پور کے حالات بھی دگرگوں تھے' اسی طرح تالپوروں کا اہم ٹھکانہ حیدر آباد بھی زوال پذیر تھا۔

کیپٹن ڈیوڈ سیٹن David Seton اور حیدر آباد کے میروں کے درمیان 1808ء میں ایک معاہدے طے پایا۔ جس کے مطابق فریقین میں سے جب بھی کسی ایک کو فوجی مدد کی ضرورت پڑتی تو درخواست کرنے پر دوسرا فریق یہ مدد فراہم کرنے کا پابند تھا۔ اس معاہدے کے تحت کمپنی کا ایک نمائندہ بھی تالپور میروں کے دربار میں تعینات کر دیا گیا۔ اگلے سال نیکولس سمتھ Nicholas Hankey Smith کی سربراہی میں ایک اور وفد آیا۔ دربار میں کئی بار اس کے ساتھ بہت ہی توہین آمیز سلوک روا رکھا گیا لیکن سمتھ وہیں ڈٹا رہا۔ آخر کار اس کی محنت اور برداشت رنگ لائی۔ وہ تالپور حکمرانوں کے ساتھ ایک اور معاہدہ کرنے میں کامیاب ہو گیا جس میں ایک شق یہ بھی شامل تھی کہ دونوں ریاستوں کے درمیان کبھی دشمنی کی فضا پیدا نہیں ہونے دی جائے گی۔

1820ء میں اس معاہدے کی تجدید ہوئی۔ 1832ء میں ایک اور معاہدہ طے پایا جس کے نتیجے میں دریائے سندھ جہاز رانی کے لئے کھل گیا اور فریقین کو پابند کر دیا گیا کہ وہ ایک دوسرے کی ملکیت پر حریصانہ نظر نہیں رکھیں گے' انگریزوں نے یہ بھی قبول کر لیا کہ نہ تو کوئی مسلح جہاز یا کشتی دریائے سندھ سے گزر سکے گی اور نہ ہی اس میں سفر کرنے والا کوئی شخص کسی بھی قسم کے ہتھیار سے لیس ہو گا۔

لیکن یہ معاہدے انگریز کو اس کے مخصوص مفادات کے حصول سے باز نہ رکھ سکے۔ یہ معاہدے تو محض دام ہم رنگ زمیں تھے۔ سمندر پار سے آنے والوں کے عزائم تو کچھ اور تھے۔ 1942ء میں سندھ ہسٹاریکل سوسائٹی کے زیر اہتمام ایک مقالہ پڑھا گیا جس میں انڈین سول سروس کے افسر ایچ ٹی لیمبرک H.T. Lambrick نے ایک سندھی کے حسرت آمیز جملے کا ذکر کیا ہے جو اس سندھی نے ایک اور انگریز جیمز برنز کو دریائے سندھ کا جائزہ لیتے ہوئے دیکھ کر کہا تھا "افسوس سندھ ہاتھ سے جاتا رہا کیونکہ انگریز نے دریا دیکھ لیا ہے"۔

کمپنی دریا کو تجارتی اور فوجی دونوں مقاصد کے لئے استعمال میں لانا چاہتی تھی۔ میانی اور ڈبا کے مقامات پر استعماری افواج نے تمام معاہدوں کی دھجیاں بکھیر کے رکھ دیں۔

میانی اور ڈبا کے معرکوں میں مقامی افواج کی شکست کے نتیجے میں سر چارلس نیپئر Sir Charles Napier نے 1843ء میں سندھ پر قبضہ کر لیا۔ سندھ کے ساتھ دوستی اور تعاون

کے معاہدوں کے پس منظر میں اس فتح پر نیپئر سے یہ پیغام منسوب کیا جاتا ہے۔

"Peccavi" (I have Sinned [Sind])

''اعتراف گناہ یہ ہے کہ میں نے سندھ فتح کر لیا ہے۔''

چارلس نیپئر کو مفتوحہ سندھ کا پہلا گورنر مقرر کیا گیا۔

انگریز ہندوستان میں ایک ناقابل شکست طاقت کی حیثیت اختیار کر چکے تھے لیکن 1841ء میں کابل کی شرمناک شکست کے بعد ان کے حوصلے پست تھے۔ اس مرحلے پر سندھ کی فتح نے برطانوی توسیع پسندی کو ایک نیا عزم اور حوصلہ دیا۔ ایک بار پھر بین الاقوامی سرحدوں کے پار نظریں جمائی جا سکتی تھیں۔ گورنر نیپئر پنجاب کے جنوبی علاقوں میں اپنی مہم جوئی کا آغاز کر چکا تھا۔

سکھ ریاست کے ساتھ بھی انگریز ایک معاہدے کے پابند تھے لیکن اب انہیں 1809ء کے اس معاہدے کی ضرورت نہیں تھی۔ کنگھم Cunningham نے اعتراف کیا تھا کہ 'سکھوں نے 1809ء کے تعلقات کی پاسداری کی لیکن انگریز اپنے مختلف النوع مفادات اور ذمہ داریوں کے پیش نظر ان تعلقات کو زیادہ اہمیت نہیں دے سکے۔

وادی سندھ پر قبضہ

پنجاب کی طرف باقاعدہ رخ کرنے سے پہلے انگریز بلوچستان میں الجھے ہوئے تھے۔ دریائے سندھ میں اوپر کی طرف جاتے ہوئے الیگزینڈر برنز نے خان آف قلات سے کچھ خط و کتابت بھی کی لیکن بیچ کے لوگوں کی وجہ سے دونوں کے درمیان کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ اسی دوران بلوچ قبائل خاص طور پر بگٹی ' مری اور جھاکرانی استعماری قوت کے مواصلاتی نظام کو درہم برہم کرنے کے درپے تھے۔ لیفٹیننٹ جان جیکب John Jacob اور لیفٹیننٹ میئر ویدر Mereweather کئی مہینے تک قبائل کے ساتھ جھڑپوں میں الجھے رہے۔ دسمبر 1839ء میں بگٹی سردار بیرک گرفتار ہو گیا اور بگٹی شورش کا سلسلہ وقتی طور پر رک گیا۔ اب انگریز مری قبائل کی طرف متوجہ ہوئے اور 1840ء میں درہ نفوسک کی لڑائی میں دونوں طرف سے خوب داد شجاعت دی گئی۔ کمپنی کی حکومت جیکب کی اس رائے سے متفق نظر آتی تھی کہ 'پنجاب سے اگر رسائی حاصل نہ ہو تو اس صورت میں دفاع اور تجارت کے حوالے سے درۂ خیبر کے مقابلے میں درۂ بولان انگریزوں کے لئے زیادہ فائدہ مند ہے۔'

رنجیت سنگھ کی موت سے پنجاب پر قبضے کے امکانات ایک بار پھر روشن ہو گئے تھے۔ برطانوی استعمار نے اپنی توپوں کا رخ پنجاب کی طرف پھیر دیا تھا۔ پنجاب کا محاذ جنگ دہک اٹھا تھا۔

پہلی سکھ جنگ (1845) دو تجربہ کار دشمنوں کے درمیان معرکہ تھا جس میں انگریزوں کو اس لحاظ سے برتری حاصل رہی کہ انہوں نے سر ہنری لارنس کو پنجاب کا پولیٹیکل ایجنٹ ماننے اور اس کے زیر نگرانی حکومت چلانے کی شرائط منوالیں۔ سکھ خالصہ اس صورت حال سے سخت برافروختہ تھا لیکن لارنس کی شخصیت کے طلسم نے حالات کو بگڑنے سے بچائے رکھا۔ 1848ء میں لارنس رخصت پہ گیا تو وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔

دوسری سکھ جنگ (49-1848) کے دوران کئی معرکے بپا ہوئے اور بالآخر بہادر سکھ فوج مکمل شکست سے دوچار ہوئی اور پنجاب پر انگریز راج قائم ہو گیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اپنوں کی غداری کے بغیر نڈر سکھوں کی شکست ممکن نہیں تھی۔ گلاب سنگھ جسے صلے میں کشمیر دیا گیا تھا' سکھوں کا میر جعفر ثابت ہوا۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ گلاب سنگھ بھی رنجیت کے جری خالصہ کو لڑے بغیر ہتھیار ڈالنے پر آمادہ نہیں کر سکتا تھا لہٰذا خفیہ طور پر یہ طے ہوا کہ عین لڑائی کے دوران سکھ جرنیل اپنی فوج کو علی الاعلان چھوڑ کر الگ ہو جائیں گے۔

سوبراؤں کی لڑائی کا نتیجہ پہلے سے طے شدہ تھا۔ کننگھم لکھتا ہے "خفیہ معاہدوں اور شرمناک غداری کے ماحول میں سوبراؤں کی جنگ لڑی گئی" چیلیانوالہ کی لڑائی بھی اعصاب اور شاطرانہ حکمت عملی کا امتحان ثابت ہوئی اور گجرات وہ جگہ تھی جہاں آخری معرکہ برپا ہوا۔ جنرل گوف General Gough نے 21 فروری 1849ء کو پنجاب کا نظم و نسق سنبھالا۔ جنرل کو بعد میں لارڈ کے خطاب سے نوازا گیا۔

پنجاب برصغیر کا آخری اور فیصلہ کن میدان جنگ ثابت ہوا۔ 1857ء کی جنگ آزادی تک ' سکھوں کی مزاحمت کسی بھی مقامی قوت کی جانب سے صنعتی سامراج کی بے رحمانہ پیش قدمی کو روکنے کی آخری کوشش تھی۔ پنجاب میں انگریزوں کو برصغیر میں اب تک پیش آنے والی شدید ترین مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔

سقوط پنجاب کے پیچھے صنعتی پیداوار ' مواصلات ' جنگی حکمت عملی اور آلات حرب کی پیداوار میں برطانوی پیش رفت اور جدید نقشہ نویسی کا دانشمندانہ استعمال تھا۔ زمین کی ساخت ماننے والے نقشوں کی مدد سے جنگی منصوبہ بندی کا فن ہندوستان کے لئے نامانوس تھا۔ برطانوی فوج کے لئے فین گارڈن کے تیار کردہ نقشے انتہائی گراں قدر اور غالباً فیصلہ کن اہمیت کے حامل ثابت ہوئے۔

برصغیر پر استعماری غلبے میں اخلاقی پہلو کی اہمیت بھی کچھ کم نہیں تھی۔ سرمایہ دارانہ نظام اپنی اقدار بھی ساتھ لایا تھا۔ کسی عمل کا نتیجہ ہی اس کا جواز مہیا کرتا ہے۔ یہ نظریہ ' جفاکش راجپوتوں '

جاٹوں اور بلوچوں کے لئے کس قدر صدمے کا باعث رہا ہو گا؟ جنگوں کے فیصلے کے لئے میدان جنگ تھے نہ کہ سازشیں اور غداریاں۔ پلاسی' سرنگا پٹم اور سوبراؤں میں انگریز کی سازشوں کے نتیجے میں جعفر' صادق اور گلاب سنگھ کی غداری' زوال پذیر جاگیردارانہ اخلاقیات کے لئے بھی کراہت انگیز تھی۔ یہی اقدار ابھرتی ہوئی بورژوازی ثقافت کی محافظ ثابت ہوئیں۔

انگریز کے نزدیک منڈیوں تک رسائی ہر قیمت پر جائز تھی اور مقصد کے حصول میں کامیابی ہی اس کا جواز مہیا کرتی تھی۔

انگریزوں نے اپنی جنگیں' لڑائی سے پہلے ہی جیت لی تھیں۔ سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان تو اس گھناؤنے پہلو کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے اور سکھ بھی انگریز کے اس وار سے بچ نہیں پائے۔ پلاسی' سرنگا پٹم اور میانی کی طرح پنجاب کی جنگوں کا نتیجہ بھی شکست نکلا۔

اور پھر برآمدات' درآمد میں بدل گئیں

1838ء میں رانی جنداں کی کوکھ سے جنم لینے والے دلیپ سنگھ کو 1846ء میں رسمی طور پر راجا تسلیم کر لیا گیا لیکن اب پنجاب کی حیثیت ایک زیر کفالت ریاست سے زیادہ نہیں تھی اور یہی ماتحتی 1849ء میں بالآخر راج میں پنجاب کی شمولیت کے کام آئی۔ برصغیر کا غلہ خیز خطہ اب یونین جیک کا سب سے زرخیز پیداواری علاقہ تھا۔

مفتوحہ پنجاب سے حاصل ہونے والی آمدنی اتنی زیادہ تھی کہ پہلے ہی سال سے فوجی دستوں اور شہری انتظامیہ کے اخراجات منہا کرنے کے بعد بھی 50 لاکھ روپے سالانہ کی آمدنی ہونے لگی۔ اس کے علاوہ آب پاشی کی جدید برطانوی تکنیک کے استعمال سے پنجاب کی زرخیز زمینیں اتنی زیادہ پیداوار دینے لگیں کہ لیڈن ہال سٹریٹ Leadenhall Street کے ڈائریکٹروں یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی کی انتظامیہ نے ڈلہوزی کو اپنی بھرپور حمایت کا یقین دلایا۔

اس کے بعد مانچسٹر میں کبھی کپاس کی قلت نہیں ہوئی۔ اب برطانیہ ایک اور لمبی زقند بھرنے کے لئے تیار تھا۔ سلطنت کے استحکام اور انگلستان میں صنعتی انقلاب کے ثمر آور ہونے کے باعث برصغیر سے خام مال کی لوٹ کھسوٹ بہت منفعت بخش کاروبار تھا' لیکن اس لوٹ کے نتیجے میں کامیاب ہونے والے صنعتی انقلاب کے بعد مصنوعات کے سیلاب کے لئے منڈیوں کی تلاش ایک نیا مرحلہ تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے معاشی نظام میں انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت تھی۔ اب کاروباری سرمایہ داری کی جگہ آزاد تجارت کے سرمایہ دارانہ اصول اپنائے گئے جس میں نوآبادیاتی نظام کے طور طریقوں کو یکسر

تبدیل کر دینا ناگزیر ہو گیا تھا۔

برطانیہ میں ارتقاء پذیر جدید طبقوں کے مطالبات اور عام تجارت پر تیار مال بنانے والی صنعتوں کے غلبے کے نتیجے میں وادی سندھ ' ہندوستان اور انگلستان کے مابین تعلقات ایک نئی ڈگر پر استوار ہونے لگے۔ راج کی ضرورت تھی کہ اپنی نوآبادیوں کو کپاس برآمد کرنے والے ممالک کی صف سے نکال کر کپاس کی مصنوعات درآمد کرنے اور برطانوی تاجر کو منافع بخشنے والے ممالک میں شامل کیا جائے۔ اس کے لئے ہندوستان کے ساتھ تجارت پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی اجارہ داری کو ختم کرنا اشد ضروری تھا۔ اب انگلستان سے مصنوعات کی برآمد کو حکومتی سرپرستی میں فروغ دینے کی حکمت عملی اپنائی گئی۔

کمپنی کے معاملات میں حکومتی دخل اندازی پہلے ہی بہت زیادہ ہو چکی تھی۔ لارڈ نارتھ Lord North کے 1773ء کے ریگولیٹنگ ایکٹ Regulating Act میں گورنر جنرل ' اس کی کونسل اور سپریم کورٹ کے تقرر کا جواز فراہم کیا جا چکا تھا۔ اب پٹ Pitt کے 1784ء کے انڈیا ایکٹ میں ہندوستان کے لئے وزیر داخلہ اور لندن میں ایک بورڈ آف کنٹرول کی گنجائش مہیا کر دی گئی۔ کمپنی کی اجارہ داری 1813ء میں ختم ہو گئی تھی۔ انیسویں صدی کے وسط میں کمپنی خود بھی زمانے کی دستبرد کا شکار ہو گئی۔ ملکہ کے لئے راج کو براہ راست اپنی تحویل میں لینے کا وقت آن پہنچا تھا۔

1857ء کے بحران نے سلطنت کو ہلا کے رکھ دیا اور برطانوی حکومت نے ملکہ برطانیہ کے رسمی اختیارات کے نام پر ' برصغیر کے تمام معاملات کی ذمہ داری خود سنبھال لی۔

زیر کفالت ریاستوں کا نظام

یہاں ذیلی یا زیر کفالت ریاستوں Subsidiary States کے نظام کے بارے میں تھوڑی سی وضاحت ضروری ہے۔

یہ نظام برطانیہ کی استعمارانہ توسیع پسندی کے ہاتھوں میں ایک ایسا توہین آمیز ہتھکنڈا تھا جس پر سامراج کے عیارانہ مزاج کی گہری چھاپ تھی۔ ریاست کی کسی بھی تعریف کے مطابق ہندوستان میں ریاستوں کی تعداد تین سے چھ سو کے درمیان تھی۔ ان میں ایسی ریاستیں بھی تھیں جن کی "شہنشاہیت" محض ایک گاؤں تک محدود تھی اور 8 کروڑ نفوس پر مشتمل ایسی وسیع ریاستیں بھی تھیں جو صحیح معنوں میں ایک قومی ریاست کی تعریف پر پورا اترتی تھیں۔ ان میں سے اکثر ریاستوں کے حکمران انحطاط پذیر جاگیردار تھے ' اس نظام میں محض نام کو بھی کوئی خوبی باقی نہیں رہ گئی تھی اور برطانوی استعمار

نے برصغیر کو محکوم رکھنے کے لئے شہزادگان کی فطری کمزوریوں سے بھرپور فائدہ اٹھایا تھا۔

برصغیر میں ذیلی یا زیر کفالت ریاست وہ تھی جسے نو آبادیاتی طاقت اپنے مخصوص مفادات کے تناظر میں دوست ریاست قرار دے کر' پہلے مرحلے میں وہاں اپنا پولیٹیکل ایجنٹ مقرر کر دیتی تھی۔ استعمار کے اس نمائندے کے تحت معقول تعداد میں فوجی نفری بھی ہوتی اور بظاہر وہ مقامی راجہ یا نواب کا مشیر ہوتا جس کے ذمے حکمران کے اقتدار کا تحفظ بھی تھا۔ اس حوالے سے کامیابی کے ساتھ قدم جمانے کے بعد' توقع کے عین مطابق' ایسے حیلے بہانے تراش لئے جاتے جو مقامی حکمران کا تختہ الٹنے میں کام آتے اور یوں ریاست کو بتدریج راج میں ضم کر لیا جاتا۔ حکمران کو اقتدار سے محروم کرنے کے لئے سازش' رشوت' لالچ اور تشدد کے ذریعے ایسے حالات پیدا کر دیئے جاتے کہ جن کے سامنے اپنے محدود وسائل کے باعث حکمران بے بس ہو جاتا تھا پھر کوئی مناسب موقع دیکھ کر' حکمران پہ نااہلی یا رعایا پر ظلم روا رکھنے کا الزام عائد کر دیا جاتا اور اس بہانے حکمران اور رعایا' دونوں کے وسیع تر مفاد میں انگریز کو "بادل نخواستہ" مداخلت پر مجبور ہونا پڑتا۔ اس طرح حکومت پر براہ راست قبضہ کر لیا جاتا اور کسی کٹھ پتلی وارث کی عدم موجودگی میں ریاست' سلطنت برطانیہ کو منتقل ہو جاتی تھی۔

راج کے شارحین' بیتے دنوں کی یادوں سے مسحور ہو کر' بڑی ڈھٹائی سے ڈلہوزی کی خیر اندیش حکمت عملی کے گن گاتے ہیں۔ سپئر کے نزدیک 'ہندوستانی ریاستوں کا (راج میں) ضم کیا جانا (سلطنت برطانیہ) کے شاندار کارناموں میں سر فہرست ہے' اس عمل کا اخلاقی جواز بھی فوراً ہی تراش لیا گیا' ڈلہوزی سمجھتا تھا کہ ہندوستان کے مقابلے میں برطانوی طرز حکمرانی اتنا بہتر تھا کہ جتنے زیادہ علاقے پر راج کا تسلط ہوتا' ہندوستان کے عوام کے لئے اتنا ہی بہتر تھا' مقامی حکمرانوں کی بداعمالی کے اکثر واقعات کے پس پردہ انگریز مشیروں کی ریشہ دوانیاں کارفرما ہوتی تھیں لیکن اس کے باوجود (ڈلہوزی سے منسوب) سپئر کے تفاخرانہ استدلال کو چھپانے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔

ذیلی ریاستوں کے نظام میں اختیارات کا سرچشمہ برطانوی حکومت تھی۔ بعض اوقات تو برطانوی مشیر اپنے وزیر بھی مقامی حکمران پر مسلط کر دیتا تھا جو اکثر و بیشتر انگریز ہوتے۔ ذیلی ریاست اجازت کے بغیر برطانوی شہریوں کو ملازم بھی نہیں رکھ سکتی تھی۔ ریاستی حکمرانوں کو ہر معاملے میں پولیٹیکل ایجنٹ کا مشورہ قبول کرنا پڑتا تھا۔

نوجوان شہزادوں کی تربیت کے لئے انگریز آیاؤں کے انتخاب کا مرحلہ بہت اہم ہوتا تھا اور اکثر اوقات یہ آیائیں بھی راج کی طرف سے ہی بھیجی جاتی تھیں۔ جیمز موریس James Morris کے الفاظ میں 'انگریز اتالیق اور آیاؤں' مشیر اور ملاقاتیوں کے علاوہ ایٹن اور آکسفورڈ

Eton-Oxford کے تعلیمی سانچوں میں ڈھل کر یہ شہزادگان خود آدھے انگریز بن جاتے تھے۔ اس انگریزاشرافیہ کے مانند جن پر مشرقی ملمع سازی کی گئی ہو۔ آکسفورڈ سے فارغ التحصیل ہونے والا شہزادہ استعماری مشیر کی ہدایت اور مشورے کا اور بھی زیادہ محتاج ہوتا تھا۔ اس صورت حال میں ذیلی ریاست کا حکمران محض نام کا حکمران رہ جاتا لیکن اس کے باوجود اس سے انتظامی امور کی بہتر انجام دہی اور اچھی حکمرانی کی توقع رکھی جاتی۔ اس کے مقابلے میں برطانوی مشیر کا کردار اس داشتہ کی طرح تھا جس پر ذمہ داری تو کوئی بھی عائد نہیں ہوتی لیکن اسے مراعات تمام تر حاصل ہوتی ہیں۔

لاہور میں برطانوی پولیٹیکل ایجنٹ اور انتظامیہ میں 'پنجاب سسٹم' کے معمار ہنری لارنس Henry Lawrence نے پہلی سکھ جنگ کے بعد تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ 'یہ نظام صرف بری حکومت کی ترویج کے لئے موزوں ہے' اور اس کی کارکردگی کو ذاتی طور پر جانچنے کے بعد اس نے لکھا کہ 'بری حکمرانی کو یقینی بنانے کے لوازمات میں مقامی حکمران اور اس کے وزیر شامل ہیں دونوں کا انحصار بیرونی فوج پر ہوتا ہے اور دونوں برطانوی مشیر کی ہدایات کے تابع ہیں'' سر ہنری لارنس سے 30 سال پہلے سر تھامس منرو Sir Thomas Munro نے بھی زیر کفالت ریاستوں کے نظام کو مطعون کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ جہاں بھی اس نظام کو متعارف کرایا گیا اور اگر اس ریاست کا حکمران غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک نہیں تھا تو وہاں کے دیہات زوال پذیر ہوئے اور ان کی آبادی کم ہوتی چلی گئی'' ڈلہوزی نے ذیلی ریاست کے نظام کو بار بار استعمال کیا اور مناسب وارث کی عدم موجودگی میں 'نظریہ کالعدم' Doctrine of Lapse کو جواز بنا کر صرف اس نے آٹھ ریاستوں کو راج میں ضم کیا جن میں انتہائی اچھی شہرت کی حامل' مسلمانوں کی ریاست اودھ بھی شامل تھی۔

جب ان دو نظاموں کے درمیان (زرعی اور جاگیردارانہ ہندوستان بمقابلہ صنعتی اور سامراجی برطانیہ) سب سے اہم اور آخری جنگ لڑی گئی تو تقریباً سارا ہندوستان برطانیہ کے زیر تسلط آ چکا تھا۔ بابر اور اکبر کا وارث' تیموریہ خاندان کا آخری فرمانروا' شہنشاہ ابو غازی ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ثانی ایک بے حیثیت و لاچار وظیفہ خوار بن کے رہ گیا تھا۔ وہ محض ایک علامتی حکمران تھا جس کے اقتدار اعلیٰ کی حدود محل کے پائیں باغ سے ذرا آگے جا کر ختم ہو جاتی تھیں۔

اور یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب 1857ء کی جنگ آزادی یا بغاوت کا آغاز ہوا جسے انگریز نے غدر کا نام دیا تھا۔

22

1857ء

9 مئی 1857ء

جب پنجاب انگریز راج میں ضم ہوا تو اس وقت بنگال رجمنٹ کے دستے برطانوی فوج کا سرمایہ افتخار سمجھے جاتے تھے۔ ان جوانوں اور نان کمیشنڈ افسروں کی اکثریت ایسے علاقوں سے بھرتی کی گئی تھی جنہیں آج اتر پردیش کہا جاتا ہے۔ وہ راج کے تنخواہ دار بھی تھے اور اودھ کے بے حیثیت بادشاہ کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے پنشن یافتہ شہنشاہ سے علامتی وفاداری بھی برقرار رکھے ہوئے تھے۔

شاہ اودھ کے ساتھ اپنے پچاس سالہ معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے انگریزوں نے 1856ء میں واجد علی شاہ کو معزول کر دیا۔ اس مقصد کے لئے کانپور سے جو فوج لکھنؤ پہنچائی گئی اس کی اکثریت شاہ اودھ کی رعایا تھی لیکن واجد علی شاہ نے اپنے دشمنوں کو بھی مایوس ہی کیا۔ ایک بھی گولی چلائے بغیر ہتھیار ڈال دیئے گئے۔ اور جب واجد علی شاہ نے اپنی شاہی دستار چیف کمشنر سر جیمز آؤٹرم Sir James Outram کے حوالے کی تو اودھ کا بادشاہ ماتمی لباس پہن کر انگریز کمشنر کے حضور پیش ہوا اور وہ آنکھوں میں آنسو لئے ایک عاجز فریادی کی طرح اپنے "حقوق اور مراعات" کے لئے گڑگڑا رہا تھا۔ درخواست مسترد کئے جانے پر وہ خاموشی سے کلکتہ چلا گیا اور اپنی عرضداشت گورنر جنرل کی خدمت میں پیش کی۔ وہاں بھی مایوسی مقدر بنی تو معزولی کا روگ لئے وہ لندن تک گیا لیکن اقتدار پر بحالی اس کا نصیب نہ ہو سکی۔

دوسروں کی بات تو کیا وہ فوجی جو کمپنی کی ملازمت میں تھے وہ بھی اپنے بادشاہ سے بہر حال اس سے

کہیں بہتر رویئے کی توقع رکھتے تھے۔ بادشاہ سے ان کی توقعات جو بھی رہی ہوں لیکن اودھ پر انگریز کے براہ راست قبضے سے راج پر بنگالی فوج کے اعتماد کو سخت دھچکا لگا۔

انگریزوں کی طرف سے جلد ہی ایک اور اشتعال انگیزی بھی ہوئی۔ اسی سال لارڈ کیننگ Lord Canning نے جنرل سروس انلسٹمنٹ ایکٹ General Service Enlistment Act جاری کر دیا جس کی رو سے کمپنی کے سپاہیوں کو اپنے رہائشی علاقوں سے دور کہیں بھی تعینات کیا جا سکتا تھا۔ کمپنی کی فوج کے بنگالی دستوں میں اودھ (اتر پردیش) کے سپاہی ابھی حال ہی میں مالی مشکلات سے دوچار ہو چکے تھے۔ انہوں نے انگریز کی طرف سے پنجاب کو زیر کرنے کی جنگیں لڑی تھیں اور جب تک پنجاب راج کی حدود میں شامل نہیں ہوا تھا' انہیں اضافی تنخواہ حاصل ہوتی تھی لیکن 1849ء میں پنجاب پر قبضے کے بعد کمپنی کے آڈیٹر جنرل نے اضافی مراعات روک لی تھیں۔ کمپنی کے سپاہی اس کٹوتی کو اپنی وفاداری اور پنجاب فتح کرنے میں اپنی قربانیوں کا انعام تو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ گویا بے چینی اور وسوسے دلوں میں گھر کر چکا تھا۔

مارچ 1857ء میں ایک انگریز اپنے گھر خط لکھتے ہوئے تذکرہ کرتا ہے کہ "اس وقت پورے ہندوستان میں ایک عجیب پراسرار سا ماحول پایا جاتا ہے.......... یہ ایک تحریک ہے یا کیا ہے؟ کسی کو اس کا مقصد سمجھ نہیں آتا........ کسی کو معلوم نہیں یہ کب اور کہاں سے شروع ہوئی' کس نے اور کس مقصد کے لئے شروع کی۔ کیا اس کا تعلق کسی مذہبی رسم سے یا کسی خفیہ تنظیم سے ہے؟ بہر حال اس کا نام "چپاتی تحریک" ہے۔ جس شخص کو ایک چپاتی ملتی ہے اس سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اور بہت سے لوگوں کو ایک ایک چپاتی بھیجے گا۔ یہ ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے' بددل لوگوں کا ایک دوسرے سے اظہار یکجہتی۔ جس شخص کو ایک چپاتی ملی اور اس نے جن دوسرے لوگوں کو چپاتیاں بھجوائیں گویا وہ سب ایک جیسا ذہن اور سوچ رکھنے والے لوگ ہیں۔ ایک عام اندازے کے مطابق صرف رات ہی رات میں یہ چپاتیاں 160 سے 200 میل کے علاقے میں تقسیم ہو جاتی ہیں"۔

فوج کے سپاہیوں کی وفاداری پہلے ہی مشکوک تھی کہ اس دوران بریچ لوڈنگ انفیلڈ رائفلز Breach Loading Enfield Rifles' اور اس کے کارتوسوں کا قضیہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ہندو اور مسلم سپاہیوں میں یہ خیال عام ہو گیا کہ ان کے کارتوسوں کی لیپ میں گائے اور سؤر کی چربی استعمال کی گئی ہے۔ انہیں چلانے سے پہلے سپاہیوں کو ان کے سرے دانتوں سے کاٹ کر علیحدہ کرنے پڑتے تھے اور دونوں مذاہب سے تعلق رکھنے والے سپاہی اس انتہائی ناپسندیدہ صورت حال پر مشتعل ہو گئے۔

9 مئی 1857ء کے روز میرٹھ کی فوجی چھاؤنی میں وہ 85 سپاہی غیر مسلح کر دیئے گئے جنہوں نے

چکنے کارتوسوں کے استعمال سے انکار کر دیا تھا۔ ان سپاہیوں کا تعلق تیسری لائٹ کیویلری Third Light Cavalry 11ویں اور 20ویں نیٹو انفنٹری Native Infantry ' 60ویں رائفلز کی پہلی بٹالین ' چھٹے ڈریگون گارڈز Dragoon Guards ' گھڑ سوار آرٹلری کے ایک دستے ' پیادہ توپخانے کی ایک کمپنی اور ایک لائٹ فیلڈ بیٹری Light Field Battery سے تھا۔ ان میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے اور دوسروں کے درس عبرت کے لئے ان کی وردیاں اور جوتے اتار کر انہیں بیڑیاں پہنا دی گئیں۔ وہاں موجود باقی سپاہی یہ توہین برداشت نہ کر سکے۔ اگلے روز سب نے 'بغاوت' کر دی۔ دیسی سپاہیوں کی رجمنٹوں نے قیدی چھڑا لئے اور میرٹھ چھاؤنی میں مقیم بیشتر انگریز اور ان کے خاندان ہلاک کر دیئے گئے اور یہ 'باغی' دہلی کی جانب روانہ ہو گئے۔

ادھر دہلی کی دیسی سپاہیوں پر مشتمل رجمنٹیں بھی اٹھ کھڑی ہوئیں اور چھاؤنی پر قبضہ کرنے کے بعد انہوں نے معزول و ناتواں بہادر شاہ ثانی کو بطور شہنشاہ دہلی کے تخت پر بحال کر دیا۔ تقریباً تین ماہ دہلی اور اس کے مضافات پر حریت پسندوں کا قبضہ رہا۔ پھر 20 ستمبر کو انگریز فوجی دستوں نے کشمیر گیٹ سے دہلی پر حملہ بولا اور شہر پر دوبارہ قبضہ کرنے میں کامیاب رہے۔

آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر ثانی' جغاکش بابر کا جانشین' اپنے جد امجد ہمایوں کے مقبرے سے گرفتار ہوا۔ اسے جیل میں ڈال دیا گیا اور یورپ سے آنے والے 'معزز مہمانوں' کے سامنے انتہائی توہین آمیز انداز میں پیش کر کے فرد جرم عائد کی گئی جس کے مطابق ہندوستان کے شہنشاہ نے ''مملکت برطانیہ کے ایک عام شہری کی حیثیت سے اپنی وفاداریوں سے انحراف کیا اور آزاد ہندوستان کا مقتدر بادشاہ ہونے کے اعلان سے لاتعلقی کا اظہار نہ کرنے کے جرم کا ارتکاب کیا'' 1859 میں بہادر شاہ کو جلاوطنی کی سزا دے کر رنگون پہنچا دیا گیا جہاں 87 سال کی عمر میں اس نے جہان فانی سے کوچ کیا اور مرتے دم تک بے بسی کے عالم میں بس مشق سخن ہی جاری رکھ سکا۔

کتنا ہے بدنصیب ظفر' دفن کے لئے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

جو بویا' وہی کاٹا

1857ء کی جنگ کے بعد 'برطانوی بالادستی' ہندوستان کے صدیوں سے جامد زرعی طرز حیات کی تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ نئی سماجی اقدار کے تحت حسب و نسب کی جاگیرداری وراثت کے بجائے صنعت و تجارت میں کامیابی وجہ تکریم ٹھہری اور وراثتی مرتبے کی نسبت پیشوں میں واضح مہارت '

خاص طور پر ان شعبوں میں جو استعمار کی استحصالی حکمت عملی کی اعانت کرتے تھے' معاشرے میں عزت و توقیر کا باعث ہوئی۔

تقریباً تین ہزار سال میں پہلی بار ہندوستان کا معاشرتی ڈھانچہ اور ذات پات کا گھمبیر نظام حقیقی خطرے سے دوچار تھا۔

یورپ کا سیکولر طرز عمل بھی اپنا اثر دکھا رہا تھا۔ بڑے شہروں کی صنعتی ثقافت میں پابندیوں سے عورت کی ممکنہ آزادی کے تصور نے صدیوں سے مروج خاندانی رشتوں کے منقطع ہونے کا خدشہ لاحق کر دیا۔ معاشرہ شہری طرز زندگی کی جانب گامزن ہوا اور گاؤں سے شہروں کی طرف نقل مکانی سے مشترکہ خاندان کے نظام کو شکست و ریخت کا سامنا کرنا پڑا' نسلوں پرانے سماجی تعلقات کی بنیادیں ہل رہی تھیں' رجعت پسندانہ نظریات اور اخلاقی اقدار کا بھی دیوالیہ پٹ رہا تھا۔ 1857ء کی بغاوت اپنے مزاج کے اعتبار سے بدیسی حکمرانوں کے خلاف جاگیردارانہ رد عمل کا متشدد اظہار تھی جس کی قیادت جاگیرداروں یا ان کے حمایت یافتہ افراد کے ہاتھوں میں تھی اور جسے دہلی اودھ اور وسطی ہندوستان اور بہار کے چند علاقوں میں ہی عوامی حمایت حاصل ہو سکی۔

برطانیہ نے ہندوستان کی مدد سے وادی سندھ پر قبضہ کیا اور اب وادی سندھ سے بھرتی کیے گئے فوجیوں کی مدد سے انگریز ہندوستان کو مکمل طور پر اپنا مطیع بنانے میں مصروف تھے۔ اس زمانے میں وادی سندھ کے باسی پوربی ہندوستانیوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ آخر کیوں؟ سندھی اور پنجابی ابھی تک ایسی انگریز رجمنٹوں اور ایسے انگریز فوجی دستوں مثلاً گائیڈز کیولری Guides Cavalry' بنگال پیادہ توپخانے' بنگال نیٹو انفنٹری Native Infantry' بنگال سیپرز اور مائنرز Sappers & Miners' تھرڈ حصارز' ناتھ لانسرز' بنگال لانسرز Lancers اور ولٹ شائرز Wiltshires کو نہیں بھول پائے تھے جن کے ہاتھوں انہیں میانی' ڈبہ' سبراؤں' چیلیانوالہ اور گجرات میں شکست ہوئی تھی۔ یہ تمام افواج آج کے اتر پردیش' بہار اور مہاراشٹر کے سپاہیوں پر مشتمل تھیں۔ صرف افسران اور چند یونٹ بدیسی تھے۔

فاتح انگریز جرنیل نیپئر Napier اور گوف Gough کا توہین آمیز اور ظالمانہ رد عمل وادی سندھ کے لوک گیتوں اور داستانوں میں آج بھی زندہ ہے لیکن ان جرنیلوں کے احکامات پر عملدر آمد کرنے والے کون تھے؟ یہی ہندوستان سے بھرتی ہونے والے انگریز کمان کے ماتحت پوربی پیادہ سپاہی۔

پنجاب اور سندھ کے علاقے تھکن سے چور تھے۔ ابھی چند سال پہلے وہ انگریزوں کے خلاف ایک طویل مگر ناکام جدوجہد کرتے رہے تھے اور ابھی تک ''پوربیوں'' کے لگائے ہوئے زخم چاٹ رہے تھے۔

انہوں نے اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا تھا کہ نیپئر 'گوف اور دوسرے انگریز جرنیلوں کی سرکردگی میں 1843 سے 1849ء کے دوران ان کے خلاف لڑنے اور ان کے قصبوں میں لوٹ مار کرنے والے فوجی دریائے جمنا کے کناروں پر بسنے والے تھے۔ پنجابی اور سندھی اپنی فوجی مہارت پر فخر کیا کرتے تھے۔ وہ دیکھ چکے تھے کہ انہیں شکست سے دوچار کرنے والی فوج کی ایک تہائی سے بھی کم تعداد انگریزوں پر مشتمل تھی' باقی سب اودھ اور بہار کے سپاہی تھے' اس سلسلے میں جان ہیرس John Harris لکھتا ہے۔

"پنجاب ہمیشہ سے مختلف تھا اور اسے ادغام سے فائدہ پہنچا تھا۔ یہاں کے قبائل مردانہ شجاعت کے حامل جنگجو تھے۔ انگریزوں کو یہاں سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا لیکن انگریزوں سے ان کی خفگی' اودھ کے متکبر سپاہیوں کے خلاف نفرت و حقارت سے بدرجہا کم تھی جن کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ وہ انہیں کچا چبا سکتے تھے مگر انگریزوں کی سرکردگی میں وہ (پوربی) انہیں شکست دینے میں کامیاب رہے"

اب 1857ء میں پنجاب اور بلوچ فوجی دستے 1849 کا "قرض چکانے" دہلی کی جانب روانہ ہوئے۔ وادی سندھ کے بارے میں یہی تصور تھا کہ وہ ہندوستان سے اپنی پرانی شکست اور ہزیمت کا بدلہ چکا رہا ہے۔ وادی سندھ اور ہندوستان ایک بار پھر ایک دوسرے کے مقابل صف آراء تھے اور یہ صورت حالات غیر ملکی طاقت کے لئے بے پناہ فائدے کا باعث ہوئی۔ انہوں نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ پہلے ایک کو دوسرے اور پھر دوسرے کو پہلے کے خلاف استعمال کیا۔

لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرلینا غلط ہوگا کہ صرف سندھی اور پنجابی ہی دہلی سے برسرپیکار تھے۔ اس دفعہ بھی ہوڈسن اور پروبین Hodson & Probyn کے گھڑ سوار دستے ماضی کی طرح پوربیوں اور دہلی والوں پر مشتمل تھے اور بدیسی آقاؤں کی فوج میں انہی کی اکثریت تھی۔ دہلی والے اپنے بھائی بندوں پر حملہ آور تھے۔ وہ خود بنگال لانسرز Lancers' سکنرز ہارس Skinners Horse اور پروبین ہارس Probyn's Horse فوجی دستوں میں شامل تھے' جو دہلی پر حملہ آور ہوئے۔ البتہ سیونتھ حصارز 7th Hussars ' نائنتھ لانسرز ' رائل منسٹر فیوزلیئر Royal Munster Fusiliers اور نارتھمبرلینڈ فیوزلیئر Northumberland Fusiliers جیسے اودھی دستوں کے ہمراہ پنجابی اور سندھی رجمنٹیں بھی تھیں۔ کلکتہ کونسل وہیں اپنے ہیڈکوارٹر پر موجود رہی اور برقی پیغامات اور بنگالی قاصدوں کے ذریعے احکامات بھیج کر جنگی کارروائیوں کی نگرانی کرتی رہی۔ مشرق میں

بارک پور اور مغرب میں پنجاب اور سندھ سے دہلی کی طرف فوجیں روانہ ہوئیں۔ جب سکھ پائنرز Pioneers ' سیکنڈ پنجاب ' الیونتھ سکھ ' نتھ بلوچ ' سیونتھ راجپوت اور 12 ایف ایف ہندوستانی شہروں کے محاصرے کے لئے بھیجی گئیں تو وادی سندھ نے فی الواقع جوابی حملے کے لئے بدیسی حکمرانوں کو محض چند اضافی دستے فراہم کئے جن کی مدد سے انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کیا۔

نیلی بار کا سورما

یہ کہنا بہر حال حق بجانب نہ ہوگا کہ انگریزوں کے خلاف 1857ء کی جنگ میں وادی سندھ نے قطعی حصہ نہیں لیا' یا کہ اس نے مکمل طور پر انگریز کی معاونت کی۔ اکثر چھاؤنیوں میں بغاوت شروع ہونے سے قبل ہی اس کی پیش بندی کر لی گئی تھی۔ برصغیر کی ہر چھاؤنی میں انگریز فوجی افسروں کو برقی پیغامات کے ذریعے میرٹھ میں بغاوت کی اطلاع فوج کے نچلے درجوں تک افواہیں پہنچنے سے پہلے ہی مل چکی تھی لہٰذا وہ سندھ اور پنجاب میں بھی بہت سی یونٹوں کو بغاوت سے قبل ہی غیر مسلح کر چکے تھے۔ وادی سندھ کے سپاہیوں کو جب پریڈ کے میدانوں میں بلا کر غیر مسلح کیا گیا تو وہ اس وقت تک دہلی کے واقعات سے لاعلم تھے۔

لیکن ان پیش بندیوں کے باوجود وادی سندھ میں کئی فوجی یونٹوں نے بغاوت میں حصہ لیا جبکہ اس حقیقت کو عام طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر فیروز پور میں سینکڑوں سپاہی اپنی بیرکوں سے نکل آئے اور انگریز افسروں کے گھروں کو آگ لگا کر دہلی کی طرف چل دیئے۔ ان میں سے جو پکڑے گئے انہیں توپ کے دہانوں سے باندھ کر اڑا دیا گیا۔ جالندھر میں چھٹی اور ساتویں لائٹ کیولری اور 36 اور 61 پنجاب رجمنٹ نے اپنی چھاؤنی پر قبضہ کر لیا۔ مردان کے قریب ہوتی میں 55 ویں انفنٹری نے بھی یہی کیا۔ بغاوت میں حصہ لینے کے الزام میں 14 ویں پنجاب رجمنٹ کے سپاہیوں کا کورٹ مارشل ہوا۔ سیالکوٹ میں نویں لائٹ کیولری نے بھی بغاوت کی اور انگریزوں کو بہت نقصان پہنچانے کا باعث بنی۔ اسی طرح پشاور ' میانوالی ' ملتان ' انبالہ اور تھانیسر میں بھی بغاوت ہوئی۔

اگرچہ پیش بندی تو لاہور میں بھی کر لی گئی تھی لیکن اس کے باوجود یہاں بھی گڑبڑ ہوئی۔ 26 ویں نیٹو انفنٹری رجمنٹ جسے غیر مسلح کیا جا چکا تھا' 30 جولائی 1857ء کو میاں میر چھاؤنی سے باہر نکل آئی۔ تلوار ' تیروں سے مسلح ان فوجیوں نے کمانڈنگ افسر میجر سپنسر سمیت رجمنٹ سارجنٹ اور دو حوالدار قتل کر دیئے۔ منٹگمری Montgomery اور اس کی مسلح پولیس نے راوی کے بائیں کنارے کے

ساتھ ساتھ ان فوجیوں کا تعاقب کیا اور اجنالہ کے قریب ان میں سے ڈیڑھ سو کو ہلاک کر دیا۔ تین سو گولی سے اڑا کر اجنالہ میں ہی ایک گڑھے میں اجتماعی طور پر دفن کر دیئے گئے۔ 45 فوجی گرفتار کر کے لاہور لائے گئے اور منٹگمری کی موجودگی میں پریڈ کے دوران پوری لاہور چھاؤنی کے سامنے انہیں توپ کے دہانوں سے باندھ کر اڑا دیا گیا۔

وادی سندھ میں 1857ء کی جنگ کا غیر متنازعہ ہیرو کھرل قبیلے کا سردار احمد خان تھا۔ ساہیوال سے ملتان تک کا تمام علاقہ جو نیلی بار کہلاتا تھا' اس کی عملداری میں تھا۔ احمد خان جب انگریزوں کے خلاف ہتھیار بند ہوا تو اس کی عمر 80 سال تھی۔ لیکن اس کا حوصلہ اور اس کا جوش اور ولولہ کسی طرح بھی ایک کڑیل جوان سے کم نہ تھا۔ اس عمر میں بھی وہ ایک عظیم شہ سوار تھا۔ اس کی سرکردگی میں کھرلوں نے برق رفتار جنگی مہارت کے ساتھ گوریلا جنگ کے بہت سے دلیرانہ کارنامے سرانجام دیئے۔ مراد فتیانہ' نادر شاہ اور مردانا چند دوسرے بہادر سردار تھے جو کھرلوں کے شانہ بشانہ انگریزوں کے خلاف صف آراء ہوئے۔

21 ستمبر 1857ء کو گوگیرا کے نزدیک لڑائی کے دوران احمد خان مارا گیا۔ اس کا سر تن سے جدا کر کے اور مٹی کے ایک مٹکے پر سجا کے عام نمائش کے لئے رکھا گیا لیکن شکست کے باوجود کھرلوں نے جرات کا مظاہرہ کیا اور اپنے سردار کا سر وہاں سے خفیہ طور پر اٹھا لانے میں کامیاب رہے اور اسے احمد خان کے جسم کے ساتھ دفن کر دیا گیا۔ آج بھی قصہ گو اپنے گیتوں میں احمد خان کھرل کے گن گاتے نہیں تھکتے۔

ڈھوکاں یاد کریندیاں ہین
اک واری مڑ آویں ہاں
رائے نتھو دیا احمد خاناں

لیکن وادیٔ سندھ کے ان علاقوں کے بیشتر لوگ جنہیں انگریزوں نے 1843 سے 1849ء کے دوران بنگال آرمی کے ذریعے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا تھا۔ دہلی کے حالات سے عام طور پر لاتعلق ہی رہے۔

پیرانہ سال شاعر بادشاہ اور غدار مہاراجے

1857ء کی جنگ میں ناکامی کے پس پردہ کچھ اور عوامل بھی کارفرما تھے۔ بہادر شاہ ظفر قائدانہ صلاحیتوں سے عاری ایک 82 سالہ بوڑھا' بیمار اور ناتواں شخص تھا۔ بلاشبہ کمپنی نے اسے شاہانہ کروفر کا ڈھونگ جاری رکھنے کی اجازت دے رکھی تھی اور گزر اوقات کے لئے اسے ایک لاکھ روپے ماہانہ دیئے جاتے تھے لیکن اس کی شاہ خرچیوں' محل کی دیکھ بھال اور اس کے خرچ پر پلنے والے بے مصرف لوگوں کی

کثیر تعداد کے پیش نظر یہ ایک بہت حقیر رقم تھی۔ وہ شاہی تخت پر محض ایک نمائشی فرمانروا کی حیثیت سے براجمان ہوتا اور شعر و سخن کی محفلوں اور درباری آداب و رسوم کے ذریعے عہد رفتہ کے مغل جاہ و حشم کا سراب ترتیب دینے کی کوشش کیا کرتا۔ اگرچہ عوام الناس کے لئے وہ ابھی تک 'بادشاہ' تھا لیکن اس کی سیاسی اہمیت اور حیثیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ شاذ و نادر ہی اسے اپنے محل اور قلعے سے باہر آنے کی اجازت ملتی تھی۔ وہ شاعری سے دل بہلاتا اور اس فن میں اس کی حیثیت مسلمہ تھی۔

نوجوانی اور ادھیڑ عمری کے دور میں بہادر شاہ ظفر کی شاعری اس کے بتدریج بگڑتے ہوئے حالات کی واضح عکاسی کرتی ہے۔ یہ اس کے اپنے ذہن کا پرتو اور اس بے چارگی کا کربناک احساس ہے جسے اس پر مسلط کر دیا گیا تھا اور جس سے چھٹکارا پانے کی کوئی تدبیر اس کے بس میں نہیں تھی۔ بہادر شاہ ظفر کی شاعری میں پنچھی' زنجیر' اسیر' پنجرہ اور پھندا جیسے الفاظ کا چناؤ اسی بے بسی کا اظہار ہے اور تواتر کے ساتھ انہی تراکیب کا استعمال اس کے بے پناہ اندرونی کرب اور عذاب مسلسل کی دلیل بھی۔ اگرچہ 'بادشاہ' اپنی شاعری میں ہمہ وقت مایوسی کی بات نہیں کرتا اور کبھی کبھار اس کے شعروں میں شوق' تمنا اور امید کی ہلکی سی جھلک بھی دکھائی دے جاتی ہے لیکن ایسے وقفے بہت کم ہیں اور اس کی مایوسی اور بے چارگی کے اندھیروں کو مزید اجاگر کر دیتے ہیں۔

صرف شاعر بادشاہ ہی اس دل شکستگی اور ملال کا اسیر نہیں تھا۔ میر انیس' ابراہیم ذوق' اسد اللہ خان غالب' حکیم مومن جیسے جید اساتذہ بھی اسی اندوہ کا شکار تھے۔ دکھ اور کرب کے اظہار میں لکھنؤ مکتبہ فکر دہلی سے کہیں آگے تھا اور وہاں 19ویں صدی کے سرکردہ شعراء مثلاً میر دبیر علی انیس اور سلامت علی بیر نے تو مرثیہ گوئی ہی کو اظہار کا وسیلہ بنا لیا تھا اگلی صدی کے شعراء میں غالب اور مومن جیسے عظیم شاعر ذات کے حصار سے نکل کر اپنی نظم و نثر میں بذلہ سنجی' فلسفے' فہم و ادراک اور زندگی سے بھرپور انداز فکر اختیار کرنے پر بھی قدرت رکھتے تھے لیکن بہادر شاہ ظفر کی شاعری کلیتاً اس کی واردات قلبی سے عبارت ہے جو مایوسی اور بے چارگی اور بدنصیبی کے سوا کچھ نہیں' کیا کوئی اور بادشاہ بھی ان حالات سے گزرا ہوگا کہ وہ ایسا مایوس کن طرز اظہار اختیار کرنے پر مجبور ہوتا؟

دشت وحشت کو ارادہ ہے کہ آباد کروں
کھول دے کاش مرے پاؤں کی زنجیر حریف

کارواں منزل پہ پہنچا اور سارے ہم صفیر
مثل گرد کارواں' اک میں بچھڑ کے رہ گیا

اس چمن میں کیا کرو گے سے کشو ہنس بول کر
غنچہ ساں خاموش، خون دل کو ہی پی کر رہو

بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

اے اسیرو اب نہ پر میں طاقت پرواز ہے
کیا کرو گے تم نکل کر دام سے، بیٹھے رہو

شاید ایک نوجوان بادشاہ اس جنگ کی قیادت جوش اور ولولے سے کر سکتا لیکن فرغانہ کے جری سردار اور کبھی حوصلہ نہ ہارنے والے بابر کی نسل کے آخری فرمانروا میں زندگی کے اس کٹھن مرحلے کو سر کرنے کی ہمت نہیں تھی۔

1857ء کے دوران سلطنت کے مختلف حصوں میں ہونے والی بغاوتوں کے مابین ہم آہنگی کا فقدان اور نظام اولاقات کا تفاوت بھی ناکامی کی ایک بڑی وجہ بنا۔ یہ بغاوت، تن تنہا بھڑک اٹھنے والی آگ کے الگ تھلگ سلسلوں سے مشابہ تھی۔

برصغیر اس حد تک منقسم ہو چکا تھا کہ ملک گیر سطح پر کسی منصوبہ بندی کے تحت کوئی اجتماعی اور ہم آہنگ کارروائی ممکن نہیں رہی تھی۔ اشرافیہ میں سرکشی کا رواج نہیں تھا البتہ اکا دکا بغاوتیں ہوتی رہتی تھیں جیسے شعلہ بھڑک کے راکھ ہو جائے۔ بہادر اور حسین لکشمی بائی، 20 سالہ رانی جھانسی، نانا صاحب، اودھ کی ملکہ حضرت محل اور محمود آباد کے پرجوش شہزادگان کا شمار ایسے ہی سرکش بہادروں میں ہوتا ہے جو پل دو پل کے لئے منظر پر ابھرے اور غائب ہو گئے ورنہ ہندوستان کے شہزادگان تو کسی بھی مزاحمتی تحریک سے ہمیشہ لاتعلق ہی رہے بلکہ بعض اوقات تو انہوں نے ہندوستان کو سرنگوں کرانے میں انگریزوں سے مکمل تعاون کیا اور ان کے کارناموں کا ذکر استعماری گزٹ میں بھی جا بجا ملتا ہے۔

اس سلسلے میں جیند کے راجہ کی مثال خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ مقامی اور غیر ملکیوں میں وہ پہلا شخص تھا جو انگریز کی حمایت میں باغیوں کے خلاف لڑنے نکلا۔ اس نے دہلی کی جانب پیش قدمی کرتی ہوئی انگریزی فوج کے لئے ہر مرحلے پر رسد بہم کرنے کا پیشگی بندوبست کیا۔ علی پور کی لڑائی میں راجہ بنفس نفیس شامل تھا اور اس کے فوجی دستوں نے ستمبر 1857ء میں دہلی پر فیصلہ کن حملے میں اہم کردار

ادا کیا۔ کپور تھلہ کے راجہ رندھیر سنگھ نے جالندھر کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے دوآبہ پر قبضہ کر لیا جہاں ابھی تک ایک بھی برطانوی فوجی نہیں پہنچ سکا تھا۔ یہاں سے وہ اپنی فوج لے کر بڑی بغاوت کچلنے اودھ چلا گیا۔ فرید کوٹ نے اپنی خدمات فیروز پور کے ڈپٹی کمشنر کو پیش کر دیں اور ستلج سے گزرنے والی کشتیوں کی حفاظت میں پیش پیش رہا۔ اس نے ایک سرگرم انقلابی شام داس کے مضبوط گڑھ پر حملے کی قیادت بھی کی اور اسے تباہ کر دیا۔ نابھہ نے لدھیانہ انگریزوں کے حوالے کیا اور جالندھر کے باغیوں کی سرکوبی کے لئے پھلور کے مقام پر انگریزوں کا بھرپور ساتھ دیا۔

ایک غیر مساوی جنگ

یہ سچ ہے کہ ہندوستان کی عمومی صورت حال سے دکن اور جنوبی ہندوستان کی لاتعلقی نے بھی انگریزوں کی کامیابی میں اہم کردار ادا کیا لیکن بنیادی وجہ ایک اور بھی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں فریق تاریخی، سماجی، سیاسی اور معاشی ترقی کے حوالے سے اک دوسرے کے ہم پلہ نہیں تھے۔

مئی سے ستمبر 1857ء کے دوران جب دہلی، شہنشاہ کے پرجوش حامیوں کے قبضے میں تھا تو برطانوی فوجی کشمیری دروازے سے پرے اور شہری حدود سے چند میل باہر ایک ٹیلے پر ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ اس جگہ پتھر کا ایک ستون سیاحوں کو آج بھی اس دور کی یاد دلاتا ہے اور اس پر ان لوگوں کے نام آج بھی کندہ ہیں جو کشمیری دروازے کے راستے دہلی پر فیصلہ کن حملے کے دوران مارے گئے، لیکن وہ حقائق اس سے کہیں زیادہ اہم ہیں جو اس یادگار پر کہیں کندہ نہیں اور وہی متحاربین کی اصل قوت اور استعدادِ کار پر روشنی بھی ڈالتے ہیں۔

وہ مختصر سی انگریز فوج جو بظاہر بڑی مخدوش حالت میں دہلی سے باہر ایک ٹیلے پر تعینات تھی، دہلی سے پرے کی دنیا کے ساتھ مسلسل رابطہ رکھے ہوئے تھی جس کا واضح ثبوت اسی فوج کے لیفٹیننٹ تھامس کیڈل Thomas Cadell، لیفٹیننٹ چارلس ایورٹ Charles Ewert، کیپٹن بارٹر Barter اور بریگیڈیئر آرکڈیل ولسن Archdale Wilson کے خطوط سے ملتا ہے۔

1850ء کی دہائی کے آغاز ہی سے برطانیہ نے ہندوستان میں ریل کی پٹڑی اور ٹیلی گراف لائنیں بچھانا شروع کر دی تھیں اور بعد میں یہ بھی کہا گیا کہ "ہندوستان میں برطانوی راج کو ٹیلی گراف نے بچا لیا۔" جب میرٹھ جل رہا تھا تو میرٹھ سے آگرہ کے درمیان ٹیلی گراف لائن اتنی دیر ضرور بحال رہی کہ پوسٹ ماسٹر کی بہن اپنی خالہ کو یہ پیغام دے سکتی کہ وہ اپنا میرٹھ کا مجوزہ سفر ملتوی کر دے کیونکہ وہاں سپاہیوں نے بغاوت کر دی تھی۔ ذرا سی دیر بعد جب سرکاری برقیہ آگرہ بھیجا جانے لگا تو پہلے حملے کے

ساتھ ہی لائن منقطع ہو گئی لیکن اس نامکمل پیغام کے باوجود میرٹھ کی صورت حال کے بارے میں دور دراز کی چھاؤنیوں کو بھی خبر ہو گئی۔ ادھر دہلی پر باغیوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد بھی وہ دو یورپین نوجوان برقی پیغام رساں جو نیلے اور شہر پناہ کے درمیاں کسی چوکی پر تعینات تھے ' یہ بھانپ گئے کہ پوسٹ ماسٹر چارلس ٹوڈ Charles Todd دہلی تا میرٹھ ٹیلی گراف لائن کی مرمت کراتے ہوئے ہلاک ہو چکا ہے انھوں نے فراست سے کام لیتے ہوئے چند لمحوں ہی میں انگریز کمانڈر انچیف کو شملہ میں تمام صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ کیا ہندوستان میں کوئی ایسی ٹیکنالوجی دستیاب تھی جو اس برقی سہولت کا مقابلہ کر سکتی؟

کلکتہ سے پشاور تک 1851ء میں پہلی بڑی ٹیلی گراف لائن بچھانے کی منظوری دیتے ہوئے ہندوستان کے گورنر جنرل ڈلہوزی نے پیش گوئی کی تھی کہ یہ منصوبہ سلطنت کا سب سے اہم سیاسی اور معاشی سرمایہ ثابت ہو گا اور یہ اندازہ اس روز حرف بحرف درست ثابت ہوا جب آگرہ سے کلکتہ کے درمیان 800 میل طویل برقی تار کے ذریعے لفظ 'بغاوت' ترسیل کیا گیا۔ ڈلہوزی نے اس راستے کا نقشہ خود تیار کیا تھا جہاں سے اس اہم ٹیلی گراف لائن کو گزرنا تھا۔ کلکتہ سے بنارس 'الہ آباد' آگرہ 'انبالہ' لاہور اور پشاور تک یہ مواصلاتی رابطہ یقیناً انتہائی اہم اور ناگزیر ثابت ہوا تھا۔ ٹیکنالوجی کی سبقت نے غیر ملکی حکمرانوں تک یہ خبر پہنچا دی تھی اور اس سے پیشتر کہ دوسری رجمنٹوں کے سپاہی اپنے ہم وطنوں کے جرات مندانہ اقدام سے آگاہ ہو کر خود بھی متحرک ہوتے ' پیش بندی کے طور پر انہیں غیر مسلح کیا جا سکتا تھا۔

والپرٹ Wolpert لکھتا ہے کہ 'جنگ کے دوران ٹیلی گراف نے اپنا سکہ جما دیا تھا۔ اس کے گنگناتے تاروں نے بہت سے ''باغیوں'' کو ''پھانسی'' دلوانے میں مدد کی 'برقی تاروں نے جامع منصوبہ بندی ' درست وقت کے انتخاب اور کمک کی آمد سے ہم آہنگ ہو کر دہلی پر فیصلہ کن حملے کو ممکن بنا دیا تھا۔ پنجاب کی جانب سے بڑھتے ہوئے لارنس اور نکلسن اور بارک پور کے فوجی دستوں نے جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے حاصل کردہ کلکتہ کونسل کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے دہلی پر آخری حملہ ایک مربوط اور کامیاب کارروائی ثابت ہوا۔

جنگوں کے دوران رفتار اور ہدایات کی فوری ترسیل اکثر فیصلہ کن ثابت ہوتی ہے۔ نپولین کی کامیابیوں کا انحصار اسی پر تھا۔ محمود غزنوی ' مغل اور ان کے درمیانی عرصے میں 'کئی صدیوں کے دوران وسطی ایشیائی حملہ آوروں نے گھوڑے پر سوار اپنی سبک رفتار فوج اور تیز تر پیغام رسانی کے ذریعے ہندوستان اور یہاں کی ریاستوں پر اپنی بالادستی قائم رکھی۔ گھوڑے نے طاقتور اور سست رو ہاتھی

کو ہمیشہ اپنی رفتار سے شکست دی۔ انگریز بھی ٹیلی گراف کی رفتار اور بھاپ کی قوت کے بل پر ہندوستان کو مات دینے میں کامیاب رہا۔ کارل مارکس نے 1853ء میں ہی یہاں کی حالت زار کے بارے میں تجزیہ کرتے ہوئے لکھا تھا'

"انسانی محسوسات کے لئے یہ صورت حال کس قدر قبیح ہے کہ پدری قبائلی نظام پر مشتمل کسی معاشرے میں انتہائی محنتی اور اپنے کام سے کام رکھنے والی بے شمار لیکن بے ضرر سماجی تنظیمیں چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں بے ترتیبی سے منقسم ہو کر اس طرح بدحالی کا شکار ہوں کہ ان کے اراکین یا اس معاشرے کے افراد اپنے اجداد کی تہذیب اور گزر بسر کے موروثی ذرائع سے بھی محروم ہوتے چلے جائیں' لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ حقیقت بھی ہمیں پیش نظر رکھنا ہوگی کہ پر سکون دکھائی دینے والی یہ دیہی برادریاں جو بظاہر بہت بے ضرری نظر آتی ہیں دراصل ہمیشہ سے ایشیائی ظلم و جبر کا مضبوط گڑھ رہی ہیں۔ ان تنظیموں نے انسانی ذہن کو ممکنہ حد تک مختصر دائرے میں مقید کر کے اسے توہم پرستی اور روایتی ضوابط کا ایسا طوق پہنایا کہ جس نے اسے اپنے شاندار ماضی اور تاریخی توانائیوں سے بھی محروم کر دیا۔

یہ درست ہے کہ ہندوستان میں سماجی انقلاب بپا کرنے کے پس پردہ برطانیہ کے اپنے مذموم مفادات بھی تھے اور اس نے بڑے عاجلانہ انداز میں ان کے حصول کی کوشش کی لیکن اہم سوال کچھ اور ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ایشیا میں بنیادی سماجی انقلاب لائے بغیر انسانیت کا مقدر سنور سکتا ہے؟ اگر نہیں تو انگلستان کے جرائم خواہ کتنے ہی سنگین رہے ہوں' یہ ملک برصغیر میں مطلوبہ انقلاب لانے میں لاشعوری طور پر تاریخ کا آلہ کار رہا ہے"۔

"سنڈیمانیت" اور فارورڈ پالیسی

سلطنت ہندوستان کے استحکام اور وادیٔ سندھ کے انضمام کے ساتھ برطانوی استعمار کا دائرہ برصغیر کے شمال مغرب تک پھیل گیا جہاں کئی بڑی اور بنیادی تبدیلیاں لائی گئیں۔ سرحدی تحصیل ڈیرہ غازی خان کا ڈپٹی کمشنر ان برطانوی افسروں میں سے ایک تھا جو ایسی تبدیلیوں کے معمار تھے۔ کیپٹن رابرٹ گرووز سنڈیمان Robert Groves Sandeman پہلے فوج میں تھا جہاں سے

وہ سول سروس میں آگیا اور اسسٹنٹ کمشنر کی حیثیت سے کوہاٹ ' پشاور ' ہزارہ اور بنوں میں تعینات رہا۔ وہ صرف 31 سال کا تھا جب اسے ڈیرہ غازی خان کے اس دور افتادہ ضلع کا ڈپٹی کمشنر بنایا گیا جہاں جنگجو اور آزاد بلوچ قبائل آباد تھے جو مسلسل آپس میں برسرپیکار رہتے۔ اس خانہ جنگی کے باعث تجارت میں آئے دن رکاوٹیں پیش آتی رہتی تھیں حالانکہ یہ تجارت قبائلیوں کے لئے بھی منفعت بخش ثابت ہو سکتی تھی اور برطانوی سلطنت کی سرحدیں بھی اس طرح محفوظ رہتی تھیں۔ سنڈیمان نے قبائل اور قبائلی سرداروں کی کمزوریوں کو اپنے مفادات کے لئے استعمال کرنے کی ٹھانی۔ یہ قبائل اس خصوصی اہمیت سے ناآشنا تھے جو انہیں اپنے جغرافیائی محل وقوع کے باعث حاصل تھی اور ان کی مصنوعی آن بان جس سے انہیں اب تک محروم رکھتی چلی آئی تھی۔ سنڈیمان نے ان قبائل کو ایک دوسرے کے قریب لانے کے عمل سے اپنے مفادات کے حصول کی کوششوں کا آغاز کیا۔ سنڈیمان کی یہ خواہش بھی ہوتی کہ اپنے قبیلے کی نظر میں سردار کی قدر و منزلت میں کمی نہ آنے پائے کہ اس طرح سردار انگریز کے لئے زیادہ مفید ثابت ہو سکتا تھا۔ سڑکوں کی تعمیر اور نہروں کی کھدائی کے ٹھیکوں سے بھی اس نے سرداروں کی مالی اعانت کی۔

اپنے سردار ببرک کی گرفتاری کے بعد سے بگٹی قبائل قدرے پرامن تھے لیکن 1867ء میں غلام حسین بگٹی نے ہرانڈ قلعے پر حملہ کیا اور چند برطانوی شہری ہلاک ہو گئے۔ سنڈیمان نے بذات خود تعاقب کے بعد '20 حملہ آوروں کو گرفتار کر لیا۔ اس 'جرم' میں اس نے پورے قبیلے کو سزا دینے کا فیصلہ کیا اور قیدیوں کی رہائی کے عوض سردار سے تاوان کا مطالبہ کر ڈالا۔ بگٹی سردار کو تاوان ادا کرنا پڑا۔

سنڈیمان نے قبائلی سرداروں کو پابند کر دیا کہ آئندہ اپنے قبیلے کے اندر نظم و ضبط کا ذمہ دار انہیں ٹھہرایا جائے گا۔ ہر سردار پر یہ پابندی بھی عائد کر دی گئی کہ وہ اپنے قبیلے کے کچھ افراد سرکاری فوج میں بھرتی کرائے گا' راج کی طرف سے جس کی اجرت بھی ادا کی جاتی تھی۔ اس طرح قبائلی نظام میں جو تبدیلیاں متعارف کرائی گئیں انہیں سنڈیمان کے نام سے موسوم کیا جانے لگا۔ یہ اس کی کامیاب حکمت عملی کی دلیل تھی کہ 1876ء میں کوئٹہ اور بولان اس کے تسلط میں آچکے تھے۔

پنجاب سلطنت برطانیہ میں ضم ہوا تو شمال مغربی سرحدی صوبے کا ایک بڑا علاقہ بھی راج کے تحت آگیا کیونکہ سکھ ریاست پشاور بلکہ اس سے بھی آگے تک پھیلی ہوئی تھی۔ بلوچی قبائل میں جو 'اصلاحات' سنڈیمان نے کیں ' آج کے شمال مغربی سرحدی صوبے میں وہی تبدیلیاں واربرٹن War Burton کے ذریعے آئیں۔ وہ صحیح معنوں میں اس 'فارورڈ پالیسی' کا معمار تھا جو برصغیر کے

شمال مغربی سرحدی علاقوں میں روسی توسیع پسندی کے ممکنہ مگر دور از کار خوف کے تحت اپنائی گئی۔ اس حکمت عملی کے تحت باقاعدہ اضلاع کے بجائے متعدد 'ایجنسیوں' پر مشتمل ایسا 'بفر زون' تشکیل دیا گیا جہاں قبائلی سرداروں کو داخلی خودمختاری حاصل تھی اور سلطنت برطانیہ کا 'پولیٹیکل ایجنٹ' ان کے مفادات کا نگران تھا جسے ڈھیلے ڈھالے سے انتظامی اختیارات بھی حاصل تھے۔ مختلف قبائل پر مشتمل یہ سرحدی 'ایجنسیاں' برطانوی سلطنت کی تسلیم شدہ سرحدوں کے اندر تھیں۔

1878ء کی تیسری افغان جنگ میں برطانیہ کو فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی اور اس طرح موریا اور مغل ریاستوں کے بعد برصغیر کی تاریخ میں ایک تیسری "عالمگیر ریاست" اپنی تکمیل کو پہنچی۔

23

تیسری عظیم ریاست

استعماری انتقام

ایسٹ انڈیا کمپنی 1858ء میں توڑ دی گئی اور حکومت برطانیہ نے ہندوستان کا نظم و نسق براہ راست سنبھال لیا۔ دہلی کو 'بغاوت' کی بھاری قیمت چکانا پڑی۔ فاتحین نے برطانوی افسروں اور ہندوستانی سپاہیوں کو ایک ہفتے کے لئے بالکل قرون وسطیٰ کے انداز میں لوٹ مار کی سرکاری طور پر کھلی اجازت دیئے رکھی۔

جیمز مورس James Morris جیسا راج کا حمایتی جو بنگال کو تاراج کرنے 'بیگمات اودھ کی بے حرمتی اور پارچہ بافوں پر ہونے والے وحشیانہ تشدد کی حمایت کرتا ہے۔ دہلی پر ٹوٹنے والے اس ظلم پر دکھ کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

> ''بغاوت کے بعد برطانوی حکومت بہت حد تک اپنی روایتی شرافت سے تہی دست ہو چکی تھی'' ایک چشم دید گواہ کے حوالے سے مورس نے 55 ویں نیٹو انفنٹری Native Infantry میں باغیوں کو سزائے موت دیئے جانے کا احوال اس طرح قلمبند کیا ہے کہ ''پہلے دس قیدی توپوں کے دہانے پر باندھ دیئے گئے ' توپخانے کے افسر نے اپنی تلوار لہرائی ' توپوں کی زوردار گرج سنائی دی اور دھویں کے اوپر ہر طرف کٹے ہوئے سر 'بازو اور ٹانگیں لہراتے ہوئے نظر آئے۔ اس دن سے ہفتے میں ایک یا دو بار یہی عمل تواتر سے دہرایا

جاتا ہے اور اب تو ہمیں اس کی عادت سی ہو چلی ہے جیسے یہ کوئی معمول کی کارروائی ہو" کچھ اور لوگوں کے بیانات بھی ان واقعات کی تصدیق کرتے ہیں۔ "مقدمے اگر چلائے بھی گئے تو یہ محض رسمی کارروائی تھی۔ افسران قسمیں کھاتے سنے گئے کہ خواہ جرم ثابت ہو یا نہ ہو' وہ بہر صورت قیدیوں کو پھانسی دلوا کے رہیں گے۔ ایسے قیدیوں ' باغیوں اور سرکش دہقانوں کو جنہیں سزائے موت کا حکم سنا دیا جاتا تھا ' افسران کے اردلی بعض اوقات انہیں بھی اذیتیں دیتے اور انہیں تشدد کا نشانہ بناتے۔ افسر' عام طور پر ایسی کارروائیوں سے چشم پوشی اختیار کرتے۔ جس بہادری اور استقلال سے یہ قیدی موت کو گلے لگاتے ' ہر دیکھنے والے کا دل اس پر تڑپ اٹھتا"

تشدد کے لئے ایسے طریقے اختیار کئے جاتے جو بہت زیادہ اذیت بخش اور ذلت آمیز ہوتے۔ جان ہیرس کے مطابق "مسلمانوں کو سؤر کی کھال میں سی دیا جاتا اور ہلاک ہونے سے پہلے ان کے جسم پر سؤر کی چربی لیپ دی جاتی۔ ہندوؤں کے ساتھ بھی یہی برتاؤ ہوتا لیکن سؤر کے بجائے کھال گائے کی استعمال ہوتی" انگریز کا رویہ ہر جگہ ایک ہی جیسا تھا۔ پشاور کا ڈپٹی کمشنر جو ایک نرم خو مذہبی شخص تھا اور جس نے گجرات کی لڑائی کے بعد قیدیوں کو چپ چاپ اپنے گھروں کو واپس جانے کی اجازت دی تھی 'لکھتا ہے

"میں ضمیر کی معمولی سی خلش کے بغیر انہیں شدید ترین اذیتیں دینے سے گریز نہیں کروں گا"

لوگوں کو وسیع پیمانے پر نامرد بنانے کی باتیں بھی کی گئیں اور کیمبرج یونین میں تو ایک نوجوان کو اس وقت بے پناہ داد ملی جب ایک مباحثے میں اس نے کہا کہ :

"ہر سنگین جب تازہ لہو سے سرخ ہو جائے ' ہر سولی جب اپنے دہشت ناک بوجھ تلے چرچرانے لگے ' ہر توپ کے سامنے جب زمین پر گوشت کے چیتھڑوں اور کٹی پھٹی ہڈیوں کا بستر بچھ جائے۔ رحم کی بات تب ہوگی"۔

ایک انوکھا انداز حکمرانی

اب تک ہندوستان کو صرف دو طرح کے حملہ آوروں کا تجربہ تھا۔ ایک حملہ آور تو وہ تھے جن میں مقدونیہ کا سکندر ' غزنی کا محمود ' وسطی ایشیا کا تیمور ' ایران کا نادر شاہ اور افغانی احمد شاہ ابدالی شامل ہیں۔ یہ طاقتور تھے اور بعض اوقات مت شکن بھی لیکن ہوتے عارضی مہمان ہی تھے۔ وہ حملہ آور ہوتے ' یہاں کے لوگوں کو زیر کرتے ' خراج وصول کرتے ' مال غنیمت سمیٹتے اور اپنے آبائی علاقوں میں اپنے

دارالحکومتوں کی طرف لوٹ جاتے۔

دوسری قسم کے حملہ آوروں میں آریا' سیتھئن (ساکا)' یوچی (کشان)' سلجوقی ترک اور مغل نمایاں ہیں۔ یہ حملہ آور ہندوستان آئے تو یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ انہوں نے قبائل اور شہزادگان کو مطیع بنایا' راجدھانیوں کو فتح کر کے اپنی ریاستوں کو وسعت دی اور سلطنتوں کو مستحکم کیا۔ ان حملہ آوروں نے خود کو اسی طرز حیات میں ضم کر لیا' وہ ہندی بن گئے اور مختلف ہندی سلسلہ ہائے شاہی کی بنیادیں رکھیں۔ اس طرح کے حملہ آوروں سے تعلق رکھنے والی حکومتی اشرافیہ کا مرکز ثقل ہمیشہ ہندوستان میں ہی رہا۔

مغلوں نے اپنا تاج محل اور شالامار کے باغات فرغانہ یا کابل میں نہیں بنائے' وہ برصغیر میں مدغم ہو گئے۔ ان کے اکابرین' ملازمت کی مدت پوری کرنے کے بعد وسطی ایشیاء میں اپنے آبائی گھروں کو نہیں لوٹ جاتے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگیاں یہیں بسر کر دیں۔ اور (بابر کے سوا) وہ یہیں مرے اور یہیں وادی سندھ یا ہند میں دفن ہوئے۔ ان کا گھر یہی سرزمین تھی۔

ان دونوں طرح کے حکمرانوں میں لیکن ایک قدر مشترک تھی۔ تین ہزار سال پر محیط اس سلسلۂ حکمرانی کے باعث نہ تو وہ ہندوستان کے نظام معیشت میں کوئی بنیادی نوعیت کی تبدیلی لا سکے۔ اور نہ ہی ان کی فتوحات یا طرز حکومت کے نتیجے میں برصغیر کے گاؤں کی معاشی زندگی' ذات پات کے سماجی نظام یا پیداواری روابط میں کوئی تبدیلی آئی۔ ہندوستان اپنی بیل گاڑی اور چرخے کے ساتھ 1707ء میں اورنگ زیب کی وفات پر بھی وہی ہندوستان تھا جیسا کہ 1526ء میں بابر یا اس سے بھی پہلے 1206ء میں قطب الدین ایبک کی تخت نشینی کے وقت۔

ایک اور زاویہ فکر سے اگر دیکھا جائے تو انگریز راج سے پہلے برصغیر نے کبھی اپنی آزادی نہیں گنوائی تھی بلکہ اپنے فاتحین کو فتح کر کے خود اپنے اندر سمو لیا تھا۔

لیکن برصغیر پر انگریز کا قبضہ ایک قطعی منفرد اور انوکھا واقعہ تھا۔ برطانیہ نے برصغیر میں ذرائع پیداوار اور مبادلے کے نظام کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں اور یہاں کے مروجہ سماجی روابط پر گہرے اور دیرپا نقوش چھوڑے۔ ماضی کے فاتحین نے ہندوستان کی سماجی تشکیل کو جوں کا توں رہنے دیا اور وہ خود بھی اس دھارے میں شامل ہو گئے جب کہ برطانوی فتوحات نے سوچ اور فکر کا پورا نظام ہی بدل ڈالا۔ ان کے ساتھ ہر شعبہ زندگی میں نئے خیالات کی آمد ہوئی۔ وہ جدید ٹیکنالوجی اور نئے آلات پیداوار لے کر آئے اور انہوں نے پیداواری رشتوں کو نئی جہتیں دیں۔ بیل گاڑی کی جگہ بھاپ سے چلنے والا انجن اور ریل گاڑی آ گئے۔ گھڑ سوار پیغام رسانوں کی جگہ برقی ٹیلی گراف نے لے لی اور ٹیکسٹائل نے چرخے کو

چلتا گیا۔

انگریز نہ تو خود یہاں مستقل آباد ہوئے اور نہ ہی انہوں نے مقامی یا اپنے سرمائے کو یہاں پر خاطر خواہ مقدار میں لگایا۔ حکومت اور ریاست کی فاضل آمدنی اور فاضل پیداوار سب کی سب لندن اور مانچسٹر کے سرمایہ کاری اداروں کے لئے مختص ہو گئیں۔ اب یہاں سے حاصل کئے گئے اس سرمائے کو دوبارہ کبھی اور کسی خاطر خواہ مقدار میں برصغیر کی معاشی ترقی کے لئے استعمال میں نہیں آتا تھا۔

دیسیوں پر تشدد سے گریز کی استدعا

انگریز کی برصغیر میں آمد کے ابتدائی کچھ عرصے کو چھوڑ کر 'بدیسی حاکموں کا محکوم مقامیوں کے ساتھ مکمل مل جانے کا کبھی سوال ہی پیدا نہیں ہوا۔ آغاز میں دونوں نسلوں کے درمیان محدود پیمانے پر میل ملاپ کے کچھ آثار پیدا ہوئے اور آپس میں شادیاں بھی ہوئیں لیکن 1857ء کی جنگ کے بعد دونوں طرف اعتماد کی فضا قائم نہ رہ سکی۔ دخانی جہاز کی ایجاد سے میم صاحبان' ہندوستان میں اپنے شوہروں کے پاس آنے لگیں۔ 19ویں صدی کے اواخر میں نہر سویز کا راستہ کھلا تو حاکم اور محکوم کے درمیان نسلی تفریق میں بھی شدت آگئی۔ برطانوی افسروں اور ان کی بیگمات کے لئے نئے قصبے اور مضافات وجود میں آئے جنہیں سول لائنز اور کیمپ کہا گیا۔ یہاں شاندار بنگلے 'دورویہ سرسبز درختوں کے درمیان چوڑی گلیاں اور کھلی سڑکیں تعمیر ہوئیں جہاں سے فوجی دستے سبک رفتاری کے ساتھ گزر سکتے تھے تاکہ بوقت ضرورت 'گڑبڑ' ختم کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔

1857 کے بعد 'نسلی تفاوت سے سمندر پار شادیوں کے رجحان کو فروغ ملا۔ ہندوستانی 'منتظم خانہ' کی غداری کے خوف نے نوجوان انگریزوں کو مقامی داشتہ کے بجائے برطانوی بیوی اور اس سے منسلکہ تحفظ کی جانب مائل کیا۔ غیر ملکی حاکموں کا اپنی رعایا سے الگ تھلگ رہنا اصول بن گیا۔ گورے ایک قطعی علیحدہ نسل قرار پائے۔ اعلانیہ اور غیر اعلانیہ نسلی امتیاز کے دور کا آغاز ہو چکا تھا۔ نسلی تعصب کو مہمیز ملنے لگی۔ ریل کے ڈبے 'انتظار گاہیں 'کلب' رہائشی کالونیاں حتیٰ کہ بازار بھی الگ الگ ہو گئے۔ ہندوستان کے اندر دو ہندوستان جنم لے چکے تھے جو گلابی اور براؤن کے فرق کو نمایاں کرتے تھے۔

اب ہندوستان کے ہوٹلوں میں اس مضمون کی تختیاں آویزاں نظر آتیں۔ ''شرفاء سے التماس ہے کہ ملازمین کو پیٹنے سے گریز کریں'' یہاں شرفاء سے مراد سفید فام انگریز اور ملازمین کا مطلب مقامی لوگ تھا اور یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ 1940ء کی دہائی تک صورت حال یہ تھی کہ برصغیر آنے والے برطانوی فوجیوں کو پرانے اور تجربہ کار لوگ مشورہ دیتے تھے کہ کسی مقامی کو پیٹا نہ جائے لیکن اس

کے باوجود برطانوی عملداری میں ایسا ہونا کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں ہوتا تھا۔ اب تو محض 'دیسی' کا لفظ ہی تضحیک اور حقارت کی علامت بن چکا تھا۔

انگریز کا مقامی یا دیسی لوگوں سے اجتناب اور ان کے ساتھ حقارت آمیز برتاؤ محض رنگت کے واضح فرق کی بناء پر نہیں تھا۔ ترک 'افغان اور مغل بھی ہندوستان کے اصل باشندوں کے مقابلے میں زیادہ گورے اور جسمانی اعتبار سے غالباً زیادہ طاقتور بھی تھے لیکن انہوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنالیا تھا' وہ یہاں کے رہنے والوں کے ساتھ شیر و شکر ہو گئے تھے 'انہوں نے یہیں شادیاں کی تھیں اور مقامی رنگ ڈھنگ میں ہی رچ بس گئے تھے۔

انگریزوں کے مختلف اور نمایاں ہونے کی بنیاد رنگ سے کہیں زیادہ ان کی صنعتی ترقی پر تھی۔ مادی خوشحالی ان کے غرور اور نخوت کا سرچشمہ تھی اور ان کا نسلی تعصب' سماجی اور معاشی برتری سے نمویاب ہوتا تھا۔ ان میں احساس تفاخر اور دیسیوں کے ساتھ توہین آمیز برتاؤ کا جذبہ اتنا شدید تھا کہ پال سکاٹ Paul Scott کے مطابق جب وائسرائے لارڈ ولنگڈن Lord Willingdon نے ایک نجی تقریب میں چند 'دیسی' مہمانوں کو بمبئے یاٹ کلب میں مدعو کیا تو رولس رائس گاڑیوں میں آنے والے ان دیسی شرفاء کو وائسرائے کے علم میں لائے بغیر بیرونی دروازے سے ہی لوٹا دیا گیا۔ دروازے پر موجود کسی گورے کے لئے یہ تصور بھی محال تھا کہ کوئی دیسی خواہ وہ کتنا ہی بلند مرتبت ہو 'وائسرائے کا مہمان ہو سکتا ہے اور وہ بھی بمبئے یاٹ کلب میں!!

بارہا دہرایا جانے والا سوال

یہ ایک تکلیف دہ اور بارہا پوچھا جانے والا سوال ہے کہ مسلم مغل انڈیا میں وہ کون سے حالات تھے جن کے نتیجے میں ایک دور افتادہ اور اجنبی قوت اسے شکست دینے میں کامیاب رہی؟ اور اس کا جواب' جیسا کہ ہم پہلے بھی تجزیہ کر چکے ہیں 'اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ شکست 'انڈیا کے زوال پذیر نظام میں مضمر تھی۔ برطانیہ نے تو صرف ایک ایسے مردہ درخت کو اکھاڑ پھینکا تھا جس پر آکاس بیل نے سبزے کا سوانگ رچایا ہوا تھا۔

سائنس اور فتوحات میں یورپ کی پیش قدمی جاری تھی اور پاپائیت زوال پذیر تھی۔ درحقیقت یورپ میں سائنس اور فکر کے پروان چڑھنے کے عمل کے ساتھ ہی وہاں پر مذہب کا زوال شروع ہوا۔ اب پاپائیت کی کائناتی مرکزیت جیسے نظریات سے اختلاف ہو سکتا تھا اور انہیں باطل قرار دیا جا سکتا تھا۔ سائنسدانوں کو یہ ثابت کرنے کی آزادی تھی کہ عورت کے مقابلے میں مرد کی ایک پسلی کم نہیں ہوتی'

وہ پسلی جس کے بارے میں عام عیسائی یقین رکھتے تھے کہ عورت تخلیق ہوئی۔

یورپ میں ایک ایسا ماحول بھی وجود میں آگیا جس میں ہر معاملے پر اپنی ذاتی رائے رکھنے' شک کرنے اور سوال پوچھنے کا حق تسلیم کر لیا گیا تھا۔ ان حالات میں تحیر خیز ایجادات اور ٹیکنالوجی کی پیش رفت کو روکا نہیں جا سکتا تھا۔

سرمایہ داری نظام کا جنم بھی انہی حالات کا منطقی نتیجہ تھا۔ یورپ میں بے لچک اور جامد مذہبی عقائد کا استرداد اور سرمایہ داری نظام کا فروغ' سائنس' ٹیکنالوجی اور جمہوری اقدار کی مزید تقویت کا باعث ہوا۔ سائنسی رویّوں نے پاپائیت کی مذہبی شدت پسندی کو الٹے قدموں چلنے پر مجبور کر دیا۔ جاگیرداری نظام پر بھی سرمایہ دارانہ قوتیں اور جمہوری ادارے غالب آتے چلے گئے۔ ہر ایک پیش رفت سے دوسری تبدیلیوں کو تقویت ملی اور خود اسے بھی قدم جمانے کے مواقع فراہم ہوئے۔

لیکن برصغیر میں ایسا نہیں ہوا۔ یہاں کا نظام جامد' دقیانوسی اور غنودگی کا شکار رہا' دراصل برصغیر تو نوآبادیاتی طاقت کی آمد سے قبل ہی شکست کھا چکا تھا اور پھر دور افتادہ سامراجی برطانیہ اسے ایک غیر مزاحم نوآبادی اور اپنا زرعی لاحقہ بنانے میں کامیاب رہا۔ برطانوی منڈیوں میں انڈیا کی مصنوعات پر قدغن تھی لیکن برطانوی مصنوعات انڈیا کی منڈیوں میں آزادانہ فروخت ہو سکتی تھیں۔ داخلی اور علاقائی محصولات کے ذریعے مقامی مصنوعات کی پورے برصغیر میں نقل و حرکت کو محدود کر دیا گیا اور اس کا سب سے پہلا شکار انڈیا کی صنعت پارچہ بافی بنی۔ پلاسی (1757) سے میرٹھ (1857) کے درمیان لاکھوں پارچہ باف اور ہنرمند بے روزگار ہو گئے۔ اس کے علاوہ مقامی ساخت کے کاغذ' شیشے اور دھات کی مصنوعات سے لے کر چینی کے برتن اور مٹی کے ظروف کی تیاری تک ہر شے پر بھاری محصول عائد کر کے ان کی لاگت میں اضافہ کر دیا گیا۔ اس کے برعکس ریلوں کا وسعت پذیر نظام' برصغیر کے کونے کونے میں برطانوی مصنوعات کی تمام تر محصولات سے مبرّا اور آزادانہ فروخت کا ضامن بنا۔

ترقی کا شاخسانہ

آخر میں اس ترقی اور پیش رفت کا بھی کچھ ذکر ہو جائے جس کی برصغیر کو بھاری قیمت چکانا پڑی اور جو واری سندھ اور ہند میں برطانیہ کی موجودگی کا جواز بنی۔ اس سلسلے میں جو اعداد و شمار سامنے آتے ہیں' ان کی روشنی میں کسی مزید ثبوت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ برطانوی راج کے دوران برصغیر میں ترقی تو یقیناً ہوئی جیسا کہ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا میں لکھا ہے کہ:

"برٹش انڈیا میں 1892ء تک 43800 میل لمبی چھوٹی یا بڑی نہریں تعمیر کی جا چکی تھیں اور اس زمانے میں ان پر 38 کروڑ 26 لاکھ روپیہ لاگت آئی۔ یہ نہریں ایک کروڑ 34 لاکھ ایکڑ اراضی سیراب کرتی تھیں۔ اس سرمایہ کاری سے سالانہ چار سے پانچ فیصد لگان وصول ہوتا تھا اور پچاس سال بعد جب برطانیہ یہاں سے روانہ ہوا تو سرکاری بہی کھاتوں کے مطابق برٹش انڈیا کا نصف سے زیادہ زیر کاشت رقبہ 5 کروڑ 88 لاکھ ایکڑ بنتا تھا اور جسے سرکاری شعبے میں آب پاشی کی سہولتیں حاصل تھیں۔ اب نہروں کی طوالت 74656 میل تک جا پہنچی تھی اور ان سے 3 کروڑ 28 لاکھ ایکڑ اراضی سیراب ہوتی تھی جو کل زیر کاشت رقبے کا ایک چوتھائی تھا۔

انڈیا میں ریلوے کا آغاز 1853 میں ہوا اور اس کے پھیلاؤ کی رفتار اتنی تیز تھی کہ 1910ء میں یہ دنیا کا چوتھا سب سے بڑا ریلوے نظام تھا۔ کم و بیش تمام برصغیر پر محیط اس نظام سے انڈیا کے نقل و حمل کے وسائل میں دوررس تبدیلیاں آئیں۔ ریلوے سفری سہولتوں کی سہل دستیابی اور رفتار میں اضافے سے اشیاء کی پیداواری لاگت میں کمی آئی اور شرح منافع بڑھ گئی۔ مصنوعات کی علاقائی تخصیص ممکن ہوئی اور تجارت کو وسعت ملی۔ ایک ایسا ملک جہاں باربرداری کے ہوشربا اخراجات کے باعث تجارتی مراکز اپنی علاقائی حدود سے آگے نہ بڑھ پائے تھے اور ان میں باہمی رابطہ بھی مفقود تھا' ریلوے کی ترقی نے اسی ملک کو نہ صرف مقامی بلکہ پوری دنیا کے تجارتی مراکز سے منسلک کر دیا اور انڈیا کی اجتماعی معیشت پر اس کے خوشگوار اثرات مرتب ہوئے۔"

لیکن کیا وادیٔ سندھ اور ہندوستان کو اس معاشرتی پیش رفت سے حاصل ہونے والے فوائد سامراج کی اس معاشی لوٹ مار سے زیادہ تھے جس میں ان سہولتوں کے باعث مزید اضافہ ہوا تھا؟

اس میں شک نہیں کہ ریلوے لائنیں بچھائی گئیں' سڑکیں تعمیر ہوئیں اور نہریں کھودی گئیں لیکن ریل کی پٹڑی اگر بچھائی گئی تو یہ نو آبادیاتی طاقت کی جنگی حکمت عملی کا تقاضا تھا یا اس کے پس پردہ کلیتاً برطانوی تجارتی مقاصد کار فرما تھے۔ کارل مارکس نے 1853ء ہی میں پیش گوئی کر دی تھی کہ "برطانیہ کے حکمران طبقے کو انڈیا کی ترقی میں اب تک محض اتفاقی' عارضی اور استثنائی دلچسپی رہی ہے۔ حکمران

طبقہ اسے فتح کرنا چاہتا تھا' دولت کے پجاری اسے لوٹنا چاہتے تھے اور صنعتکار اونے پونے داموں پر اس کا سودا کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اب پانسہ پلٹ چکا ہے' صنعتی طبقے نے جان لیا ہے کہ انڈیا کو پیداواری عمل میں شریک کرنا اس کے اپنے مفاد میں ہے اور یہ مقصد حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ یہاں ذرائع آب پاشی اور داخلی مواصلاتی نظام کو فروغ دیا جائے اب وہ چاہتے ہیں کہ انڈیا میں ریلوں کا جال بچھا دیا جائے اور وہ ایسا ہی کریں گے لیکن اس کے نتائج قابل ستائش نہیں ہو سکتے۔"

وادیٔ سندھ میں کپاس پیدا کرنے والے علاقے براہ راست بندرگاہوں سے ملا دیئے گئے تاکہ لنکاشائر کو خام روئی کی برآمد میں آسانی ہو۔ ان علاقوں میں بہت سی نہریں اور بیراج بھی بنائے گئے۔ لنکاشائر میں تو 18ویں صدی سے دھاگے کی ملیں کام کر رہی تھیں لیکن کپاس کے گھر' وادیٔ سندھ اور ہندوستان کو 1887ء سے پہلے ایسا کوئی مل لگانے کی اجازت نہ دی گئی۔ اس سال ایک پارسی جے این ٹاٹا نے ایمپریس مل کے نام سے ناگپور میں روئی سے دھاگا بنانے کی مشینیں لگائیں اور اس کا مقصد مانچسٹر میں پارچہ بانی کی صنعت کو سستے داموں دھاگا مہیا کرنا تھا۔ اس دوران یہاں جو صنعت بھی لگائی گئی اس میں ترغیبی ترجیح برآمدی مصنوعات کے لئے تھی یا پھر بدیسی تاجروں اور سرمایہ کاروں کی مقامی طلب کو پورا کرنا اس کا بدیہی مقصد تھا۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ نوآبادیاتی صنعتوں میں پیداوار کو ہمیشہ ممکنہ حد تک کم سطح پر رکھا گیا اور اس کی مثال برٹش انڈیا میں ریل کے انجن کی تیاری ہے۔ مقامی ریلوے ورکشاپوں میں جو انجن بنائے جا رہے تھے وہ کارکردگی کے اعتبار سے بدیسی انجنوں کے ہم پلہ اور قیمت میں ارزاں تھے۔ 1865ء میں ایسا ایک انجن بمبئے میں بائیکولا کے مقام پر بنایا گیا تھا لیکن اس کے باوجود 1941 تک انڈیا میں صرف 700 انجن تیار کئے گئے جب کہ اسی عرصے کے دوران 12 ہزار انجن برطانیہ سے درآمد کئے گئے۔

نہر سویز کے راستے تجارت کا آغاز ہوا تو "انڈیا" میں تاخیر سے شروع ہونے والا یہ محدود صنعتی عمل بھی ترک کر دیا گیا۔ 1860ء تک حال یہ تھا کہ انڈیا میں مشینری درآمد کرنے کی اجازت نہیں تھی ۔پٹ سن میں بنگال کو دنیا بھر میں اجارہ داری حاصل تھی لیکن یہ صنعت مکمل طور پر برطانوی ملکیت میں تھی البتہ اس کے انتظام وانصرام میں سکاٹ لینڈ کے باشندوں کو ہمیشہ فوقیت حاصل رہی۔ "انڈیا" کا پٹ سن بھی سکاٹ لینڈ پہنچتا اور وہیں ڈنڈی کے کارخانے اس سے مصنوعات تیار کرتے۔ اسی طرح بنگال اور بہار میں کوئلے کے ذخائر بھی برطانوی ملکیت میں تھے۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران جب بحری راستے غیر محفوظ ہو گئے تو نوآبادیات میں بھی محدود پیمانے پر صنعتی پیداواری عمل کی اجازت دے دی گئی۔ اس نوآبادی پر جتنے ترقیاتی اخراجات اٹھتے' اس سے

کہیں زیادہ اثاثے یہاں سے نکال لئے جاتے۔ ریلوے اور نہری نظام پر جو خرچ بھی آیا ''انڈیا'' کو اس سے کئی گنا زیادہ قیمت چکانا پڑی۔ اپنے فتح کئے جانے اور پھر ایسٹ انڈیا کمپنی سے برطانوی حکومت کو اپنی منتقلی (یا فروخت) کے اخراجات بھی خود ''انڈیا'' نے برداشت کئے۔ اس وسیع و عریض نوآبادی کو سامراجی عزائم کی تکمیل کے لئے ایک مستقر کے طور پر استعمال کیا گیا۔ برطانوی سلطنت کی فارس اور افریقہ تک توسیع بھی یہیں سے ممکن ہوئی اور پھر برطانوی فوج کے ایک حصے کے تربیتی اخراجات بھی ''انڈیا'' سے وضع کئے گئے اور اس کے لئے برصغیر کی مجموعی آبادی پر فی کس محصول عائد کر دیا گیا۔ فی الواقع محکوم ''انڈیا'' کو اپنے حاکم برطانیہ کے بے شمار اخراجات کا بوجھ اٹھانا پڑا۔ یہاں تک کہ چین اور فارس میں سفارتی عملے 'لندن سے انڈیا تک ٹیلی گراف لائن اور بحر الکاہل میں برطانوی بحری بیڑے کے ایک حصے کے اخراجات پورے کرنے کے ذمہ داری بھی انڈیا پر ڈال دی گئی اور انتہا تو یہ ہے کہ لندن میں سلطان ترکی کے اعزاز میں دیئے گئے استقبالئے کے اخراجات بھی ''انڈیا'' نے ہی چکائے۔

اور اس پر ستم یہ کہ جب برصغیر کے 70 ہزار مربع میل پر پھیلی ہوئی دو کروڑ کے لگ بھگ آبادی 1897ء کے خوفناک قحط کی گرفت میں تھی تو دوسری طرف مسرت و انبساط میں ڈوبا ہوا انگلستان اپنی ملکہ وکٹوریہ کی پر شکوہ ڈائمنڈ جوبلی منا رہا تھا۔

سامراجی برطانیہ نے جو لوٹ مار بنگال میں کی صرف اسی نے ان کے صنعتی انقلاب کو شاندار انقلاب بنا دیا۔ یہ محض اتفاق نہیں تھا کہ پلاسی کی جنگ 1757ء کے فوراً بعد ہی جب مال غنیمت انگلستان پہنچنا شروع ہوا تو وہاں ایجادات کے ایک لامتناہی سلسلے کا آغاز ہوا۔ ایجادات بذات خود تو خوابیدہ ہوتی ہیں اور اپنی بیداری کے لئے طلب اور قوت خرید میں اضافے کی منتظر رہتی ہیں۔ سرمایہ انہیں مہمیز (ایڑ) لگاتا ہے۔ ایسا سرمایہ جو حرکت میں ہو 'گردش میں ہو اور نت نئی اشیاء کے تعاقب میں ہو۔ اور بنگال کی لوٹ کھسوٹ نے برطانیہ کو یہ عنصر فراہم کر دیا۔ بنگال کی دولت نے براعظم یورپ سے کہیں پہلے انگلستان میں سائنسی ترقی کے شاندار دور کا آغاز کر دیا حالانکہ اس سے قبل 'سائنسی پیش رفت میں یورپ انگلستان سے کہیں آگے تھا۔ یہ بنگال کی دولت تھی جس نے برطانیہ کو صنعتی انقلاب کا محور بنا دیا۔

ایک منتشر معاشرہ

انڈیا پر برطانوی بالادستی کے پس پردہ بہت سے عوامل کارفرما ہے۔ برطانیہ کی بحری قوت اور ٹیکنالوجی میں سبقت سے صرف نظر ممکن نہیں لیکن اس سیاق و سباق میں کسی ایک 'اور سب سے اہم عنصر کی نشان دہی اگر کی جائے تو وہ صرف بنگال سے حاصل ہونے والا مال غنیمت تھا جس نے دوسری

یورپی اقوام کے مقابلے میں برطانیہ کو ٹیکنالوجی اور بحری اہلیت میں برتری حاصل کرنے کے قابل بنایا۔ باقی ماندہ عوامل کو جاننے کے لئے تو صرف حقائق کا تذکرہ ہی کافی ہے اور کسی بھی تجزیے میں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ برطانیہ نے فرانسیسیوں کو جنوب میں قدم جمانے کا موقع نہیں دیا۔

کلائیو کی ہندوستان میں آمد کے ساتھ ہی فرانسیسیوں کو 1749ء میں ترکنوپولی Trichnopoly کے مقام پر شکست ہوئی۔ مشہور فرانسیسی جرنیل ڈوپلیکس Dupleix اس شکست سے دلبرداشتہ ہو کر وطن لوٹ گیا۔ جنگ پلاسی کے تین سال بعد جب یورپ میں جاری سات سالہ جنگ ہندوستان تک آ پہنچی تھی تو 1760ء میں وندیواش Wandiwash میں انگریز کے ہاتھوں فرانسیسیوں نے فیصلہ کن شکست کھائی اور اس بار ان کا جرنیل ڈی بسے de Bussey گرفتار ہوا۔

یہ بات نہیں کہ انگریزوں کے مقابلے میں فرانسیسی کم ترقی یافتہ تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انقلاب فرانس کے نتیجے میں یورپ کو ایک نئی تازگی اور توانائی حاصل ہوئی تھی جس کا اولین اظہار نپولین کی توسیع پسندی کی شکل میں سامنے آیا۔ میسور میں ٹیپو سلطان کے ساتھ رابطے بھی اسی سلسلے کی کڑی تھے۔ دوسری طرف بنگال کی فاضل پیداوار کے بل بوتے پر آنے والے صنعتی انقلاب کے نتیجے میں برطانیہ کو فیصلہ کن پیش رفت حاصل ہوئی اور برطانوی بورژوازی عالمی منڈیوں میں اپنے تمام حریفوں کو چت کرنے میں کامیاب رہا۔ عالمی بالادستی حاصل کرنے کا جو خواب نپولین نے دیکھا تھا وہ تو 1823ء میں اس کے ساتھ ہی سینٹ ہیلینا کی تنہائیوں میں دفن ہو گیا۔

انگریزوں نے برصغیر سے فرانسیسیوں کو نکال باہر کیا تو انہیں محض ایک ایسے ملک اور ایسے نظام حکومت کا سامنا تھا جو لخت لخت اور منقسم تھا۔ البتہ کہیں کہیں ٹیپو سلطان جیسے روشنی کے مینار باقی تھے۔ ٹیپو شیر کی زندگی جیا اور بے مثل شجاعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے شہید کی موت مرا۔ لیکن اس کی شکست میں ایک منظم اور وسائل سے مالا مال دشمن کے علاوہ اپنوں کی غداری نے بھی فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا۔

کچھ اور عوامل بھی تھے جو برصغیر پر انگریز کی بالادستی کا جواز بنے۔ مغل سلطنت کی خستہ حالی' نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملے جن میں بابر کا دارالحکومت دہلی اس کے جانشینوں کے عہد میں فارس کے شہنشاہ اور پھر افغان بادشاہ کی افغانی فوج کے ہاتھوں قتل عام کا شکار ہوا' مرہٹہ گروہوں کا عروج' پلاسی کے میدان میں 1761ء کی ہزیمت اور 1818 میں انگریز کے ہاتھوں ان کی پہلی حتمی شکست' وہ فیصلہ کن موڑ ثابت ہوئے جو برصغیر کی تاریخ کا منظر ہی بدل گئے۔ اس سلسلے میں اکبر اعظم کے بے وقعت اور

بد نصیب جانشین شاہ عالم سے روہیلوں کا توہین آمیز انتقام بھی قابل ذکر ہے جس کے نتیجے میں روہیلوں کے مقابلے میں شہنشاہ ہند ' بادشاہ اودھ اور انگریزوں کے درمیان اتحاد ثلاثہ ہوا۔

مغل سلطنت ٹوٹ پھوٹ کر چھوٹی چھوٹی ریاستوں اور بادشاہتوں میں تقسیم ہو چکی تھی جو مسلسل شکست و ریخت کے باعث مزید ریاستوں ' راجدھانیوں اور جاگیرداریوں کی صورت میں بکھرتی چلی گئی۔ مرہٹے ' افغان ' راجپوت ' جاٹ ' سکھ اور ان کی ہر لحظہ بدلتی وفاداریوں نے ہر سو پھیلی بد نظمی اور افراتفری میں مزید اضافہ کیا۔ وادیٔ سندھ اور ہندوستان مکمل طور پر سیاسی انتشار کا شکار تھے اور یورپ تیزی سے ان کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا۔ ان سب بر صغیر مخالف قوتوں میں برطانیہ سر فہرست تھا۔

لاٹری کا چلن اور بے محنت حصول دولت

اس کتاب میں حقائق کو زیر بحث لانے کا مقصد بر صغیر کی تاریخ کو محض سلسلے وار بیان کر دینا ہی نہیں بلکہ ان بنیادی وجوہات کی تلاش اور تجزیہ ہے جن کی بناء پر برطانیہ 25 کروڑ افراد پر مشتمل ایک وسیع و عریض خطے کو حیرت انگیز طور پر صرف مٹھی بھر افراد کی جدوجہد اور مہم جوئی کے ذریعے زیر تسلط لانے میں کامیاب رہا اور چونکہ ' سندھ واسی پر برطانوی راج کے اثرات کا جائزہ لینا بھی اس کتاب کا اہم موضوع ہے ' اس لئے ہمیں ایک اور پہلو پر بھی خصوصی توجہ دینا ہو گی۔

جب نہری نظام کو فروغ ملا اور وادیٔ سندھ کے دور دراز علاقوں تک ریل اور سڑک کے ذریعے رسائی ممکن ہوئی تو اس پیش رفت کے نتیجے میں بے شمار ایسی اراضی بھی سرکاری تحویل میں آئی جسے آسانی سے قابل کاشت بنایا جا سکتا تھا۔ ان زمینوں کی نو آبادکاری نے سندھ واسی کی نفسیات پر گہرے نقوش مرتب کئے۔

جدید نہری نظام سے قبل وادیٔ سندھ کا بیشتر علاقہ چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں اور خودرو نباتات سے ڈھکا ہوا تھا جنہیں 'بار' کہا جاتا تھا۔ ستلج اور راوی ' چناب اور جہلم کے درمیانی لیکن دریا کے کناروں سے ہٹے ہوئے علاقے آج بھی نیلی بار اور گوندل بار کے ناموں سے یاد کئے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ باقی تمام علاقہ صحرا تھا۔ یہ درست ہے کہ موئن جوڈارو کے وقتوں سے وادیٔ سندھ میں زراعت کو ایک مقبول روایتی پیشے کے طور پر اپنایا جا چکا تھا اور یہ عمل اس معاشرے میں خاندان کے فروغ کا باعث بنا لیکن زراعت اب تک دریا کے کناروں سے متصل بیلے اور کچے کے علاقوں تک محدود تھی۔ ان ہی علاقوں میں موسمی سیلاب گندم ' کپاس اور گنے کی فصلوں کے لئے وافر پانی مہیا کر دیتے تھے اس لئے زراعت مجبوراً محدود پیمانے پر ہی ممکن ہو سکتی تھی۔

انگریز کو جب کپاس اور گندم کی کاشت کے لئے مزید اراضی درکار ہوئی تو انہوں نے بیلے اور کچے کے علاوہ بار کی زمینوں کو بھی زرخیز پایا اور صحرا بھی انہیں مائل بہ کرم نظر آئے۔ کمی تھی تو صرف پانی کی' یہ زمینیں صدیوں سے پیاسی تھیں۔ ان کی سیرابی کے لئے بیراج اور نہروں کا جال پھیلا کر مزید لاکھوں ایکڑ زمین قابل کاشت بنادی گئی۔

لیکن اس زمین پر ہل چلانے اور اس سے فصل اٹھانے کے لئے لوگ درکار تھے۔ تب ان زمینوں کو نوآبادیاں قرار دے کر انہیں مقامی بے زمین افراد یا دور دراز سے لائے گئے آباد کاروں کے حوالے کر دیا گیا اور یہ آباد کار ان زمینوں پر کاشت کرنے لگے۔

ان زمینوں کی ملکیت وادی سندھ کے بے شمار افراد کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ تھی۔ 19 ویں اور 20 ویں صدی کے دوران ہزاروں خاندان دور دراز علاقوں سے لا کر یہاں آباد کئے گئے۔ سرگودھا اور جھنگ کے علاقوں میں زمین کے بہت بڑے بڑے قطعات من پسند افراد کو تحفتاً دیئے گئے۔ ساہیوال اور فیصل آباد میں دیئے جانے والے رقبے نسبتاً چھوٹے تھے۔

راتوں رات خاندانوں کی تقدیر بدل گئی۔ بے زمین مزارعے' زمیندار اور ڈاکوؤں کے سردار' جاگیردار بن گئے۔ ضلعی سطح کے انگریز افسران تو کیا ان کے نائب بھی کسی سے خوش ہوتے تو اس پر نوازشات کی بارش ہو جاتی۔ گورے صاحب کا گوالا زمیندار اور اسے دیسی شراب مہیا کرنے والا جاگیردار بنا۔ پنجاب اور دہلی کے خلاف جنگوں میں انگریز کا ساتھ دینے والوں کو بھلا کیسے فراموش کیا جا سکتا تھا' انہیں زمین کی ملکیت کی صورت میں سب سے زیادہ بخششیں عطا ہوئی۔ اس طرح معاشی لحاظ سے آسودہ ایک نیا حکمران طبقہ وجود میں آیا۔ اس دوران اکثر ایسا بھی ہوا کہ فیض یابی کی اس دوڑ میں بہت سے ''مستحق'' صرف اس لئے پیچھے رہ گئے کہ موقعہ پرستی میں وہ اپنے بھائی بندوں کے ہم پلہ نہ تھے۔ اور جو ''وصولی'' میں کامیاب ہو کر اشرافیہ میں شامل ہو جاتے' جلد ہی ان کے اصل کردار اور ترقی حاصل کرنے کے کمالات کو بھلا دیا جاتا۔ غداری اور اطاعت گزاری کا صلہ دیا جانا ضروری تھا۔

نیا حکمران طبقہ کسی جدوجہد کے نتیجے میں سامنے نہیں آیا تھا اور نہ ہی امریکہ اور یورپ کے حکمران اور امیر طبقات کی طرح یہ لوگ قربانیاں دے کر یا جنگ جیت کر اپنا مقام بنانے میں کامیاب ہوئے تھے بلکہ ہماری نئی اشرافیہ نے تو یہ مرتبہ اور یہ شان و شوکت ایک قطعی متضاد رویئے یعنی بغیر جدوجہد کے اور صرف بدیسی حکمرانوں کے روبرو' سر تسلیم خم کر کے حاصل کی تھی۔ انگریز کے گھوڑوں کی لگام تھامنے کے عوض ان کی لاٹریاں نکلی تھیں۔ اس کے باوجود یہی طبقہ غالب رہا' اسی نے حکومت کی اور یہی زندگی کی تمام آسائشوں سے بہرہ ور بھی ہوا۔

بہر حال کامیابی کا جادو سر چڑھ کے بولتا ہے اور منزل راستے کا جواز فراہم کر دیتی ہے۔ جب وادیٔ سندھ کے معاشرے میں ان منحوس اقدار کا بیج بویا جا رہا تھا۔ برطانیہ کے پبلک سکولوں میں بچوں کو اس سے قطعی مختلف تربیت دی جا رہی تھی۔ ''ہر قیمت پر کامیابی'' کا حصول وادی سندھ کے سماج کا رہنما اصول قرار پایا' اہلیت سے قطع نظر راتوں رات امیر بننے کا آزار ایجاد ہوا۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ آزار اور کامیابی کا یہ نسخہ جڑ پکڑ تا گیا اور معاشرے کی اخلاقی بنیادیں کھوکھلی ہوتی چلی گئیں۔ آج کا ہیروئن اور کلاشنکوف کلچر' انہی بد اعمالیوں کا شاخسانہ ہے۔

وادیٔ سندھ میں یہ سلسلہ نہر' ریل اور سڑک کی تعمیر کے بعد 'نوآبادکاری' کی حکمت عملی سے شروع ہوا۔ وادیٔ سندھ اور ہند کے استحصال کے لئے ریل اور نظام آبپاشی سامراجی ضرورت تھے کیونکہ اب برطانیہ کو اسی خطے کی دولت اور اس کے وسائل سے ترقی کی منازل طے کرنا تھیں اور اپنے نت نئے ہتھکنڈوں کے ذریعے ہندو اور مسلمانوں سمیت انڈیا کی اکثریت کو زیر دام رکھنا تھا۔

حصہ سوم

دو قومیں

1757ء سے 1947ء تک



قائداعظم محمد علی جناح



موہن داس کرم چند گاندھی' پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ

دو قومیں

1757ء سے 1947ء تک

تعارف

اس کتاب کے پہلے دو حصوں میں میری شعوری کوشش رہی ہے کہ سندھ واسی کی جغرافیائی اور مستقل قومیت کا تعین کر سکوں تاکہ نہ صرف اس کی شناخت اور اسے نو دریافت کرنے میں آسانی ہو بلکہ 'جو کچھ وہ نہیں ہے' اسے بھی اجاگر کیا جا سکے۔ اس کا مقصد جہاں ایک طرف اسے اپنے منفرد تشخص کا احساس دلانا ہے تو دوسری طرف اسے یہ باور کرانا بھی مقصود ہے کہ سماجی' سیاسی اور ثقافتی حوالے سے اس کی شناخت' اپنی جغرافیائی حدود سے پرے بسنے والے تمام افراد بشمول وادیٔ گنگا' جنوبی جزیرہ نما ہندوستان' عرب اور یورپ سے' قطعی مختلف اور منفرد ہے۔

لیکن آج' وادیٔ سندھ کے اس خطے میں آباد پاکستانی قوم کی اہم اور نمایاں خصوصیت محض یہ نہیں کہ وہ ایک قوم ہے اور اپنے وسیع تر تناظر میں ان انڈو آریائی گروہوں پر مشتمل ہے جو کبھی سندھ اور اس کے معاون دریاؤں کے کناروں پر آباد ہو گئے تھے' اس سلسلے میں فیصلہ کن امر یہ بھی ہے کہ اس ریاست میں بسنے والوں کی غالب اکثریت بنیادی طور پر مسلمان ہے لیکن اس کے باوجود صرف یہی ایک حقیقت اسے اسلامی ریاست ماننے کے لئے کافی نہیں۔ اردن اور ترکی بھی تو ہیں جن کی تمام آبادی ہی مسلمان ہے مگر اس کے باوجود وہ اسلامی ریاستیں نہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وادیٔ سندھ اور شمال مغربی ہندوستان کے تمام باشندوں نے تو الگ ریاست کے قیام کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔ وادیٔ سندھ کی آبادی کا ایک قابل قدر حصہ سکھ اور ہندوؤں پر مشتمل تھا اور ظاہر ہے وہ علیحدگی یا پاکستان کے حامی نہیں تھے۔

اگر، محض وادیٔ سندھ کی بنیاد پر پاکستان تخلیق ہوا ہوتا تو بر صغیر کی تقسیم کے بعد کوئی ہندو اور سکھ یہاں سے ہجرت نہ کرتا۔ ان کی ہجرت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یقیناً کچھ اور عوامل بھی تھے جو وادیٔ سندھ میں رہنے والے افراد کے درمیان بھی الگ پہچان کا جواز تھے۔ وہ عوامل کیا تھے؟

مملکت پاکستان کی جغرافیائی سرحدوں کا تعین اس انداز میں ہوا کہ اس میں مسلم اکثریت کے صوبوں اور ریاستوں کو شامل کیا گیا اور 20ویں صدی کے نصف اول میں یہی پہلو تقسیم ہند کی تحریک اور جدوجہد کا مرکزی خیال تھا۔

اپنے تشخص کے حوالے سے بلا شبہ اور بالالتزام یہ ایک مسلم تحریک تھی اور تحریک پاکستان میں حصہ لینے والے مسلمان ہی تھے لیکن کیا یہ ایک مذہبی تحریک تھی؟ کیا ملا اس تحریک کے قائد تھے یا غیر متعصب اور ترقی پسند راہنماؤں نے اس تحریک کی قیادت کی؟ کیا اس تحریک کا تعلق صرف مذہب سے تھا یا اس کے پس پردہ بر صغیر کے مسلمانوں کے اپنے مخصوص ثقافتی' اقتصادی اور معاشی مفادات بھی کار فرما تھے جو دیگر مسلم ممالک سے تو مختلف تھے مگر سندھ طاس کے مسلمانوں کے درمیان یکساں تھے۔

بہت سے تجزیہ نگار اس امر پر اصرار کرتے ہیں کہ صرف مذہب ہی تخلیق پاکستان کا جواز اور بنائے منطق تھا اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں وہ خود کو حق جانب قرار دیتے ہیں کہ تحریک پاکستان چونکہ مسلمانوں کی تحریک تھی اس لئے مذہبی جماعتوں ہی کو نہ صرف طرز حکومت وضع کرنے بلکہ حکومت کرنے کا وراثتی حق حاصل ہے۔ لیکن اس امر پر اصرار کرنے والوں کی اکثریت نے تو اس وقت تخلیق پاکستان کی مخالفت کی تھی جب یہ مطالبہ ہندوستان کے مسلمانوں میں قبول عام کی سند حاصل کر رہا تھا اور دراصل یہی وہ پہلو ہے جس کی بناء پر اس تحریک کو جو بالآخر قیام پاکستان پر منتج ہوئی اور جس نے اس نئی ریاست کو منطقی جواز بھی فراہم کیا' اسے بری طرح اور اکثر اوقات جان بوجھ کر مسخ کیا جا رہا ہے۔ پاکستان کے یہ نئے نظریہ ساز جن کی اکثریت مطالبہ پاکستان کی مخالف تھی' جذباتیت کو ہوا دے کر اس صورت حال کو محض اس لئے پراگندہ کر دینے کے درپے رہے ہیں تاکہ نظریہ پاکستان کے بارے میں ان کی مخصوص تشریح سند کا درجہ حاصل کر لے اور ظاہر ہے اس کا نتیجہ قدیم اور جدید' دقیانوسی اور جدت پسند' رجعت پرست اور حقیقت پسندوں کے درمیان محاذ آرائی کی صورت میں نکلا۔

اس کتاب کے آئندہ ابواب میں کٹر مذہبی نوعیت کی بحث و تکرار کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے بر صغیر میں آبادی کے دو بڑے طبقات کی سماجی و معاشی حالت زار اور ان کے ثقافتی نقطہ نظر کے درمیان فرق کا جائزہ لینے کی سعی کی جائے گی۔ یہی وہ دونوں گروہ ہیں جو 1947 میں بر صغیر کی تقسیم کے عمل

کے دو متحارب کردار تھے۔ صاف ظاہر ہے کہ تفریق اور تفاوت کو نمایاں کرنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ مماثلتوں کا جائزہ بھی لیا جائے اور ایسا کرتے ہوئے عین ممکن ہے کہ ہمیں چند دلچسپ نتائج اخذ کرنے میں مدد ملے۔

ممکن ہے کہ ہمیں دونوں قوموں کے رسم و رواج اور دیگر سماجی رویوں میں اس سے کہیں زیادہ مطابقت نظر آئے جس قدر آج ہم قبول کرنے کو تیار ہیں یا پھر حتمی تجزیے کے مطابق معاشی تفاوت ہی ان کے درمیان حد فاصل بنا ہو۔ یوں لگتا ہے کہ اس تفاوت کا آغاز خوش قسمتی یا بد نصیبی کے ان مواقع سے ہوا جو 18ویں صدی کے بنگال نے مہیا کئے۔ یہی وہ مقام تھا جہاں سے دونوں قوموں نے ترقی کے لئے دو مختلف معاشی راستوں کو اپنایا۔

موجودہ دور کے نظریہ سازوں نے جن اختلافات کو ہوا دی 'اس سے اور بھی کئی سوالات جنم لیتے ہیں۔ مثلاً یہی کہ ابھرتے ہوئے بورژوائی نظام کو ہندو نے بڑی گرمجوشی سے اپنا لیا اور متامل مسلمان 'زوال پذیر جاگیرداری نظام سے چمٹا رہا۔ آخر ان دونوں کا تفاوت فرقہ وارانہ تقسیم پر کس حد تک اثر انداز ہوا؟ کیا پاکستان بنانے والوں 'خاص طور پر عوام کو حتمی کامیابی سے ہمکنار کرنے والے محمد علی جناح کے ذہن میں ایک مسلم ریاست کا تصور تھا یا ایک اسلامی ریاست ان کا مطمع نظر تھی؟ کیا مسٹر جناح ملک میں جمہوری پارلیمانی طرز حکومت کے حامی تھے یا مذہبی جماعتوں کی حکمرانی چاہتے تھے؟

میری کوشش تو ہوگی کہ میں بے جا طور پر برصغیر کے ہندو مسلم باسیوں کے درمیان موجود مماثلتوں 'مشترکہ خصوصیات اور پہلوؤں کو نظر انداز نہ کروں لیکن کتاب کے باقی حصے میں میرا تجزیہ ایسے مختلف النوع تاریخی اور معاشی عوامل پر ہی مرکوز رہے گا جو ہندو مسلم اختلافات کو نمایاں اور اجاگر کرنے اور انہیں مزید ہوا دینے کا باعث ہوئے اور پھر حالات کے جبر نے 1947ء میں تقسیم کے اہم کرداروں کو وادی سندھ اور ہند کے درمیان' ہمیشہ سے موجود تاریخی تفریق کی جانب موڑ دیا۔

24

ہندو مسلم تفریق کی علامت

فرقہ وارانہ گروہ بندی

یہ حقیقت کسی مزید تصدیق کی محتاج نہیں کہ بر صغیر کے ہندو اور مسلمان اپنی الگ الگ پہچان رکھنے والی دو مختلف قومیں ہیں اور اس حقیقت کو باور کرانے کے لئے ہمیں تقسیم کے دونوں جانب کے کسی جوشیلے بنیاد پرست کی ضرورت نہیں (گو "قوم" کے نظریئے کی یہی ایک اور حتمی تعریف نہیں مگر فی الحال یہی لفظ زیادہ موزوں ہے)۔ برطانوی راج کی آہنی گرفت نے ان دونوں کو ایک ہی جوت میں باندھے رکھا اور برطانوی افسر شاہی بھی ان دونوں مخالفین کو ایک ہی قید خانے کی سلاخوں کے پیچھے رکھنے میں کامیاب رہی لیکن 20ویں صدی کے اوائل میں جونہی ایک ناتواں سی مقامی حکومت کا موہوم سا امکان پیدا ہوا تو آپس کے تمام تر ناقابل مصالحت اختلافات کھل کر سامنے آگئے۔ اور 1909ء کے کونسلز ایکٹ یا منٹو مورلے ریفارمز ایکٹ سے پہلے ہی جداگانہ طرز انتخاب کا مطالبہ سامنے آگیا۔

عام طور پر ہندو اور مسلم مذاہب کے سماجی اظہار کو خوب نمایاں کیا جاتا ہے۔ ہندومت پرستی کے مقابلے میں مسلم بت شکنی کی روایات کا تذکرہ ہوتا ہے۔ ہندوؤں کی کثرت پرستی کا مسلمانوں کی وحدانیت سے تقابل رہتا ہے۔ اگرچہ کچھ مسلمان صوفیاء جذب و عقیدت کے ساتھ کئے جانے والے رقص کی چند اقسام کو جائز قرار دیتے ہیں لیکن ہندوؤں کے دیوتا شیو کے سامنے تنتری مسلک کے عقیدت مندانہ رقص، مسلمانوں کے نقطہ نظر سے ناشائستگی کی حد تک بیباکانہ اور اجنبی تھے۔ ہندوؤں میں ستی کی رسم اور ذات پات کی آہنی گرفت مسلمانوں کے لئے ہمیشہ ذہنی پریشانی کا باعث رہی لیکن اس

کے باوجود کئی صدیوں کے مسلم راج کے دوران ہندوستان کے کسی مسلمان فرمانروا نے ان رسومات کو ختم کرنے کی ایک بھی قابلِ ذکر کوشش نہیں کی۔ بلکہ ہندو راجاؤں اور ریاستوں کو فتح کر لینے کے بعد بھی ان ریاستوں میں ان سب رسومات کو جاری رہنے دیا گیا بلکہ ذات پات کے نظام کو یہ بادشاہ لگان کی وصولی اور امن و امان کے قیام کے سلسلے میں بڑی ہوشیاری کے ساتھ اپنے فائدے کے لئے استعمال کرتے رہے اور ستی کی رسم کو تو مسلمان حکمرانوں نے نہیں بلکہ 1829 میں انگریزوں نے قانون سازی کے ذریعے ممنوع قرار دیا۔

مسلمانوں نے 1192 عیسوی کے بعد تقریباً 500 سال تک شمالی ہندوستان کے بیشتر علاقے پر حکومت کی۔ متکبر برہمن اور خود سر کشتریوں پر مشتمل ہندو اشرافیہ بھی مسلمان شہنشاہوں کی رعایا ہی رہی۔ ہندو اکابرین مسلمان حکمرانوں کے معتمد یا مصاحب بننے سے زیادہ کسی عہدے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ اگر بہت بھی ہوتا تو انہیں اپنے علاقے میں جزوی خود مختاری حاصل ہو جاتی تھی لیکن رہتے وہ محکوم جاگیردار ہی تھے۔

غزنی کا سلطان 'اسلام کے جس بت شکن مزاج کا ہندوستان میں کئی بار عملی مظاہرہ کر چکا تھا ہندو اسے بھی فراموش نہیں کر سکے تھے۔ یہ برصغیر کی آبادی کے دو بڑے گروہوں کے تصادم کا نقطہ عروج تھا۔ رومیلا تھاپر Romila Thapar کے تفصیلی تجزیئے سے ہم سومنات کی تباہی اور ہندو ذہن پر اس واقعے کے دور رس اثرات سے پہلے ہی آگاہ ہو چکے ہیں لیکن فیروز شاہ اور اس کے بعد اورنگ زیب کے دور میں مندروں پر قبضے کا مقصد 'زوال پذیر جاگیرداریوں کے باعث خالی ہوتے ہوئے قومی خزانے کا خسارہ کم کرنا اور مبینہ طور پر حکومت دشمن اتحاد اور سازشوں کی سرکوبی کرنا بھی تھا۔ ان روبہ زوال سلطنتوں میں علاؤالدین خلجی اور اکبر جیسی رواداری' خود اعتمادی اور تحمل کا فقدان تھا۔

دو قومی تال میل

یہ تاریخ کو مسخ کرنے کے مترادف ہوگا اگر ہم صرف دونوں مذاہب کے ماننے والوں کے باہمی اختلافات کو ہی اجاگر کرتے رہیں۔ دونوں طرف کے بنیاد پرست اگرچہ اعتراف نہیں کریں گے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہندو اور مسلمان صدیوں تک بڑی حد تک ہم آہنگی اور بقائے باہمی کے تحت امن و سکون سے زندگی گزارتے رہے۔ وہ ایک دوسرے کی حکومتوں میں وزراء کے عہدوں پر بھی فائز ہوتے تھے۔ اکثر اوقات ہندو اور مسلمان جاگیردار آپس میں اتحاد بھی قائم کر لیتے تھے۔ کم از کم حکمران اشرافیہ کی سطح پر دہلی کے بادشاہ اور مغل شہنشاہ بین المذہبی شادیاں بھی رچا لیتے۔ علاؤالدین خلجی 'اکبر اور جہانگیر کی

بیویاں اور ملکائیں ہندو راجپوت گھرانوں سے تھیں اور مغل نظام حکمرانی کا انحصار تو بڑی حد تک راجپوت راجدھانیوں کی حمایت پر رہا۔

سلاطین دہلی کے دور سے پہلے دونوں مذاہب کے درمیان مضبوط روابط کا آغاز ہندوستان کے جنوبی ساحلی علاقوں سے ہوا۔ ہندوستان کے اس جزیرہ نما کے ساحلی علاقے کی ایک تنگ سی پٹی میں عرب تاجروں نے پہلی بار اسلام روشناس کرایا۔ سلطنت روما کے زوال کے بعد مشرق و مغرب کے مابین تجارت میں عرب تاجر امیر ترین درمیانی عامل تھے۔ سمندروں کے مابین سفر آشنائی نے انہیں ہندوستانی جزیرہ نما کے ساحلی علاقے مالابار میں مختصر سی نوآبادیاں قائم کرنے میں مدد دی تھی لیکن ان کی توجہ صرف بحری تجارتی راستوں پر رہی اور انہوں نے ساحلوں سے خشکی کی جانب آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کی اس لئے اندرون ملک ان کا اثر ورسوخ نہ ہونے کے برابر تھا۔

عربوں کی طرف سے اولین حملہ محمد بن قاسم کی سرکردگی میں کیا گیا لیکن اس کا مقصد علاقائی توسیع پسندی نہیں بلکہ بحری تجارت اور حاجیوں کا تحفظ تھا مگر قاسم کو جلد ہی کمان سے سبکدوش کر دیا گیا۔ سندھ کے پڑوس میں رشترکتی اور ان کے بعد آنے والے پرتی ہار حکمران ' عربوں کی کسی قدر نیم دلانہ پیش قدمی کو روکنے میں کامیاب رہے۔ وادی سندھ کے صرف ایک حصے یعنی آج کے صوبہ سندھ پر امیوں اور عباسیوں کا دور حکمرانی تقریباً 140 برس تک قائم رہا اور یہ علاقہ چونکہ اسلامی سلطنت کے قلب سے انتہائی دور واقع تھا اس لئے یہاں اسلامی سلطنت کی گرفت بھی کمزور اور تسلسل سے عاری رہی لہٰذا محض وسیع و عریض برصغیر کے ایک کونے پر عربوں کے اس براہ راست مگر کمزور اثرورسوخ کے تحت برصغیر میں وسیع پیمانے پر اسلام کی اشاعت و ترویج ممکن نہیں تھی۔

قاسم کے تین سو سال بعد جب وسطی ایشیا کے مسلمان فاتحین نے وادیٔ سندھ میں اپنی مہم جوئی کا آغاز کیا تو اس وقت جنوبی وادیٔ سندھ سے عربوں کا براہ راست اقتدار ختم ہوئے ایک صدی سے زیادہ عرصہ بیت چکا تھا۔ یہاں تک کہ بچے کھچے مسلم علاقوں میں بھی عرب رسم ورواج کا اثرورسوخ نہ ہونے کے برابر تھا۔ ان لوگوں نے عربوں سے زیادہ وادیٔ سندھ کی ثقافت سے اثر قبول کیا۔ وہ ایک کثیر للمذاہب ماحول میں مختلف نظریات رکھنے والے افراد کے ساتھ خوش اسلوبی سے جینا سیکھ گئے تھے۔

ہندوستان میں وسیع اور مستحکم مسلم ریاستوں اور سلطنتوں کے قیام کے بعد بھی فرقہ وارانہ ہم آہنگی برقرار رہی۔ فیروز شاہ اور اورنگ زیب کے علاوہ سلاطین دہلی اور مغل دور کے تقریباً سبھی حکمرانوں نے دونوں فرقوں کے درمیان توازن قائم رکھنے کی کوشش کی۔ حال ہی میں پروفیسر آر۔ ناتھ R Nath نے پہلے مغل شہنشاہ ظہیرالدین بابر کی ایک وصیت کے مستند ہونے کی تصدیق کی جس میں بابر

نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "لوح دل کو مذہبی تعصب سے پاک رکھنا ضروری ہے اور ہر مذہب کے ساتھ اس کے اصولوں کے مطابق انصاف ہونا چاہئے...... اور شاہی عملداری میں کسی بھی مندر یا عبادت گاہ کی بے حرمتی نہیں ہونا چاہئے"

بابر کا پوتا جلال الدین اکبر اپنے دادا سے بھی دو ہاتھ آگے رہا اور اس نے ہندو شہزادیوں کو اپنی بیویوں کی حیثیت سے محل میں جگہ دی۔ 1563ء میں اس نے مندروں اور خانقاہوں کی زیارت کرنے والے ہندوؤں پر عائد ٹیکس ختم کر دیا اور اس سے اگلے سال اس نے جزیہ بھی واپس لے لیا جو تمام غیر مسلموں پر عائد تھا۔ اپنے اس عمل سے اکبر نے دراصل غیر مسلموں کو شہریت کے مساوی حقوق عطا کئے۔ اس نے غیر مسلموں کو حکومت اور فوج کے اعلیٰ عہدوں پر بھی فائز کیا۔ اپنے دور اقتدار کے عروج میں اس نے برصغیر کے دو بڑے مذاہب اسلام اور ہندومت کی تعلیمات کے ادغام سے ایک نیا مذہبی فلسفہ دین الہٰی کے نام سے متعارف کرانے کی ناکام کوشش بھی کی۔

اگرچہ اکبر نے دوسروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ پیش رفت کی لیکن اس کی کاوش اپنے پیش رو حکمرانوں کی روش سے اچھوتی نہیں تھی۔ دہلی کے مسلمان بادشاہ اور مغل فرمانروا ہمیشہ سے جنگجو ہندو راجپوت خانوادوں کے ساتھ عسکری اتحاد کے خواہش مند رہے۔ بے شمار ہندو' جرنیل اور جاگیرداروں کی حیثیت سے ان بادشاہوں کے نمک خوار رہے۔ اگرچہ رعایا کی بہت بڑی اکثریت ہندو ہونے کے ناطے جزیہ دہندگان کے زمرے میں آتی تھی لیکن اس کے باوجود صدیوں پر محیط ہر عہد میں جزیہ' مملکت کی آمدنی کا نہایت قلیل حصہ تھا۔ جزیہ اگر لاگو بھی کیا جاتا تھا تو صرف دستکار اور شہری آبادی اس کی زد میں آتی تھی۔ دیہی امراء' فوجی تنخواہ دار اور پہلے سے ہی ٹیکسوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے کسان جزیئے سے مستثنٰی تھے۔

سلاطین دہلی اور مغل افواج تو اپنی عسکری افرادی قوت کا ایک بڑا حصہ ہندو جاگیرداریوں سے حاصل کرتی ہی تھیں لیکن ان سے کمتر درجے کی مسلمان ریاستیں بھی اکثر انہیں اپنا اتحادی بنا لیتی تھیں۔

اودھ کے نواب' وزیر صفدر جنگ نے 1751ء میں ملہار راؤ ہولکر کی مرہٹہ فوج' مہدجی سندھیا اور راجہ سورج مل کے جاٹ دستوں کی مدد سے روہیل کھنڈ کی مسلم حکومت اور پوری روہیلہ ریاست کو شکست سے دوچار کیا۔ 1757ء میں ایک روشن خیال ہندو دیوان رام نرائن نے پلاسی کی جنگ میں بہادر نواب سراج الدولہ کا ساتھ دیا جبکہ مسلمان نواب کے سب سے معتمد مسلمان جرنیل میر جعفر نے عین وقت پر اس سے غداری کی۔ رام نرائن نے جس شعر میں اپنے اتحادی مسلمان نواب کی شکست اور موت کی تصویر کشی کی' اس نے دلوں پر بہت گہرا اثر چھوڑا۔

غزالاں تم تو واقف ہو، کہو مجنوں کے مرنے کی
دیوانہ مر گیا آخر، تو ویرانوں پہ کیا گزری

مسلم سردار غلام قادر روہیلہ کے ہاتھوں مسلمان شہنشاہ شاہ عالم کی رسوائی اور بینائی سے محروم کئے جانے کا احوال سن کر وہ مرہٹہ سردار سندھیا ہی تھا جس نے اپنے جرنیل رانا خان کو حکم دیا کہ نابینا مغل شہنشاہ کو ظالم روہیلہ سردار سے رہائی دلائی جائے۔ جب مرہٹوں نے قلعہ دہلی کا محاصرہ کیا تو غلام قادر میرٹھ کی طرف بھاگ نکلا اور مغل شہزادوں اور شہزادیوں کو بطور یرغمال اپنے ساتھ لیتا گیا لیکن روہیلہ سردار کا تعاقب کر کے اسے گرفتار اور پھر ہلاک کر دیا گیا۔ اس موقعہ پر ایک درجن سے زیادہ مسلمان شہزادے اور اتنی ہی شہزادیاں اپنی رہائی کے لئے مرہٹہ ہندو فوج کی رہین منت تھیں اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔

1857ء کی جنگ آزادی کے دوران ہندو اور مسلمان دونوں ایک دوسرے کے شانہ بشانہ انگریزوں کے خلاف برسرپیکار تھے۔ اس جنگ کا آغاز مئی 1857ء میں میرٹھ چھاؤنی کے مقامی فوجیوں کی بغاوت سے ہوا۔ ان فوجیوں نے بندوق میں چکنے کارتوسوں کے استعمال سے انکار کر دیا تھا۔ ان بندوقوں کو لوڈ کرنے کے طریق کار کے خلاف ہندو اور مسلمان سپاہیوں کا ردعمل یکساں تھا۔ جب یہ وطن کے جیالے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر میرٹھ چھاؤنی سے 40 میل دور دہلی کی طرف روانہ ہوئے تو میرٹھ اور اس کے نواحی علاقوں سے ان کے ساتھ شامل ہونے والے شہریوں اور دہقانوں میں دونوں مذاہب کے نام لیوا تھے۔

اگرچہ بہت سے ہندو اور مسلمان شہزادوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا اور کچھ نے معنی خیز "غیر جانبداری" میں عافیت جانی لیکن اس 20 سالہ حسین رانی جھانسی (لکشمی بائی) کا نام فرنگیوں کے خلاف بہادری کے جوہر دکھانے والے ہندوؤں کی فہرست سے خارج نہیں کیا جا سکتا جو انگریز کے خلاف بے جگری سے لڑتے ہوئے شکست و موت سے ہمکنار ہوئی اور نہ ہی نانا صاحب اور اس کے گوریلا کمانڈر تانتیا توپی کی شجاعت کو جھٹلایا جا سکتا ہے۔ ان مرہٹہ سرداروں نے اس وقت بھی ہتھیار اٹھائے جب ان کی افواج اور گھوڑے مسلسل معرکوں کے بعد تھکن سے چور تھے۔ مرہٹوں نے تو دہلی کے مسلمان شہنشاہ کی شکست کے بعد بھی 1858 تک انگریز کے خلاف اپنی مزاحمت جاری رکھی۔

یہ سب ہندو اور مسلمان ایک کمزور مسلم شہنشاہ کی نسلاً منتقل ہونے والی حکمرانی کے لئے لڑ رہے تھے۔ شہنشاہ کو بھی دونوں فرقوں کی قربانیوں کا احساس ہوا تو اس نے 27 اگست 1857 کو ایک شاہی فرمان جاری کیا جس کے الفاظ تھے۔

"جیساکہ سب جانتے ہیں کہ موجودہ دور میں ہندوستان کے لوگ ...... ہندو اور محمدن .... بے دین اور سازشی انگریز کے ظلم اور جبر کی چکی میں پس رہے ہیں لہٰذا ہندوستان کے تمام متمول افراد کا فرض ہے کہ اپنی زندگیاں اور مال و منال عوام کی بہبود کے لئے وقف کر دیں"

اگرچہ یہ شاہی فرمان مالدار لوگوں کو متحرک کرنے میں تو کچھ ایسا کامیاب نہیں رہا لیکن یہ حقیقت ضرور آشکار کر گیا کہ بہادر شاہ ظفر کی نظر میں ہندوؤں کے بجائے عیسائی کافر تھے۔

1857ء کی جنگ آزادی نے ثابت کر دیا کہ ہندو اور مسلمان کسانوں اور متوسط طبقات کے مفادات مشترک تھے اور وہ ان کے تحفظ کے لئے ایک دوسرے کے شانہ بشانہ لڑنے کو تیار تھے۔ یہ صورت حال ہندو اور مسلمان اشرافیہ کے مشترکہ مفادات کا پتہ بھی دیتی ہے۔ اس مرحلے پر دونوں کے مابین بنیادی تفریق دراصل طبقاتی اور جغرافیائی (یا علاقائی) بنیادوں پر تھی نہ کہ فرقہ وارانہ اختلافات کی بنیاد پر۔

پرامن بقائے باہمی

مسلمان بادشاہوں نے ہندو شہزادیوں سے شادیاں رچائیں۔ شاہی دربار نے بہت سے ہندو رسم و رواج اپنائے جن میں بادشاہت کے ساتھ الوہیت کا امتزاج بھی شامل تھا۔ یہ تصور اسلام کے لئے قطعی اجنبی تھا۔ مغل شہنشاہوں نے ظل سبحانی کا لقب اختیار کیا جس کے لغوی معنی ہیں "خدا کا سایہ" یعنی خدا کا نمائندہ یا اس کی طرف سے مقرر کردہ۔ دہلی کے بہت سے مسلمان بادشاہ بڑے جوش و خروش سے ہولی، دسہرہ اور دیوالی جیسے ہندو تہواروں میں شرکت کرتے تھے۔ بسنت اور بیساکھی جیسے موسمی تہوار بھی مختلف مذہب کے لوگ مل جل کر مناتے تھے۔

ظاہر ہے ایسے مشترکہ اور مقبول عام تہواروں میں شمولیت محض شاہی خاندان اور جاگیردار اشرافیہ تک محدود نہیں تھی۔ عوامی سطح پر بھی دونوں مذاہب کے لوگ آپس میں گھل مل جایا کرتے تھے اگرچہ وہ تاریخ دان جن کی توجہ محض شاہی خاندان اور محلاتی رسومات پر مرکوز رہتی تھی، ایسی تقریبات کے عوامی پہلو کو نمایاں نہیں کر سکے۔

یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان کی طرف مسلمانوں کی ہجرت بڑے محدود پیمانے پر رہی۔ وسطی ایشیا کے سپاہیوں کے ساتھ آنے والے مسلمان وسیع پیمانے پر ہجرت کر کے وادئ سندھ اور ہند میں نہیں آئے۔ ترک، افغان اور مغل افواج کے ساتھ صرف معمول کے مطابق پڑاؤ کے منتظمین اور اسی طرح

دوسرے کارندے ہوتے تھے البتہ ہندوستان میں مستحکم مسلم حکومتوں کے قیام کے بعد وسطی ایشیاء کے کچھ مسلمان تاجروں کو یہاں اپنے مراکز قائم کرنے کی ترغیب ضرور ملی اور کئی دستکار اور معمار بھی نقل مکانی کر کے وادیٔ سندھ اور ہندوستان میں آئے۔ عرب تاجروں نے بھی ہندوستان کے جزیرہ نما ساحل کے ساتھ ساتھ اپنی بستیاں قائم کی تھیں خاص طور پر مالابار اور بھڑوچ (ممبئی) کے آس پاس لیکن یہ تمام 'غیر ملکی مسلمان' مجموعی طور پر بھی ہندوستان میں مسلم آبادی کا عشر عشیر نہیں تھے۔

انڈین مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت ہندوؤں اور خاص طور پر نچلی ذات کے ہندوؤں سے مسلمان ہوئی تھی۔ مذہب کی اس تبدیلی کے ذریعے وہ اپنی حقیر حیثیت کا طوق اتار پھینکنا چاہتے تھے۔ ایک بار جب فیصلہ ہو جاتا تو پھر تمام برادری بیک وقت اسلام قبول کر لیتی تھی لیکن دوسری طرف دستکاروں کا کوئی گروہ یا طبقہ حلقہ بگوش اسلام ہوتا تو ان کے سماجی مرتبے یا معمول کے طرز زندگی میں کوئی فوری اور قابل ذکر تبدیلی نہیں آتی تھی۔ دستکاروں کو گزر بسر کے لئے اپنا وہی موروثی پیشہ جاری رکھنا پڑتا کہ جس میں انہیں مہارت حاصل ہوتی تھی۔ اس لئے ان کا پیشہ 'رہن سہن کا انداز' معیار زندگی اور ان کا سماجی مرتبہ کم و بیش وہی رہتا جو قبول اسلام سے پہلے تھا۔ مثال کے طور پر جولاہوں کا تعلق ایک ایسی برادری سے ہے جس نے بہت وسیع پیمانے پر اسلام قبول کیا لیکن اس کے باوجود ذات پات کے ہمہ گیر اثر و نفوذ کے تحت (جو بدقسمتی سے ہندو مسلم کی تخصیص کے بغیر انڈین معاشرے کا عمومی مزاج تھا) معاشرے میں جولاہوں کا رتبہ اتنا ہی کمتر رہا جتنا کہ قبول اسلام سے پیشتر تھا۔

چونکہ دستکار اپنے 'پیشے کی ذات' سے پہچانے جاتے تھے لہٰذا ذات کا یہ امتیاز 'خاص طور پر سماجی تعلقات اور بین الطبقاتی شادیوں کے حوالے سے 'دستکار کے قبول اسلام کے بعد بھی جاری رہا۔

مذہب کی تبدیلی کا یہ عمل سست روی سے بتدریج جاری رہا کیونکہ سماجی رتبے میں کوئی فوری تبدیلی متوقع نہیں ہوتی تھی لہٰذا مسلمانوں کے صدیوں پر محیط دور اقتدار کے باوجود لوگوں کی اکثریت ہندو ہی رہی۔ دونوں مذہبی گروہوں کے باہم گھل مل کے رہنے کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی تھی کہ نہ تو ماضی اور نہ ہی ہمعصر ماحول سے ان کے رابطے یکایک منقطع ہوئے تھے۔

ممکن ہے آج ہمارے لئے یہ قیاس کرنا مشکل ہو کہ یہ دونوں گروہ جن کی زندگی کے اہم پہلو ایک دوسرے سے واضح طور پر مختلف تھے 'ایک ایسے وقت میں بھی کیونکر بقائے باہمی کے تحت ہر سطح پر مربوط زندگی گزارتے رہے جب مغل سلطنت اپنا عروج گزار کے مائل بہ زوال تھی۔ یہ درست ہے کہ شاہی خانوادوں اور اشرافیہ کی بین المذاہبی شادیوں کی بناء پر بہت سی ہچکچاہٹوں کو طے کرنے میں مدد ملی۔ دونوں طرف کے لوگ آزادانہ ایک دوسرے کی مذہبی رسومات اور تہواروں میں شرکت کرتے تھے۔

ادبی اظہار کا ایک مشترک ذریعہ اور مشترکہ ادبی ورثہ وجود میں آگیا تھا۔ اگرچہ مت اور مت کدہ ' مے ' میخانہ اور میکدہ فارسی زبان اور روایات کا حصہ تھے لیکن یہ اردو اور دوسری مقامی زبانوں کے مسلم شعراء کے لئے اظہار کا دلکش پیرایہ ثابت ہونے لگے تھے حالانکہ کٹر مسلمانوں کے نزدیک یہ انداز بیان انتہائی بے ہودہ تھا۔ ادب نے دونوں طرف کے بہت سے تاثراتی حوالوں کو یکجا کر کے انہیں اپنی نرم اور زرخیز زمین میں سمو لیا تھا۔ ذرا دیکھئے تو مت ' خدا اور کفر جیسے الفاظ ' اذن شعری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کس خوبصورتی سے اس ایک شعر میں یکجان ہوئے ہیں۔

لائے اس مت کو التجا کر کے
کفر ٹوٹا ' خدا خدا کر کے

اجماع ضدین کے حامیوں ' یعنی بھگتیوں نے بھی دونوں مذاہب کے مابین ' رابطے استوار کرنے اور بقائے باہمی کی فضاء پیدا کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ صوفیاء کا پیغام بھی کئی صدیوں پر محیط ' غیر متغیر اور اٹل تھا۔ وہ ہمیشہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا پرچار کرتے رہے۔ ان کی دلگداز شاعری نے ہمیشہ رواداری کا درس دیا۔ انہوں نے تنازعے کے محرکات پر اپنی توجہ مرکوز رکھی ' اس کی نشاندہی کرتے رہے اور اسے تمسخر کی نظر کر دیا۔ اپنی شاعری اور اپنے عمل سے ان لوگوں نے پرامن بقائے باہمی کی فضیلتوں کو اجاگر کیا۔ دونوں طرف کے بنیاد پرست ان کا نشانہ تھے۔ تعصب سے نفرت اور انسانیت سے پیار ان کا پیغام رہا۔ اور اسی عمل اور رویئے سے انہوں نے لوگوں کو مشرف بہ اسلام کیا۔

صوفیاء کرام عظمت انسانی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے علمبردار تھے۔ ان کے نزدیک انسان اشرف المخلوقات ہے اور بلا لحاظ مذہب ' عقیدہ اور ذات اس کا تحفظ کیا جانا چاہئے۔ اپنے نظریات کے اظہار میں وہ جرات مندانہ صاف گوئی سے کام لیتے تھے اور کسی مصلحت کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔

مسجد ڈھا دے مندر ڈھا دے
ڈھا دے جو کجھ ڈھیندا
اک بندے دا دل نہ ڈھاویں
سوہنا رب دلاں وچ رہندا

بسا اوقات مذہبی ہم آہنگی کا تسلسل ٹوٹ بھی جاتا تھا ' تصادم بھی ہوتے تھے اور خون خرابہ بھی لیکن امن و آشتی کا دور ' فتنہ و فساد کے دورانئے سے ہمیشہ طویل تر ہوتا۔ علاوہ ازیں اکثر اوقات یہ فسادات مخصوص علاقوں تک محدود ہوتے۔ جس سے یہ حقیقت یقیناً عیاں ہوتی تھی کہ دونوں مذاہب کے لوگ دو مختلف قومیں ہیں لیکن یہ کہاں ظاہر ہوتا تھا کہ دونوں امن سے اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ اکثر اوقات

تو یہ تنازعات مذہبی مباحث اور فرقہ واریت سے ماورا ہوتے تھے۔

ہندوستان اور وادیٔ سندھ کی گذشتہ چند صدیوں کی تاریخ میں جنگ پلاسی (1757)ء دونوں قوموں کے درمیان تفریق کو اجاگر کرنے اور تفرقے کی غالباً سب سے اہم وجہ ثابت ہوئی حالانکہ مذہبی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور باہمی تعاون اس جنگ کے بعد بھی ایک صدی سے زیادہ عرصے تک جاری رہا۔ اس جنگ کے نتیجے میں کچھ اہم نئے کھلاڑی اور ایک نئی قوت میدان میں اتری جس نے عمومی صورت حال کو یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا۔ اس لئے ہم ایک بار پھر 'جنگ پلاسی' کی طرف لوٹتے ہیں۔

نفاق

1757ء کی جنگ پلاسی سے 1947ء کی تقسیم برصغیر کے درمیانی 190 سالہ دور نے ان تمام عوامل کو گھن کی طرح چاٹ لیا جن کی بناء پر فرقہ وارانہ بقائے باہمی کی پرامن فضا قائم تھی۔ اسی عرصے کے دوران' دونوں مذہبی فرقوں کے درمیان جارحانہ اور شدید مخاصمت کی وسیع خلیج حائل ہوتی چلی گئی۔

یہ معاملہ اتنا بھی سادہ نہیں تھا کہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے زوال کو محض برصغیر کے نئے فرنگی حکمرانوں کی "تقسیم کرو اور حکومت کرو" کی سوچی سمجھی حکمت عملی کا نتیجہ قرار دے دیا جائے۔ اس حکمت عملی نے بقائے باہمی کے خاتمے میں یقیناً اپنا کردار ادا کیا لیکن یہ ہندو مسلم تفریق بہر حال معنوی نہیں تھی' اس کا اپنا معروضی وجود تھا جو واضح طور پر نظر بھی آتا تھا۔ یہ تفریق ایسے ناگزیر حالات کا شاخسانہ تھی جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس فرقہ وارانہ مخاصمت کی جڑیں مذہبی اختلافات کے علاوہ طبقاتی کشمکش' پیشہ ورانہ چپقلش' گزر اوقات کے ذرائع' سماجی مرتبے اور ادراک کے تفاوت میں بھی تھیں۔

روایتی اعتبار سے مسلمان یا تو حکمران ہوتے تھے یا محنت کش۔ حملہ آور تارکین وطن حکومت کرتے تھے اور نچلی ذاتوں کے قبول اسلام کرنے والوں کی گزراوقات دستکاری پر تھی۔

ہندو تو تجارت اور بہی کھاتے کے اپنے پرانے پیشوں کو جاری رکھے ہوئے تھے۔ انگریزوں کی آمد سے پہلے برصغیر کے تجارتی افق پر ان کی اجارہ داری تھی لہذا پلاسی کی جنگ کے نتیجے میں جب برطانوی تاجروں کو پہلی بار فیصلہ کن انداز میں برصغیر میں قدم جمانے کا موقعہ ملا تو ہندو تاجروں کے لئے اس نئے نظام کا حصہ بننے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ انگریز اور مقامی تاجر (جن کی اکثریت ہندو تھی) شریک کار بن گئے جبکہ انگریزوں کے لئے برصغیر کے مسلمان حکمرانوں کو شکست دے کر ہی قوت اور اقتدار حاصل

کرنا ممکن تھا۔ اس اعتبار سے انگریز اور مسلمان ایک دوسرے کے دشمن ٹھہرے۔ برطانوی راج کے اصل مقاصد نے برصغیر کے دونوں مذہبی گروہوں کو ایک دوسرے کے خلاف صف آراء کر دیا تھا۔

ہندو تاجر جلد ہی برصغیر میں برطانیہ کی تجارتی اور صنعتی پیش قدمی کی معاونت کرنے لگے اور یہ کردار ان کی فطری صلاحیتوں کے عین مطابق تھا۔ بنگال میں انگریزوں کی آمد کے اولین ایام سے ہی انہوں نے صنعت و تجارت کے ساتھ ساتھ ذیلی انتظامی عہدوں پر بھی قدم جمانے کا آغاز کر دیا تھا۔ انیسویں صدی شروع ہوئی تو ہندو برصغیر میں اپنی ملیں اور صنعتیں لگا رہے تھے اور بیسویں صدی تک پہنچتے پہنچتے صحیح معنوں میں ایک قومی ہندو بورژوا طبقہ ارتقاء کے بہت سے مراحل طے کر کے اس برطانوی سامراج کے غیر منصفانہ پھندوں سے آزاد ہونے کے لئے زور آزمائی کر رہا تھا جو اس کی ترقی کی قیمت پر اپنی اجارہ داری کے تحفظ میں مصروف تھا۔

اس کے برعکس برصغیر کے مسلمانوں نے تجارت ' قرضوں کے بیوپار اور بہی کھاتوں کے کام کو ہمیشہ حقارت کی نظر سے دیکھا۔ مسلمان اشرافیہ جاگیردار تھی اور وہ زمین ہی کو اپنی نجابت کا حوالہ گردانتے تھے۔ مسلمان جاگیردار ہندو مہاجن کا مقروض ہونے کے باوجود اس کے پیشے کو اپنی اولاد کے شایان شان نہیں سمجھتا تھا۔ ذات پات کا نظام اب پیشے کے حوالے سے قابل شناخت طبقوں میں ہٹ کر بہت نمایاں ہو چکا تھا اس لئے تجارت یا پیشہ تبدیل کرنے کی راہ میں یہ ایک بڑی رکاوٹ ثابت ہوا۔ ایک مسلمان جاگیردار کے لئے تجارت جیسا پیشہ اختیار کرنا ایک قابل شرم اور بعید از قیاس بات تھی حالانکہ عرب تاجر تو صدیوں سے لین دین اور دوسری تمام مروجہ تجارتی سرگرمیوں میں شامل رہے تھے 'لیکن راسخ العقیدہ ترک اور افغان ' اسلام کی رو سے سود حرام ہونے کے باعث لین دین کے معاملات میں جھجک کا شکار رہے۔ اس انداز فکر نے ساحلی عربوں اور خانہ بدوش پٹھانوں کے علاوہ برصغیر کے مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت کو تجارت سے باز رکھا۔

لہٰذا مسلمان صنعت و تجارت کے برطانوی انداز سے دور ہی رہے جب کہ ویش (ہندوؤں کی تاجر ذات) نے اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا جسے مسلمانوں نے گنوا دیا تھا۔

بورژوا جاگیردار آویزش کے اثرات

مسلمان اور ہندوؤں کے مابین پیشوں کے تفاوت نے دونوں کی ثقافت اور ان کے عمومی رویوں کے درمیان گہری تفریق کو مزید نمایاں کیا۔ یہاں بھی کٹر عقائد کے مقابلے میں ان عوامل کا عمل دخل زیادہ تھا جو حالات کے جبر کے نتیجے میں دونوں کے معاشی اور سماجی رتبے کو بیش و کم کرنے کا باعث بنے۔

ہندوستان میں تاجر کو ایسے انتظامی اور قانونی تحفظات حاصل نہیں تھے جو قرض دار سے رقم کی وصولی کی ضمانت دے سکتے۔ اسے ناگہانی نقصان ' مال کی ضبطی ' معاہدوں کی خلاف ورزی واجب الوصول کی عدم ادائیگی جیسے مسائل کا سامنا تھا۔ اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے تاجر کے پاس واحد حل، اس کی مالی بچت ہی تھا اور یوں اس کی (یعنی ہندو کی) کفایت شعاری ضرب المثل بن گئی۔ اس کے برعکس جاگیردار کے پاس جبراً مالیہ وصول کرنے کا اختیار تھا۔ وہ اس مقصد کے لئے ایسے افراد بھرتی کر سکتا تھا جو کسان سے جبری وصولی کرتے اور عدم ادائیگی کی صورت میں اس کی فصل ضبط کر لیتے تھے۔ جاگیردار کو اپنے ملازمین کی وفاداری کے سوا کسی قسم کا تحفظ درکار نہ تھا' لٰہذا فضول خرچی اس کا (گویا مسلمان کا) شعار ٹھہرا۔

اسی باعث ہندو یا مسلمان ہونے کے علاوہ دونوں فرقوں کے مابین ایک نمایاں فرق یہ بھی تھا کہ ہندوؤں میں ایک مضبوط اور فعال بورژوا طبقہ موجود تھا جب کہ مسلمان ابھی تک محض زراعت اور جاگیروں پر تکیہ کئے ہوئے تھے۔ اس طرح یہ دونوں فرقے تاریخ کے دو مختلف ادوار میں زندہ تھے اور یہ فرق اتنا واضح اور نمایاں تھا کہ اگر ان کے درمیان مذہبی خلیج نہ بھی حائل ہوتی تب بھی شاید اسی بنیاد پر برصغیر تقسیم ہو جاتا۔

یہ فرق قائم رہا اور بالآخر 20ویں صدی کے وسط میں یہی تحریک پاکستان کا سب سے متحرک پہلو بھی ثابت ہوا۔ وادیٔ سندھ کا واضح طور پر جاگیردارانہ اور زرعی رجحان رکھنے والا معاشرہ ہندوستان کے واضح بورژوا رجحان رکھنے والے معاشرے کے غلبے سے گریزاں تھا۔

یہاں 'واضح رجحان' کی محتاط اصطلاح کا استعمال شعوری ہے کیونکہ دونوں جانب اس کے مخالف عناصر بھی غیر اہم نہیں تھے۔ گویا ہندو جاگیرداروں نے بورژوا تحریک کا ساتھ دیا جبکہ وادی سندھ کی مختصر سی نوزائیدہ مسلم بورژوازی نے یہاں کے زمینداروں کی قیادت کی۔ ہندو اور مسلمان جاگیرداروں اور بہت سے کسانوں نے بورژوا مسلم سیاستدانوں اور دانشوروں (مثلاً مولانا آزاد) کی طرح انڈین بورژوازی کے واحد ترجمان موہن داس کرم چند گاندھی کی حمایت کی جب کہ بنگالی بورژوازی اور مسلمان تاجر تحریک پاکستان کے پرجوش حامی تھے۔ بلاشبہ یہ نوخیز اور ابھرتی ہوئی مسلمان بورژوازی ایک نئی ریاست کی صورت میں اپنے لئے ایک محفوظ منڈی بھی چاہتے تھے جہاں انہیں اجارہ داری حاصل ہو۔ اپنی اس کوشش میں وہ کامیاب بھی رہے۔

بنگال جس نے برصغیر کی تاریخ کے فیصلہ کن موڑ پر ایک انتہائی اہم کردار ادا کیا' ہمیں بورژوا اور جاگیردار مفاداتی ٹکراؤ کے اثرات اور اس کے نتیجے میں سندھ واسی کی شناخت Identity کے حوالے

سے بہت سی کلیدی نوعیت کی معلومات فراہم کرتا ہے۔ اگر ہم سندھ واسی (گویا پاکستانی) کی شخصیت اور برصغیر میں ہندو مسلم تفریق کی بنیادی وجوہات تلاش کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں تو بنگال کی تاریخ کے بہت سے واقعات اس موضوع پر روشنی ڈال سکتے ہیں۔ برطانیہ کے ہاتھوں بنگال کی شکست ' یہاں برپا ہونے والی لوٹ مار اور اس کے نظم ونسق کے مخصوص برطانوی انداز میں ہندو مسلم تفریق کا راز پنہاں ہے لہٰذا ہمیں بنگال کی طرف واپس جانا ہوگا۔

25

"سونار بنگلہ"

بنگال کی خصوصی اہمیت وافادیت

ہوسکتا ہے برطانیہ کی ترجیح کسی اور خطے، کسی اور زمین کے لئے ہوتی لیکن یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ یورپ کی تمام بحری طاقتوں کے مقابلے میں اسے سب سے پہلے بنگال میں قدم جمانے کا موقعہ مل گیا۔

ولندیزی، جزائر انڈونیشیا پر قبضہ کر کے وہاں نو آبادی قائم کرنے کی برطانوی کوششوں کو 1623 عیسوی میں موثر طور پر ناکام بنا چکے تھے۔ مشرق بعید میں ناکامی کے بعد برطانیہ نے ہندوستان کی طویل ساحلی پٹی پر نظریں جما دیں۔ 1612ء میں سورت اور 1640ء میں انہوں نے مدراس میں کارخانے لگائے لیکن یہ پیش قدمی اتنے دور رس نتائج کی حامل نہیں تھی جبکہ بنگال میں ایک مختصر سی بستی کا قیام ان کے لئے انتہائی منفعت بخش ثابت ہوا۔

بنگال، برطانیہ کے لئے ہندوستان پر قبضے کی کلید ثابت ہوا اور اس کام کے لئے یہ خطہ نہایت موزوں اور کار آمد تھا اس خطے نے انگریزوں کی پیش قدمی کے لئے تمام دروازے کھول دیئے اور تمام رکاوٹیں ختم کر دیں۔ بنگال مشرق بعید کی منفعت بخش ساحلی تجارت کے راستے میں تھا۔ اس نے برطانیہ کے لئے ایک وسیع کاروباری تاجر طبقہ بھی فراہم کیا اور جہاز رانی کے قابل ایک ایسا دریائی نظام بھی جو کہ جنوبی ہندوستان تک رسائی کے لئے صحیح معنوں میں ایک آبی شاہراہ کہلانے کا مستحق تھا۔

ہم اس حقیقت سے تو پہلے ہی روشناس ہو چکے ہیں کہ سلاطین دہلی اور ان کے پیشرو دور میں ذات پات کا نظام اور دروں بیں گاؤں کا آزار کس طرح انڈین تاجر، گلڈ اور قصبے کی موت کا ہرکارہ ثابت ہوا۔

خود کفیل گاؤں اور ذات پات کے اس نظام سے اس کسان کو بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچا تھا جو جاگیرداروں کے مابین مسلسل جاری جنگوں کے باعث حد سے متجاوز لگان کے بوجھ تلے پس رہا تھا۔ غیر متحرک اور منجمد دیہاتی معاشرے نے ترقی کے امکانات مفقود کر دیئے تھے۔ تجارت میں کوئی منافع نہیں تھا اور نہ ہی اجناس کی ترسیل میں کوئی فائدہ۔

مگر ہندوستان کی دیہی آبادی کے اس زوال اور مایوسی کے دور میں بنگال تو جیسے کسی اور ہی دنیا کا ٹکڑا تھا۔ جنوب مشرقی ایشیا کے ساتھ تجارتی روابط نے اس کے قصبوں کو خوشحالی عطا کی تھی۔ 12ویں اور 13ویں صدی کے بنگال میں ہم عصر یورپ کے ہم پلہ سرمایہ کارانہ معیشت جنم لے چکی تھی اور 15ویں صدی تک پہنچتے پہنچتے بنگال باقی ماندہ ہندوستان سے کہیں آگے نکل چکا تھا۔

بنگال کے وسائل بے بہا تھے' اس کی سرزمین سیلابی مٹی سے زرخیز اور بارش کی بہتات کے باعث پٹ سن اور چاول کی کاشت کے لئے مثالی تھی۔ مرطوب آب و ہوا' بال سے باریک دھاگا کاتنے کے لئے بہت موزوں تھی۔ یہ دھاگا' دنیا کی نفیس ترین' پھول جیسی بے وزن اور مشہور زمانہ ''ڈھاکہ کی ململ'' بنانے کے کام آتا تھا۔ ایسی آب و ہوا ریشم کے کیڑوں کی پرورش اور ریشمی کپڑا بنانے کے لئے بھی موزوں تھی۔ یورپ اور ہندوستان میں آئے دن ہونے والے مسلح تصادم بنگال کے قلمی شورے کی مانگ میں اضافے کا سبب بنے۔ قلمی شورہ' بارود بنانے کے کام آتا تھا اور بنگال میں اس کے بے پناہ ذخائر تھے جو اس کی مستقل آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ بنے۔

بنگالی زمیندار اور دستکار مسلمان تھے۔ زمیندار حکمران اور انگریز کے راستے کا پتھر تھا۔ دستکار محنت کش تھا اور انگریز کی صنعت و پیداوار کا حریف بھی۔ موریا دور سے ہی تجارت ویش یعنی ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی اور بنگال کا ہندو' انگریزی بولنے والے گورے تاجر کا قدرتی حلیف تھا۔ 1690ء میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی ہگلی سے کلکتہ منتقل ہوئی تو اس کے کارکنوں کا ایک معتدبہ حصہ ہندوؤں پر مشتمل تھا۔ مقامی کاروباری تاجروں کی ایک بڑی تعداد بھی ویش تھی جو کمپنی کی تجارت سے بالواسطہ نفع اندوز ہو رہے تھے۔ ویش (ہندو) اور کمپنی (انگریز) کے درمیان یہ منفعت بخش شراکت 19ویں صدی میں بھی ایک عرصے تک جاری رہی۔ ہندو (تاجر اور بورژوازی) اور مسلمان (جاگیردار اور زمیندار) کی یہ تقسیم جو بنگال سے شروع ہوئی بالآخر ہند اور سندھ کو بھی تقسیم کر گئی۔

بنگال میں انگریزوں کو حاصل ہونے والا فائدہ بے پناہ اور مثالی تھا اگرچہ یہ ان کی شعوری کوششوں کا ثمر تھا لیکن بنگالی تاجر (ہندو ویش) نے بھی حالات کی فسوں کاری' اپنی تاجرانہ جبلت' اور زیرک موقعہ پرستی کے امتزاج سے خوب دولت کمائی۔ انگریز کے لئے ویش' کلرک' اکاؤنٹینٹ'

کھاتہ نویس اور سٹور کیپر کی حیثیت سے ناگزیر تھا۔ اس نے ویش کو اس کی پیشہ ورانہ مہارت کے شعبوں میں بیش بہا مواقع فراہم کئے اور جواباً ویش نے اپنے علاقے اور اس کے تجارتی طریقہ کار کے بارے میں راہنمائی فراہم کر کے پہلے تو اپنے صوبے اور پھر پورے برصغیر کو انگریز کے لئے وا کر دیا۔

بنگال کا ایک اور اہم پہلو اس کا محل وقوع بھی تھا۔ سورت اور مدراس کے برعکس بنگال، مغل سلطنت کے دارالخلافے دہلی تک ایک سہل اور براہ راست آبی راستہ فراہم کرتا تھا۔ مدراس انتہائی جنوب میں واقع تھا اور سورت دریائے نربدا اور تاپتی کے دہانوں کے درمیان واقع ہونے کے باوجود کسی خاص افادیت کا حامل نہیں تھا جب کہ بنگال سے دریائے جمنا اپنے معاون دریاؤں کے ساتھ مل کر شمالی ہندوستان کے قلب تک پہنچنے کے لئے ایک بنا بنایا راستہ تھا' دہلی تک لے جانے والی ایک قدرتی آبی شاہراہ۔ لیکن یہ 'بنگال جمنا فوقیت' فرانسیسیوں اور پرتگالیوں کو حاصل نہ ہو سکی کیونکہ وہ ہندوستان کے جنوبی جزیرہ نما کے ساحلی علاقوں پانڈی چری اور کالی کٹ تک محدود رہے۔

جمنا کے کناروں پر ایسے خوشحال تجارتی مراکز آباد تھے جہاں محض زراعت ہی سب سے اہم کاروبار زندگی نہیں تھا۔ ڈھاکہ' مرشد آباد' پٹنہ (جو کبھی موریا سلطنت کا مرکزی شہر تھا) اور پھر آگرہ سے دہلی تک یہ تمام شہر اندرون ملک کے معروف آبی راستے کی بندرگاہیں تھے جہاں صنعتیں' کاروباری مراکز' سرمایہ فراہم کرنے والے ادارے اور دوسری تمام بندرگاہی سہولتیں دستیاب تھیں۔ جمنا کے ساتھ ساتھ وادیٔ سندھ کے سرحدی علاقوں بلکہ وادیٔ سندھ میں بھی تاجروں کی ایک متمول برادری آباد تھی۔

پلاسی کی جنگ کے نتیجے نے بنگال کو ایسٹ انڈیا کمپنی اور کلکتہ کونسل کی جارحانہ بے قراری اور توسیع پسندانہ عزائم کے راستے کا سنگ میل بنا دیا۔ اگرچہ کمپنی نے اس کے بعد بھی کئی اہم فتوحات حاصل کیں لیکن پھر شاذ و نادر ہی کمپنی کو اس کے لئے نئے سرے سے اپنی توانائی صرف کرنا پڑی ہو۔ یوں لگتا ہے جیسے انگریز کے ''اقتصادی سفیر'' 'ویش تاجر' کمپنی کی افواج سے پہلے ہی وہاں فتح کی راہ ہموار کر چکے ہوتے تھے۔ کبھی فوج تاجر کا ہراول دستہ ہوتی تو کبھی تاجر فوج کا۔

پلاسی کے بعد جنوب میں سرنگا پٹم کے مقام پر 1799ء میں ٹیپو سلطان کی شکست اور مغرب میں مرہٹوں کی 1818ء میں حتمی شکست کے بعد کمپنی کی حکومت کو حاصل ہونے والا استحکام ایک فطری اور ناگزیر عمل تھا۔

ایک وسیع تاجر طبقہ اور 'شاہراہ جمنا' بنگال کے دو خصوصی تحفے تھے جن سے برطانیہ کو اپنی فتوحات میں بالواسطہ مدد ملی۔

خوشحال بنگال اور مرکز گریز رجحانات

برطانوی غلبے سے قبل ' بنگال ہمیشہ سے ایک متمول اور خوشحال ریاست چلی آ رہی تھی لیکن دہلی کے حکمرانوں کے لئے یہ ایک دور افتادہ سرحدی ریاست تھی۔ صرف موریا سلطنت اور گپتا کی مگدھ بادشاہت کے دور میں یہ خطہ ہندوستان کے دارالخلافے کے نزدیک تر تھا اور انہی ادوار میں بنگال 'قرب مرکز' کے عیوب و محاسن سے روشناس ہوا۔ ان دنوں یہ خوشحال اور عظیم سلطنتوں کا ایک بنیادی اور اٹوٹ انگ ہوا کرتا تھا لیکن تاریخ کے باقی ادوار میں ٹیکسلا اور دہلی جیسے سیاسی مراکز سے دوری کی بناء پر بنگال بڑی حد تک خود مختار ہی رہا۔ بنگال بے پناہ خوشحال بھی تھا اور مرکز سے دور بھی۔ یہی وجہ تھی کہ مرکز گریز رجحانات بنگال کی سرشت میں دائمی طور پر سرایت کر گئے۔ بنگال کی یہی خصوصیت اس کا امتیاز بن گئی اور یہاں کی مرکز گریز بغاوتیں کچلنے کے لئے کئی بادشاہوں کو اکثر بنفس نفیس یہاں آنا پڑا۔

سلاطین دہلی میں سے التمش (1225ء) بلبن (1280ء) محمد تغلق (1333ء) اور فیروز تغلق (1358ء) جیسے بادشاہوں کو ایسی ہی مہمات کے سلسلے میں بادل ناخواستہ بنگال آنا پڑا۔ شیر شاہ سوری نے تو مرکزی حکومت کے اختیار کو بنگال تک موثر بنانے کے لئے گرینڈ ٹرنک روڈ تعمیر کی۔

بنگال کے مرکز گریز رجحانات اس کی خوشحالی کا بین ثبوت تھے۔ یہاں کے وسائل اتنے ثمر آور تھے کہ وہ اپنے مقامی خود مختار حکمران خانوادوں اور ان کی افواج کی بخوبی کفالت کر سکتے تھے۔ بنگال کی آمدنی ' فوجی مہمات کے لئے اسلحے کی خرید اور مزید فاضل پیداوار اس کی تجارتی ضروریات کے لئے بہت تھی۔

یہی وجہ تھی کہ سلاطین دہلی اور مغل دور کے بہت سے بنگالی صوبیدار دہلی کی بالادستی کا طوق اپنے گلے سے اتار پھینکنے کی سعی کرتے رہے۔ سلطان غیاث الدین بلبن کے صوبیدار سلطان طغرل نے بنگال میں دولت کی فراوانی دیکھتے ہوئے اپنا جاہ و حشم بڑھانے کی کوشش کی اور ہاتھیوں سے لیس فوجی دستوں میں بطور خاص اضافہ کیا لیکن اس کی یہ حرکت نہ صرف اسے بلکہ اس کی ساری فوج کو بہت مہنگی پڑی۔ جرنیلوں کی دو مہمات ناکام ہونے کے بعد بوڑھے بلبن نے اپنی افواج کی کمان خود سنبھالی۔ بغاوت کچلنے کے بعد بد قسمت سلطان طغرل کی جگہ اپنے بیٹے کو بنگال کا صوبیدار بناتے ہوئے بلبن نے خاص طور پر اس امر کا اہتمام کیا کہ باغیوں کو نئے صوبیدار کی موجودگی میں سزا دی جائے تاکہ اسے بغاوت کے عبرت ناک انجام سے آگاہی رہے۔ بعد میں آنے والے بہت سے بادشاہوں اور شہنشاہوں نے یہی طرز عمل اختیار کیا اور اس ضمن میں جہانگیر کے تعلق سے جس واقعے کا حوالہ دیا جا چکا ہے وہ اپنی نوعیت کا انوکھا واقعہ نہیں تھا۔

طغرل کی بغاوت بادشاہ کی ذاتی قیادت میں ناکام بنائی گئی لیکن بنگال کے تین صوبیدار مرکزی حکومت کے خلاف سرکشی میں کامیاب بھی رہے۔ شیر شاہ سوری نے بابر کے بیٹے اور اکبر کے باپ

نصیر الدین ہمایوں کو قنوج کے مقام پر نہ صرف شکست فاش دی بلکہ اسے جان بچانے کے لئے برصغیر چھوڑ کر ایران میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا اور دہلی کے تخت پر شیر شاہ قابض ہوا۔

شیر شاہ ہندوستان کا قابل ترین منتظم بادشاہ ثابت ہوا۔ ہندوستان کے انتہائی جنوب مشرقی علاقے سونار گاؤں کو انتہائی شمال مغرب میں خیبر سے ملانے والی شاہراہ کی تعمیر آج بھی اس کی عظیم صلاحیتوں کو خراج عقیدت پیش کرتی ہے۔ پینے کے پانی کے لئے جابجا کنویں ' مسافر خانے ' سرائیں اور پھلدار و سایہ دار درخت شروع سے آخر تک اس سڑک کی زینت تھے جو میدانوں کے ختم نہ ہونے والے سلسلوں سے گزرتی ہوئی ہمالیہ کی دشوار گزار ڈھلوانوں تک پہنچتی ہے۔ شیر شاہ نے زمین کے لگان کا از سر نو تعین کیا اور کالنجر کی لڑائی میں اپنی بے وقت موت سے پہلے وہ حکومتی نظم و نسق میں بے شمار انتظامی اصلاحات متعارف کرا چکا تھا۔

بنگال کے ذہین و فطین حکمرانوں میں شیر شاہ سوری بلاشبہ ایک نمایاں نام ہے۔ حسین شاہ ' ابراہیم شاہ اور شاہجہان کا بیٹا شجاع بھی دل و دماغ کی خوبیوں سے مالامال بے مثل حکمران تھے لیکن بنگال کے قابل ترین حکمرانوں میں سب سے درخشاں نام یقیناً انگریزوں کے قبضے سے قبل بنگال کے آخری فرمانروا نواب سراج الدولہ کا ہے اور یہی نام انگریز کی نظر میں سب سے مطعون ٹھہرا۔

سراج الدولہ سے غداری

سراج الدولہ ابھی محض 20 سالہ نوجوان تھا جب وہ اپنے زیرک دادا علی وردی خان کی وفات پر 1756ء میں بنگال کا صوبیدار بنا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بنگال کے ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی کے بہت سے مفادات وابستہ ہو چکے تھے۔ ہگلی کی خوشحال بندرگاہ بے حد ترقی کر چکی تھی کیونکہ شہنشاہ اورنگ زیب کے زمانے میں انگریزوں کو دی جانے والی سہولتوں پر دہلی تخت کے وارث کئی بار ہمدردانہ نظر ثانی کر چکے تھے۔

بنگال کے ایک سابق صوبیدار شائستہ خان کی ابتدائی مزاحمت کے باوجود شہنشاہ فرخ سیار نے 1717ء میں کمپنی کو بعض ناقابل فہم مراعات سے نوازا۔ کمپنی کے تجارتی سامان کو چنگی اور دوسرے بہت سے مقامی محصولات سے مستثنیٰ کر دیا گیا اور کمپنی کو کلکتے کے نواح میں 48 گاؤں خریدنے کی اجازت بھی دی گئی۔ مرشد آباد کی ٹکسال کو شاہی فرمان کے ذریعے پابند کیا گیا کہ وہ ایک ہفتے میں تین روز کمپنی کے لئے سکے ڈھالے۔

اپنے مالی مفادات رکھنے والی ایک نوزائیدہ غیر ملکی تجارتی کمپنی کے لئے یہ فیصلہ انتہائی اہم معاشی

اور دور رس سیاسی نتائج کا حامل تھا کیونکہ اس فیصلے سے ایسٹ انڈیا کمپنی بادشاہ کے اس کلی اختیار میں شریک ہو گئی تھی جو اسے ہندوستان کے خود مختار فرمانروا کی حیثیت سے حاصل تھا۔ شائستہ خان کے ساتھ کینہ پروری کا اظہار کرتے ہوئے شہنشاہ فرخ سیار نے بنگال کے صوبیدار کو حکم دیا کہ کمپنی کے تمام قرضدار گرفتار کر کے انہیں کمپنی کے حوالے کر دیا جائے۔ ان مراعات کے حصول اور کمپنی اہلکاروں کے جابرانہ اختیار میں اضافے سے کمپنی کی آمدن کئی گنا بڑھ گئی۔ حیرت انگیز تیز رفتاری سے بڑھنے والی یہ دولت بیک وقت بہت سے شہروں کی کفالت کر سکتی تھی۔ 1757ء تک کلکتہ بھی ایک خوشحال شہری مرکز بن چکا تھا۔

اسی سال کے دوران ایسٹ انڈیا کمپنی کے سیاسی عزائم مزید کھل کر سامنے آنے لگے۔ جیسے جیسے کمپنی کے معاشی مفادات میں اضافہ ہوتا گیا اس کے گورنروں نے کمپنی کے مفادات کے تحفظ کے لئے مزید علاقوں پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ ایک تجارتی کمپنی نے فوجی تعمیرات کا آغاز بھی کر دیا۔ نواب سراج الدولہ کسی صورت بھی ایسے اقدامات کی اجازت دینے کے حق میں نہیں تھا۔ اس نے کمپنی کو تنبیہ کرتے ہوئے یاد دلایا کہ وہ صرف تجارت کر سکتے تھے 'انہیں اپنی فوج رکھنے کا قطعی کوئی اختیار حاصل نہیں۔ لیکن جب انگریزوں نے اس کی تنبیہ پر توجہ نہ دی تو سراج الدولہ نے آگے بڑھ کر کلکتے کو اپنی تحویل میں لے لیا۔

اس وقت شروپشائرShropshire کا ایک تیز طرار انگریز رابرٹ کلائیوRobert Clive ' جنوب میں مدراس اور فورٹ سینٹ ڈیوڈFort St. David کا گورنر تھا۔ برطانوی حکومت کی طرف سے اسے کلکتے کو سراج الدولہ کے قبضے سے چھڑانے کے لئے بھیجا گیا۔ کلائیو سمندر کے راستے بنگال پہنچا۔ 900 یورپی اور 1500 ہندوستانی سپاہی اس کے ساتھ تھے۔

نواب سراج الدولہ کے ایک جرنیل میر جعفر نے غداری کی اور کلائیو کے ساتھ خفیہ گٹھ جوڑ کر لیا اور یہی غداری بالآخر بنگال کی بدنصیبی کا پروانہ بنی۔

میر جعفر کی غداری 1757ء کی جنگ پلاسی میں سراج الدولہ کی شکست کا باعث ہوئی۔ سراج الدولہ نے اس میدان جنگ میں اپنی جان کی بازی بھی ہار دی اور یہ بنگال کی بربادی کا نقطہ آغاز تھا۔

اگلے 13 سال کے دوران بنگال کو اس بیدردی سے لوٹا گیا کہ یہ سرسبز 'زرخیز' دولت اور سونا اگلنے والی سرزمین 1769ء میں اپنی تاریخ کے بدترین قحط سے دوچار ہوئی۔

26

سفاکانہ لوٹ مار

باج گزاری اور ممنونیت کا خراج

پلاسی کی جنگ سے برصغیر کی تاریخ کے ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ فاتحین نے اپنے کاروبار کا آغاز شرمناک لوٹ مار سے کیا اور سپئر Spear کے الفاظ میں یہیں سے بنگال کی "مالیاتی خونریزی" کی ابتدا ہوئی۔

میر جعفر کو غداری کے انعام میں اس یقین دہانی پر بنگال کا کٹھ پتلی نواب مقرر کیا گیا تھا کہ وہ کمپنی کو دو کروڑ روپیہ ادا کرے گا لیکن یہ مطالبہ اتنا غیر حقیقت پسندانہ تھا کہ انتہائی ظالمانہ ہتھکنڈے اختیار کرنے کے باوجود جعفر بنگال کے کسانوں سے اتنی رقم نچوڑنے میں ناکام رہا اور محض ایک جزوی ادائیگی کر سکا۔ کسانوں سے مزید رقم نکلوانہ سکنے کی پاداش میں اسے حکومت سے نکال کر اس کے داماد کو تخت نشین کیا گیا۔

میر قاسم کی تقرری بھی ایک بڑی رقم کی ادائیگی کے وعدے پر ہوئی تھی لیکن اس کا پیش رو اپنے تین سالہ دور جبر میں خزانہ خالی کر چکا تھا۔ قاسم کو اپنا قرض چکانے کے لئے مزید محصولات عائد کرنا پڑے اور وصولی کے لئے مزید جبر اور بے انتہا ظلم کیا گیا۔ محصول جمع کرنے والوں کی تعداد بڑھا دی گئی اور انہیں وسیع تر اختیارات تفویض کئے گئے۔ معمولی سی عدم ادائیگی پر بھاری جرمانے وصول کئے جاتے اور نادہندگان کو گرفتار کر کے ان کا مال واسباب اور جائیداد ضبط کر لی جاتی۔

قاسم نے پہلی قسط کے طور پر دو کروڑ روپے اور کمپنی کے سپاہیوں کی تنخواہ کی مد میں دس لاکھ

روپے ادا کیے۔ جنوبی ہندوستان میں فرانس کے ساتھ کمپنی کی جنگ کے اخراجات بھی قاسم کو ادا کرنے پڑے۔ یہ ادائیگی پانچ لاکھ روپے تھی۔ میر قاسم نے کمپنی کو بنگال کی تین سب سے خوشحال تحصیلوں سے مالیہ اور دوسرے محصولات وصول کرنے کی اجازت بھی دے دی۔

اپنی تمام تر مصلحت کوشی کے باوجود قاسم بھی ایک خاص حد سے نیچے گرنے کو تیار نہیں تھا۔ اسے بھی یہ احساس تھا کہ اب پانی حد سے گزرتا جارہا ہے۔ تاریخ اس کے بارے میں یہ بات ضرور کہے گی کہ اقتدار حاصل کرنے کے بعد قاسم نے کمپنی کے چنگل سے اپنی حکومت چھڑانے کی سعی ضرور کی۔ وہ اپنی فوج تیار کرنے لگا اور اس نے اپنے اہم ٹھکانے مونگر کی قلعہ بندی بھی کرلی۔ پٹنہ کی فیکٹری میں کمپنی کی طرف سے ایک مسلح گیریزن قائم کرنے کی خفیہ کوششوں کی مزاحمت کے ساتھ ساتھ قاسم نے گنگا سے گزرنے والی کمپنی کی کشتیوں کی تلاشی لینے کا حق بھی اپنے لئے محفوظ رکھا۔

ایک بار جب اس کے کارندوں نے کمپنی کی چھ ایسی کشتیوں کو روکا جو ٹیکسٹائل مصنوعات کی آڑ میں اسلحہ لے جارہی تھیں تو شدید ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے کمپنی نے قاسم کی معزولی کا حکم جاری کر دیا اور اسے 1763ء میں بنگال اور بہار سے پرے دھکیل دیا گیا۔ قاسم کو الہ آباد میں پناہ لینا پڑی جہاں اودھ کے شجاع الدولہ کی مدد سے قاسم نے انگریزوں پر حملے کا منصوبہ بنایا۔ دہلی کے تخت نشیں شاہ عالم نے اتحادیوں کو اپنی حمایت کا یقین دلایا لیکن مصلحت سے کام لیتے ہوئے جنگ میں اپنی عملی شرکت سے احتراز کیا۔

اتحادیوں نے 1764ء میں بکسر کے مقام پر انگریزوں سے شکست کھائی جس کی بنیادی وجہ کمپنی کی فوجی برتری سے زیادہ اتحادیوں کا باہمی نفاق تھا۔ لیکن شکست تو بہر حال ہوئی تھی۔ قاسم فرار ہو گیا' بادشاہ جنگ میں شامل ہی نہیں تھا اور شجاع الدولہ نے پانچ لاکھ روپے کی پیشکش کے ساتھ کمپنی سے صلح کی خواہش کا اظہار کیا۔

شہنشاہ کو نوازنے کے لئے کمپنی نے اس کی مراعات میں مزید اضافے کا فیصلہ کیا جس کا بوجھ شجاع الدولہ کو برداشت کرنا پڑا۔ ان مراعات میں شہنشاہ کی الہ آباد میں رہائش گاہ کے تمام اخراجات اور ان برطانوی افسروں کا مشاہرہ شامل تھا جو امور مملکت میں مشورہ دینے کے لئے وہاں تعینات کئے گئے تھے۔

بکسر کی لڑائی کے بعد کمپنی کی سرپرستی میں مراعات حاصل کر کے شہنشاہ کمپنی کے ہاتھوں میں کھلونا بن چکا تھا۔ ادھر قاسم کی ناکام سرکشی کے بعد کمپنی نے میر جعفر کو دوبارہ بنگال کا حکمران بنا دیا لیکن 1765ء میں اس کی موت کے بعد پندرہ سالہ' نجم الدولہ کمپنی کی جانب سے بنگال کا سربراہ مقرر ہوا۔ وہ میر جعفر کا بیٹا تھا۔

ایک نئے حکمران کے آنے سے تمام سابقہ معاہدوں کی تجدید ضروری تھی لیکن اس کے بجائے کمپنی نے مزید مفادات کے حصول کے لئے ایک نیا معاہدہ مسلط کر دیا جس کے تحت کمپنی کو بلا روک ٹوک بنگال میں تمام ریونیو افسران کو بھرتی یا برخاست کرنے کا اختیار حاصل کر لیا۔ برطانوی تاجروں کو غیر مشروط طور پر ہر طرح کے محصولات، چنگی اور فیس سے مبرا کر دیا گیا۔ نواب کو صرف اتنی فوج رکھنے کی اجازت دی گئی جو لگان اور مالیہ کی جبری وصولی کے لئے ناگزیر تھی۔ نواب کی انتظامیہ پر کمپنی کے سپاہیوں کی تنخواہوں کے پانچ لاکھ روپے سالانہ کا مزید بوجھ ڈال دیا گیا لیکن لوٹ یہیں تک محدود نہیں تھی۔ نوعمر نواب کی طرف سے ''اظہار ممنونیت'' کے طور پر کلکتہ کونسل کے اراکین کو خفیہ طور پر 30,30,506 روپے بھی ادا کئے جاتے تھے۔

کمپنی کے افسران کو یہ بلا جواز اور مسلسل ادائیگیاں بنگال کے وسائل پر ایک مستقل بوجھ تھیں۔ میر جعفر نے اپنی غداری اور برطانوی اعانت کے لئے 12,38,575 پونڈ یا 1,23,85,750 روپے بطور نذرانہ انگریز کی خدمت میں پیش کئے۔ صرف کلائیو نے 31,500 پونڈ (3,15,000 روپے) نقد وصول کئے لیکن اس کے علاوہ بھی اس کی خدمات کا نذرانہ بے بہا تھا۔ اسے بہت بڑی جاگیر بھی عطا کی گئی اور اس طرح وہ بنگال کا پہلا یورپی جاگیردار بن گیا۔ قاسم نے انگریز افسران کی خدمت میں 2,00,269 پونڈ (20,02,690 روپے) پیش کئے اور یہ رقم اس کے علاوہ تھی جو اسے نواب مقرر کئے جانے پر کمپنی کو ادا کرنا پڑی۔ میر جعفر جب دوبارہ نواب تعینات ہوا تو اس نے 5,00,165 پونڈ (50,01,650 روپے) کا بھاری نذرانہ ادا کیا۔ نوعمر نجم الدولہ کے نذرانے کا تخمینہ 2,30,356 پونڈ (23,03,560 روپے) ہے۔ کمپنی کی آمدنی جس میں وہ جرمانے اور نذرانے بھی شامل تھے جو اس نے اپنے جابرانہ اور کڑے سامراجی معاہدوں کے تحت حاصل کئے، انہیں شمار کئے بغیر کمپنی کے افسران نے صرف ذاتی حیثیت میں 21,69,665 پونڈ (2,16,96,650 روپے) بٹورے جب کہ بہی کھاتوں کے مطابق ان سات سالوں میں کمپنی کی مجموعی آمدنی 3,27,70,650 پونڈ یا دوسرے لفظوں میں 32,77,06,500 روپے تھی۔ اور یہ آج سے تقریباً دو سو برس پہلے کی بات ہے۔

جیمز مورس James Morris کو بھی مجبوراً اعتراف کرنا پڑا کہ:

''منافع وہ بنیادی مقصد تھا جسے باقی تمام مقاصد پر فوقیت حاصل تھی۔ بہت سے شریفانہ اور کئی درپردہ مقاصد بھی کارفرما رہے ہوں گے اور بہت سے نرم خو سامراجی اہلکاروں نے یقیناً کوئی فائدہ نہیں اٹھایا ہوگا لیکن سلطنت کی سب سے اہم اور بنیادی ترجیح دولت سمیٹنا تھی اور یہ انداز فکر ابتدا سے ہی

> کار فرما تھا۔ جب سے برطانوی مہم جو مصالحہ جات اور نیل کی تلاش میں ہندوستان پہنچے 'ایک شریفانہ قسم کی لوٹ کھسوٹ برطانوی سامراج کا لازمی حصہ رہی۔"

صرف ایک انگریز ہی "شریفانہ قسم کی لوٹ مار" جیسی اصطلاح گھڑ سکتا ہے گویا کسی مقامی حکمران کی جانب سے عوام کا مالی استحصال ایک غیر شریفانہ قسم کی لوٹ مار تھا۔ برطانوی سامراجی استحصال کو محض لوٹ مار اور وہ بھی شریفانہ قسم کی' قرار دینا قطعی جائز نہیں تھا۔

بنگال کے فاتح اور اس کے پہلے گورنر رابرٹ کلائیو نے اپنی 1765ء کی رپورٹ میں لکھا کہ:

> "ایسی بے حکومتی 'افراتفری 'رشوت 'بددیانتی اور استحصال بنگال کے علاوہ کسی دوسرے ملک میں دیکھا 'نہ ہی سنا اور نہ ہی اتنے غیر منصفانہ اور جارحانہ انداز میں اتنی بے پناہ دولت سمیٹنے کے طریقے کہیں اور اپنائے گئے"

آپ اسے خواہ کسی نام سے بھی پکاریں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے بنگال میں لوٹ مار محض انہی جارحانہ 'ظالمانہ اور حریصانہ انداز کار تک محدود نہیں تھی بلکہ دولت کے حصول میں کمپنی کا انداز کہیں زیادہ سفاکانہ تھا۔

مصیبت زدہ جاگیردار 'مزارعین اور دستکار: سب مسلمان

پلاسی کی جنگ اور اس کے نتیجے میں برطانوی بالادستی کے ظالمانہ اثرات کا سامنا محض کسانوں ہی کو نہیں تھا 'بنگال کے دستکاروں کو جس بے دردی سے کچلا گیا اس نے بھی علاقے کی زبوں حالی میں اضافہ کیا۔ یہ ماہر اور مشاق ہنرمند صدیوں سے دنیا کا نفیس ترین کپڑا تیار کر رہے تھے۔ قدرت نے ان جولاہوں کو ایسا ہنر ودیعت کیا تھا اور ان کے ہاتھ میں اس قدر نفاست اور نازکی تھی کہ ان کی بنی ہوئی ململ کی ایک قسم تو مشکل دکھائی دیتی تھی۔ یہ ململ اتنی باریک 'نفیس اور ملائم تھی کہ اس کی داستانیں آج بھی زباں زد خلق عام ہیں۔ کہتے ہیں کہ چالیس گز ململ کا تھان انسانی مٹھی میں سما سکتا تھا اور چھوٹی سی گیند کی شکل دے کر اسے زنانہ انگوٹھی میں سے گزارا جا سکتا تھا'لیکن اس قدر نازکی اور نفاست کے باوجود یہ مضبوط اور پائیدار کپڑا تھا۔ قدیم روم اور ہم عصر یورپ کی اشرافیہ اس ململ کی تلاش میں سرگرداں رہتی تھی۔ یہ دنیا کا سب سے گراں قدر کپڑا تھا۔ اس کے علاوہ بنگال کے دوسرے پارچہ جات بھی انتہائی عمدہ معیار پیش کرتے تھے۔

کپڑے کی بنائی کے اس ہنر کی متعلقہ خاندان اور ذات کی طرف سے ایک ایسے بیش بہا راز کی

طرح حفاظت کی جاتی تھی جو سینہ بہ سینہ اگلی نسلوں کو منتقل ہوتا تھا۔ دنیا کی کوئی دستی کھڈی اس نایاب ہنر کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی حتی کہ فلائنگ شٹل Flying Shuttle اور سپننگ جینی Spinning Jenny جیسی اختراعات بھی اس کے ہم پلہ نہیں تھیں لہٰذا لنکاشائر Lancashire میں جدید ٹیکنالوجی کی شاہکار ' دھاگا بنانے اور کپڑا بننے کی ملوں کو بنگالی ہنر مندی سے مقابلے میں خصوصی تحفظات کی اشد ضرورت تھی۔

بنگال کی دستی کھڈیوں کی صنعت کو تباہ کرنے کے لئے بے رحمانہ پابندیاں لاگو کر دی گئیں اور کمپنی کے سپاہیوں کے ذریعے ان پر وحشیانہ انداز میں عملدر آمد ہوا۔ عمدہ پارچہ بافی پر اذیت ناک سزائیں دی جاتی تھیں۔ مقامی کپڑے کی بہت سی اقسام کی تجارت ممنوع قرار دے دی گئی۔ ایسی مصنوعات کو فوری طور پر ضبط کر کے ضائع کر دیا جاتا تھا۔ مقامی ہنر مندوں کو ان کے دیہی پیداواری مراکز سے بیدخل کر دیا گیا اور ان کی بستیوں کی بستیاں اجاڑ دی گئیں۔ کپڑا بنانے والی ملوں میں پارچہ بافی کو فوری طور پر روک کر انہیں بحق سرکار ضبط کر لیا گیا اور کمپنی انہیں کسی اور کام کے لئے استعمال کرنے لگی۔

بنگال کی صنعتوں کو تباہ کر دیا گیا تھا۔ عمدہ ململ سمیت ہر قسم کے بڑھیا کپڑے کی تیاری پر سخت پابندیاں لاگو ہو چکی تھیں۔ ہندوستان سے انتہائی موٹے ' بھدے اور کھردرے کپڑے کی بر آمد پر بھی بھاری محصولات عائد تھے لیکن اس کے باوجود ٹیکسوں کی جبری وصولی اور پیداوار کی مسلسل ضبطی کا سلسلہ جاری تھا۔ معمولی سی عدم ادائیگی پر زرعی آلات اور مال مویشی ضبط کر لئے جاتے تھے اور یہ ظلم اس حد تک روا رکھا جاتا کہ اگلی فصل کے بیج بھی چھین لئے جاتے لیکن اس کے برعکس لنکاشائر کی مصنوعات کے فروغ کے لئے ہندوستان میں ان کی در آمد پر کوئی محصول ' ٹیکس یا ڈیوٹی عائد نہیں تھی۔ کچھ عرصے بعد تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ بنگالی جولاہوں پر کسی بھی مقامی یونٹ میں کام کرنے پر مکمل پابندی عائد کر دی گئی۔

ہو سکتا ہے یہ محض اتفاق ہو لیکن حقیقت یہی ہے کہ پلاسی کی جنگ میں انگریز کی جیت کے بعد جو لوگ سب سے پہلے مشق ستم کا نشانہ ٹھہرے ' وہ مسلمان ہی تھے اور ان میں جاگیردار اشرافیہ 'کسان اور دستکار سبھی شامل تھے۔ دوسری طرف اس جنگ کے نتائج سے مستفید ہونے والوں میں ان ہندوؤں کو اولیت حاصل تھی جو ویش ذات کے تاجر طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ راج کے اولین ایام میں مسلمان الگ تھلگ اور پیچھے دھکیل دیئے گئے جب کہ ہندو بڑی آسانی سے نئے نظام کا حصہ بن گئے۔ ہندوؤں نے فائدہ اٹھایا اور مسلمان بازی ہار گئے۔

دونوں کے مابین ' وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ معاشی تفاوت بھی بڑھتا گیا لیکن صورت حال ہر

جگہ لازماً ایک جیسی نہیں تھی۔ راج کے تحت ہر زمانے اور برصغیر کے ہر علاقے کے مسلمان گھاٹے میں نہیں رہے۔

جنگ پلاسی کے تقریباً سو سال بعد جب انگریزوں نے پنجاب پر قبضہ کیا تو یہاں کی مسلم اشرافیہ اور مالکانہ حقوق رکھنے والے کاشتکاروں کو فائدہ پہنچا۔ نہروں اور بیراجوں کی تعمیر سے پنجاب میں کپاس کے قابل کاشت رقبے میں بہت اضافہ ہوا جس کا براہ راست فائدہ یہاں کے جاگیردار اور نئی زمینوں کے آبادکاروں کو ہوا جن کی اکثریت مسلمان تھی۔ یہ لوگ انگریزوں کے زبردست حامی و موئد ہو گئے۔ یونینسٹ پارٹی کا حلقہ نیابت انگریزوں کے زیر اثر آگیا تھا اور اس سیاسی جماعت کو آخری وقت تک ان کی سرپرستی حاصل رہی البتہ 1946ء میں موقعے کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے جاگیرداروں نے انگریزوں سے دور ہٹنا مناسب سمجھا۔

لیکن جنگ پلاسی کے بعد کی دہائی میں بنگال کے سینے پر جو زخم لگے وہ کبھی نہ بھر پائے۔ ان دس سالوں کی لوٹ مار کا نتیجہ بنگال کے خوفناک قحط کی صورت میں نکلا جس کے انمٹ داغ برصغیر کے ذہن اور روح پر ہمیشہ کے لئے نقش ہو گئے۔

27

قحط اور آباد کاری

جاگیر دار سے بورژوا کی طرف پیش قدمی

بنگال میں قحط کا آغاز 1769ء میں ہوا اور 1770ء کے دوران بھی جاری رہا۔

اس قحط کی تباہ کاریوں کا احوال بیان کرنا ممکن نہیں۔ کمپنی کی فوجی فتح کے بعد صرف 13 سال میں بنگال کی خوشحالی عوام کی زبوں حالی میں بدل گئی۔ لوگوں کے ہجوم بے مقصد بھٹکتے پھرتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کی آنکھیں اندر دھنسی ہوئی اور بے جان تھیں اور غذا کی کمی سے ان کے پیٹ پھول گئے تھے۔ لوگ اپنی اولاد فروخت کر دینے پر مجبور ہونے لگے اور جب فاقے کرتے ہوئے انہیں موت سامنے نظر آنے لگتی تو وہ اپنے زندہ یا مردہ بھائی بندوں کا گوشت کھانے پر اتر آئے۔

بنگال کا قحط ایک نئے اور مکمل سماجی انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اس کے دو پہلو بہت نمایاں تھے۔

ایک تو قدیم کی جگہ نئے پیداواری روابط وجود میں آئے۔ گزشتہ تین ہزار سالوں کے دوران برصغیر کے پیداواری روابط میں غالباً یہ کلیدی اہمیت کی پہلی اور فیصلہ کن تبدیلی تھی۔ یہ بورژوائی پیداواری روابط کا آغاز تھا۔

لیکن اس معاشرتی انقلاب کا دوسرا پہلو کہیں زیادہ اہم تھا۔ پیداوار کے جاگیرداری رشتوں کی جگہ بورژوائی روابط کا فروغ ہوا تو اس کے ساتھ ایک نئی معاشی تقسیم نے بھی جنم لیا جس نے مروجہ معاشی نظام کو ہندو مسلم تفریق کی حد بندیوں میں بدل کے رکھ دیا۔

اس قحط میں بنگال کی ایک تہائی آبادی اپنی جان کی بازی ہار گئی۔ ظاہر ہے مفلوک الحال کسانوں کی ایک تہائی آبادی بھی اسی المناک انجام سے دوچار ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود کلکتہ کونسل لگان کی وصولی پر بضد رہی۔ اسے منسوخ یا کم کرنے کی تمام اپیلیں مسترد کر دی گئیں۔ کمپنی کے افسران نے لگان کی وصولی کے جابرانہ ہتھکنڈے جاری رکھے۔ عدم ادائیگی کی صورت میں آلات زراعت اور مال مویشی کی ضبطی بھی جاری رہی۔ تباہ کن قحط کے باوجود کمپنی کے اہلکاروں نے 'قریب المرگ کسانوں کی فصلیں' زرعی اجناس کے ذخیرے حتیٰ کہ آئندہ فصل کے بیج پر قبضہ کر لینے کا عمل بھی پوری شدت سے جاری رکھا۔ اس ظلم' جبر اور استحصال کے نتیجے میں جلد ہی پورے بنگال میں افرادی قوت اور پیداواری مداخل کی شدید قلت نے جنم لیا۔ بچے کھچے لوگ اپنی زمینیں چھوڑ کر بھاگ گئے' زرعی اجناس اور غلہ نایاب ہو گیا البتہ کمپنی کے پاس کلکتہ کے نزدیک فورٹ ولیم کے گودام غلے سے بھرے ہوئے تھے اور ان پر کڑا پہرہ تھا۔ اس دوران کمپنی کے اہلکاروں نے بھی زرعی اجناس کی ذخیرہ اندوزی سے خوب ہاتھ رنگے۔

جب قحط کے آثار کم ہونے لگے تو زرعی مزدور کو احساس ہوا کہ تعداد میں کمی کے باعث اس کی مانگ میں اضافہ ہوا ہے۔ چونکہ بہت ہی قلیل مدت میں بنگال کی آبادی ناقابل یقین حد تک کم ہو گئی تھی اس لئے زندگی میں پہلی بار کسان اپنی خدمات کے معاوضے کا تعین خود کر سکتا تھا اور وہ زیادہ بولی دینے والے کے ساتھ معاہدہ کرنے میں آزاد تھا۔ دہقانوں کی اکثریت جاگیرداروں کے چنگل سے آزاد ہو کر دیہات چھوڑ گئی تھی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اب کوئی جاگیردار انہیں دور دراز کے علاقوں سے زبردستی واپس لے جانے کی پوزیشن میں نہیں۔ بین الاضلاعی سطح پر کسانوں کی اجتماعی نقل مکانی کے نتیجے میں زرخیز اراضی کے وسیع و عریض رقبے ویران اور بنجر پڑے تھے۔ پہلی بار بنگال کی قابل کاشت اراضی' کاشت کرنے والے ہاتھوں سے زیادہ تھی۔ لگان وصول کرنے والے اہلکاروں کے دباؤ کے تحت جاگیردار دیوانہ وار کسانوں کی تلاش میں تھے اور انہیں پرکشش مراعات کی ترغیب دے رہے تھے۔ کمیاب افرادی قوت کو بہتر معاوضہ ملنے کا آغاز ہو چکا تھا۔ کسان اور جاگیردار کے تعلق کار میں ایک بنیادی تبدیلی آ رہی تھی۔

دہقان کو سوداکاری میں اپنی بالادستی کا احساس ہو چکا تھا اور وہ اپنی نو دریافت آزادی کو گنوانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ اس کی مانگ تو ہر جگہ تھی اور کسی ایک قطعہ اراضی سے مستقل مدھے رہنا اس کے مفاد میں نہیں تھا۔ حال ہی میں حاصل ہونے والی اس آزادی سے اس کے رویئے میں بھی تبدیلی آئی۔ اپنے معاوضے کے لئے اب وہ مہینوں انتظار نہیں کر سکتا تھا کہ فصل تیار ہو اور اسے حصہ ملے۔ وہ نقد معاوضہ چاہتا تھا اس لئے اس نے باقاعدہ تنخواہ کا مطالبہ کر دیا۔ یہ تنخواہ داری مدھن کا آغاز تھا۔ ایک غیر اقامتی

تنخواہ دار زرعی مزدور طبقہ وجود میں آ چکا تھا۔ اب ایسے آقا کی ضرورت تھی جس کے پاس سرمایہ کاری کے لئے نقد رقم موجود ہو۔ قحط کے بعد 1771ء میں زراعت کے لئے سرمایہ اور پیداواری مداخل ناگزیر تھے اور دونوں ہی مسلمان جاگیر دار اور جز وقتی زمیندار کی پہنچ سے باہر تھے۔

اس مرحلے پر کلکتے کے سود خور سرمایہ کار سرگرم عمل ہوئے۔ صرف انہی کے پاس سرمایہ کاری کے وسائل موجود تھے۔ قحط کے باعث فصل کی اچھی قیمت سرمایہ کاری کے لئے موثر ترغیب تھی۔ ہندو تاجر انگریز کا فطری کاروباری اتحادی ہونے کے باعث خوب دولت کما چکا تھا۔ اب اس نے مسلمانوں کی زمینیں اونے پونے داموں خریدنا شروع کر دیں۔ 'تنخواہ داری بندھن' The Wage Nexus کے ساتھ ہی غیر حاضر زمینداری کے دور کا آغاز بھی ہوا۔ لگان وصول کرنے کا اختیار' زمیندار یا جاگیردار سے بورژوازی' اور مسلمان سے ہندو کو منتقل ہو گیا۔

اس نئے معاشی بندھن سے نہ صرف سیاست نئے طبقاتی خطوط پر استوار ہوئی بلکہ پہلے سے موجود فرقہ وارانہ تفریق کے درمیان اب معاشی خلیج بھی حائل ہو گئی اور یہ تفریق ہی درحقیقت باہم متصادم معاشی مفادات کے ٹکراؤ کا باعث ثابت ہوئی۔

کلائیو' ہیسٹنگز اور مکافات عمل

''تنخواہ داری بندھن'' ایک نیا پیداواری رشتہ تھا۔ یہ جبری محکومی یا ایک ہی قطعہ اراضی سے بندھے رہنے کی مجبوریوں سے ماوراتھا۔ یہ رشتہ کسان کی زندگی میں ایسی تبدیلیوں کا مظہر بن گیا جس نے لاکھوں انسانوں کو نہ صرف ایک حیران کن آزادی اور ایک نو دریافت اعتماد اور حوصلہ دیا بلکہ وہ پہلی بار اپنے حقوق سے روشناس بھی ہوئے۔ زرعی پرولتاریہ نے اپنی مشقت کی اہمیت اور قیمت جان لی تھی۔ اب کھیت مزدور اپنی شرائط منوانے پر اصرار کر سکتے تھے اور یہ صرف ابتدا تھی۔ حکمرانوں نے محسوس کر لیا تھا کہ کسان اس راستے پر بہت آگے تک جا سکتے ہیں۔ اس خطرے کا بروقت تدارک ضروری تھا۔ بنگال کے نئے حکمران اس صورت حال سے پوری طرح آگاہ تھے کہ پرولتاریت اور کسان کی آزادی کے اس بڑھتے ہوئے رجحان کی بیخ کنی ضروری ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مستقل آباد کاری کے ذریعے یہ مقصد حاصل کر لیا گیا۔

بنگال کے قحط کا ایک معاشرتی پہلو اور بھی تھا۔

ایک طرف تو کلکتہ کونسل کو احساس ہو گیا کہ اندھا دھند اور لامحدود لوٹ مار کے نتائج بالآخر نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔ دوسری طرف نیا زمیندار طبقہ جو انگریز کا اتحادی بھی تھا، لگان کی زیادہ

شرح اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے 'نابوب' (یعنی "انگریز نوابوں") کی منظم رشوت ستانی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے لگا تھا۔

اگر محض کسان اور جاگیردار ہی کمپنی کے اہلکاروں کی بدعنوانیوں کا نشانہ بنے ہوتے تو قحط کے خوفناک اثرات اور کلکتہ کونسل کے ظالمانہ اقدامات کے باعث اس کی شدت میں اضافہ شاید کبھی برطانیہ کی توجہ حاصل نہ کرپاتا لیکن اب ہندوستان میں برطانیہ کا ثانوی "شراکت دار" یعنی انڈین بورژوازی بھی ان بدعنوانیوں کے مہلک اثرات کی زد میں تھا۔ یہ نیا اتحادی انگریز کے سابقہ اتحادی یعنی جاگیردار کے مقابلے میں زیادہ بارسوخ تھا۔ جاگیردار کے برعکس انڈین بورژوازی کی آواز سمندر پار لندن میں ویسٹ منسٹر کے ایوان اقتدار تک پہنچ رہی تھی۔

رابرٹ کلائیو Robert Clive 1755ء میں فورٹ سینٹ ڈیوڈ کا گورنر مقرر کیا گیا لیکن اس کی شہرت کا آغاز اس وقت ہوا جب وہ 1756ء میں، سراج الدولہ سے فورٹ ولیم واپس لینے کے لئے کلکتہ آیا اور جنگ پلاسی کے نتائج نے اسے شہرت کے بام عروج تک پہنچادیا۔ اب اس کا نام ہندوستان اور انگلستان کے گھر گھر میں جانا جاتا تھا۔ 1756ء سے 1767ء کے دوران کلائیو دو بار کمپنی کا گورنر رہا۔ وہ خالی ہاتھ ہندوستان آیا تھا اور لکھ پتی بن کے لوٹا۔ اس کے دوسرے عرصہ تقرر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو حکومت سے درخواست کرنا پڑی کہ اسے (کمپنی کو) دیوالیہ ہونے سے بچایا جائے۔ اس حوالے سے برطانوی دارالعوام میں کلائیو کا رویہ بھی زیر بحث آیا اور مسلسل ایک رات اسے خود پر ہونے والی کڑی تنقید اور جرح کا جواب دینا پڑا۔ وہ عوامی نمائندوں کے رویے پر شاکی تھا کہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کیا گیا ہے جیسے وہ گورنر نہیں کوئی رسہ گیر ہو۔ اس نے بیان دیا کہ "میں حیران ہوں کہ اتنے تحمل سے میں نے یہ سب الزامات کیسے برداشت کر لئے؟"

وارن ہیسٹنگز Warren Hastings 1772ء اور 1785ء کے درمیان پہلے کمپنی کا گورنر اور پھر گورنر جنرل رہا۔ اس نے اپنے مطلق العنان انداز حکومت، لامحدود حرص، معاہدہ شکنی کی عادت' ہندوستانی تحصیلوں کو فروخت کرنے اور برطانوی فوجیوں کے ساتھ اپنے نجی ملازموں جیسا سلوک کرنے اور انہیں کرائے پر مختلف ہندوستانی ریاستوں کے حوالے کرنے کے علاوہ بیگمات اودھ کی غیر ضروری اور جان بوجھ کر تذلیل کے حوالے سے خوب "شہرت" کمائی۔

لیکن یہ معاملات برطانوی پارلیمان کی تشویش کی بنیاد اس لئے نہیں بنے تھے کہ ان کے نتیجے میں بنگال' قحط اور بدحالی کا شکار ہوا بلکہ یہ فکرمندی تو چار لاکھ پونڈ کی اس وعدہ خلافی کی وجہ سے تھی جسے کمپنی نے بطور ٹیکس 1767ء میں برطانوی حکومت کو ادا کرنے کا وعدہ کیا تھا اور اب اسے پورا کرنے

سے معذوری ظاہر کی جا رہی تھی۔ برطانوی پارلیمان کا ہر رکن جانتا تھا کہ ذاتی طور پر کمپنی کے ملازمین کی اکثریت ہندوستان سے واپسی پر بے حساب دولت سمیٹ کر لاتی ہے۔ اس کا مطلب صاف عیاں تھا کہ بنگال کے معاملات میں کہیں بہت بڑی گڑبڑ ضرور تھی۔

گورنر رابرٹ کلائیو کی بیباکانہ رشوت خوری اور گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز کے ناقابل وضاحت آمرانہ اقدامات برطانوی پارلیمنٹ میں بحث کا مستقل موضوع بن چکے تھے جہاں ایڈمنڈ برک Edmund Burke اپنی فطری برجستگی کے ذریعے کمپنی اور اس کے گورنروں کو ایسی کڑی اور جرات مندانہ تنقید کا نشانہ بنا رہا تھا جو برطانوی اشرافیہ میں بنگال کی لوٹ مار سے حاصل ہونے والی آسودگی کی وجہ سے شاذ ہی نظر آتی تھی۔

اگرچہ کلائیو اور ہیسٹنگز دونوں بری کر دیئے گئے لیکن دونوں سابق ہیرو اپنے وطن میں اس قدر بھرپور تذلیل کا نشانہ بنے کہ کلائیو نے تو دلبرداشتہ ہو کر خودکشی کر لی اور ہیسٹنگز 1818ء میں دوسری شادی کرنے کے بعد اپنی موت تک گمنامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوا۔

ان احتسابی کارروائیوں سے یہ نتیجہ اخذ کرنا خوش فہمی کہلائے گا کہ برطانیہ اپنے سپوتوں کے ظلم اور چیرہ دستیوں پر نادم تھا۔ انگریزوں کی اکثریت سامراجی لوٹ مار کے ذریعے حاصل ہونے والے مفادات پر شاداں و فرحاں تھی۔ 1782ء میں برطانوی وزیراعظم ولیم پٹ William Pitt نے دارالعوام میں تقریر کرتے ہوئے کم و بیش ایسے ہی تاثرات کا اظہار کیا تھا۔ اس نے نام لئے بغیر ایڈمنڈ برک کو شدید تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کہا کہ "غیر ملکی (انڈین) شہزادے یہاں ووٹ تو نہیں ڈالتے لیکن وہ پارلیمان کی نشست خرید لیتے ہیں اور اپنے ایجنٹ یہاں بھیج دیتے ہیں جو بظاہر برطانوی قوم کے نمائندوں کی حیثیت سے پارلیمان میں ہمارے ساتھ بیٹھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس بارے میں کسی کو بھی شبہ نہیں ہو گا کہ میرا اشارہ کس کی جانب ہے۔ یہ لوگ مشرق کے راجہ ٹیگور اور نواب آف آرکوٹ جیسے حقیر آمروں کے ایجنٹ کی حیثیت سے ہمارے درمیان موجود ہیں۔"

ایڈمنڈ برک کی شعلہ بیانی کو ایک راجا اور ایک نواب کے کھاتے میں ڈال دینا یقیناً نامناسب حرکت تھی۔ برک ہندوستان کے جاگیرداروں کا ترجمان نہیں تھا۔ اس کی جذباتی تقریریں تو ہندوستان کے بورژوا کی حالت زار کی آئینہ دار تھیں۔ یہ طبقہ برطانوی پارلیمان پر مسلسل دباؤ برقرار رکھے ہوئے تھا۔ وہاں اس کے حمایتی موجود تھے۔ اس طبقے کا موقف تھا کہ بے لگام اور بے قاعدہ لوٹ مار ہندوستان میں برطانوی بالادستی کے لئے خطرہ ثابت ہو سکتی ہے۔ پھر یہ بلاامتیاز لوٹ کھسوٹ راج کی آمدنی میں کمی کے ساتھ ساتھ نئے ملکیتی زمیندار اتحادیوں میں برطانیہ کے خلاف نفرت کا جواز بھی

فراہم کر سکتی ہے۔

برطانوی اشرافیہ اس عالمگیر سچائی سے تو بہر حال آشنا تھی کہ سونے کا انڈہ دینے والی مرغی کو ذبح نہیں کیا جاتا۔ سامراجی مقاصد کی بار آوری کے لئے مرغی کا صحت مند اور زندہ رہنا ضروری ہے لہذا ایسٹ انڈیا کمپنی کے انتظامی اور مالیاتی امور میں ربط و جواز اور معقولیت لانے کے لئے کارنوالیس Com-wallis کو ہندوستان روانہ کیا گیا۔

مستقل آبادکاری' دہقان اور نو ملکیتی زمیندار

بنگال کے قحط نے سونے کا انڈہ دینے والی مرغی کو ذبح کر دینے میں بس ذرا سی کسر ہی چھوڑی تھی۔ لوٹ مار کی انتہا نے آمدنی کے سوتے خشک کر ڈالے تھے لہذا 'لوٹ مشین' کی از سر نو مرمت اور ترتیب نو ضروری تھی۔

جیمز مورس کے مطابق انڈین انتظامیہ کا اصل کام لگان کا تعین تھا جو آمدنی کا سب سے بڑا اور اہم ذریعہ تھا اور لارڈ کارنوالس کو اس کارگراں بار کا اختیار دیا گیا تھا۔ وہ خود بھی جاگیردار تھا اور اس کا شمار وزیر اعظم پٹ Pitt کے قریبی دوستوں میں ہوتا تھا۔

کارنوالس نے 1793ء میں آبادکاری کی نئی حکمت عملی کا اجراء کیا جس کے تحت لگان کی شرح اور اراضی کی ملکیتی شرائط کا تعین ہوا۔ اسی حکمت عملی کو تھوڑے عرصے بعد مستقل بنیادوں پر لاگو کر دیا گیا اور "مستقل آبادکاری کی حکمت عملی" Permanent Settlement ہی اس کا نام قرار پایا جس کے مطابق ملکیتی زمیندار جب تک مقررہ لگان ادا کرتا رہے اس کی ملکیت محفوظ تھی اور سرکاری لگان سے جتنی اضافی رقم یا جنس وہ کسان سے نکلوا سکتا تھا اس پر زمیندار کا حق تھا۔

اگرچہ اب کسان کو ایک بار پھر جابرانہ وصولیوں اور غیر متوازن یک طرفہ ادائیگیوں کا سامنا تھا لیکن جاگیردار کو حکومت (کمپنی) کی طرف سے مقرر کردہ اور مستقل محصولات ادا کرنے کی سہولت مل گئی تھی۔ یوں جاگیردار لگان کی وصولی کے لئے دراصل کمپنی کا نمائندہ بن گیا تھا۔ اپنے اس کردار کی موثر ادائیگی کے لئے اسے اختیارات بھی تفویض کئے گئے تاکہ وہ جبری وصولی کے ساتھ دیہات میں امن و امان بھی برقرار رکھ سکے۔ گویا اس طرح نیا ملکیتی زمیندار ہندوستان میں راج کا کلیدی دست راست بن گیا۔ اس طرح افسر شاہی کی مدد سے اس نے سب سے نچلی سطح پر برطانوی حکومت کے دو بڑے اور بنیادی مسائل یعنی لگان کی وصولی اور امن وامان کے قیام کی ذمہ داری سنبھال لی۔

برصغیر کی افسر شاہی جو' راج کی سوچ اور محض محصولات کی وصولی کو مدنظر رکھتی ہے، آج بھی

کارنوالس کی ان اصلاحات کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ یہ لوگ اسے ایک نابغہ، سرکاری واجبات کی وصولی کا ماہر اور غیر معمولی خصوصیات کا حامل منتظم قرار دیتے ہیں حالانکہ اس نے تو صرف اتنا کارنامہ انجام دیا تھا کہ کلائیو اور ہیسٹنگز کی لوٹ مار کو منظم، باقاعدہ اور فعال بنا دیا۔ وہ اس ''لوٹ مشین'' کو تیل دے کر رواں کرنے اور اسے ترتیب نو دینے آیا تھا جو کند ہتھیار سے اوچھے زخم لگا رہی تھی۔ کارنوالس کمپنی کی آمدنی کو 28 لاکھ 18 ہزار پونڈ سے بڑھا کر 34 لاکھ پونڈ تک لے گیا۔

کارنوالس کی 'مستقل آباد کاری' کی پالیسی کا مقصد بظاہر زمیندار کو لگان وصول کرنے والے اہلکاروں کی تلون طبع اور مطلق العنانیت سے محفوظ رکھنا تھا۔ پورے صوبے میں زمین کا تخمینہ لگانے کے بعد جاگیردار پر لگان کی شرح عائد کی جاتی تھی جو پہلے دس سال کے لئے تھی لیکن بعد میں اسی کو مستقل کر دیا گیا۔ جب تک ملکیتی زمیندار یہ رقم ادا کرتا رہتا وہ بے دخلی سے محفوظ رہتا تھا۔ کمپنی کی حکومت کو اس سے کوئی سروکار نہیں تھا کہ مالکان اراضی خود اس رقم سے کتنا زیادہ اور کیسے وصول کرتے ہیں۔ کمپنی اور ملکیتی حقوق رکھنے والے نئے ہندو زمیندار کے مابین ایک نیا تعلق کار وجود میں آ چکا تھا اور یہ شراکت مشترکہ مفادات کے حصول کے لئے تھی۔ اس سوداکاری میں صرف کسان خسارے میں تھا اور اس کا پرسان حال کوئی نہیں تھا۔

بنگالی آبادی کی اکثریت کے لئے آباد کاری کی نئی حکمت عملی بربادی کا ایک نیا پیغام تھی۔ قحط کے بعد ایک مختصر سی مدت کے لئے کسان کو اس وقت کچھ اہمیت حاصل ہوئی تھی جب کمیابی کے باعث اس کی مانگ میں اضافہ ہوا تھا اور اسے انتہائی پرکشش مراعات کی پیشکش ہونے لگی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ قحط سے پہلے بھی دہقان سے جبری وصولیاں کی جاتی تھیں لیکن اس دور میں نہ تو جاگیردار کا رویہ اتنا جارحانہ تھا اور نہ ہی اسے اتنے وسیع اختیارات حاصل تھے۔ نئی 'اصلاحات' نے دہقان کو ایک بار پھر غیر محفوظ اور غیر یقینی صورت حال سے دوچار کر دیا تھا۔ جاگیردار کو تو لگان وصول کرنے والے سرکاری اہلکاروں سے نجات مل چکی تھی لیکن مزارعین کو اب بھی اتنے ہی بے اصول اور جابر غیر حاضر زمیندار کی من مانیوں کا سامنا تھا۔

صدیوں پرانے رسم و رواج کے باعث سابقہ جاگیردار کم از کم شادی، غم، پیدائش و موت اور ایسے ہی دوسرے مواقع پر اپنے مزارعین کی مالی اعانت کرتا تھا۔ اس کے علاوہ بیماری کی صورت میں بھی گزر اوقات کے لئے وہ ان کی بری بھلی مدد کر دیتا تھا۔ صدیوں پرانی روایات نے جاگیردار کے کندھوں پر' اپنے غلاموں کی بقا کی خاطر' ان کے ساتھ پدرانہ رویہ اپنائے رکھنے کی ذمہ داری عائد کر رکھی تھی جس کے باعث نامساعد حالات میں وہ بعض اوقات لگان کے بوجھ سے چھٹکارے کے لئے

جاگیردار سے درخواست کر لیتا تھا لیکن ''نو ملکیتی غیر حاضر زمیندار'' یا کمپنی کی حکومت سے ان رعائتوں کی توقع عبث تھی۔ کلکتہ میں مقیم زمینوں کے نئے مہاجن مالکان قدیم رسوم و رواج اور صدیوں پرانی روایات کی پابندیوں سے آزاد تھے اور کمپنی کے ڈائریکٹروں کو صرف منافع سے غرض تھی جو گزرتے ہوئے ہر لمحے کے ساتھ زیادہ سے زیادہ لوٹ کھسوٹ کی ادھیڑبن میں لگے رہتے تھے۔ اس رجحان نے باقیماندہ ایسے جاگیرداروں کو بھی چلتا کیا جو قدیم رواج اور نئے مطالبات کے درمیان گھر گئے تھے۔ زمینوں کی فروخت کا ایک نیا مرحلہ شروع ہوا اور کلکتہ کے ساہوکاروں نے کم و بیش بقیہ تمام اراضی بھی خرید لی۔

کلکتے کے ساہوکار کو صرف فاضل پیداوار سے سروکار تھا اور 'فاضل پیداوار' کے بارے میں اس کا تصور سابق جاگیرداری دور میں غصب کی جانے والی مقدار سے کہیں زیادہ تھا۔ اپنے اختیار کے باوجود ماضی کا جاگیردار کسانوں کا خون نچوڑنے میں ایک خاص حد سے تجاوز نہیں کرتا تھا لیکن کلکتے کے مہاجنوں نے تو زمینیں صرف اس لئے خریدی تھیں تاکہ جلد از جلد زیادہ سے زیادہ منافع کمایا جاسکے۔ وہ اپنے مزارعین کو بے دردی سے نچوڑنے لگے۔ فاضل زرعی پیداوار نے کلکتہ والوں کی توندیں بڑی کر دی اور ان میں کمپنی کے اہلکار اور نوملکیتی غیر حاضر زمینداروں کی نئی قسم یعنی کلکتہ کے مہاجن دونوں شامل تھے۔

منافع کی حریص برطانوی انتظامیہ، عوام کی حالت زار سے لاتعلق تھی۔ یہ ایک بے رحم کاروباری گروہ تھا جس نے زیادہ سے زیادہ فائدے کی ہوس میں لگان کی شرح انتہائی بلند اور زرعی اجناس کی قیمتیں قابل رحم حد تک کم رکھیں۔ لگان کی شرح زیادہ رکھنے کا مقصد کسانوں کو زیادہ پیداوار حاصل کرنے پر مجبور کرنا تھا اور زرعی اجناس کی سرکاری قیمت اس لئے کم رکھی جاتی تھی تاکہ کمپنی کے اہلکار ذخیرہ اندوزی کے ذریعے 'بلیک مارکیٹ' میں زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کر سکیں۔

یہ سارا کھیل کسان کی ''فاضل پیداوار'' کا مرہون منت تھا جس کے نتیجے میں اس کی وہ چند روزہ آزادی بھی جاتی رہی جو اسے ایک تباہ کن قحط کے بعد حاصل ہوئی تھی۔ کاشتکار کی حیثیت ایک بار پھر اس مزارعے جیسی ہو گئی جسے جب چاہے زمین سے بے دخل کیا جاسکتا تھا۔ وہ ایک بار پھر شہریت کی اسی سب سے نچلی سطح پر پہنچ گیا جہاں اس کا مقام ایک ایسے خانہ زاد غلام کا تھا جسے زمیندار کے جابرانہ اختیار اور ظالمانہ برتاؤ کے آہنی شکنجے میں کس دیا گیا تھا۔

یہ صورت حال بنگال کے اجتماعی کردار میں ایک تبدیلی کا پیش خیمہ تھی۔ 25 سال کا وہ مختصر عرصہ جس نے اسے ایک اچھوتی آزادی سے روشناس کرایا تھا، اتنی آسانی سے تو نہیں بھلایا جاسکتا تھا اور

نہ ہی کسان ان مراعات سے آسانی کے ساتھ دست کش ہونے پر تیار تھا۔

بنگالی کسان کے خلاف غیر حاضر ہندو زمیندار کا رویہ انتہائی جارحانہ تھا جس کی ایک وجہ تو یقیناً یہی ہو سکتی ہے کہ برسہا برس مسلمان جاگیردار کے تحت کام کرنے کے باعث اس نے اپنے سابقہ آقا کا مذہب قبول کر لیا تھا لیکن کسان اور نو ملکیتی ہندو زمیندار کے مابین' حال ہی میں رائج ہونے والے معاشی روابط بھی اس مخاصمت کی ایک اہم اور بنیادی وجہ ثابت ہوئے۔ انہی حالات کے باعث ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے مقابلے میں بنگالی کسانوں نے سب سے زیادہ علم بغاوت بلند کیا اور بنگال میں مسلسل وقفوں کے ساتھ عوامی ابھار جنم لیتے رہے۔

دور افتادہ بنگال میں ان تبدیلیوں نے وادی سندھ کی ایک سو برس بعد کی سیاست پر کیونکر اثر ڈالا؟ اس سوال کا جواب دراصل وقت نے ہی دیا۔ اسی لئے ان واقعات کا ذکر ضروری تھا کیونکہ بنگال کے سابقہ مسلمان جاگیرداروں کے وسیع پیمانے پر زمینیں فروخت کرنے کے نتیجے میں ہندو بورژوا طبقہ برصغیر میں وقت سے کہیں پہلے وجود میں آگیا۔ اس طرح دنیا بھر میں انگریز کی اور بہت سی نوآبادیوں کے برعکس یہاں ترقی پذیر بورژوازی اور پسماندہ زمینداروں کے درمیان تفریق بھی مذہبی بنیادوں پر ہی قائم ہو گئی۔

برطانوی راج کے ابتدائی زمانے میں ہندو بورژوازی کا برطانوی نظام حکومت سے الحاق کمپنی کا اہم اثاثہ ثابت ہوا۔ اس شراکت میں دونوں کے لئے فائدہ ہی فائدہ تھا۔ اس صورت حال سے بنگال کے سماجی اور معاشی خدوخال میں بہت سی بنیادی اور حقیقی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ انگریز کی بے رحمانہ حکمت عملی نے بڑی بے دردی سے بنگال کے معاشی ڈھانچے کو یکسر تبدیل کر دیا تھا۔

یہ تبدیلی ہندو مسلم تفریق کو مسلسل بڑھاتی چلی گئی اور یہی سماجی اور معاشی تفریق ایک روز ہندوستان کے باقی ماندہ علاقوں اور وادی سندھ کو اپنی گرفت میں لینے والی تھی۔

خرچیلے اور کفایت شعار

کئی اور حوالوں سے بھی کمپنی کی فتح نے بنگالی مسلمانوں پر ناروا اثرات مرتب کئے جس سے موقع پرست ہندو ساہوکار نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

ہندوستان کا نظام عدل صدیوں سے مقامی پنچایت، گلڈ کے جرگوں اور حکومتی عدالتوں پر مشتمل تھا۔ اسلام کی آمد کے بعد اسلامی ضابطے عدالتی کارروائیوں کی بنیاد بنے۔ امن و امان سے متعلق سنگین جرائم اور گلڈ کے باہمی اختلافات کا تصفیہ اسلامی عدالتوں میں ہوتا تھا۔ ایسے مقدمات مقامی قاضی،

علاقائی صوبیدار اور بسا اوقات شہنشاہ کی عدالت تک پہنچتے تھے۔ مقدمات کا فیصلہ ان عدالتوں کے صوابدیدی اختیارات پر ہوتا تھا اگرچہ اصولاً ان پر اسلامی شریعت کی پابندی لازمی ہوتی تھی۔ اسلام میں وکالت کی روایت نہیں تھی اور نہ ہی وکیل کے ذریعے مقدمہ دائر کرنے کا طریق کار' اسلامی اور جاگیرداری نظام عدل میں مروج تھا لیکن اس کے باوجود عرضداشت لکھنے والے منشیوں، مشیروں اور شریعت کی زبان اور مزاج کا ادراک رکھنے والے ماہرین کا ایک وسیع طبقہ وجود میں آچکا تھا۔

جب انگریزوں نے قوانین کو ازسر نو مرتب کرنے کا آغاز کیا تو ان عدالتوں کی حیثیت معدوم ہوتی چلی گئی۔ اسلامی قوانین کے بجائے برطانیہ کا عدالتی نظام رائج ہونے لگا۔ اب مقدمات دیوانی، فوجداری اور مال گزاری عدالتوں کے نظام کے تحت نبٹائے جانے لگے اور لاتعداد مسلمان عرضی نویس، منشی اور شریعت کے ماہرین بے روزگار ہوگئے۔

19ویں صدی کے وسط تک مغربی تعلیم اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت ہونے والے مقابلے کے امتحان کے ذریعے ملازمتوں کے حصول میں ہندو مسلمانوں سے بہت آگے نکل گئے۔ اس رجحان نے ہندوؤں میں بورژوا طبقے کے فروغ میں بہت مدد دی جبکہ اس نظام سے شاکی مسلمان پسماندہ اور قدامت پسند جاگیرداروں کے نرغے میں پھنسے رہے۔ ہندوستان کی قومی تحریک بھی پہلے بورژوا اکثریت کے علاقوں اور متوسط بورژوا طبقے سے شروع ہوئی۔

19ویں صدی کے اواخر میں ہندو بورژوازی طبقہ پوری طرح نمو پا چکا تھا اور اب انگریز کے ساتھ اپنے اشتراک کی زنجیریں توڑنے کا خواہاں اور انگریز تاجر، صنعتکار اور حکمران کی جگہ لینے کے لئے جدوجہد پر آمادہ تھا۔ مسلمان ابھی تک بہت پیچھے تھے اور اس جدوجہد میں ابھی شامل ہونے کے لئے تیار نہ تھے۔ اس طرح مذہبی تفریق کے ساتھ دو مختلف طبقوں کے دو مختلف معاشرتی نظاموں کی تفریق بھی شامل ہوگئی۔ اگرچہ وقت گزرنے کے ساتھ مذہبی اختلافات زیادہ نمایاں ہوکر سامنے آئے لیکن اوائل میں بنیادی وجہ نزاع' مذہبی تعصب میں کم اور معاشی و معاشرتی تفاوت میں زیادہ تھی۔

سماجی رویے اور ثقافت کا ایک اور فرق بھی بہت نمایاں تھا۔ مسلمانوں کا مذہب اور ان کا ثقافتی اظہار ذخیرہ اندوزی کے خلاف تھا۔ ان کا عمومی رجحان نمود و نمائش، اسراف اور بے جا اصراف کی طرف بہت زیادہ تھا۔ مسلمان عورتیں پاؤں میں بھی سونے کے زیور پہنتی تھیں جبکہ ہندو عورتیں اس سے اجتناب کرتی تھیں۔ مسلمان امراء سونے اور چاندی کے برتن استعمال کرتے تھے اور اشیائے خورد ونوش کو سونے چاندی کے ورق سے سجاتے تھے اور قیمتی دھاتوں کی اچھی خاصی مقدار واقعی کھا جاتے تھے۔ اس کے برعکس ہندو عقیدہ اور ان کا سماجی تشخص خورد و نوش کے لئے استعمال ہونے والے

برتنوں کی تعداد کم از کم رکھنے کا قائل تھا۔ سارا کنبہ ایک ہی تھالی سے کھالیتا' تاکہ نہ صرف انہیں رسوم کے حوالے سے بلکہ معمول کے مطابق بھی صاف ستھرا رکھا جا سکے۔ مسلمانوں کے ہاں برتنوں کا حجم بھی عام طور پر زیادہ ہوتا تھا کیونکہ مہمانداری ان کا ثقافتی ورثہ اور ایک اہم سماجی فریضہ تھا اور ہر فرد کے لئے برتن علیحدہ علیحدہ ہوتے تھے۔

مختصر لفظوں میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مسلمان اسراف اور ہندو بچت کے دلدادہ تھے۔

28

معاشی تفریق

انگریزی زبان

برطانوی سامراج کے استحکام کی راہ میں زبان ایک بڑی رکاوٹ تھی۔ انگریز کمپنی کے انتظامی امور کی جاآوری میں انگریزی زبان کے استعمال کی حوصلہ افزائی کرتے تھے لیکن مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ مقبول دیسی زبانوں سے انگریزی زبان کی طرف تبدیلی کا عمل بتدریج طے پائے۔

انگریز مقامی آبادی کے جذبات برانگیختہ کرنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتے تھے۔ لیکن جب لارڈ بینٹنک Lord Bentinck، 1828ء میں گورنر جنرل بن کر آیا تو ہندوستان پر انگریز کی گرفت کافی مضبوط ہو چکی تھی اور اس کے اعتماد میں بہت اضافہ ہو چکا تھا۔ بنگال اور بہار کی انگریز حکومتیں مستحکم ہو چکی تھیں۔ 1799ء میں سرنگاپٹم کے بہادر سپوت ٹیپو سلطان کی شکست کے بعد جنوب ان کے قدموں میں تھا، حیدر آباد کا نظام الملک ایک قابل اعتماد اتحادی تھا کیونکہ اس کی غداری کے عوض انگریزوں نے میسور کا کچھ علاقہ اس کے حوالے کر دیا تھا۔ 1818ء میں مرہٹوں کو بھی مکمل طور پر کچل دیا گیا تھا۔ اکثر فرمانروائیاں تعاون کے معاہدوں کے ذریعے انگریز سرکار کی زیر کفالت ریاستوں میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ سامراجی حکومت کے اقامتی نمائندے انگریز فوجیوں کی معقول تعداد کے ساتھ، کم و بیش برصغیر کے ہر ریاستی دارالحکومت میں موجود تھے۔

گورنر جنرل بینٹنک نے 1835ء میں انگریزی کو سرکاری اور ہر قسم کے قانونی کاروبار کی زبان قرار دے دیا۔ اسی سال انگریزی زبان کی تعلیم کا آغاز بھی ہو گیا۔ یوں بدیسی زبان کا علم ذیلی سرکاری ملازمتوں

کے حصول میں بھی ایک فیصلہ کن حیثیت اختیار کر گیا۔ مسلمانوں کو یہ نئی زبان سیکھنے میں تامل تھا۔ اس حقیقت سے قطع نظر کہ وہ قدامت پسند تھے، مسلمانوں کے جاگیرداری نظام میں انگریزی زبان کے استعمال کی ضرورت بہت کم تھی۔ صرف شہری علاقے، بدلتے حالات کے تقاضوں کے ساتھ چلنے کی اہمیت سے آگاہ تھے۔ شہروں میں بسنے والے مقامی لوگ جن میں اکثریت ہندوؤں کی تھی ایک بار پہلے بھی مصلحت کے پیش نظر فارسی زبان کو اپنا چکے تھے اور اب تو کمپنی کے اقتدار کو نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔ اس دوران شہروں میں ایک بورژوازی طبقہ جنم لے چکا تھا اور اس طبقہ میں بھی ہندو بھاری اکثریت میں تھے' جن کی اچھی خاصی تعداد پہلے سے ہی کمپنی کی ملازمت میں تھی لہٰذا انہوں نے انگریزی زبان کو اپنانے میں بھی دیر نہیں لگائی۔ انگریزی زبان کے رائج ہوتے ہی کلکتہ کونسل کی ذیلی ملازمتوں پر ہندو کی اجارہ داری قائم ہو گئی۔

برطانیہ کا ففتھ کالم

براہمو سماج سوسائٹی کا بانی، بنگالی برہمن راجہ رام موہن رائے 1772ء میں پیدا ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہیسٹنگز Hastings نے بنگال میں اپنی لوٹ مار اور ڈاکہ زنی کا ابھی آغاز ہی کیا تھا لیکن رائے اس صورت حال کا صحیح ادراک نہ کر سکا اور اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ، اجتماعی رویوں کو نئے حالات کے مطابق ڈھالنے کی تلقین کرتے گزارا۔ اگرچہ وہ ہندومت کی بنیاد پرستی اور قدیم تعلیمات کی طرف لوٹ گیا لیکن جیسا کہ اس کی کتاب "پرسپٹس آف جیسس" .Precepts of Jesus سے ظاہر ہے، رائے نے عیسائیت سے گہرا اثر قبول کیا۔ 1818ء میں اس نے ہندوستان کے پہلے اخبار (ظاہر ہے انگریزی زبان میں) کا اجراء کیا۔ مغرب سے مستعار عقلیت پسندی کی بنیاد پر اس نے ہندومت کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور ذات پات، ستی کی رسم اور مت پرستی کے خلاف صف آراء ہو گیا۔ اس نے معاشرے میں عورت کا مقام بلند کرنے کی ضرورت کا احساس بھی دلایا۔

بلاشبہ یہ اعلیٰ وارفع نظریات کا پرچار تھا لیکن اصلاح کے اس جذبے کے پس پردہ ایک بنیادی پیغام تھا کہ " نئے نظام کو قبول کر کے اس کی اطاعت کرو، 'کمپنی بہادر' کی ملازمت اختیار کرو، مغرب کا سورج مشرق (بنگال) سے طلوع ہو رہا ہے اس کے ساتھ پیش قدمی کرو کیونکہ تمہاری ترقی میں ہی تمہاری برادری کی ترقی کا راز پنہاں ہے۔" رائے کے تعاون سے 1816ء میں مغربی تعلیم کے حصول کے لئے ایک کالج کا قیام عمل میں آیا۔ رائے کا انتقال انگلستان میں ہوا جہاں وہ بیک وقت انگریزوں کی کلکتہ کونسل کا نامزد سفیر اور آخری مغل تاجدار کا نمائندہ تھا۔ بنگال کو ترقی پسندی کی راہ پر ڈالنے والے اس بنگالی

برہمن کو 1833ء میں برسٹل Bristol میں اس کی وفات پر، اس کی شخصیت کے عین مطابق ' آلنو ویل ALNO VALE کے عیسائی قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔

یہاں ایک وضاحت ضروری ہے۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ تمام ہندو برادری نے رائے کی تلقین پر یورپی اطوار کو گلے لگا لیا ہو۔ جیسا کہ ہمارے علم میں ہے کہ 1857ء کی جنگ آزادی میں بہت سے مقامات پر ہندو اور مسلمان شانہ بشانہ انگریز کے خلاف صف آراء تھے جبکہ کئی دوسرے علاقوں میں (جن میں کشمیر سے حیدر آباد تک بہت سی شاہی فرمانروائیاں شامل تھیں) دونوں مذاہب کے لوگ یا تو لاتعلق رہے اور یا آزادی کی اس جنگ میں انگریز کی جانب سے لڑے۔ دراصل یہی وہ ہندو اور مسلم ریاستیں تھیں جنہیں بجا طور پر "برطانیہ کا ففتھ کالم" کہا جا سکتا ہے۔ ان میں سے اکثر ریاستی شہزادگان ضمنی یا ذیلی ریاستوں کے نظام کے تحت برطانیہ کی حمایت کے پابند تھے جب کہ کشمیر اور حیدر آباد کے حکمران اپنے اقتدار کے لئے انگریز کے رہین منت تھے جس نے 'اپنے ہی لوگوں کو شکست دینے میں' ان کی مدد کی تھی۔ 1799ء میں سرنگا پٹم کے ہیرو سلطان ٹیپو کی شکست کے بعد حیدر آباد کے نظام نے ریاست میسور کے کچھ حصوں پر قبضہ کر لیا تھا جبکہ ادھر وادی سندھ میں گلاب سنگھ کو 1846ء میں سکھ قوم سے غداری کے صلے میں "سستے داموں" کشمیر کی فرمانروائی حاصل ہوئی تھی۔

یہاں پہنچ کر ذہن میں یہ سوال ضرور ابھرتا ہے کہ وہ کیا محرکات تھے جن کی بناء پر 19ویں صدی کے نصف اول میں بنگال کا ہندو 'انگریز کا حلیف بن گیا جبکہ دوسرے بہت سے علاقوں کے ہندو (دہلی، میرٹھ، کانپور اور جھانسی) انگریز راج کے خلاف اور ایک کمزور مسلمان شہنشاہ کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر ان علاقوں کے مسلمان انگریز کے خلاف صف آراء کیوں ہوئے جبکہ بنگال، پنجاب اور سندھ میں ان کی اپنی قوم الگ تھلگ رہی۔

جاگیردار اور بورژوا ' ایک ناگزیر تفریق

19ویں صدی میں محب وطن اور غدار کے درمیان پہچان کی لکیر ہندو مسلم تفریق کی بنیاد پر اس قدر واضح نہیں تھی بلکہ بورژوا اور جاگیردار طبقے کا حوالہ اسے نمایاں کرتا تھا۔ یہ دونوں طبقے دو مختلف نظام ہائے زندگی کی نمائندگی کرتے تھے۔

بنگال میں مختلف عوامل کے گٹھ جوڑ مثلاً ہندو تاجر کی موجودگی، لوٹ مار، قحط اور زمینوں کے مستقل نظام آبادکاری کے باعث جاگیرداری طرز پیداوار مکمل طور پر تباہ ہو چکا تھا۔ اب بنگال میں اراضی، دولت مند ساہوکار کے توسط سے زیر کاشت لائی جا رہی تھی جو کمپنی کی تجارتی سرگرمیوں کے

حوالے سے خوب دولت سمیٹ رہے تھے۔ برطانوی بالادستی میں اضافے کے ساتھ ان کے مفادات کی دنیا بھی وسعت اختیار کر رہی تھی۔ ان ہندوستانیوں کے مفاد کا تقاضا یہی تھا کہ انگریز ہندوستان کی باقیماندہ سرزمین پر بھی قبضہ جمانے میں کامیاب ہو جائیں۔ یہ ایک ایسا گھڑا گھڑایا طبقہ تھا جو ایک بڑی سامراجی طاقت کی بین الاقوامی اور سمندر پار تجارت سے مستفید ہو رہا تھا اور اس مسلسل بڑھتی ہوئی تجارت سے حاصل ہونے والے فوائد لامحدود تھے۔

بنگال کے ہندو ساہوکار اور تاجر کم از کم نصف صدی تک ہندوستان میں برطانوی تجارت کے بلاشرکت غیرے ایجنٹ رہے۔ کمپنی کی مقامی افسر شاہی پر بھی انہی کا غلبہ تھا اگرچہ کارنوالس کے "یورپیانے" کی حکمت عملی کے باعث انہیں صرف ماتحت عہدوں تک ہی محدود رکھا گیا لیکن یہ دور صحیح معنوں میں گورے "نابوب" اور ان کے مقامی شرکت کاروں کا دور تھا۔ اس صورت حال کے تناظر میں بہت سے مسلمان تجزیہ نگاروں کے ذہن میں یہ انمٹ تاثر جاگزیں ہو گیا کہ جیسے ہندوستان کی تمام ہندو آبادی راج کی حامی اور لوٹ مار میں اس کی شریک کار تھی۔

اپنی تمام تر زمین گنوانے کے باوجود ایک جاگیردار کے نزدیک بہی کھاتہ لکھنے والے یا ایک منشی کا پیشہ باعث تحقیر تھا۔ اسے اپنی ذات اور حسب نسب پر بڑا غرور تھا۔ ذات پات کے صدیوں پرانے نظام کے تحت یہ پیشے صرف ہندو ویش کے لئے مخصوص تھے۔ اسلام ہندوستان میں آیا تو اس نے ذات پات کے نظام کی شدید مخالفت کی لیکن اس کے باوجود یہاں کے مسلمان اس ہمہ گیر نظام کی قباحتوں کا شکار ہونے سے بچ نہ سکے۔

جاگیردار اس لئے بھی بورژوازی سے خائف تھا کہ اس کے ارتقاء کے ساتھ اقدار کا ایک اجنبی نظام بھی متعارف ہو رہا تھا۔ جو پرانی اقدار و روایات کے لئے خطرہ تھا۔ سرمایہ داری نظام کی یلغار جاگیرداری نظام کے لئے موت کا پروانہ تھی۔ معاشی بالادستی دراصل سیاسی بالادستی کا زینہ ہے لہذا نیا نظام 'نیچ ذات' کے تاجر کو طاقت ور بنا رہا تھا۔ لگان کی وصولی اور شاہی احکامات کے تحت فوجی بھرتی کا اختیار ایک جاگیردار کے نزدیک دو بہت ہی باعزت فریضے تھے۔ ان دونوں کا تعلق زمین اور مزارعے پر جاگیردار کی صدیوں پرانی بالادستی سے تھا۔ کسان اپنی فاضل پیداوار جاگیردار کے حوالے کرنے کا پابند تھا اور مزارعین کی صحت مند اور نوجوان اولاد پر اپنے آقا کی خاطر جنگ لڑنا بھی فرض تھا۔ جاگیرداری نظام میں افواج کا تعلق تنخواہ سے نہیں بلکہ جاگیردار کی زمین کاشت کرنے کے حوالے سے ہوتا تھا۔
لیکن کمپنی کے نظام اور اس کی فوج کی دھج ہی نرالی تھی۔ ضلعی سطح پر لگان وصول کرنے والے اور تنخواہ دار فوجی پرانے نظام کی جگہ لینے آن پہنچے تھے۔

دوسری اہم بات جسے یہاں دہرانے میں کوئی حرج نہیں، راجپوتی آن بان اور عزت و وقار کا جاگیردارانہ اظہار شجاعت جو 10 ویں اور 11 ویں صدی میں حقائق اور داستانوں کے حوالے سے پروان چڑھا، انگریز کی خود غرضانہ حکمت عملی کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ انگریز تو سازش کے ذریعہ "ففتھ کالم" کی تشکیل جیسے گھناؤنے ہتھکنڈوں سے کام لیتا تھا۔ اس نے جنگ ہمیشہ قبل از وقت منصوبہ بندی اور غداروں کی اعانت سے جیتی۔ وہ جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی خفیہ سازباز کے ذریعے اپنے غنیم کے دفاع میں شگاف ڈال دیتا تھا۔ مرشد آباد، سرنگا پٹم اور لاہور کے حکمرانوں کے خلاف جنگیں اسی حکمت عملی کے تحت جیتی گئیں۔

شجاعت اور بہادری کے جاگیرداری ضوابط میں ایسے طریق کار کا تصور بھی محال تھا۔ بیجاپور کے جرنیل افضل خان کو جس دھوکے سے شیواجی نے اپنے مہلک دام میں پھنسایا، ہندوستان کا جاگیردار طبقہ اس پر ششدر رہ گیا۔ اسی لئے یہ مرہٹہ لڑاکا گوریلا جنگوں سے داستانی شہرت حاصل کرنے کے باوجود راجپوتوں کی بھرپور اور وسیع تر حمایت حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ درحقیقت جے پور اور کئی دوسری راجپوت اور جاٹ جاگیردار عملداریوں نے اس کی باقاعدہ مخالفت کی۔ لیکن تاریخ کے اگلے مرحلے میں شیواجی ہندو یا مسلم جاگیردار کا تو نہیں البتہ ہندو بورژوا کا ہیرو بن گیا۔

لیکن یہاں بھی ایک نمایاں تفریق موجود تھی۔ ہم اس صورت حال کا پہلے بھی جائزہ لے چکے ہیں کہ تمام جاگیرداریوں کے شہزادگان نے 1857ء کی جنگ آزادی میں محب وطن قوتوں کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ وہ جاگیردار جنہیں انگریزوں نے نوازا تھاوہ اس جنگ سے لاتعلق رہے یا عملی طور پر انگریز کی حمایت میں لڑے۔ بیرنگٹن مور Barrington Moore نے اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ہندوستانی معاشرے کی جس تفریق کو 'بغاوت' نے سب سے زیادہ نمایاں کیا وہ ایک طرف ایسے قدامت پسندوں کی برافروختگی تھی جن کے مادی مفادات کو (انگریزوں کی طرف سے) تحفظ فراہم نہیں کیا جا رہا تھا اور دوسری طرف جنگ آزادی اور حریت پسندوں کے ساتھ ان طبقات کی سردمہری تھی جنہیں برطانوی حکمت عملی سے فائدہ پہنچا تھا یا انہیں کوئی نقصان نہیں اٹھانا پڑا تھا۔ یہ تفریق نہ صرف مذہبی بنیاد سے ماورا بلکہ کسی حد تک مادی مفادات پر بھی مبنی تھی۔

مختصر الفاظ میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ 1857ء کی جنگ آزادی میں ہندوستان کے زمینداروں اور کسانوں کی اکثریت (بشمول ہندو اور مسلمان) ملک گیر سطح پر انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی تھی جب کہ نوزائیدہ بورژوازی طبقہ کمپنی کے ساتھ تھا۔

آفاقی تصورات اور صف اول کے سوداگر

برطانوی راج کے کچھ حمائتی ایسے بھی ہیں جو 'سپئر Spear' کی طرح ایسے سوال کرنے سے نہیں چوکتے کہ "ہندوستان کے باسی مغربی تہذیب پر اعتماد کیوں نہیں کرتے تھے کہ اس تہذیب کو اپنے اندر جذب کئے بغیر اس کے ساتھ زندگی تو گزاری جاسکتی تھی۔ جیسا کہ ہندوستانیوں نے اسلام کے ساتھ کیا تھا کہ اسے ہندومت میں جذب کئے بغیر اس کے ساتھ اور اس کے تحت کئی صدیاں گزار دیں۔ مغرب کی ضرب سے ''ہندوتا'' کا خول آخر کیسے ٹوٹا یا اگر ٹوٹا نہیں تو چیخ کیوں گیا؟'' اور پھر خود ہی ان سوالوں کا اس انداز میں جواب دیتے ہوئے مطمئن ہو جاتے ہیں کہ "مغربی اثرات ایک کٹر مذہبی نظام کے چیلنج کے بجائے ایسے غیر مذہبی، ہمہ گیر اور آفاقی اصول و نظریات کی شکل میں سامنے آئے کہ جنہیں قبول بھی کیا جاسکتا تھا اور اپنی مذہبی اور معاشرتی روایات سے کھلم کھلا انحراف کئے بغیر ان پر عمل بھی کیا جاسکتا تھا۔"

میں بصد احترام ایسے 'ضرورت سے زیادہ سہل نتائج' اخذ کرنے والوں سے اختلاف رکھتا ہوں۔

سب سے پہلے تو کہنا چاہوں گا کہ مغرب کے ان نام نہاد 'آفاقی نظریات' کو برصغیر میں قطعی مختلف تناظر میں دیکھا گیا۔ کوئی انگریز مورخ تو انہیں "آفاقی نظریات" لکھ سکتا ہے۔ ہم ایسا تسلیم نہیں کر سکتے کہ یہ 'آفاقی نظریات' تو ایک اجنبی اور نسل پرست قوم کی لوٹ مار کا دوسرا نام تھا۔

یہ کیسے آفاقی نظریات تھے جو 1857ء کے ظالمانہ انتقام کی اجازت دیتے ہیں؟ اور وہ کون سے آفاقی نظریات تھے جن کے تحت 1882ء میں اس بے ضرر البرٹ بل (Ilbert Bill) کو مسترد کر دیا گیا جس میں صرف یہ تجویز کیا گیا تھا کہ ہندوستان کے اہل ججوں کو بھی یورپی ججوں کی طرح بنگال پریذیڈنسی کے تمام مقدمات کی سماعت کا اختیار ہونا چاہیے۔ کسی انڈین جج کی عدالت میں خواہ وہ کتنا ہی قابل اور غیر جانبدار کیوں نہ ہو، ایک انگریز کے پیش ہونے کا تصور ہی برطانوی قوم کے 'آفاقی مزاج' کے لئے بے حد تکلیف دہ تھا۔ یہ کیسے 'آفاقی نظریات' تھے جو مٹھی بھر انگریزوں کے لئے ٹرینوں میں علیحدہ اور مخصوص بوگیوں کی اجازت دیتے تھے؟ اور کیا جلیانوالہ باغ کے اجتماع میں بلا اشتعال نہتے شہریوں کا قتل عام انہی 'آفاقی نظریات' کی روشن مثال تھا؟

کارنوالس کا متعصبانہ بیان انگریز کی اسی حقارت کا پرتو ہے جو ہر سامراجی کے دل میں مقامی لوگوں

کے لئے تھی۔ کارنوالس کا بیان تھا کہ " میں اس سچائی پر اپنے پورے وثوق سے ایمان رکھتا ہوں کہ ہندوستان کا ہر مقامی باشندہ بد دیانت ہے۔" کارنوالس کے بعد آنے والے کسی انگریز حکمران نے کبھی اس حقارت کو چھپانے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی اپنے روزمرہ کے معمولات میں، مختلف طور طریقوں سے اس کے اظہار سے کبھی اجتناب کیا۔

ہندوستان ایک نوآبادی تھا، ایک قوی ہیکل اور بے حس صنعتی مشین کا زرعی لاحقہ۔ اسے انگریز صنعتکاروں کو خام مال بھی مہیا کرنا تھا اور پھر ایک محکوم نوآبادیاتی منڈی ہونے کے ناطے تیار مال مہنگے داموں واپس خریدنا بھی تھا۔ دونوں صورتوں میں قیمت کا تعین اور دیگر امتیازات انڈین مفادات کے خلاف ہوتے تھے اور پھر یہ توقع بھی رکھی جاتی تھی کہ اس استحصال کو خندہ پیشانی سے بے چون و چرا تسلیم بھی کر لیا جائے۔ برطانوی راج کے لئے امن و امان قائم رکھنا کلیدی اہمیت کا حامل تھا اور اسے مقامی آبادی پر ہر طرح کے ظلم و ستم کی قیمت پر برقرار رکھا جاتا تھا۔

ہندوستان کے بارے میں راج کا آفاقی نظریہ غالباً یہی تھا کہ یہ نوآبادی ان کا ایک غیر مزاحم زرعی لاحقہ ہے۔ سامراجی حکومت کے تمام ادارے، انتظامیہ، عدلیہ اور مقننہ اسی ایک اصول پر کاربند تھے اور تمام ترقی اسی ایک مقصد کے حصول کی خاطر تھی۔ ریلوے کی مثال کا ہم پہلے ہی جائزہ لے چکے ہیں۔ ریلوے کی تعمیر اور وسعت کے بارے میں عام خیال یہی تھا کہ اس سے ہندوستان میں معاشی ترقی ہوگی جس کے نتیجے میں یہ نوآبادی برطانیہ کے تیار مال کے لئے منڈی اور خام مال کا سرچشمہ ثابت ہونے کے علاوہ انگریز حکمرانوں کو اس پر گرفت مضبوط کرنے اور اس کے دفاع کو ناقابل تسخیر بنانے میں بھی مدد دے گی کیونکہ ریلوے کے ذریعے سرحدوں پر اور برصغیر میں کہیں بھی فوج پہنچانا آسان ہو جائے گا۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ غیر مذہبی اثرات سے 'سپر' کی مراد یورپ کی متعارف کردہ سائنسی ترقی ہو جس نے ہندوستان کے موجود مذاہب کی بنیادیں ہلا دیں حالانکہ برطانیہ کی ہرگز یہ خواہش نہیں تھی کہ ہندوستان پر اس کے غلبے کی نوعیت مستقل بنیادوں پر غیر مذہبی ہی رہے بالخصوص اس احساس کے بعد کہ مذہبی مشن 'آفاقی نظریات' کی ترویج میں کارگر ثابت ہو سکتے ہیں۔

برصغیر میں کمپنی کی حکومت کے اولین دور میں جب ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہندوستان کے کسان کا استحصال کیا جا رہا تھا، ان دنوں عیسائی مبلغین کی سرگرمیوں کو ایک رکاوٹ اور بے جا مداخلت تصور کیا جاتا تھا۔ لہٰذا 1813ء تک عیسائیت کے پرچارکوں پر ہندوستان کے دروازے بند رکھے گئے لیکن 19ویں صدی کے آغاز میں جب سکاٹ لینڈ کے پادریوں نے عیسائی تعلیمات کا ہندوستان کی مقامی زبانوں میں ترجمہ کیا تو اس کامیابی نے سامراجی عزائم کی تکمیل میں عیسائی مبلغین کی

اہمیت کو اجاگر کر دیا۔

1813ء میں عیسائی مبلغین کو ہندوستان آنے کی اجازت مل گئی اور ان کی خاطر خواہ سرپرستی بھی کی گئی۔ چند ہی دہائیوں میں عیسائی مشن، کانوینٹ سکول اور مشنری ہسپتال اس وسیع برطانوی نوآبادی کے کونے کونے میں پھیل گئے۔ انہیں اراضی کے وسیع قطعات بلا معاوضہ مہیا کئے گئے مقامی اور سرکاری ٹیکسوں سے بھی انہیں چھوٹ حاصل تھی۔ گرجوں کے مینار اور مخروطی طرز تعمیر جلد ہی ہندوستان کے عمومی منظر کا حصہ بن چکا تھا۔ عیسائی مبلغین بڑی کامیابی سے مقامی آبادی کا نقطہ نظر بدلنے لگے اور ان میں اپنے توہمات اور دقیانوسی کٹر مذہبی عقائد کی گرفت سے آزاد ہونے کی تڑپ پیدا ہوئی۔ اس ضمن میں کمپنی کی فوج بھی سراپا تعاون تھی۔

سپئر Spear اکیلا ہی اس احساس تفاخر سے معمور نہیں تھا جب اس نے کہا۔۔۔۔ "لیکن عیسائیت اور اس کے ساتھ عمومی مغربی اثرات دو لحاظ سے بہت اہم تھے۔ سکولوں اور کالجوں نے مسیحی اخلاقیات اور مغربی تصورات کی ترویج کی جس نے متوسط طبقے کی سوچ پر واضح اثرات مرتب کئے۔ طبی سہولیات اور ہسپتالوں کے قیام نے بھی ہندوستانی عوام کے شعور کو بہت متاثر کیا۔ اگرچہ اس طریقہ کار سے عیسائیت قبول کرنے والوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی لیکن ہندوستانی معاشرے کی اجتماعی سوچ نے اس صورت حال سے گہرا اثر قبول کیا اور اہل فکر و دانش بھی معترف تھے کہ مذہب کا اصل کام یہی ہے۔"

اس منظر نامے نے ہندو مذہب کو بھی دور رس تبدیلیوں کی راہ سجھائی اور یوں بہت سی ہندو اصلاحی تحریکوں نے بھی عیسائیت کے اسی انداز عمل کی راہ اپنائی۔ ہندوؤں میں بھی ایک جامد اور انفعالی احساس کی جگہ عملی انسان دوستی کا جذبہ ابھرا۔ ہندوستانی جس کی ایک مثال کے لئے گاندھی کا نام لیتے ہیں۔ نہرو کی سوچ بھی اس وقت مہاتما گاندھی سے کچھ ایسی مختلف نظر نہیں آتی جب پنڈت نہرو نے ایک بنگالی سنیاسی اور انسان دوست رام کرشن پرماہنس کی تعریف کرتے ہوئے فرانسس کنز Franciscans اور کوئیکرز Quakers مسلک کے درویشوں کی "عیسائی خصوصیات" کو اس سے (رام کرشن سے) منسوب کرتے ہوئے اس کی تعریف کی۔

عیسائی مبلغین کی تعلیمات اور اس کے اثرات قبول کرنے کے لئے جو لوگ سب سے پہلے اور رضاکارانہ طور پر آگے آئے، وہ ہندو تھے۔ مشنری اثرات کا رنگ بھی انہی پر گہرا اور نمایاں تھا لیکن اس عمل سے ایک نئے تضاد کی راہ بھی ہموار ہو رہی تھی۔

19ویں صدی میں یہ مشنری ادارے ہندو نوجوانوں کو سامراجی بینکوں، ریلوے، روئی کی تجارت

اور دوسرے کاروباری اور انتظامی شعبوں میں کلرک اور اکاؤنٹنٹ جیسی اسامیوں کے لئے تیار کرتے رہے۔ مشنری تعلیم غالباً وہ اہم ترین عنصر تھا جس نے ملک میں اس مخصوص طبقے کو فروغ دیا جس کی اعانت سے برطانیہ نے ہندوستان پر حکومت کی۔ کلیسا کی سرکاری سرپرستی کا انعام انگریز سرکار کو ہندوستان پر اپنی مضبوط گرفت کی صورت میں ملا۔ ان مشنری اداروں نے ایسے افراد تیار کئے جو عیسائیت قبول کئے بغیر ہندو متوسط طبقے یعنی بورژوازی کے فروغ کا باعث ہوئے۔ لیکن جلد ہی اس طبقے نے برطانوی اجارہ داری، مقامی صنعتوں پر پابندی اور برطانوی مصنوعات کے تحفظ جیسے اقدامات اور برطانوی راج کے نسل پرستانہ تشخص کو ناپسندیدگی سے دیکھنا شروع کر دیا۔

ہندوؤں نے ہی برصغیر فتح کرنے میں کمپنی سے تعاون کیا تھا اور ہندو ہی بعد میں راج کے خاتمے کے لئے قوم پرست تحریک شروع کرنے میں پیش پیش تھے۔

سپئر کی طرف سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بھی متنازعہ ہے کہ برصغیر کے عوام نے مغربی اطوار کو بہت جلد قبول کر لیا۔ یہ دعویٰ کرنا کہ بورژوا طبقے نے (جس کی اکثریت ہندوؤں پر مشتمل تھی) مغربی اثرات قبول کئے، ایک الگ بات ہے لیکن اس نتیجے کو سارے برصغیر پر منطبق کر کے یہ کہہ دینا کہ مغربی رجحانات کو قبول عام حاصل تھا، ایک قطعی مختلف بات ہے۔ ہاں، اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستانی تاجر نے برطانوی تجارت کو اسی طرح اپنایا تھا جیسے کبھی اس نے عرب اور شرق الہند کی ساحلی تجارت کو اپنا لیا تھا۔ اس نے شمال مغربی دروں کے راستے وسطی ایشیا اور ایران کے ساتھ بھی تجارت کی تھی لیکن ہندوستان اور وادی سندھ میں مسلمانوں اور پھر انگریزوں کی یہاں آمد کے درمیانی عرصے کی تجارتی مہم جوئی اور موجودہ تجارتی سرگرمیوں میں بہت ہی واضح اور نمایاں فرق تھا۔ پہلی دفعہ ایسا ہوا تھا کہ تاجروں کے ایک مخصوص طبقے کو ایک ایسی صنعتی قوم کے وسائل اور پیداواری صلاحیتوں کا بھرپور تعاون حاصل تھا جس کا سرمایہ دارانہ طرز پیداوار بے حد ترقی یافتہ اور موثر تھا۔

ایک مخصوص کاروباری اقلیت کے سوا برطانوی نظریات اور نظام کو عوام نے قبول نہیں کیا تھا۔ عوام کی اکثریت ظالمانہ سامراجی استبداد کا شکار تھی۔ ہندوستان کا صرف اقلیتی لیکن بارسوخ بورژوازی ،انگریز کا شریک کار تھا۔ 19ویں صدی کے وسط تک جاگیردار اور دیہی ہندوستان بالعموم انگریز کا مخالف ہی رہا۔

برطانیہ کے مقامی ساجھے داروں میں تبدیلی

1857ء کی بغاوت فرو کرنے کے بعد انگریزوں نے فیصلہ کیا کہ انہیں اپنے شریک کار اور اپنی

وفاداریاں بدلنا ہوں گی۔ اب انہوں نے جاگیردار کو طاقتور بنانا اور اس پر انحصار کرنا شروع کر دیا۔ یہ تبدیلی بھی مبنی بر مصلحت تھی۔ بغاوت کا زیادہ زور وادی جمنا کی زرعی جاگیروں کے علاقے میں تھا۔ اگر ہندوستان اور وادی سندھ کو لنکا شائر اور ڈنڈی کی کپڑے اور پٹ سن کی صنعتوں کا محکوم اور لاحقہ بنائے رکھنا مقصود تھا تو مقامی کسان کی فاضل پیداوار کی بر آمد ناگزیر تھی اور فاضل پیداوار سمیٹنے کے لئے زرعی اجناس کی جاگیر دارانہ لوٹ کھسوٹ سے بہتر کوئی اور راستہ نہیں تھا۔

دوسری طرف سامراجی بورژوازی کو چونکہ مقامی نئے بورژوازی کے ساتھ کاروباری مسابقت کا بھی اندیشہ تھا لہذا برطانوی حکومت نے 1857ء کے بعد برصغیر میں جاگیرداری نظام کی سرپرستی کرنے اور اسے طاقتور بنانے کا آغاز کر دیا۔ جاگیردار کو اپنا سابقہ تسلط اور مراعات بحال کرانے میں برطانوی انتظامیہ اور پولیس کا مکمل تعاون حاصل تھا۔ جاگیرداروں کی بغاوت پر کامیابی سے قابو پانے کے بعد انگریز نے اپنے مخصوص مفادات کی خاطر ایک جاں بہ لب نظام میں نئے سرے سے روح پھونکنا شروع کی۔ 1857ء کے معتوبین کی اکثریت کے ساتھ ملکہ وکٹوریہ کی ''رحمدلی کے صدقے'' مفاہمت کی راہ نکال لی گئی۔ حتیٰ کہ اودھ کے تعلقہ داروں کی عملداری بھی بحال ہو گئی حالانکہ وہ بغاوت میں عملاً حصہ لے چکے تھے۔

لگان کی وصولی' اور امن وامان کی بحالی، راج کی دو بنیادی ترجیحات تھیں جن کے بارے میں ہم پہلے بھی بات کر چکے ہیں۔ ان میں سے موخر الذکر بھی دراصل اول الذکر ہی کو ممکن بنائے رکھنے کا ایک اہم ذریعہ تھا۔ اس بات کا سرکاری طور پر اعتراف کیا جا چکا تھا کہ ہندوستان میں برطانوی انتظامیہ کی پہلی ذمہ داری لگان کا تخمینہ لگانا تھا کہ آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ یہی تھا۔ برصغیر کی اہم اور بنیادی اشیائے پیداوار کی بر آمد سے حاصل ہونے والی آمدنی بھی اسی لگان کے زمرے میں آتی تھی اور اسے تجارت قرار دینا محض لفظوں کا ہیر پھیر تھا۔

نئے شراکتی گٹھ جوڑ کا فائدہ' اس میں شامل تمام شراکت داروں کو پہنچا۔ جاگیردار کے تحفظ کے لئے ایک طاقتور اور مستحکم مرکزی حکومت موجود تھی جو سلطنت کے دور دراز علاقوں میں بھی باغی اور حکومت دشمن عناصر کو سزا دینے کی اہل تھی۔ دوسری طرف راج نے بھی جاگیردار کی شکل میں ایک ایسا کار آمد اور کارگر شریک کار دریافت کر لیا تھا جو کسان کی فاضل پیداوار غصب کرنے کے علاوہ امن و امان کی بحالی میں بھی کامیاب معاونت کر سکتا تھا۔

ہندوستان کا بورژوازی اب یک و تنہا تھا۔ چونکہ ہندوستانی صنعت بھی اب انگلستانی مصنوعات کا مقابلہ کر سکتی تھی اس لئے لنکا شائر کو فائدہ پہنچانے کے لئے 1879ء میں برطانوی مصنوعات پر تمام

محصولات منسوخ کر دیئے گئے۔ 1895ء میں کپاس کی مقامی مصنوعات پر پانچ فیصد ایکسائز ڈیوٹی عائد کر دی گئی تاکہ سرکاری آمدنی میں اضافے کے لئے لنکاشائر کی مصنوعات پر اسی شرح سے عائد ہونے والے حالیہ ٹیکس کا تدارک کیا جا سکے۔ پونڈ کے مقابلے میں روپے کی قیمت کا تعین اس طرح کیا گیا کہ برطانیہ سے درآمد کی حوصلہ افزائی اور ہندوستان سے برآمدات کی حوصلہ شکنی ہو۔

مرکزی حکومت کی آہنی گرفت نے جاگیرداروں کے درمیان بالادستی کے حصول کے لئے مسلسل جاری رہنے والی ان جنگوں کا خاتمہ کر دیا جن کے باعث گذشتہ ڈیڑھ سو سال میں وسطی اور جنوبی ہندوستان کی زرخیز زمین بنجر ہو کر خوفناک صحراؤں میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اگلی نصف صدی کے دوران کسان کو امن و سکون، جاگیردار وڈیرے کو اس کا گم گشتہ طمطراق اور سامراج کو ہندوستان اور وادی سندھ کی پیداواری دولت غصب کرنے کی آزادی ملی۔

ان علاقوں میں جہاں آبپاشی کے ذریعے قابل کاشت اراضی میں اضافہ ہو رہا تھا، انگریزوں نے وہاں بھی زمیندارہ نظام متعارف کرانا مناسب سمجھا۔ یہ افراد کسان سے اس کی 'فاضل پیداوار' کی وصولی کے ذمہ دار تھے اور 'لمبڑدار' کہلاتے تھے۔ 1880ء کے بعد بیراجوں اور آبپاشی کے دوسرے ذرائع کی تعمیر سے زرعی رقبے میں اضافہ ہوا تو پنجاب کے نئے زیر کاشت آنے والے علاقوں میں کسانوں کو آباد کیا گیا لیکن ان کی ملکیتی اراضی کا رقبہ یکساں نہیں تھا۔ شروع شروع میں تو بڑے قطعات ایک سو سے ڈیڑھ سو ایکڑ کے درمیان تھے لیکن جب 'پنجاب لینڈ ایلی نیشن ایکٹ مجریہ 1900ء (Punjab Land Alienation Act, 1900) کے تحت زراعت سے غیر وابستہ برادریوں اور قبائل کو اس امر کا پابند بنا دیا گیا کہ وہ اپنے مقروض کسانوں اور زمینداروں سے ان کی ملکیتی زمین حاصل نہیں کر سکتے اور اس دوران حق شفعہ کے قوانین بھی لاگو ہو گئے تو بڑے زرعی قطعات کے مالکان نے اپنے ملحقہ ہمسایوں کی زیادہ سے زیادہ زمین حاصل کرنا شروع کر دی، جلد ہی وہ بہت بڑے زمیندار اور غیر حاضر جاگیردار بن چکے تھے۔ اب زمین کی قیمت میں مسلسل اضافے کا رجحان ہوا۔ 1866ء سے 1922ء کے درمیانی عرصے میں زمین کی عمومی قیمت 10 روپے ایکڑ سے بڑھ کر 280 روپے فی ایکڑ تک جا پہنچی۔

جاگیردار کی زمین اور قیمت دونوں میں اضافے کے ساتھ اس کے سیاسی اثر و رسوخ میں بھی اضافہ ہوا۔ سیاسی قوت ایک بار پھر معاشی قوت سے جنم لے رہی تھی۔ 19ویں صدی کے اختتام تک وادی سندھ سمیت زرعی جاگیرداریوں کے یہ علاقے راج کے مضبوط گڑھ بن چکے تھے۔

انگریز بتدریج اپنے اتحادی تبدیل کر چکا تھا۔ بورژوازی نے 19ویں صدی کے پہلے نصف میں

سامراجی فتوحات کے پہلے مرحلے کو کامیابی سے ہمکنار کیا تھا جبکہ جاگیر دار اب راج کو مستحکم کرنے میں مدد دے رہا تھا۔ بورژوا طبقہ برطانوی تاجروں سے مسابقت کی اہلیت رکھتا تھا اور فی الواقعہ اس پنجہ آزمائی کے لئے اس نے پر تولنا شروع کر دیئے تھے لیکن جاگیر دار کو اپنے مخصوص حالات کی بناء پر اب انگریز کا خوشامدی بن کر رہنا تھا۔ برطانوی حکومت اور جاگیر دار کے مفادات متصادم نہیں بلکہ مشترک ہو گئے تھے جبکہ 19 ویں صدی کے دوسرے نصف تک مقامی تاجر اور مقامی صنعت کار تاج برطانیہ کا حریف بنا جا رہا تھا۔

بورژوا کی بیداری اور ہندو احیائے مذہب

انڈین بورژوازی کی اکثریت ہندوؤں پر مشتمل تھی اور جب واضح طور پر نظر آنے لگا کہ انگریز نے اس طبقے سے منہ موڑ لیا ہے تو بورژوازی نے جمع پونجی سے نجی کاروبار، تجارت اور چھوٹی صنعتوں میں سرمایہ کاری کا آغاز کر دیا۔ یہ تاجر خاندان' صنعت و تجارت کے ان شعبوں کی طرف مائل ہوئے جہاں انگریز کی اجارہ داری نہیں تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنی مہارت اور بچت و منافع کی فطری اہلیت سے کام لیتے ہوئے برطانوی صنعت کے ایسے شعبوں میں بھی مسابقت پر اتر آئے جہاں مقابلے کی حوصلہ شکنی کے لئے انگریز نے بھاری ٹیکس عائد کر رکھے تھے۔ اس امر کے باوجود کہ لنکاشائر کی صنعت کو تحفظ دینے کے لئے ہندوستان میں کپڑے کی صنعت پر بھاری محصولات عائد تھے، مقامی صنعت کو نئے سرے سے فروغ حاصل ہوا۔

معاشی مفادات میں مسابقت بڑھی تو ہندو بورژوازی کی سیاسی بصیرت میں بھی اضافہ ہوا۔ اب اس بورژوازی کو اپنے معاشی مفادات کے فروغ کے لئے ایک تجارتی تنظیم اور اپنے سیاسی حقوق کے تحفظ کے لئے ایک سیاسی جماعت درکار تھی۔ لہذا یہ محض اتفاق نہیں کہ انڈین چیمبر آف کامرس اور انڈین نیشنل کانگرس ایک ہی سال یعنی 1885ء کے دوران وجود میں آئے۔ بورژوا کی بیداری کے ساتھ ہندو مت کے احیاء کو ایک مشترکہ معاشی ایجنڈے اور اپنی آزاد حیثیت کے جواز کے لئے ایک فلسفے کی ضرورت آن پڑی تھی۔ مقامی منڈیوں سے غیر ملکی مصنوعات کا انخلاء بھی اسی مشترکہ معاشی ایجنڈے کا ناگزیر حصہ تھا۔ گویا 1857ء کی جنگ آزادی میں ہندوستان کی شکست کے بعد ایک نئی اقتصادی جنگ کا آغاز ہو چکا تھا۔

1857ء میں ایک گجراتی برہمن سوامی دیانند سرسوتی نے ایک تنظیم 'آریا سماج' قائم کی۔ یہ ایک ہندو قومی تحریک تھی جو اپنے مقلدین کو وید کی قدیم تعلیمات پر سختی سے کاربند رہنے اور تمام جدید

رجحانات کی اعلانیہ مذمت کرنے کی تلقین کرتی تھی۔ نہرو کے الفاظ میں "یہ اسلامی اور عیسائی اثرات کے خلاف رد عمل کا اظہار تھا۔"

پنجاب اور متحدہ صوبہ جات (یوپی) کے متوسط ہندو طبقات میں آریا سماج کی اس پرجوش تحریک کو بڑی تیزی سے قبول عام حاصل ہوا اور بہت سے سنجیدہ اور متین ہندو بھی اس سحر کے اسیر ہونے لگے۔ موتی لعل نہرو جیسے جدت پسند نے اپریل 1909ء میں اپنے بیٹے جواہر لعل نہرو کے نام خط میں لکھا کہ "حالات روز بروز دگرگوں ہوتے جارہے ہیں لیکن اس برائی میں سے بھی ایک اچھائی نمودار ہو رہی ہے، آریا سماج نے بڑی خاموشی سے، اسلام کے پیروکاروں کو ہندو بنا کر محمدن زعم کا بھرپور جواب دیا ہے۔ ہر روز مسلمانوں کے تبدیلی مذہب کی خبریں آرہی ہیں اور بعض اوقات تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی دن میں پورے کا پورا گاؤں اپنا مذہب بدل لیتا ہے۔"

معاشی اعتبار سے بھی ہندو بورژوا مسلسل ترقی پذیر تھے جب کہ مسلمانوں کا جاگیرداری نظام انحطاط کا شکار تھا۔ اور عام طور پر معاشی آسودگی کی کشش ہی مذہب اور اعتقاد کے چناؤ میں کلیدی اہمیت کی حامل ہوا کرتی ہے۔

عملی سیاست میں بال گنگا دھر تلک (1920ء۔1856ء) کی پرجوش لیکن اشتعال انگیز شخصیت آریا سماج فلسفے کی بہترین نمائندگی کرتی ہے۔ ہندوؤں کے مذہبی جذبات ابھارنے کے لئے تلک نے شیوجی مسلک کی تجدید کرتے ہوئے قدیم مذہبی کتابوں کے مقدس ہندو سورماؤں کی عبادت کو فروغ دیا۔

برطانوی حکومت نے قدیم ہندو اعتقادات کے احیاء کے رد عمل میں یکے بعد دیگرے کئی ایسے قوانین نافذ کئے جن کا مقصد بورژوازی کے بڑھتے ہوئے اضطراب پر قابو پانا تھا۔ بیسویں صدی کی پہلی دہائی اس سلسلے میں بہت سے جابرانہ قوانین کے عملی نفاذ سے عبارت ہے۔ 1904ء کے آفیشل سیکرٹس ایکٹ Official Secrets Act کے ذریعے 'سرکشی' کی تعریف از سر نو ترتیب دی گئی اور اخبارات میں حکومت پر تنقید کو بھی اسی زمرے میں شامل کر لیا گیا۔ 1907ء میں ضابطہ فوجداری میں ترمیم 'عام اجتماعات اور باغیانہ عوامی اجتماعات پر پابندی کے ضابطے جاری کئے گئے۔ اگلے سال یعنی 1908ء میں دھماکہ خیز مواد کے حوالے سے ایک کڑا ضابطہ (Explosive Substances Act) جاری ہوا اور اخباری اشتعال انگیزیوں کے خلاف بھی قانون سازی کی گئی۔

لیکن اس موقعے پر انڈین بورژوازی کے نزدیک انگریز اور جاگیردار سے ٹکر لینا اس کے طبقاتی مفاد میں نہیں تھا۔ تاجروں اور صنعتکاروں کا یہ وسعت پذیر طبقہ انگریز کی جگہ لینے کو بے قرار تو تھا، اور دیہی

ہندوستان کو اپنی محکوم منڈی بنانے کے سنہری خواب بھی دیکھنے لگا تھا، اسی طرح وادی سندھ کو احمد آباد اور کلکتے کی صنعتوں کا زرعی لاحقہ بنانا بھی اس کی آرزو تھی مگر انڈین بورژوازی اس حقیقت کا بھی مکمل ادراک رکھتا تھا کہ یہ کام بتدریج اور سبج سبھاؤ سے ہونا چاہیے۔ اور یہ کہ بال تلک اور آریا ساج کا جارحانہ مزاج اس شاطرانہ حکمت عملی کا متحمل نہیں ہو سکتا کیونکہ اس مرحلے پر عسکری انداز اختیار کرنا، فرقہ واریت کے خون آشام بھیڑیوں کو دعوت دینے کے مترادف ہوتا جس کے نتیجے میں "شکار" کا بھاگ نکلنا یقینی تھا۔ ایسے میں ہندو (یا بر صغیر کی) بورژوازی کی ضرورت تھی کہ وہ ایک دھیمی، نرم خو حکمت عملی اپنائے جو بر صغیر کی وسیع تر آبادی کو اپنے دامن میں جگہ دینے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ یہ اسی مصلحت پسندی کا ناگزیر تقاضا تھا جس کے تحت کانگریس کی سیاسی عملیت پسندی' آریا ساج کے فلسفے اور حکمت عملی کا زور توڑنے میں کامیاب رہی اور شعلہ بیان و پرجوش بال تلک پہلے تو گوپال کرشن گوکھلے (1966ء - 1915ء) اور پھر موہن داس کرم چند گاندھی کے مقابلے میں سیاسی شکست سے دوچار ہوا۔

پہلی جنگ عظیم

اسی دوران پہلی جنگ عظیم (1919ء - 1914ء) شروع ہو گئی۔ جنگ کے دوران ہندوستان کے بڑے جاگیردار اور ریاستی شہزادگان برطانیہ کی معاونت میں ایک بار پھر پیش پیش تھے۔ ستمبر 1917ء کے جس حملے میں ترکوں کے ہاتھ سے حیفہ جاتا رہا اس کی قیادت مہاراجہ جودھ پور کے گھڑ سوار دستوں نے کی۔ ان جوانوں کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ بیکانیر کے شتر سوار دستے مصر، چین اور فلسطین جیسے دور دراز محاذوں پر 'داد شجاعت' دیتے رہے اور گوالیار کے سندھیا نے تین بٹالین فوج اور ایک بحری ہسپتال اپنے انگریز آقاؤں کو فراہم کیا۔

اس جنگ نے تمام ذرائع نقل و حمل اور ہندوستان کو جانے والے بحری راستے مخدوش بنا دیئے تھے۔ جس کے باعث برطانیہ مجبور ہوا کہ ہندوستان کو ایک متبادل صنعتی مرکز کے طور پر ترقی دے۔ یوں مقامی صنعتوں کی حوصلہ افزائی کا آغاز ہوا۔ جمشید جی ٹاٹا کے پارسی گھرانے کو جمشید پور میں سٹیل مل اور ناگپور میں ٹیکسٹائل مل لگانے کی اجازت دی جا چکی تھی۔ اب ان صنعتوں کی پیداواری گنجائش میں اضافہ کیا گیا۔ ٹاٹا سٹیل میں ریلوے انجن بھی بننے لگے لیکن ان کی قیمتوں کا تعین سرکار خود کرتی تھی۔ برٹش انڈیا ریلوے چونکہ انجنوں کی واحد گاہک تھی لہذا ٹاٹا پوری طرح انگریز سرکار کے رحم و کرم پر تھے۔

اگرچہ برطانیہ نے معاشی سرگرمیوں پر عائد پابندیوں کو نرم کر دیا تھا لیکن دوسرے شعبوں میں ایسی کشادہ دلی روا نہیں رکھی گئی۔ پہلی جنگ عظیم 'اس وسیع عریض برطانوی نو آبادی میں 'سیاسی سرگرمیوں پر مزید جابرانہ پابندیوں کا حوالہ بنی اور رہی سہی شہری آزادیاں بھی جاتی رہیں لیکن اس موضوع پر گفتگو سے پہلے اس امر کا جائزہ لینا مناسب ہوگا کہ برصغیر کی تاریخ کے اس دوراہے پر مسلمان کس مقام پر کھڑے تھے۔

اس سلسلے میں ہمارے لئے یہی جان لینا کافی ہے کہ راجارام موہن رائے کی اصلاحی تحریک جس میں ہندوؤں کو انگریز کی ملازمتیں حاصل کرنے، اپنے خول سے باہر آنے اور راج کے ساتھ عملی تعاون کی ترغیب دی گئی تھی، مسلمانوں میں اس سے ملتی جلتی تحریک سرسید احمد خان کی قیادت میں لگ بھگ پچاس سال بعد شروع ہوئی۔

29

مسلمانوں کی حالت زار

تقسیم بنگال

جب ہندو' عسکریت پسندی کی حدوں کو چھوتے ہوئے اعتماد کے ساتھ 20 ویں صدی کی جانب رواں دواں تھا تو مسلمان بے عملیت کے عالم میں دہلی اور لکھنو کی عظمت رفتہ میں گم تھا۔ اسے نئے نظام سے چڑ تھی جس کی اقدار اس کے لئے قطعی اجنبی تھیں۔ وہ ایسا شکست خوردہ سورما تھا جس میں گرنے کے بعد اٹھنے کی سکت بھی نہیں رہی تھی اور اس کی باقیماندہ توانائی محض ماضی کی خوشگوار یادوں کے سہارے زندہ رہنے پر صرف ہو رہی تھی۔ زندگی گزارنے کے اس انداز نے اسے مکمل طور پر بے عمل بنا دیا تھا۔

نئی صدی کے آغاز پر مسلمان عالم تذبذب میں تھے۔ سید احمد خان عمر بھر' مسلمانوں کو جدید علوم حاصل کرنے کی تلقین کرتے رہے اسی طرح جیسے نصف صدی پہلے راجا رام موہن رائے ہندوؤں کو بیدار کرنے میں معروف تھا۔ سید احمد خان علی گڑھ کے اینگلو محمڈن کالج کے بانی تھے اور انہیں تاج برطانیہ کی خدمات کے صلے میں سر کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کو ماضی کے بد خول سے باہر نکالنے اور جدید تعلیم سے بہرہ ور کرنے کی بھرپور جدوجہد کی تاکہ وہ بھی معاشی ترقی کے راستے پر گامزن ہو سکیں۔ علی گڑھ کے نوجوان سر سید احمد کے خوابوں کی تعبیر ثابت ہوئے۔

مسلمان اشرافیہ نے بھی حالات اور تبدیلیوں کے مرکزی دھارے سے لاتعلق رہنے کے نقصانات کو بھانپ لیا تھا۔ وہ اب غیر معینہ مدت کے لئے دور بیٹھ کر جلنے کڑھنے پر تیار نہ تھے۔ وہ معاشی

ترقی کی اہمیت سے بھی آگاہ ہو چکے تھے اور انہیں یہ بھی احساس ہو گیا تھا کہ بال تلک اور آریا سماجیوں نے جس فرقہ وارانہ مخاصمت کو جنم دیا تھا، اس کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک مشترکہ پلیٹ فارم کی اشد ضرورت تھی۔ ہندو انتہا پسند آمادہ پیکار تھا اور مسلم طبقہ امراء کو اس کے سوا کوئی اور راستہ سجھائی نہ دیا کہ برطانوی حکومت کا تحفظ حاصل کیا جائے۔

ادھر انگریز بھی مسلم برادری کی اہمیت سے پوری طرح آگاہ ہو چکے تھے۔ سویز کے مشرق میں برطانوی سلطنت کے استحکام اور سلامتی کا انحصار مسلمانوں کے تعاون پر تھا۔ اس اہمیت کے پیش نظر اور مسلمانوں کی اجتماعی تشفی کی خاطر 1905ء میں انگریزوں نے بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ مسلم اکثریت کے بنگالی علاقے جو زیادہ تر زرعی آبادی پر مشتمل تھے، انہیں ہندو اکثریت کے صنعتی مرکز یعنی کلکتہ سے علیحدہ کر دیا گیا۔ بنگال کی تقسیم پر ہندو نے شدید رد عمل کا اظہار کیا اور اس انتظامی اقدام کی مذمت کرتے ہوئے ایک عوامی تحریک شروع کر دی۔ مسلمان دفاعی پوزیشن اختیار کرنے پر مجبور تھے اور ایک مشترکہ پلیٹ فارم کا قیام ناگزیر ہو گیا تھا لیکن محسوس یہی ہوتا تھا کہ سامراجی حکومت کی سرپرستی کے بغیر کامیابی کا حصول ممکن نہیں۔

وفاداری کا انداز

مسلم لیگ دسمبر 1906ء میں قائم کی گئی لیکن اس سے پہلے اکتوبر میں ایک وفد آغا خان کی سربراہی میں وائسرائے سے ملا اور درج ذیل دلائل کے ساتھ برطانوی حکومت کی حمائت چاہی۔

" جناب والا کی اجازت سے ہم ایک قدم اور آگے بڑھانا چاہتے ہیں اور استدعا کرتے ہیں کہ بالواسطہ یا بلاواسطہ نمائندگی کے ایسے کسی بھی عمل میں جو مسلمانوں کی موجودہ حیثیت یا ان کے اثر و رسوخ پر اثر انداز ہو، محمڈن برادری کو نہ صرف ان کی عددی قوت کے مطابق نمائندگی دی جائے بلکہ اس کا تعین کرتے ہوئے مسلمانوں کی سیاسی اہمیت اور سلطنت کے دفاع میں ان کی خدمات کو بھی ملحوظ خاطر رکھا جائے۔"

30 دسمبر 1906ء کو ڈھاکہ میں منعقد ہونے والے مسلم لیگ کے تاسیسی اجلاس کے صدر نشیں، اتر پردیش کے جناب وقار الملک نواب مشتاق حسین نے صدارتی خطبہ دیا۔ سامراجی انتظامیہ کی سرپرستی کے حصول کی خواہش ان کے خطاب سے بھی عیاں ہوتی ہے۔

" حاضرین کرام!۔۔۔۔۔ مختصر یہ کہ آج ہم ایک قوم کی حیثیت سے، حالات کے تقاضوں سے مجبور ہو کر اپنے سیاسی عمل کا آغاز کر رہے ہیں۔۔۔۔۔ لیکن اس عمل سے ہماری وفاداری کی روح متاثر

نہیں ہو گی اور کسی بھی سطح کی راست گوئی ہمیں روایتی تعظیم سے روگرداں نہیں کرے گی۔۔۔۔ ہماری لیگ (جماعت) کا مقصد اپنے سیاسی حقوق اور مفادات کا تحفظ اور فروغ ہے لیکن حکومت (برطانیہ) کے ساتھ محمڈن (مسلمانوں) کی روایتی وفاداری میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔"

1911ء میں بنگال کی تقسیم کا فیصلہ منسوخ کر دیا گیا۔ یہ ہندو ہٹ دھرمی کے نتیجے میں حکومتی جانبداری کا واضح ثبوت تھا لیکن 30 دسمبر 1912ء کو مسلم لیگ کونسل نے اپنے اہداف کا تعین کرتے ہوئے جن مقاصد کا اظہار کیا، ان میں فدویانہ انداز فکر برقرار تھا۔ اس لائحہ عمل میں ایک مقصد یہ بھی تھا کہ۔۔۔۔ "ہندوستان کے شہریوں میں تاج برطانیہ کے ساتھ وفاداری کا جذبہ قائم رکھنے اور اسے فروغ دینے کی کوشش کی جائے گی۔"

30 دسمبر 1906ء کے اجلاس کی اہم قرارداد میں جس اولین مقصد کو آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام کی بنیاد قرار دیا گیا اس کے الفاظ بھی کچھ یوں تھے۔ "ہندوستان کے مسلمانوں میں برطانوی حکومت کے لئے وفاداری کے جذبے کو فروغ دینا اور ان غلط فہمیوں کو دور کرنا جو حکومتی اقدامات سے اس کی نیت کے بارے میں پیدا ہو سکتی ہیں۔" ایک سال بعد مسلم لیگ کے قیام کی پہلی سالگرہ کے موقعہ پر کراچی کے اجلاس میں جب وہ قرارداد منظور کی گئی (30 دسمبر 1907ء) جس میں جماعتی آئین کے حوالے سے مسلم لیگ کا نصب العین بھی شامل تھا، تو ایک بار پھر اسی مقصد کا اعادہ کیا گیا۔

مسلمان زمینداروں کی اکثریت ہندو بورژوازی کے جارحیت پسندانہ مذہبی احیاء سے خائف ہو کر برطانوی تحفظ کی طلبگار تھی اسی لئے یہ زمیندار تاج برطانیہ سے اپنی وفاداری کے اظہار کا ایک بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتے تھے۔ لیکن اب اعتدال پسند ہندوؤں کی وجہ سے کانگریس میں انتہا پسندوں کا اثر ورسوخ کم ہونے لگا تھا۔ اعتدال پسند گوکھلے Gokhle اور اصلاح پسند مسز اینی بسنت Mrs. Anie Besant بالترتیب 1905ء اور 1917ء میں کانگریس کے صدر ہوئے۔ یہ لوگ کانگریس سے انتہا پسندوں کو الگ تھلگ کرنے میں بڑی حد تک کامیاب رہے جس کے نتیجے میں برصغیر کے مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد کانگریس کی جانب راغب اور انگریزوں سے دور ہوتی گئی۔

ہم آہنگی 'بنیاد پرست' اور ایک بیرسٹر

برطانوی حکومت 1909ء کے ایکٹ میں جداگانہ انتخابات کی رعایت دے کر مسلمانوں کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب رہی تھی۔ یہ قانون اقلیت کی نمائندگی کا ضامن تھا۔ اب ہندوستان کے بورژوازی کو بھی مسلمانوں کی حمایت درکار تھی۔ اس کے نزدیک مسلمانوں کی اکثریت رکھنے والے

علاقے مستقبل کے آزاد ہندوستان کا غیر مزاحمتی زرعی لاحقہ ہو سکتے تھے اور اس مرحلے پر ہندوستان کا بورژوازی بھی مسلمانوں کے مطالبات تسلیم کرنے اور کرانے پر آمادہ تھا۔

مسلم لیگ اور انڈین نیشنل کانگریس کے درمیان ہونے والے معاہدہ لکھنو (1916ء) کے تحت مسلمانوں کے جداگانہ انتخابات کے حق کو تسلیم کر لیا گیا تھا۔ پنجاب میں امرتسر کے قتل عام (1919ء) کے خلاف احتجاج کے دوران بھی ہندو مسلم ہم آہنگی برقرار رہی تھی۔ دوسری طرف لارڈ کرزن Lord Curzon کے اپنے الفاظ میں پہلی جنگ عظیم کے دوران ہندوستان کے جسد سے خون کی آخری بوند تک نچوڑ دی گئی تھی۔ اگرچہ 1919ء کا مونٹیگ چیمس فورڈ ریفارمز ایکٹ Montague Chelmsford Reforms Act منظور کیا جا چکا تھا لیکن اس سے بھی حکومت کے خلاف جذبات سرد نہیں پڑے تھے۔

اس دوران ہندو مسلم اتحاد اپنے اوج کمال پر تھا۔ مسلمان اور ہندو نے امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں اکٹھے اپنی جانوں کا نذرانہ دیا اور شانہ بشانہ تحریک خلافت میں شریک ہوئے۔

تحریک خلافت، سرجز کے معاہدے Treaty of Surges میں ترکی پر عائد کی جانے والی غیر منصفانہ پابندیوں کے خلاف برصغیر کے مسلمانوں کا ردعمل تھا۔ ترکی میں خلافت کی بحالی، اس تحریک کا بنیادی مقصد تھا۔ ہندو بھی اس تحریک میں شریک ہوئے۔ گاندھی کی قیادت میں انہوں نے مسلمانوں کے مطالبے کی پرزور حمایت کی بلکہ مہاتما گاندھی نے تو 1919ء کی خلافت کانفرنس کی صدارت بھی کی تھی۔ اس بے چینی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کانگریس نے بھی اپنی تحریک عدم تعاون کا آغاز کیا اور چند نامور علماء نے تو گاندھی کی حمایت کے صلے میں عدم تعاون کے اس تحریک کے حق میں فتویٰ بھی جاری کر دیا۔

پروفیسر ایم مجیب کے مطابق مسلمانوں کے بعض بنیاد پرست راہنما جذبات کی رو میں اس حد تک بہہ گئے کہ انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کو ایک ایسی جہت سے آشنا کیا جس میں حقیقت کے بجائے مصلحت کوشی کا عمل دخل زیادہ تھا۔ عبدالحمید نے اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "خلافت کے بحران میں مسلمانوں کی قیادت علماء اور ان کے حلیفوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ 1918ء سے پہلے علمائے دین، سیاست کو اپنے دائرہ عمل سے باہر سمجھتے تھے اور عام طور پر ملکی حالات و واقعات سے لاتعلق رہتے تھے۔ لیکن کئی اعتبار سے یہ نئی رخ بندی بدقسمتی کا نقطہ آغاز بنی۔ ایک طبقے کے طور پر علماء اپنے وقت سے بہت پیچھے تھے۔ ان کی تعلیم ناقص تھی اور وہ سیاست کی ابجد سے بھی ناآشنا تھے۔ ان کی باہمی چپقلش روز روشن کی طرح عیاں تھی اور ان کا بے لچک رویہ ضرب المثل تھا۔ ان علماء کی ایک

نا قابلِ ذکر تعداد کے انداز فکر کی بناء پر مذہب ایک مثالی اور تعمیری قوت کے طور پر سیاست میں نہیں آ سکا۔ بلکہ بعض اوقات تو اس کے اثرات ناشائستگی کی حدوں کو چھونے لگتے تھے۔ ان میں سے چند پر جوش علماء نے اسلامی قوانین اور روایات کو کھنگال کر ایسے مضامین کھود نکالے جنہیں سیاسی مقاصد کے لئے کھینچ تان کر گاندھی کے عدم تعاون اور ستیہ گرہ کی حمایت میں جواز بنا کر پیش کیا گیا۔ اختراع پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہوں نے پیغمبر اسلام ﷺ کی مکی زندگی کو ستیہ گرہ کی ایک ارفع مثال قرار دیا۔ اسلام اور ہندو مت میں ایکتا کے لئے اپنی مضحکہ خیز کوشش میں یہ لوگ اس حد تک چلے گئے کہ انہوں نے قدامت پرست ہندوانہ انداز میں، مقدس گنگا کے پانیوں میں چڑھاوے چڑھانے سے بھی دریغ نہ کیا۔ ہندو دیومالائی داستانوں کے کرشن میں انہیں اسلام اور عیسائیت کے موسےٰ نظر آئے اور گاندھی کو انہوں نے امام مہدی کا روپ قرار دیا۔ دو مختلف عقائد کی مبادیات کو مشترک ثابت کرنے کی خاطر وہ دور دور کی کوڑیاں لاتے رہے۔ (عبدالحمید: "مسلمانوں کی علیحدگی کی تاریخ")

بیرسٹر محمد علی جناح ابھی مسلم برادری کے ایک ابھرتے ہوئے لیڈر تھے۔ ان کی سوچ بھی فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے حق میں تھی بلکہ 1916ء کے معاہدہ لکھنو کے بعد ایک ممتاز ہندو راہنما مس سروجنی نائیڈو نے تو انہیں "ہندو مسلم یکجہتی کا سفیر" قرار دے دیا لیکن جناح نے کانگریس اور مسلمان علماء کے مابین ہونے والے اس معاہدے سے خود کو الگ تھلگ ہی رکھا۔ بنیاد پرستوں کے ساتھ ان کی بننی ہی نہیں تھی اور شاید ہی انہوں نے سیاست میں کبھی مذہبی اطوار کی حمایت کی ہو۔ گاندھی کی تحریک عدم تعاون کے بارے میں ایک جوشیلے نوجوان کے سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا۔

> "نوجوان! مجھے سیاست میں ایسی مصنوعی مذہبی پیوندکاری سے کوئی سروکار نہیں۔ اب میرا راستہ کانگریس اور گاندھی سے الگ ہے۔ میں عوام کے جذبات بھڑکانے اور انہیں اشتعال دلانے پر یقین نہیں رکھتا۔ (میرے نزدیک) سیاست شرفاء کا کھیل ہے۔"

عبدالحمید کے الفاظ میں "کانگریس اور علماء کے مابین اتحاد دائمی ثابت ہوا۔ علماء نے سیاست کو مستقل اپنا لیا تھا اور تحریک خلافت کی راکھ سرد ہونے کے باوجود انہوں نے میدان سیاست سے کوچ نہیں کیا تھا۔ علماء، مسلمانوں کی ایسی بہت سی قوم پرست تنظیموں میں مرکزی حیثیت کے حصول میں کامیاب رہے جنہیں تیسری دہائی اور پھر چوتھی دہائی کے ابتدائی برسوں میں کانگریس کی آشیرباد حاصل تھی۔ یہ علماء ایک طرف تو احیائے اسلام کے داعی تھے اور دوسری طرف ان کی وفاداریاں کانگریس کے ساتھ تھیں جو نظریاتی اعتبار سے ان کی ضد تھی۔"

اگرچہ ان میں سے اکثر علماء کم از کم 14 اگست 1947ء تک کانگریس کے نام کی مالا جپتے رہے لیکن

ہندو مسلم ہم آہنگی زیادہ عرصے تک برقرار نہ رہ سکی۔ دونوں طرف نمایاں تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں اور اسی عرصے میں مسلمانوں کی خود اعتمادی میں بھی اضافہ ہوا تھا۔

تحریک خلافت اور مسلم بورژوازی

تحریک خلافت اپنے مقاصد کے حصول میں بری طرح ناکام رہی۔ کمال اتاترک ایک مسلمان جدت پسند اور عالم اسلام کا ہیرو تھا جس نے ۱۹۲۴ء میں خود ہی خلافت کی بساط لپیٹ دی۔ برصغیر میں تحریک خلافت کے قائدین کے لئے یہ امر باعث شرمندگی ہوا۔ ان دنوں غالب تاثر یہی ابھرا کہ یہ غلط مقصد کے لئے ایک بے سمت جدوجہد تھی۔ عوام کو جذباتی ہیجان میں مبتلا کرنا، غیر مسلم حکمرانوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے ہندوستان کے مسلمانوں سے ہجرت کی اپیل کرنا اور وسیع پیمانے پر عوام کو متحرک کرنا، سب کچھ مکمل طور پر انتشار کی نذر ہو گیا۔

لیکن تحریک خلافت سے نمایاں طور پر کچھ مثبت نتائج بھی برآمد ہوئے۔

یہ بات کسی صورت بھی کم اہمیت کی حامل نہیں تھی کہ سیاسی مزاحمت کے لئے عوام کو متحرک کرنے کے عمل میں ایک منفرد قسم کی دلکشی بھی شامل ہو گئی تھی۔ اس تحریک سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ مسلمان بھی عوامی اجتماعات منعقد کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ سیاسی نظریات کی خاطر قید وبند کی صعوبتیں برداشت کرنے کے عمل کو تحسین کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ سیاسی تحریکوں کو ایسے کارکن میسر آنے لگے جن کی آنکھوں میں بہتر مستقبل کے خواب رہتے تھے۔ افسر شاہی اور پولیس کو چھوڑ کر عوام کے ہر طبقے میں سیاسی نظر بندوں کو احترام اور رتبہ ملا۔ علی برادران شوکت علی اور محمد علی، بنیادی انسانی حقوق کی خاطر قید وبند کی صعوبتیں اٹھانے والے ان گنت قوم پرستوں کے نڈر پیش رو بن کر ابھرے۔ یہ روایت مسلسل جاری ہے اور آج ہمیں جو شہری آزادیاں میسر ہیں ان کا ماخذ یہی اولین جدوجہد اور قربانیاں ہیں۔

تحریک خلافت نے مسلم سیاسی صحافت اور عملیت پسند شاعری کو بھی فروغ دیا۔ اسی دوران ایک فعال اور طاقتور پریس کی روایت بھی جنم لے چکی تھی جسے جرمانے، بندش اور ضبطی بھی مرعوب نہ کر سکے اور پھر یہی طرز فکر وعمل تحریک پاکستان کا راہنما اصول بن گیا۔ مولانا ظفر علی خان (1956ء۔ 1873ء) کے اخبار "زمیندار" کی اشاعت پر کئی بار پابندی عائد کی گئی۔ اور متعدد بار خود انہیں بھی جیل جانا پڑا یا پنجاب میں وزیر آباد کے قریب اپنے گاؤں میں انہیں نظر بند کیا جاتا رہا۔ اس صورت حال پر انہوں نے لکھا تھا کہ:

دنیا میں ٹھکانے دو ہی تو ہیں آزاد منش انسانوں کے
یا تخت جگہ آزادی کی یا تختہ مقام آزادی کا

مولانا حسرت موہانی (1951ء - 1878ء) بھی سرگرم عمل، درویش صفت دانش ور تھے۔ انہوں نے بھی مسلمانوں کو اپنا طوق غلامی اتار پھینکنے کی ترغیب دی۔ وہ کانپور میں منعقد ہونے والی، انڈین کیمونسٹ پارٹی کی پہلی کانفرنس کے صدر نشیں 'جمعیت العلمائے ہند کے بنیادی رکن اور بعد ازاں مسلم لیگی امیدوار کی حیثیت سے ہندوستان کی قانون ساز اسمبلی کے رکن بھی منتخب ہوئے۔ ۱۹۲۸ء میں حسرت موہانی نے روزنامہ "مستقل" شروع کیا۔ اس مصنف، شاعر اور سرگرم سیاسی کارکن اور رہنما نے برسہا برس جیل کاٹی اور اپنے احساسات کو شاعری کی زبان کچھ اس طرح دی کہ :

ہے مشق سخن جاری، چکی کی مشقت بھی
کیا طرفہ تماشا ہے، حسرت کی طبیعت بھی

اور ان سب باتوں سے کہیں زیادہ اہمیت کی حامل وہ خود اعتمادی تھی کہ تحریک خلافت جس کا ماخذ ثابت ہوئی پہلی بار برصغیر کے مسلمانوں کو اس حقیقت کا ادراک ہوا کہ انگریز جس سے حال ہی میں وہ ٹکر لے چکے تھے، نہ تو انہیں اس کی حفاظتی سرپرستی کی ضرورت ہے اور نہ ہی وہ کانگریس کی شرائط تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔ درحقیقت تحریک خلافت کی ہمہ گیر لہر کے باعث گاندھی کو بھی مصلحت کے پیش نظر احتجاج کرنے والوں کا ساتھ دینے پر مجبور ہونا پڑا۔ مسلم اقلیت کے اعتماد کو بحال کرنے کے حوالے سے تحریک خلافت ایک انتہائی اہم سنگ میل ثابت ہوئی۔

مسلمانوں کی سیاسی بیداری کی اسی طوفانی لہر کی باکمال راہنمائی کے ذریعے جناح اس قوم کو پاکستان کی منزل تک لانے میں کامیاب ہوئے۔ تحریک خلافت نے ایک ایسے رجحان کو جنم دیا جس سے راستے کی ہر رکاوٹ تباہ ہوئی، زنجیریں ٹوٹ گئیں اور تمام خفتہ توانائیاں بیدار ہو گئیں۔ اور ان سب عوامل نے مل کر وہ سیاسی اثاثہ تشکیل دیا جو بیس سال بعد مارچ ۱۹۴۰ء میں لاہور کے مقام پر مطالبہ پاکستان کی بنیاد بنا۔

اسی دوران مسلم بورژوازی بھی اپنی تشکیل کے ابتدائی مراحل میں تھا اور اس نے مسلم اکثریت کے علاقے میں جاگیردار کے ساتھ عہد و پیمان جوڑنے کا آغاز کر دیا تھا۔ یہ طبقہ، مسلم اکثریتی صوبوں میں اپنے ہندو مد مقابل کو قدم جمانے کا مزید موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔

ہندو اور مسلم بورژوازی دونوں پر امید تھے کہ بالآخر وہ انگریز سے تجارت، بینکاری اور صنعتیں

واپس لینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اس متنازعہ ماحول میں مسلمان بورژوازی کے لئے اپنے مخصوص علاقے اور منڈی کی خاطر تگ و دو کرنا ایک فطری امر تھا 20 مارچ 1927ء کی دہلی تجاویز اور بعد ازاں 1929ء کے 14 نکات میں ایسی کاوشوں کا عکس واضح نظر آتا ہے کہ جب مسلمانوں نے سندھ کو بمبئی سے الگ کرنے اور تمام اصلاحات کا دائرہ شمال مغربی صوبہ سرحد، بلوچستان اور مسلم اکثریت کے تمام علاقوں تک پھیلانے کا مطالبہ کیا اور اپنے اس مطالبے کو منوانے کی خاطر وہ مخلوط انتخابات کی ایک تبدیل شدہ شکل کو بھی قبول کرنے پر رضامند ہو گئے۔ اس مرحلے پر مسلم بورژوازی بھی پیش قدمی کا آغاز کر چکا تھا۔

ایک مختلف راستہ

لیکن مسلمانوں کی بدقسمتی یہ تھی کہ اگر وہ ایک قدم آگے بڑھاتے تو ان کے دو قدم پیچھے ہٹتے تھے۔ مجموعی طور پر ابھی تک وہ اپنے مقاصد کے بارے میں تذبذب اور پریشان فکری کا شکار تھے۔ کیا انہیں آگے بڑھنا، جدید تعلیم حاصل کرنا اور سائنسی علوم سے بہرہ ور ہونا چاہیے؟ یا مغرب اور دور جدید کی ہر شے سے دست کش ہو جانا چاہیے؟ خلافت اور ہجرت کی تحریکوں کے راہنما قدامت پسند علماء تھے۔ یہی لوگ مغربی اثرات کی راہ میں مزاحم بھی تھے۔ قدامت پسندوں کا یہی ذہنی انتشار، تحریک ہجرت کے حوالے سے ان کے لئے قوت متحرکہ بنا۔

اپریل 1920ء میں ایک فتویٰ جاری کیا گیا کہ اگر کوئی شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ اسے غیر مسلم حکومت کے تحت اپنے مذہبی فرائض سرانجام دینے کی آزادی حاصل نہیں تو اسے کسی مسلم ملک کی طرف ہجرت کر جانا چاہیے۔ اس فتوے کے نتیجے میں تقریباً 20 ہزار مسلمان اپنا مال واسباب، زمینیں، مکان اور جائداد کوڑیوں کے مول بیچ کر نزدیک ترین ہمسایہ مسلم ملک افغانستان کے لئے عازم سفر ہوئے لیکن افغان حکومت نے ان خود ساختہ مہاجرین کی قطعاً کوئی اعانت نہ کی۔ بہت سے لوگ سفر کی صعوبتوں کا مقابلہ نہ کر سکے اور تھکن، سردی یا بھوک کے ہاتھوں جان سے گئے۔ بچے کھچے لوگ دل شکستہ اور کوڑی کوڑی کے محتاج ہو کر واپس آ گئے۔

جمعیت العلمائے ہند کی کلکتہ کانفرنس میں 6 ستمبر 1920ء کو ایک قرارداد منظور کی گئی جس کے مطابق وہ 'دشمنان اسلام' جنہوں نے خلیفہ کو معزول کر کے اپنی کھلی اسلام دشمنی کا ثبوت دیا تھا، ان کے ساتھ مکمل عدم تعاون کی اپیل کی گئی۔ لوگوں سے کہا گیا کہ وہ اپنے خطابات اور اعزازی فرائض سے سبکدوش ہو جائیں، سرکاری تقریبات کا مکمل بائیکاٹ کریں اور تمام سرکاری یا سرکاری امداد سے چلنے

والے تعلیمی اداروں میں اپنے بچوں کو تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہ دیں۔

بیرسٹر محمد علی جناح ان اعلانات سے بے تعلق اور الگ تھلگ رہے۔

اگرچہ صاحب بصیرت اور بذلہ سنج شاعر اکبر الہ آبادی کا انتقال 1921ء میں ہو چکا تھا لیکن ان کے ایسے اشعار جو مغرب اور اس کی اقدار کا تمسخر اڑاتے تھے، قدامت پسندوں کا ہتھیار اور مغربی اطوار اور طرز فکر سے ان کی برگشتگی کے اظہار کو نمایاں کرنے کا ذریعہ بنے۔ اور جو باتیں اکبر طنز و مزاح کے لہجے میں کہتے 'قدامت پسند اسے انتہائی سنجیدگی سے لیتے اور اکثر تسلیم ہی کرتے تھے کہ:

بقول ڈارون حضرت انساں تھے بوزنا
ہم کو باور آ گیا یورپ کے انساں دیکھ کر

بے پردہ کل جو نظر آئیں چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

لیکن اس تذبذب، انتشار اور افراتفری کے محرکات میں سب سے نمایاں عنصر یہ تھا کہ برصغیر کے مسلمان ابھی تک ایک ولولہ انگیز اور غیر متنازعہ لیڈر سے محروم تھے۔

اس عرصے کے دوران وادی سندھ کے مسلم طبقوں میں سے اگر کسی نے معاشی توانائی کا مظاہرہ کیا تو وہ کراچی اور بمبئی کے ساحلی علاقوں میں آباد تجارت پیشہ خوجے، میمن اور بوہرے تھے جو اپنے ہندو ہم وطنوں کی طرح تعلیم، کاروبار، وکالت، تجارت اور صنعت کے شعبوں میں آگے بڑھنے پر مائل تھے۔ بعد ازاں یہی لوگ تحریک پاکستان کا عمل انگیز عنصر ثابت ہوئے۔

دریائے سندھ کے بالائی علاقوں میں آبپاشی کی جدید سہولتیں میسر آنے کے باعث جاگیردار مسلم اشرافیہ کا ایک نیا طبقہ وجود میں آ چکا تھا۔ پنجاب میں کیمبل پور (اٹک)، میانوالی، شاہ پور، جھنگ، ملتان اور مظفر گڑھ کے اضلاع میں اراضی کے وسیع رقبے اور جاگیریں تقسیم کی گئیں جب کہ منٹگمری (ساہیوال) اور لائل پور (فیصل آباد) کے علاقوں میں یہ نو آبادکاری، اراضی کے چھوٹے قطعات پر مشتمل تھی۔

اس طرح دو مختلف علاقوں یعنی ایک طرف ہندوستان کے مغربی ساحل اور دوسری جانب پنجاب سے دو مختلف کرداری خصوصیات کے لیڈر سامنے آئے۔ پنجاب سے جاگیرداروں اور زمینداروں کا

نمائندہ اور یونینسٹ پارٹی کا بانی' سر فضل حسین ابھرا' اور وادی سندھ کے جنوبی ساحلوں نے ابھرتی ہوئی مگر فی الوقت کمزور مسلم بورژوازی کے نقیب سر محمد علی جناح کو جنم دیا۔

زیاں آور غلط فیصلہ

دوسری طرف 1920ء کے لگ بھگ 'گاندھی اور نہرو جیسے رہنماؤں کی قیادت میں کانگریس ہندوؤں کے دل کی گہرائیوں میں اتر کر عوام کی جماعت بن چکی تھی جب کہ مسلم لیگ کو ابھی تک وسیع پیمانے پر عوامی تائید حاصل نہیں ہو سکی تھی۔ گاندھی کے راہبانہ طرز زندگی اور منکسر المزاجی نے اسے دیہی ہندوستان کے ہندوؤں کا مقبول ترین لیڈر بنادیا حالانکہ انہی عادات واطوار اور نیم لباسی کی وجہ سے لندن کی گول میز کانفرنس کے دوران اسے 'ننگا فقیر' جیسے تضحیک آمیز الفاظ سے نوازا گیا تھا۔ چند مناسب مواقع پر ستیہ گرہ اور قید وبند کی صعوبتیں جھیلنے کے باعث گاندھی کو بے پناہ عوامی مقبولیت حاصل ہو چکی تھی۔ 1928ء میں سائمن کمیشن Simon Commission کے قیام سے کانگریس کی مقبولیت اور بڑھی کیونکہ کانگریس عوام کو اس ایک نکتے پر متحرک کرنے میں کامیاب رہی تھی کہ سائمن کمیشن کا کوئی ایک رکن بھی دیسی نہیں تھا۔

کانگریس کی اس تحریک کو بہت مقبولیت اور وسیع عوامی حمایت حاصل ہوئی۔ اپنی جدوجہد کی کامیابی پر کانگریس اس قدر نازاں تھی کہ وہ مسلم لیگ کو ایک ایسا بے ضرر اور غیر اہم وجود سمجھنے لگی جسے وقت گزرنے کے ساتھ خود ہی اپنی بے بضاعتی کا علم ہو جانا تھا۔ کانگریس کی قوت اور غیر متنازعہ حیثیت کے باعث مسلم لیگ کو اس کا مطیع بن کر رہنا تھا۔ 1928ء کی نہرو رپورٹ اس کانگریسی رجحان کی پوری طرح آئینہ دار ہے کیونکہ موتی لال کمیٹی کے اس رپورٹ کو ضابطہ تحریر میں لانے سے پہلے ہی یہ طرز فکر کانگریسی لیڈروں کے ذہن میں جاگزیں ہو چکا تھا۔ اس رپورٹ میں مسلمانوں اور مسلم لیگ دونوں کو مکمل طور پر نظر انداز کیا گیا تھا۔ کانگریس کے نزدیک یہ دونوں سمت اور قیادت سے محروم تھے جب کہ کانگریس کو بین الاقوامی شہرت یافتہ گاندھی کی شکل میں ایک مستحکم قیادت حاصل ہو چکی تھی۔

مسلم لیگ ابھی اپنے تضادات اور داخلی خلفشار کا شکار تھی اور کانگریس قیادت نے اس مرحلے پر مسلم لیگ کے بارے میں شاید سوچنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔

لیکن کانگریس سے اندازے کی غلطی سرزد ہو چکی تھی۔ کانگریسی قیادت کے نزدیک محمد علی جناح کا عوامی رہنما کے طور پر ابھرنا' بعید از قیاس تھا۔ اپنے انداز فکر، اپنے طرز زندگی اور دوسرے سینکڑوں حوالوں سے وہ گاندھی کے قطعی برعکس تھے۔ وہ عمدہ تراش کے بہترین 'سیوائل رو Savile Row

برانڈ کے سوٹ زیب تن کرتے۔ انہیں انگریزی زبان پر مکمل عبور تھا اور ان کی پر شکوہ اور متاثر کن آواز انگریزوں کے لئے بھی قابل رشک تھی۔ جناح وائسرائے سے مرعوب تھے نہ بادشاہ سے۔ لندن میں پریوی کونسل کی بار میں اپنی کامیاب وکالت کے باعث وہ اپنے برطانوی ہمعصروں کی نظر میں لائق احترام تھے۔ کانگریس کی نظر میں یہ تمام خصوصیات یکجا ہو کر ایک ایسی نخوت کی آئینہ دار تھیں جو محمد علی جناح کے مسلمانوں کا عوامی رہنما بننے کی راہ میں حائل تھیں۔ ایک کانگریس لیڈر نے تو جناح کو "بگڑا ہوا بچہ" قرار دیا تھا۔

کانگریس قیادت پر امید تھی کہ گاندھی کی چادر اور نہرو کی ٹوپی آخر کار سیوائل رو Savile Row اور بانڈ سٹریٹ Bond Street کے سوٹوں کو مسترد کرانے میں کامیاب رہے گی۔ اندازے کی یہ غلطی کانگریس کو بہت مہنگی پڑی۔

30

وادیٔ سندھ کے جنگجو سورما

مراعات اور ہوشمندی کا فقدان

ہندوستان کے حوالے سے انگریز جڑواں لیکن متضاد حکمت عملی پر عمل پیرا تھے۔ وہ ابتدا ہی میں ہندوستان کے بورژوازی کی بے چینی کو محسوس کر چکے تھے اور صدی کے آغاز ہی سے اس کے تدارک کی سعی کر رہے تھے۔ ایک طرف تو وہ بورژوازی کو رعائتیں دے کر مطمئن بھی کرنا چاہتے تھے لیکن دوسری طرف کسی بھی طرح کی بدامنی کو بزور طاقت کچلنے کے لئے تیار تھے۔

برطانوی حکومت نے مقامی سول سروس کو دیسی رنگ دینے کے عمل کا آغاز کر دیا تھا کیونکہ یہ وہی طبقہ تھا جس نے 1857ء کی جنگ آزادی میں اپنے غیر ملکی آقاؤں سے وفاداری کا بھرپور مظاہرہ کیا تھا۔ 1892ء اور 1909ء کے انڈین کونسلز ایکٹ Indian Councils Act (جنہیں بعد ازاں منٹو مورلے اصلاحات Minto-Morley Reforms بھی کہا گیا) نسبتاً زیادہ پڑھے لکھے مقامی افراد کو حاصل ہونے والی اولین مراعات تھیں۔

دوسری طرف نوآبادیاتی طاقت نے بورژوازی تحریک کی طرف سے مزید معاشی آزادیوں کے مطالبے کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ 1905ء میں بنگال کی تقسیم برصغیر کے مسلمانوں کو خوش کرنے کی ایک کوشش تھی۔ لیکن بعد میں ہندوؤں کی سودیشی تحریک کے دباؤ میں بنگال کی تقسیم کالعدم قرار دے دی گئی۔ اگرچہ بنگال لانسرز جس کی اکثریت مسلمان سپاہیوں پر مشتمل تھی (لیکن اب اس میں اودھ کی سابقہ ریاستی حدود اور پنجاب سے نفری بھرتی کی جانے لگی تھی) اس رجمنٹ کی اہمیت اپنی جگہ

برقرار رکھی گئی۔

اس دوران حکومت کو چند دہشت گرد تحریکوں کا سامنا بھی تھا۔ ہندومت کے احیاء کے لئے "پونا سوسائٹی" سرگرم عمل تھی۔ جس مجسٹریٹ نے اس تنظیم کے ایک رکن کو سزا سنائی تھی، اسے گولی مار دی گئی۔ ساور کر بھائیوں کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ بنگال میں بھی اسی قسم کی مزاحمتی تحریک جنم لے رہی تھی۔ مگر ہمارا موضوع چونکہ وادی سندھ ہے اس لئے ہماری زیادہ توجہ بھی اسی طرف رہے گی۔

انگریز کے اعصاب پہلی بار تو اس وقت جواب دے گئے تھے جب 1911ء میں بنگال کی تقسیم کالعدم قرار دی گئی اور اب دوسری بار اس کے اعصاب کی کمزوری اپریل 1919ء میں جلیانوالہ باغ کے قتل عام کی صورت میں سامنے آئی۔ جبر واستبداد اور سرکاری دہشت گردی کے بھیانک اثرات نے 1919 کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ Government of India Act (مونٹیگ چیمسفورڈ اصلاحات) Montague Chelmsford Reforms کے اثرات کو بھی گہنا دیا تھا۔

مقروض دہقان اور "پنجابیانے کا عمل"

وادی سندھ میں بہت سی زیر زمین مزاحمتی تحریکوں نے جنم لیا۔ اس نمو کے پیچھے کئی ٹھوس وجوہات تھیں۔ اگرچہ ان کے بارے میں سرکاری اور روایتی مورخین نے کچھ زیادہ نہیں لکھا لیکن برصغیر میں سامراج کے براہ راست تسلط کی زنجیریں توڑنے میں ان تحریکوں نے بہت اہم کردار ادا کیا۔

وادی سندھ کا وسیع رقبہ بیک وقت برصغیر کے خوشحال ترین علاقوں میں سے بھی تھا اور قرض کے بے پناہ بوجھ تلے دبا ہوا بھی۔ جس کا اندازہ اس امر سے باآسانی لگایا جا سکتا ہے کہ پنجاب میں سود پر قرض دینا، زراعت کے بعد سب سے اہم کاروبار تھا۔ اس صدی کی دوسری دہائی کے اوائل میں ایک تخمینے کے مطابق ہر زمیندار اوسطاً 463 روپے کا مقروض تھا۔ اس دور میں روپے کی مالیت کے حوالے سے یہ ایک خطیر رقم تھی۔ بعد ازاں کساد بازاری کے دور میں تو یہ بوجھ کئی گنا بڑھ گیا۔

لیکن برطانوی راج نے پنجاب کے بدحال کسان کے لئے آمدنی کا ایک اور راستہ کھول دیا تھا۔ اس کے لئے ہندوستان کی شاہی افواج میں معمولی حیثیت کی ملازمت کا حصول دشوار نہیں تھا۔ جلیانوالہ باغ میں جب قتل عام ہوا تو مائیکل اوڈائر Michael O' Dwyer پنجاب کا گورنر تھا، اس نے لکھا ہے کہ "لارڈ رابرٹ Lord Robert اور لارڈ کچنر Lord Kitchener جیسے عظیم عسکری ماہرین کے دلائل ناقابل تردید ہیں کہ اگر ہندوستان کے 30 کروڑ عوام کو قابو میں رکھنے کے لئے صرف 75 ہزار

برطانوی (جن کی تعداد اب صرف 60 ہزار کے لگ بھگ رہ گئی ہے) اور ایک لاکھ 60 ہزار مقامی فوجی کافی ہیں تو پھر ہندوستان سے بہترین افرادی قوت کا انتخاب نہ کرنا دانشمندی سے بعید ہو گا اور ایسی افرادی قوت کی اکثریت صرف پنجاب ہی سے دستیاب ہو سکتی ہے۔"

لہذا اب ہندوستان کی سامراجی فوج کو 'پنجابیانے' کا عمل شروع ہوا اور پنجاب کو برصغیر کا 'بازوئے شمشیر زن' کہا جانے لگا۔ 1862ء میں انڈین آرمی کی 131 پیادہ یونٹوں میں سے 28 کا تعلق پنجاب سے تھا جب کہ نئی صدی کے آغاز تک پنجابی فوجیوں کا تناسب بہت بڑھ چکا تھا۔

انگریز کی مجبوری اب یہ تھی کہ پنجاب کے کسان فوجیوں کو قرض کے تباہ کن بوجھ سے نجات دلائی جائے۔ سن 1900ء میں 'لینڈ ایلی نیشن ایکٹ' Land Alienation Act نافذ کیا گیا جس کے تحت غیر زراعت پیشہ قرض خواہوں کا مقروض کسانوں کی زمین پر قبضہ کرنا غیر قانونی قرار پایا۔ اس ضابطے کے پس پردہ ایک اور مقصد بھی کار فرما تھا کہ زرعی اراضی کی تقسیم در تقسیم کے عمل کو سست بنایا جائے۔ مزید کچھ اور اصلاحی اقدامات بھی کئے گئے لیکن وہ زیادہ موثر ثابت نہیں ہوئے۔ لگان کی وصولی اور اس کی شرح میں اضافے سے نہ صرف معاشرتی اصلاحات کے تمام اثرات زائل ہوئے بلکہ عوام کے فوری احتجاج کو بھی ہوا ملی۔ جب 1907ء میں آبیانے کی شرح بڑھائی گئی تو پنجاب نے اس کے خلاف بغاوت کر دی حکومت کو یہ اضافہ واپس لینا پڑا۔

1914ء میں جب پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو انڈین آرمی کے 121 یونٹوں میں سے 57 پنجابی یونٹ تھے۔ پنجابی فوجیوں پر اس درجہ انحصار کا تقاضا تھا کہ حکومت ان فوجیوں کے گاؤں اور گھر کے حالات مزید بہتر بنانے پر توجہ دیتی۔

پہلی جنگ عظیم کا آغاز ہوتے ہی استعماری حکومت نے پنجاب اور ملحقہ علاقوں سے وسیع پیانے پر فوجی بھرتی شروع کر دی اور یوں مقروض کسانوں کی بہت بڑی تعداد نے فوج میں ملازمت اختیار کر لی۔ ان کے نزدیک یہ ایک فیصلہ کن تبدیلی کا آغاز تھا۔

اس جنگ کے دوران پنجاب کے دہقان فوجی کو دنیا کے مختلف خطوں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ اس نے ایسی ایسی سرزمین اور وہ جدید ٹیکنالوجی دیکھی جس کا تصور بھی اس کے لئے محال تھا۔ لہذا اس کا اپنی محدود سوچ سے باہر نکل آنا ایک فطری امر تھا۔ اس میں وسعت نظر بھی پیدا ہوئی کیونکہ اپنے گاؤں کے محدود ماحول سے نکل کر اب اسے بیرونی دنیا اور خاص طور پر زار کے زمانے کے روس کو دیکھنے کا موقع ملا جہاں نئے معاشرتی نظام کی تازہ ہوا کے جھونکے چلنے لگے تھے۔

جنگ کے اختتام پر جب وہ بیل گاڑی، ہل اور قرض میں جکڑے ہوئے اپنے گاؤں کے ماحول میں

واپس آیا تو اس کے دل و دماغ نئے خیالات سے معمور تھے۔ باقاعدہ پنشن کے باعث اس کی آمدنی بھی قدرے محفوظ تھی۔ نگر نگر سے گھوم کر واپس آنے والے اس 'جگ دیکھی' کے پاس اپنے سجنوں کو سنانے کے لئے نت نئی داستانیں تھیں جس نے اس کے سماجی مرتبے اور اہمیت میں اضافہ کر دیا تھا۔ اس بڑھتے ہوئے اثر و نفوذ کا اظہار لوک گیتوں میں بھی کثرت سے ہونے لگا۔

وسنا فوجی دے نال ۔ پانویں بوٹ سنے لت مارے

"میں تو اپنے فوجی کے ساتھ زندگی گزار دینا چاہتی ہوں خواہ وہ اپنے فوجی بوٹ سمیت مجھے ٹھڈے مارے۔"

سرکشی کے مقدمات اور جلیانوالہ باغ

محاذ پر جانے والے بہت سے فوجی واپس نہیں آئے۔ انہیں روس کے کیمونسٹ انقلاب میں اتنی دلکشی نظر آئی کہ وہ فوج سے فرار ہو کر دور افتادہ سرزمینوں میں سامراج کے خلاف صف آراء ہو گئے۔ دوسرے تارکین وطن بھی ان جدید نظریات سے روشناس ہوئے۔ امریکہ میں ایسے کچھ گروہوں نے مل کر 1913ء میں ایک غدر پارٹی تشکیل دی۔ اس پارٹی کے کم و بیش سبھی اراکین کا تعلق پنجاب سے تھا اور اس میں اکثریت سکھوں کی تھی۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران معاندانہ سرگرمیوں کا آغاز ہوتے ہی غدر پارٹی نے تارکین وطن سے کہا کہ وہ ہندوستان واپس پہنچ کر انگریز کے خلاف صف آراء ہو جائیں۔ ایک اندازے کے مطابق آٹھ ہزار افراد اس اپیل پر لبیک کہتے ہوئے وطن واپس پہنچے۔ ان میں چار سو گرفتار ہوئے اور ڈھائی ہزار کو ان کے آبائی دیہات میں نظر بند کیا گیا۔ مبینہ بغاوت کچل دی گئی اور لاہور کے پہلے مقدمہ بغاوت کا آغاز ہوا۔ اس سازش کیس میں گرفتار شدگان میں سے 291 افراد پر مقدمہ چلا۔ ان میں سے 42 کو سزائے موت سنائی گئی۔ 114 نے عمر بھر کے لئے 'کالے پانی' کی سزا پائی اور 42 افراد بری کر دیئے گئے۔ حکومت برطانیہ نے امریکہ سے یہ بھی مطالبہ کیا کہ ان کے ملک میں موجود غدر پارٹی کے باقیماندہ اراکین کے خلاف بھی سخت قدم اٹھایا جائے۔ وہاں سان فرانسسکو سازش کیس کے تحت عدالتی کارروائی ہوئی اور متعدد تارکین وطن پر جرم ثابت کر کے انہیں جیل بھیج دیا گیا۔

ایسے سخت گیر اقدامات کے باوجود، جنگ عظیم کے ختم ہوتے ہوتے ہندوستان کی سامراجی حکومت کے اعصاب شل ہو چکے تھے۔ اگرچہ ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ مجریہ 1915ء جس کے تحت شہری آزادیاں بے طرح مجروح ہوئی تھیں اور جسے محض حالت جنگ کے پیش نظر نافذ کیا گیا تھا، اب

ایک کمیٹی کی سفارش پر اس کادورانیہ اور دائرہ کار جنگ کے بعد کے دنوں تک بڑھادیا گیا۔ کمیٹی کی سربراہی جسٹس رولٹ Rowlatt نے کی۔ مارچ 1919ء میں 'رولٹ ایکٹس' 'Rowlatt Acts' بہ عجلت امپیریل لیجسلیٹو کونسل Imperial Legislative Council سے بھی منظور کرا لئے گئے۔ بر صغیر کے طول و عرض میں ان قوانین پر شدید رد عمل، مایوسی اور افسوس کا اظہار کیا گیا۔

رولٹ ایکٹ کے نفاذ پر کونسل سے مستعفی ہونے والے اراکین میں بیرسٹر محمد علی جناح بھی تھے۔ کونسل سے مستعفی ہوتے ہوئے نوجوان بیرسٹر جناح نے اپنے غم اور غصے کا برملا اظہار کیا۔ انہوں نے لکھا کہ رولٹ ایکٹ نے "انصاف کے بنیادی اصولوں اور عوام کے آئینی حقوق کو جڑ سے اکھاڑ دیا ہے۔ اور یہ ایسے وقت کیا گیا کہ جب ریاست کو کوئی خطرہ در پیش نہیں۔" وہ اس صورت حال سے سمجھوتہ کرنے کو تیار نہ تھے۔ پنجاب کے گلی کوچوں میں بھی اس ایکٹ کے خلاف رد عمل شدید تھا جہاں عوامی اجتماعات پر مکمل پابندی عائد کر دی گئی۔

اور یہ 13 اپریل 1919ء کا واقعہ ہے، دس ہزار کے لگ بھگ عورتیں، مرد اور بچے جن کی اکثریت نواحی دیہات کے کسانوں پر مشتمل تھی، پنجاب کے شہر امرتسر میں جلیانوالہ باغ کے مقام پر اکٹھے ہوئے۔ جنرل ڈائر Gen. Dyer نے اپنے گورکھا اور بلوچ جوانوں کے ذریعے اس اجتماع کو محاصرے میں لے لیا۔ باغ سے باہر نکلنے کا واحد تنگ راستہ بھی بند کر دیا گیا اور کسی پیشگی انتباہ کے بغیر نہتے ہجوم پر فائر کھول دیا۔ چار سو افراد موقعے پر ہلاک اور 12 سو زخمی ہوئے۔ اس سانحے کے خلاف متوقع رد عمل کی پیش بندی کرتے ہوئے گورنر مائیکل اوڈائر Michael O'Dwyer کے حکم سے پنجاب میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔

برطانوی راج کے اس جبر و استبداد کے باوجود سامراج دشمن جذبات پورے برصغیر میں پھیلتے چلے گئے۔ وادی سندھ پر مشتمل علاقے برطانیہ کے خلاف نفرت کے اظہار میں پیش پیش تھے۔ مسلمانوں کا ایک مخصوص طبقہ تو خلافت اور ہجرت کی تحریکوں کی طرف مائل رہا تھا لیکن دوسرے طبقات نے سامراجی قوت کے اس پہلو پر حملہ کیا جہاں اسے شدید زک پہنچائی جا سکتی تھی۔ اس پہلو کا تعلق سامراجی تجارت اور بیوپار سے تھا۔

ستمبر 1921ء میں لاہور کے ایک بڑے عوامی اجتماع میں درآمدی ملبوسات کو نذر آتش کیا گیا اور ایک اندازے کے مطابق تقریباً 50 ہزار ملبوسات جلائے گئے۔

دریں اثناء 1920ء کے عشرے میں بھی سازش کے مقدمات کا سلسلہ جاری رہا۔ وہ باغی گروپ جن کے بہت سے اراکین نقل مکانی کر کے کمیونسٹ روس چلے گئے تھے جب واپس آئے تو انہیں گرفتار

کر لیا گیا اور 1921ء سے 1924ء کے دوران پشاور میں یکے بعد دیگرے چلائے جانے والے سازش کے چار مختلف مقدمات میں سزاوار ٹھہرا کے پس دیوار زنداں دھکیل دیا گیا۔

بیسویں صدی کی اس فیصلہ کن دہائی میں ایسی بہت سی تنظیمیں اور مزاحمتی گروہ وجود میں آئے جو اکتوبر کے انقلاب روس سے متاثر تھے۔ مشن کالج پشاور کے ایک استاد، غلام حسین نے لاہور سے 'انقلاب' کے نام سے ایک کیمونسٹ اخبار جاری کیا۔ جلد ہی اسی نام سے ایک گروپ بھی وجود میں آگیا جس کا ہندوستان کی تمام کیمونسٹ تنظیموں سے رابطہ تھا۔ اس تنظیم کے کچھ خفیہ پیغامات اور خطوط بھی پکڑے گئے اور کانپور سازش کیس کے تحت اس میں ملوث افراد کو سزائیں سنادی گئیں۔ غلام حسین کے بارے میں شبہ تھا کہ وہ سرکاری گواہ بن چکا ہے لیکن 1818ء کے ریگولیشن III کے تحت اسے بھی قید بھگتنا پڑی۔

اگرچہ غدر پارٹی کی مزاحمتی سرگرمیوں کو سختی سے کچل دیا گیا تھا لیکن پارٹی کے جریدے 'کرتی' نے کرتی کسان پارٹی کو فکری توانائی بخشی۔ 1928ء میں روہتک اور لائل پور کی کانفرنسوں کے انعقاد میں اس جریدے نے اہم کردار ادا کیا۔ ان اجتماعات کے ذریعے کسانوں اور مزدوروں کو سامراجی ٹیکسوں اور لگان میں کمی کے لئے متحد ہو کر جدوجہد کی تلقین کی گئی۔ کانگریس نے ان سوشلسٹ اور کیمونسٹ میلانات کو اس قدر اہمیت دی کہ بعد ازاں ہونے والی ایسی ہی ایک کانفرنس میں خود جواہر لعل نہرو نے شرکت کی۔

سائمن کمیشن اور بھگت سنگھ

وادی سندھ کے ایک سرگرم اور جوشیلے کارکن بھگت سنگھ نے 1926ء میں نوجوان بھارت سبھا کی بنیاد رکھی۔ لاہور کے مختلف کالجوں سے کچھ اور طالب علم بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔ تمام برصغیر کے مزدوروں اور کسانوں پر مشتمل ایک آزاد اور مکمل طور پر خود مختار سیاسی وحدت قائم کرنا اور نوجوانوں کے دل میں جذبہ حب الوطنی پیدا کرنا، بھارت سبھا کے دو بنیادی مقاصد تھے۔ کانگریس اور تحریک خلافت کے بہت سے اہم اراکین سبھا میں شامل ہو گئے۔

لیکن بھگت سنگھ اور اس کے ساتھی ہندوستان کی سیاسی پارٹیوں اور دوسری سیاسی تنظیموں کی کارکردگی سے سخت نالاں تھے۔ ان کے سروں میں انقلاب کا سودا سمایا ہوا تھا اور وہ ایک پرشکوہ تحریک کے خواب دیکھ رہے تھے۔

دوسری طرف خود ترکوں کی جانب سے اپنے نظام خلافت کو ختم کر دینے کے بعد ہندوستان میں

تحریک خلافت خاصی شرمندگی کے عالم میں دم توڑ رہی تھی۔ کانگریس نے بھی کم از کم وقتی طور پر عوام کو متحرک کرنے کا ارادہ ترک کر رکھا تھا۔ حالانکہ اس سے پہلے ملک گیر ہڑتالوں اور احتجاجی رد عمل کے ذریعے سائمن کمیشن کو ناکام بنایا جا چکا تھا لیکن اس کے باوجود یوں لگتا تھا کہ برطانیہ بھی بتدریج آئینی تبدیلیوں اور انڈین قیادت کے ساتھ مصالحت کے امکانات کا جائزہ لے رہا ہے۔

سیاسی تعطل کے اس ماحول میں سبھا کے نوجوان اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھے۔ وہ تواتر کے ساتھ اپنے اجلاس منعقد کرتے اور اپنے مقاصد کے حصول کے لئے بڑے جوش و خروش سے ڈرامائی اقدامات کے منصوبے بنتے رہے۔ حکومت بھی ان کی سرکوبی کے لئے کسی مناسب موقعے کی تلاش میں تھی۔

سائمن کمیشن 30 اکتوبر 1928ء کو لاہور آیا۔ اس کی آمد کے خلاف لاہور کی سڑکوں پر شدید احتجاجی مظاہرہ کیا گیا۔ مظاہرین 'سائمن واپس جاؤ' کے نعرے لگاتے ہوئے دہلی گیٹ سے لنڈا بازار کے راستے ریلوے سٹیشن کی طرف بڑھ رہے تھے۔ سٹیشن سے چند سو گز دور، پولیس نے انہیں روکنے کے لئے بڑے ظالمانہ انداز میں لاٹھی چارج کیا۔ لالہ لاجپت رائے جنہیں شیر پنجاب کہا جاتا تھا، اس ہنگامے کے نتیجے میں شدید زخمی ہوئے اور چند ہفتے بعد، زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے راہی ملک عدم ہوئے۔ پولیس کے خلاف عوامی رد عمل میں شدت تھی۔ سبھا کے بعض جوشیلے عسکریت پسندوں نے انتقام لینے کی قسم کھائی۔

17 دسمبر 1928ء کو ایک انگریز پولیس افسر سانڈرس Saunders گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ اس قتل نے حکومت کو مطلوبہ بہانہ فراہم کر دیا تھا۔ سبھا کے 19 کارکنوں پر قتل کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا۔ بھگت سنگھ بھی ان میں شامل تھا لیکن وہ بری ہو گیا کیونکہ قتل کا واحد عینی شاہد انگریز پولیس افسر اسے عدالت میں شناخت نہ کر سکا۔

ذرا ملاحظہ کیجئے کہ "پولیس مقابلہ" تو کجا انگریز کے وقت میں پولیس کا گواہ پولیس افسر ہی کے قتل پر جھوٹی شہادت بھی دینے کو تیار نہیں تھا۔

پھر 10 اپریل 1929ء کو ایک اور واقعہ پیش آیا۔ دہلی کی مرکزی قانون ساز اسمبلی میں پبلک سیفٹی بل Public Safety Bill پر بحث ہو رہی تھی۔ ولبھائی پٹیل کرسی صدارت اور سر جان سائمن معزز مہمانوں کی مخصوص گیلری میں براجمان تھے۔ اچانک ایوان میں یکے بعد دیگرے دستی بموں کے دو دھماکے ہوئے۔ دو گولیاں پستول سے بھی چلائی گئیں لیکن کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔ ایوان کی گیلریوں سے پمفلٹ بھی گرائے گئے جن میں 'انڈین سوشلسٹ ری پبلک آرمی' کی طرف سے انگریز کو فوری طور

برِ صغیر سے نکل جانے کا حکم دیا گیا تھا۔ اسمبلی کے ایوان میں ہر طرف دھواں پھیلا ہوا تھا۔ بھگدڑ کے نتیجے میں چند اراکین اسمبلی کو معمولی زخم آئے لیکن کوئی بھی شدید زخمی نہیں ہوا۔

بھگت سنگھ اور اس کے قریبی ساتھی دت نے اس واقعے کے سلسلے میں خود کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ ان پر اقدام قتل اور دھماکہ خیز مواد رکھنے کا الزام عائد کیا گیا۔ دونوں نے بے قصور ہونے کا دعویٰ کیا اور اپنے بیان میں کہا کہ ان کا مقصد تو صرف سنسنی پھیلانا تھا ورنہ اگر وہ چاہتے تو وہاں موجود بہت سے افراد کو ہلاک بھی کر سکتے تھے لیکن وہ تو محض دنیا کی توجہ برِ صغیر سے اٹھنے والی صدائے احتجاج کی جانب مبذول کرانا چاہتے تھے۔ انہوں نے ہندوستان میں برپا ہونے والے متوقع انقلاب کے حوالے سے بھی حکومت برطانیہ کو متنبہ کیا۔ بھگت سنگھ اور دت کو عمر قید کی سزا سنائی گئی لیکن مستقبل قریب میں دونوں کا جان سے گزر جانا ٹھہر گیا تھا۔

شجاعت بھی تفریق کے زہر کا تریاق نہ ہوئی

بوکھلائی ہوئی سامراجی حکومت نے بلا امتیاز و بلا جواز گرفتاریوں کا وسیع سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ سینکڑوں کارکنوں کو گرفتار کر کے مقدمے چلائے گئے۔ خطوط سنسر کئے جانے لگے۔ میرٹھ میں غداری کا ایک مقدمہ پہلے ہی چل رہا تھا، اور دوسرا لاہور میں شروع ہو چکا تھا اس کے باوجود دسمبر 1929ء میں وائسرائے کی خصوصی ٹرین پر دہلی کے قریب نظام آباد ریلوے سٹیشن پر بم پھینکا گیا۔ بھگت سنگھ کے ایک اور ساتھی چندر شیکھر آزاد کو اس دھماکے کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔

دوسرے بہت سے افراد کے علاوہ بھگت سنگھ اور چندر شیکھر پر لاہور سازش کیس کے تحت مقدمہ چلا۔ اس مقصد کے لئے ایک خصوصی آرڈیننس جاری کیا گیا اور اکتوبر 1930ء میں ان دونوں کو سزائے موت سنا دی گئی۔ بھگت سنگھ اب ایک قومی ہیرو بن چکا تھا اور برِ صغیر کے عوام کی ایک بہت بڑی اکثریت نے اس کے آدرش سے یکجہتی کا اظہار کیا البتہ اہم سیاسی جماعتیں الگ تھلگ رہیں۔ اپریل 1931ء میں بھگت سنگھ اور آزاد دونوں پھانسی کے پھندے کو چوم کر امر ہو گئے۔

مزاحمت اور جدوجہد کے ان ایام میں بھگت سنگھ کے ایک ساتھی جتن داس نے جیل میں ایک نئی تاریخ رقم کی۔ قیدیوں کی کسمپرسی اور ان کی حالت زار پر احتجاج کرتے ہوئے جتن داس نے تامرگ بھوک ہڑتال کر دی اور کئی ہفتے موت اور زیست کی تکلیف دہ کشمکش میں مبتلا رہ کر بالآخر راہی ملک عدم ہوا۔ اس کی قربانی رائیگاں نہیں گئی۔ انتظامیہ کو سیاسی قیدیوں کے بارے میں اپنا رویہ بتدریج تبدیل کرنا پڑا اور جیل کے ضابطوں میں اصلاح کا آغاز ہوا۔

اگر چہ ہندو، مسلمان اور سکھ نوجوان متحد ہو کر سامراجی حکومت کے خلاف مسلح جدو جہد کرتے رہے لیکن وسیع تر عوامی سطح پر انہیں پذیرائی حاصل نہ ہو سکی اور نہ ہی وہ مختلف فرقوں کے مابین ہم آہنگی اور یگانگت پیدا کرنے میں کامیاب رہے۔ جب لاہور کے ایک ہندو پبلشر نے پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں ایک توہین آمیز اور اشتعال انگیز کتاب 'رنگیلا رسول' شائع کی تو برصغیر کی دونوں بڑی قوموں کے درمیان دوری کی ایک وسیع خلیج حائل ہونے کا آغاز ہو چکا تھا۔ 9 اپریل 1929ء کو ایک عقیدت مند مسلم نوجوان علم دین نے 'رنگیلا رسول' کے پبلشر کو چھرا گھونپ کر ہلاک کر دیا۔ علم دین پر مقدمہ چلا اور اسے سزائے موت دی گئی۔ مسلمانوں نے علم دین کو ایک شہید اور قومی ہیرو کا رتبہ دیا۔

وطن کے بہت سے دلیر سپوتوں نے انفرادی اور گروہی سطح پر اپنے بہادرانہ مزاحمتی کارناموں کے ذریعے غیر ملکی سامراجی حکومت کے انداز فکر اور لاشعور پر گہرے اثرات مرتب کئے لیکن انہیں برصغیر کی عمومی سیاست میں غیر معمولی پذیرائی حاصل نہ ہو سکی۔

32

راستے جدا ہوئے

اقبال اور ریاست

19 ویں صدی کے تیسرے عشرے میں مسلمان اور ہندوؤں کی سوچ اور فکر کو وسیع پیمانے پر عوامی پذیرائی حاصل ہونے لگی تھی۔ دونوں قومیں علی الترتیب، تحریک خلافت کے دوران اور بعد ازاں سائمن کمیشن کے خلف عوامی ابھار کو منظم تحریک کی شکل دینے میں اپنی اپنی اہلیت وصلاحیت اور جوش و جذبے کا بھرپور مظاہرہ کر چکی تھیں۔ یہی وقت تھا جب ان کے درمیان دوری کی خلیج بھی تیزی سے وسعت اختیار کر رہی تھی اور مخالف سمتوں میں سفر کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔

یہ ایک فیصلہ کن مرحلہ تھا۔ شاعر و مفکر سر محمد اقبال مسلمان قوم کے ایک جید سیاسی نظریہ ساز کی حیثیت حاصل کر چکے تھے اور ان کی طرف سے برصغیر کے مسلم اکثریتی علاقوں پر مشتمل علیحدہ اور خود مختار وفاقی اکائیوں کے قیام کی تجویز سامنے آچکی تھی۔ 1930ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے الہ آباد اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے اقبال نے اپنی تجاویز ''علیحدہ مسلم قومیتی نظریے'' کی صورت میں پیش کیں۔

اقبال نے متحدہ برصغیر کے نظریئے کو مسترد کرتے ہوئے بالاصرار کہا کہ :

''محض اس سوچ کے ساتھ اگر یہاں آئین تشکیل دیا گیا کہ برصغیر ایک ہمہ وحدت اکائی ہے یا اس ملک پر برطانوی جمہوری مزاج کے اصولوں کا اطلاق کیا گیا تو یہ ہندوستان کو نادانستہ طور پر خانہ جنگی کی طرف دھکیلنے کے مترادف ہوگا۔"

ان کا بنیادی مقصد پنجاب، شمال مغربی صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ریاست کی شکل میں متحد کرنا تھا۔ اس مرحلے پر اقبال برطانوی تسلط سے آزاد ایک ریاستی تشخص کے بارے میں قیاس آرائی ہی کر سکتے تھے۔ انہوں نے مزید کہا۔

"جہاں تک شمال مغربی ہندوستان کا تعلق ہے تو اس علاقے میں، سلطنت برطانیہ کے تحت یا اس سے الگ، ایک متحدہ اور علاقائی طور پر خود مختار مسلم حکومت کا قیام ہی مجھے مسلمانوں کی آخری منزل نظر آتا ہے۔"

یہ تنازعہ آج بھی جاری ہے کہ اقبال پاکستان میں جمہوری اصولوں کی حکمرانی چاہتے تھے یا کسی عوامی رائے کے اہتمام کے بغیر کلیتاً مذہبی جماعتوں کی حکومت۔ اقبال کے تصورات ہمیں باقاعدہ تحریری صورت میں ملتے ہیں لیکن چونکہ ان نگارشات کا ایک بڑا حصہ شاعری کی شکل میں سامنے آیا اس لئے ان کے نظریئے کی تاویلات میں اختلاف کی گنجائش بہر حال موجود رہی۔

البتہ 'اسلام میں مذہبی فکر کی تشکیل نو' کے موضوع پر خطبات اقبال کے علاوہ ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے الہ آباد اجلاس کے صدارتی خطاب سے ہمیں علامہ اقبال کی سوچ اور فکر کے بارے میں غیر مبہم اور غیر متزلزل راہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں ان کا صدارتی خطبہ زیادہ اہم ہے جس سے برصغیر کے مسلمانوں کے لئے ایک ریاست یا ریاستوں کے تصور کی ایک واضح تصویر سامنے آتی ہے۔ لیکن کیا اقبال ایک مسلم ریاست کی بات کر رہے تھے یا اسلامی ریاست کی؟ یہ سوال ہنوز ہمارے سامنے ہے۔ اقبال کے فرمودات کی روشنی میں ہمیں معروضیت کے ساتھ اس ابہام کا جائزہ لینا چاہیے تاکہ اس الجھن اور اس تفاوت کو دور کیا جا سکے۔

اقبال کا تصور مملکت

اقبال کے خطبہ الہ آباد کی مختلف توضیحات پیش کی جاتی ہیں جس میں ایک توضیح یہ بھی ہے کہ اقبال کا تصور مملکت ایک ایسی مذہبی ریاست ہے جس کی بنیاد اسلامی شریعت پر ہو۔ لیکن یہ دعویٰ کرنے والے عام طور پر خطاب کے وہ اہم حصے نظر انداز کر جاتے ہیں جن سے صاف عیاں ہے کہ اقبال نے قطعی طور پر ایسی مذہبی ریاست کی بات نہیں کی جہاں مذہبی جماعتوں کی حکومت ناگزیر ہو۔

1930ء میں اقبال کے سامنے سب سے اہم مسئلہ ہندوستان میں مسلم اقلیت کے مفادات کا تحفظ تھا۔ برصغیر کے مسلمانوں کو ہندو کے غلبے اور چودھراہٹ سے خطرہ تھا۔ اقبال کے نزدیک اگر مسلمانوں کو تحفظ کی ضمانت مل جاتی تو متحدہ ہندوستان کے ریاستی ڈھانچے میں رہتے ہوئے اس مئلے کا حل

نکل سکتا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ :

" میں جہاں تک مسلمان کے ذہن کو سمجھ پایا ہوں، مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ ایک مستقل فرقہ وارانہ معاہدے کے تحت اگر اس اصول کو ہمیشہ کے لئے تسلیم کر لیا جائے کہ برصغیر کا مسلمان اپنی ثقافت اور اپنی روایات کے مطابق زندگی گزارنے اور آگے بڑھنے کا مکمل اور آزادانہ حق رکھتا ہے تو وہ ہندوستان کی آزادی کے لئے اپنا سب کچھ داؤ پر لگانے کے لئے تیار ہو گا۔"

اب اس اہم بیان سے اس کے سوا کیا مطلب اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اگر متحدہ برصغیر کی حکومت اقلیتوں کے خصوصی حقوق کی ضمانت دے سکتی تو ایک علیحدہ ریاست کی ضرورت نہیں تھی؟ اگرچہ بعد کے حالات نے ثابت کر دیا کہ ایسا ممکن نہیں تھا لیکن غور طلب نکتہ یہ ہے کہ اقبال ایک مستقل آئینی انتظام کے تحت ایسی حکومت کے خواہاں تھے جو نہ تو صرف مسلمانوں پر مشتمل تھی اور نہ ہی لازماً اسلامی تھی۔

اقبال ایسی ممکنہ ریاست میں دوسری قوموں کے حقوق کی ضمانت بھی دیتے تھے (بعد ازاں محمد علی جناح نے بھی یہی نقطہ نظر پیش کیا۔)

"۔۔۔۔ نہ ہی ہندوؤں کو یہ خدشہ ہونا چاہیے کہ ایسی خود مختار مسلم ریاستوں کے قیام کا مطلب ان ریاستوں میں مذہبی حکومت کا قیام ہے۔"

یہ اقبال کے اپنے الفاظ ہیں۔ مقصد یہی نظر آتا ہے کہ ان کا مطمع نظر ایک ''مسلم ریاست'' کا قیام تھا (اقبال ہمیشہ اسے مسلم ریاست کہتے تھے نہ کہ اسلامی ریاست) تاکہ مسلمانوں کے معاشی، ثقافتی، مذہبی اور معاشرتی حقوق کا تحفظ کیا جا سکے۔ مسلم ریاست کے تصور کی وضاحت کرتے ہوئے اقبال نے تو یہاں تک ممکن سمجھا کہ :

"ایک مسلم ریاست کے تشخص کا اندازہ، انڈین بینکنگ انکوائری کمیٹی پر ٹائمز آف انڈیا کے ایک اداریئے سے ہوتا ہے۔ اخبار لکھتا ہے کہ قدیم ہندوستان میں، سود کی شرح قابو میں رکھنے کے لئے ریاست قوانین بناتی تھی لیکن مسلمان حکومتوں کے دور میں شرح سود پر کبھی پابندی نہیں عائد کی گئی حالانکہ اسلام واضح طور پر سود سے منع کرتا ہے۔"

ان حوالوں کے ساتھ اقبال نے ایک مستحکم مسلم ریاست کے قیام کا مطالبہ کیا۔ انہوں نے اپنی

اس تصوراتی ریاست کی ایک اور اہم خصوصیت کا ذکر بھی کیا اور خالصتاً علاقائی انتخاب کنندگان کی بات کی۔

"ہندوستان کے مسلمانوں کو کلیتاً علاقائی انتخاب کنندگان پر بھی کوئی اعتراض نہیں بشر طیکہ صوبوں کی حد بندی اس طرح کی جائے کہ ان میں لسانی، نسلی، ثقافتی اور مذہبی حوالے سے کم و بیش مشترکہ خصوصیات رکھنے والے گروہ آباد ہوں۔"

یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مذہب (مجوزہ ریاست کے) چار بنیادی خواص میں سے ایک تھا۔ اس کا ذکر یقیناً ایک علیحدہ اور ایسی منفرد خصوصیت کے طور پر کیا گیا ہے جسے ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ اور جیسا کہ ہم دیکھ ہی چکے ہیں، اقبال کے خیالات میں اس امر کی واضح یقین دہانی موجود ہے کہ مجوزہ مسلم ریاست میں مذہبی جماعتوں کی سیاست، حق حکمرانی کا حوالہ نہیں ٹھہرے گی۔ البتہ اگر کوئی بھی جماعت جمہوری اصولوں اور ضابطوں کے تحت عوام کی اکثریت کی تائید سے منتخب ہو کر آجاتی ہے تو اس کے حق حکمرانی کو تسلیم کیا جا سکتا ہے، مگر اس بناء پر نہیں کہ اس کا کوئی مخصوص نظریہ ہے محض اس حوالے سے کہ انتخابات میں اس جماعت نے ووٹ زیادہ حاصل کئے۔ لہذا یہ تصور آج کل کی مصر اور آذربائیجان (اور شاید ترکی بھی) کی اسلامی جمہوری ریاستوں جیسا تھا نہ کہ کسی غیر جمہوری اسلامی بادشاہت کے تصور کے قریب تر۔

تعطل کا خاتمہ

برصغیر کے مسلمانوں کے لئے علیحدہ ریاست یا ریاستوں کے قیام کی بات، اس صدی کی تیسری دہائی میں یقیناً ایک انوکھا سا تصور تھا۔ لیکن اس میں معجزاتی پیش بینی پنہاں تھی۔ یہ ایسا وقت تھا جب اہل بصیرت کی نظریں مستقبل پر تھیں لیکن مسلم قوم اس شعور سے عاری تھی۔ وہ ابھی تک اپنے لئے جداگانہ راستے کا تعین کرنے پر تیار نہ تھی۔ اگر کانگریس نے مسلمانوں کی نمائندگی کے سلسلے میں لیگ کے ساتھ مفاہمانہ انداز اختیار کیا ہوتا تو شاید علیحدہ راستے کی نوبت ہی نہ آتی۔ کانگریس کو اس سلسلے میں صرف اتنا کرنا تھا کہ 1937ء کی صوبائی حکومتوں میں مسلم لیگ کے نامزدگان کو بھی شامل کر لیتی۔
کانگریس نے مسلم لیگ کے ساتھ عدم تعاون میں غیر ضروری عدم برداشت کا مظاہرہ کیا۔
کانگریس کے نزدیک مسلم لیگ ایک خود ساختہ، اشتعال انگیز اور غیر نمائندہ سیاسی تنظیم تھی۔
کانگریس میں یقیناً نظریاتی تنوع بھی تھا اور اس میں مختلف قومیتوں کو نمائندگی بھی حاصل تھی۔

بظاہر یہ ایک ایسی جماعت تھی جس نے اکھنڈ بھارت کے تمام حامیوں کو اپنے پہلو میں جگہ دے رکھی تھی۔ شمال مغربی سرحدی صوبے کے خدائی خدمتگار (سرخ پوش)، شمال میں کشمیر کے برہمن اور جنوب کے ہریجنوں سمیت کم وبیش ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے کانگریسی تھے یا اس کے اتحادی۔ نئے جاگیردار چونکہ انگریز کی حمایت میں پیش پیش تھے اس لئے کانگریس کسانوں کی وسیع تر حمایت حاصل کرنے میں بھی کامیاب رہی۔ گاندھی کے دیسی کھدی کے لباس اور خود کفیل وسوراج گاؤں کے بارے میں اس کے جادوئی دیس کی کہانیوں جیسے ماورائی تصورات نے کانگریس کو دیہات میں بیحد مقبول بنادیا تھا۔ گاندھی کا چرخہ ہندوستان کی شناخت بن چکا تھا۔ احمد آباد اور کلکتے کے صنعتی بورژوازی کو وسطی اور جنوبی ہندوستان کے دہقان سے جوڑ کر گاندھی نے ایک طاقتور کثیر الطبقاتی اتحاد تشکیل دینے میں بھی شاندار کامیابی حاصل کی۔

کانگریسی قیادت پر اعتماد تھی کہ وہ تمام مسلمان جو مسلم لیگ کی حمایت میں سرگرم تھے، کانگریس کی حمایت سے متاثر ہو کر جلد ہی اس کی جانب لوٹ آئیں گے۔ انہیں کامل بھروسہ تھا کہ بس تھوڑا سا وقت گزرنے کی دیر ہے جب مسلم لیگ کو نظر انداز کرتے ہوئے 'اسے یک و تنہا اور ملک گیر سیاست سے الگ تھلگ کر دینے کی کانگریسی حکمت عملی جلد ہی رنگ لائے گی اور مسلم لیگ انتشار کا شکار ہو کر اپنی موت خود مر جائے گی۔

اگرچہ اس وقت جو لوگ مسلم لیگ کی قیادت کر رہے تھے ان کے بارے میں کانگریس کے اندازے چنداں غلط نہ تھے۔ لیکن اسے 'مسلم قوم اور اس کے شعور کی بیداری کا صحیح ادراک نہ ہو سکا۔

ہندو بورژوازی نے یقیناً بھرپور ترقی کی تھی اور عوام کی قیادت مہیا کرنے کے حوالے سے وہ شہزادوں اور جاگیردار اشرافیہ کو بہت پیچھے چھوڑ گیا تھا اور انڈین نیشنل کانگریس اپنے خدوخال کے اعتبار سے درحقیقت ایک بورژوا تحریک تھی جسے ہندو کسانوں کے وسیع طبقات کی حمایت بھی حاصل تھی البتہ ہندو جاگیردار قومی جدوجہد سے الگ تھلگ ہی رہا کیونکہ اسے ہندو بیوپاری سے بھی اتنے ہی خطرات لاحق تھے جتنا کہ اس کے مدمقابل برطانوی تاجر سے۔ اس لئے جاگیردار' حکمران نسل کے تاجر کا ساتھ کیوں نہ دیتا۔ اس صورت حال میں یقیناً یہ کوئی حیران کن امر نہیں تھا کہ اگر آزادی کے بعد کانگریسی اصلاحات کا پہلا نشانہ ہندی جاگیردار ہی بنا۔

ہندو کے مقابلے میں مسلم بورژوازی نے بہت سی خامیاں وراثت میں پائیں۔ مثال کے طور پر یہی کہ گاندھی اور نہرو خاندان نے جس پائے کی قیادت ہندو بورژوازی کو فراہم کی، مسلم بورژوازی ایسی مخلص اور جرات مند قیادت سے محروم رہا تھا، مگر کب تک؟

بالآخر صدی کی تیسری دہائی میں بمبئی کے وکیل محمد علی جناح کی شکل میں ایسی قیادت بھی میسر آگئی لیکن ابھی قوم اور اس کے لیڈر کے درمیان ایک توانا اور مضبوط تعلق استوار ہونے میں کچھ وقت درکار تھا۔

اس مرحلے پر مسلم بورژوازی طبقے کے فروغ اور ترقی کی راہ میں ایک اور رکاوٹ بھی حائل تھی۔ وہ ابھی تک زراعت اور دیہات پر تکیہ کئے ہوئے تھا اور اس کا بیوپار قصباتی منڈیوں اور مضافاتی شہروں تک محدود تھا۔ متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے مسلم بورژوا افراد کی اکثریت استاد، صحافی اور وکلاء پر ہی مشتمل تھی اور موثر کارکردگی کے لئے انہیں جاگیردار کے تعاون کی ضرورت تھی کیونکہ مسلم اکثریت کے دیہی علاقے جاگیرداروں ہی کے زیر اثر تھے۔ وہ اپنے علاقے میں امن وامان قائم رکھنے کے ذمہ دار بھی تھے اور کسان سے فاضل پیداوار کے حصول میں صرف وہی سرکار سے معاونت کر سکتے تھے۔ نوزائیدہ مسلم بورژوازی کے لئے زمیندار کا تعاون ناگزیر تھا۔ اور صدی کی چوتھی دہائی میں یہی تعاون، جہالت کے خلاف قومی جذبے سے سرشار علی گڑھ کے پرجوش طلباء کے لئے پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبے اور سندھ کے وسیع علاقوں تک رسائی کا ذریعہ بنا۔ یہی طلبا مسلم بورژوازی کا ہراول دستہ تھے۔

لیکن مسلم لیگ کو عوامی مقبولیت اور سیاسی قوت حاصل ہونے تک زمیندار مسلم لیگ اور بعد ازاں تحریک پاکستان کی حمایت پر آمادہ نہیں ہو سکتا تھا۔ مسلم لیگ ایک عوامی تحریک کی شکل اختیار کرتی تو زمیندار اور جاگیردار بھی ساتھ چل پڑتا۔ مگر زمیندار کی حمائت کے بغیر مسلم اکثریتی علاقوں میں مقبولیت کس طرح حاصل کی جائے؟ یہ عقدہ حل طلب تھا۔

اب مشکل یہ تھی کہ وادی سندھ میں عوامی حمایت کے حصول کی خاطر لیگ کو جاگیردار کی اعانت درکار تھی لیکن جاگیردار اس وقت تک تعاون پر آمادہ نہ تھا جب تک کہ لیگ اپنی عوامی مقبولیت ثابت نہ کردیتی۔ یہ ایک مکمل اور بے ڈھب الجھاؤ تھا جس کے سلجھنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔

یہ مسئلہ بالآخر حل تو ہوا لیکن زمیندار یا مسلم عوام کی مثبت پیش رفت اس کا وسیلہ نہیں بنی۔ اس الجھاؤ کو محمد علی جناح کے عزم، استقامت اور مقصد کے حصول میں ان کی یکسوئی نے سلجھایا، وہ مقصد جسے مسلم لیگ نے اپنایا تھا اسے لے کر جناح، جاگیرداروں سے بالا ہی بالا عوام تک پہنچے' اپنی انتھک محنت اور لگن سے مسلم عوام کو بیدار کیا اور آخرکار زمینداروں کو بھی اپنی اور عوام کی پیروی پر مجبور کردیا۔

بیباک اور نڈر جناح

آنریبل سوسائٹی آف لنکنز ان Lincoln's Inn کے بار ایٹ لاء جناب ایم اے جناح اب تک معاشرے میں اپنی ساکھ اور اپنا مقام بنا چکے تھے۔ ہندوستان کی مرکزی قانون ساز اسمبلی میں شاندار

کارکردگی اور اصول پرستی ان کی شہرت کا سبب بنی۔ ان کی تقاریر جرات مندانہ تھیں اور ان میں ابہام' نام کو بھی نہ تھا۔ ان کا شمار لندن کے انتہائی کامیاب وکلاء میں ہوتا تھا لیکن وہاں رہتے ہوئے جب کبھی برصغیر کے وسیع تر عوامی مفاد کی بات نکلی تو اپنے قول و فعل میں انہوں نے کبھی تحمل سے کام نہیں لیا۔ جناح کا دل و دماغ، اپنے وطن کا اسیر تھا۔

محمد علی جناح نے ان گنت اثر انگیز تقاریر کیں۔ ان بیباک تقاریر میں جناب جناح نے ریاست' سیاست اور مذہب کے بہت سے پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور اپنے نظریات کو واضح کیا۔ آپ نے سیاسی قیدیوں اور معتوبین کے لئے بھی جدوجہد کی' ان کی وکالت کی اور ان کے حق میں آواز اٹھائی۔ انہی تقاریر اور مقدمات نے مسٹر جناح کو وہ عوامی حمائت مہیا کی جس نے انہیں قائداعظم تسلیم کروایا' پھر بھی افسوس ہے مسٹر جناح کی سوانح لکھنے والے اکثر کہنہ مشق مصنفین اور مورخین ان کی زندگی کے اس اہم ترین پہلو کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔

مسٹر جناح کی ان تقاریر میں پریس کے کردار پر جے ایس کھاپرڈ کی طرف سے 1918ء میں پیش کی گئی قرارداد اور اسی سال بدنام زمانہ رولٹ ایکٹ پر ان کی تقاریر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ۱۹۱۹ میں بمبئے کرانیکل کے ایڈیٹر مسٹر بی جی ہورنمن B.G. Horniman کے دفاع میں مسٹر جناح نے گویا اپنی زندگی کا نچوڑ پیش کر دیا۔

> "جناب والا! میں ان لوگوں میں سے نہیں جو جرم اور غلط کاری کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں لیکن مجھے یہ دعویٰ ضرور ہے کہ میں نے آئین کا بہت باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے۔ میرے نزدیک کسی بھی آئینی ضابطے میں شخصی آزادی سب سے زیادہ مقدم چیز ہے جسے اس انداز میں چھینا نہیں جانا چاہیے۔"

1924ء میں دیوان بہادر ٹی رنگا چریئر T. Rangachariar نے قانون ساز اسمبلی میں قرارداد پیش کی جس میں ہندوستان کے لئے سوراج کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس موضوع پر مسٹر جناح کی تقریر انتہائی پر اثر تھی۔ 1926ء میں انہوں نے آئینی اصلاحات کا دائرہ کار شمال مغربی سرحدی صوبے تک بڑھانے کی حمایت میں ایک اور بامعنی اور پر مغز تقریر کی۔

ستمبر 1929ء میں چند پنجابی قیدیوں پر سلطنت برطانیہ کے خلاف ہتھیار اٹھانے کا الزام تھا۔ انہوں نے جیل میں بھوک ہڑتال کر دی تھی اس لئے انہیں عدالت میں پیش نہیں کیا جاسکا۔ مسٹر جناح قیدیوں کی عدم موجودگی میں مقدمے کی کارروائی پر سخت برہم ہوئے خواہ ایسی عدم موجودگی مقدمے کے کتنے ہی مختصر عرصے کے لئے کیوں نہ ہو۔ اسی سال انہوں نے ساردا بل Sarda Bill پر بہت

مفصل اور مدلل تقریر کی جس کے بارے میں بات بعد میں ہو گی۔

جناب جناح کی حریت پسندی اور اصولوں کے معاملے ان کی بے لچک فطرت کے حوالے سے ان کی دو تقاریر خصوصی توجہ کی مستحق ہیں۔ ایک تقریر تو 1918ء میں رولٹ کمیٹی کی رپورٹ پر اور دوسری سیاسی قیدیوں کے حوالے سے 1930ء میں کی گئی۔

وزیر داخلہ سیڈیشن کمیٹی Sedition Committee (یعنی برطانوی حکومت کے خلاف سازشوں کی سرزنش کے لئے قانون تجویز کرنے والی کمیٹی) کی صدارت کے لئے جسٹس رولٹ کے تقرر کی وضاحت پہلے ہی کر چکا تھا۔ وزیر داخلہ کہہ چکا تھا کہ :

"اس تقرری کے موقعے پر ہندوستان کی حکومت کو یہ صورت حال در پیش تھی کہ ہمیں ایک وسیع تر سازش کے وجود کا علم تھا جو ہندوستان اور اس کی سرحدوں سے پرے تک پھیلی ہوئی تھی اور جس کا مقصد برطانوی حکومت کا تختہ الٹنا تھا۔ میرا اشارہ محض ان کھلی سرگرمیوں کی طرف نہیں ہے جس کی مثالیں سنگاپور، پنجاب اور کئی دوسری جگہوں کے علاوہ بنگال میں جاری انقلابی شورش میں ملتی ہیں بلکہ میں ان زیرزمین سرگرمیوں کا حوالہ بھی دینا چاہتا ہوں جس کی جڑیں پورے ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہیں اور جن کے ذریعے سلطنت برطانیہ کے وفاداروں کو گمراہ کرنے کی بہت کوشش کی گئی۔"

کمیٹی کی رپورٹ میں کڑی قانون سازی اور انتظامیہ کو وسیع تر اختیارات تفویض کرنے کی سفارش کی گئی تھی۔ کونسل کے ایک رکن کھاپردے نے قرارداد پیش کی جس میں تجویز کیا گیا تھا کہ اس رپورٹ کو فی الحال التواء میں رکھا جائے اور اس دوران کرمنل انویسٹی گیشن ڈیپارٹمنٹ Criminal Investigation Department کے طریقہ کار کے بارے میں ایک اور تفتیش کا آغاز کیا جائے۔

مجوزہ اقدامات کے بارے میں مسٹر جناح کے نظریات بہت واضح تھے۔

"مائی لارڈ! ہر اس شخص کے لئے جو قانون اور انصاف پر یقین رکھتا ہے یہ اقدامات انتہائی تکلیف دہ اور گھناؤنے ہیں۔ آپ کے نقطہ نظر سے یہ اقدامات بہت موثر ہوں گے، ممکن ہے ایسا ہی ہو لیکن بے گناہ شخص کی دادرسی کیسے ہو گی؟ پھر آپ کہیں گے، کیا تمہیں انتظامیہ پر بھروسہ نہیں؟ میرا جواب ہو گا کہ ہاں مجھے انتظامیہ پر قطعاً بھروسہ نہیں۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں کہ کونسی رولٹ کمیٹی کیا تجویز کرتی ہے اور کیا فیصلہ دیتی ہے؟ میں تو اس

حقیقت پر ایمان رکھتا ہوں کہ مناسب عدالتی تحقیق کے بغیر ایک منٹ کے لئے بھی کسی شخص کی آزادی سلب نہیں کی جانی چاہیے۔۔۔۔۔۔ یہ عوام کی آزادی اور شہری کے بنیادی حقوق پر ڈاکہ زنی ہے۔ مائی لارڈ! میں یہاں آپ کے سامنے کھڑا ہو کر برملا کہتا ہوں کہ ہر وہ شخص جو غیر جانبدار اور انصاف پسند ہے، عوام کی آزادی اور خود مختاری پر یقین رکھتا ہے، ایسے اقدامات کی توثیق نہیں کر سکتا۔"

جناح اپنے قول کے سچے تھے جب شاہی مجلس قانون ساز نے رولٹ تجاویز کی منظوری دی تو وہ اس کی رکنیت سے مستعفی ہو گئے۔

نوجوان بھگت سنگھ نہ تو محمد علی جناح کا پیروکار تھا اور نہ ہی ان کا حامی۔ وہ تو سرے سے اس طرز سیاست کے خلاف تھا۔ لاہور سازش کیس کے تحت دہشت گردی کے الزام میں بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں پر مقدمہ چلایا جارہا تھا۔ ناروا سلوک کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے ان لوگوں نے جیل میں بھوک ہڑتال کر دی۔ ان کا حوصلہ توڑنے کے لئے حکومت نے انہیں ٹریبونل کے سامنے پیش نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کے ساتھ ہی ملزمان کی عدم موجودگی میں مقدمے کی کارروائی جاری رکھنے کے لئے کوڈ آف کرمنل پروسیجر یعنی ضابطہ فوجداری میں ترمیم کا بل بھی پیش کر دیا۔ ہے۔ محمد علی جناح نے پرزور انداز میں بل کی مخالفت کی۔

جناب جناح نے پہلے تو ناروا سلوک کے خلاف قیدیوں کے احتجاج کے حق کا دفاع کیا اور پھر قیدیوں کے ساتھ ایسا سلوک روا رکھنے والی حکومت کو درحقیقت ان سے برسرپیکار قرار دیا۔

"جہاں تک پنجاب حکومت کا تعلق ہے تو وہ محض ایک ٹریبونل میں مقدمہ چلا کر قیدیوں کو سزا دلوانے کی خواہاں نہیں بلکہ ان کے ساتھ آمادہ جنگ ہے۔ اس حکومت نے دراصل یہ تہیہ کر رکھا ہے کہ ہم تمہیں پھانسی دلوانے یا عمر بھر کے لئے جلاوطنی کی سزا دلانے کی خاطر کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کریں گے اور اس دوران تمہارے ساتھ انسانوں جیسا سلوک بھی روا نہیں رکھا جائے گا۔"

نڈر اور بے خوف مسٹر جناح اس بات پر مصر رہے کہ برطانوی حکومت کے خلاف دہشت گردی کے الزامات کے باوجود یہ لوگ سیاسی قیدی ہیں۔ اگرچہ بھگت سنگھ کو قانون ساز اسمبلی پر بم پھینکنے کے الزام میں سزا سنائی جا چکی تھی لیکن جناح اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ اپنے دلائل میں انہوں نے کہا:

"جہاں تک لاہور سازش کیس کے نامزد ملزموں کا تعلق ہے تو وہ ہر لحاظ سے سیاسی قیدی

ہیں۔ آپ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ سیاسی قیدی کسے کہتے ہیں؟ سیاسی قیدی کی کوئی واضح اور مخصوص تعریف بیان کرنا دقت طلب ہے لیکن اگر آپ اپنی عقل استعمال کریں، اپنی ذہانت بروئے کار لائیں تو دو قوعے کے حوالے سے آپ یقیناً کسی ایک نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ لوگ جان دینے پر تلے رہتے ہیں اور یہ بات کوئی مذاق نہیں۔ میں معزز وزیر قانون سے التماس کرتا ہوں کہ وہ اس حقیقت کو مد نظر رکھیں کہ ہر کس و ناکس 'بھوک پیاس کے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاک کرنے پر آمادہ نہیں ہوا کرتا۔ بھوک ہڑتال کرنے والے کا ضمیر بھی ہوتا ہے اور یہی ضمیر اس کے انتہائی اقدام کا محرک ہوتا ہے کیونکہ اسے اپنے مقصد کی سچائی پر یقین ہوتا ہے۔"

مسٹر جناح اپنے ذہن و دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ایک آئین پسند شخص تھے۔ وہ دہشت گردی کے حامی نہیں تھے لیکن اس کے ساتھ وہ انسانی وقار اور قانون کی حکمرانی پر بھی یقین رکھتے تھے۔

"جناب والا! آپ اس حقیقت کو ذہن میں رکھئے کہ میں بھگت سنگھ کے اقدام کو درست نہیں سمجھتا اور یہ بات میں اس ایوان میں کہہ رہا ہوں لیکن مجھے افسوس ہے کہ غلط یا صحیح طور پر آج ہندوستان کا نوجوان مضطرب ہے اور 30 کروڑ کی آبادی میں آپ ایسے جرائم کو سرزد ہونے سے روک نہیں سکتے خواہ آپ اس عمل کی جس قدر مذمت بھی کریں اور ایسے افراد کو کیسا ہی گمراہ قرار دیں لیکن سچ یہی ہے کہ برائی اس ملعون حکومتی نظام میں ہے جس سے عوام نفرت کرتے ہیں۔ آپ بے رحم منطق کا سہارا لے سکتے ہیں۔ میں ایک متحمل اور ٹھنڈے دماغ کا آدمی ہوں اور حکومت کو قائل کرنے کے لئے بے تکان تقریریں کر سکتا ہوں لیکن یہ مت بھولیں کہ باہر ہزاروں نوجوان ہیں۔ یہ واحد ملک نہیں جہاں ایسے واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ دوسرے ملکوں میں بھی ایسا ہوا ہے جہاں نوجوانوں کے بجائے سفید داڑھیوں والے لوگ حب الوطنی کے جذبات سے مغلوب ہو کر ایسے جرائم کے مرتکب ہوئے ہیں۔ آئر لینڈ کے وزیراعظم مسٹر کانگریو Congrave کے ساتھ کیا ہوا؟ اسے سزائے موت سنائی جا چکی تھی لیکن ابھی دو ہفتے قبل شاہ برطانیہ نے اسے مذاکرات کے لئے مدعو کر لیا۔ کیا وہ ایک نوعمر لڑکا تھا؟ کیا وہ کوئی نوجوان شخص تھا؟ اور کولنز Collins کے بارے میں کیا خیال ہے؟ لہذا اس قسم کے دلائل دینے کا فائدہ کیا؟ آپ ایک ایسی صورت حال کا سامنا کر رہے ہیں جس سے مفر ممکن نہیں۔ آپ جرائم کی بیخ کنی کے بنیادی قوانین کو حرکت میں لا کر اس صورت حال سے

عہدہ بر آ نہیں ہو سکتے۔ آپ بڑی سادگی سے کہہ جاتے ہیں کہ ۔۔۔۔ "اوہ! یہ تو کامن سینس Common Sense کی بات ہے" ہاں، قانون کامن سینس ہوتا ہے لیکن یہ فرد واحد کی کامن سینس نہیں ہوتا۔"

یہ مسٹر جناح ہی تھے جو رنگ، نسل، ذات، مذہب یا معاشرتی مرتبے کو خاطر میں لائے بغیر مظلوم کے حامی تھے۔ یہ وہ جناح تھے 'متنازع امور کے بارے میں جن کا موقف ذاتی مفاد اور موقعہ پرستی سے بالاتر تھا۔ یہ وہ جناح تھے جن کی دیانت کی گواہی ان کے مخالفین بھی دیتے تھے۔ جواہر لال نہرو کو جناح اور ان کے نظریات پر کڑی تنقید کے باوجود بالآخر یہ قبول کرنا پڑا کہ " جناح کو وسیع پیمانے پر تکریم حاصل ہے۔" اور یہ کہ بطور سیاست دان ان کی اہلیت مسلم ہے۔ اور بادل نخواستہ نہرو کو یہ بھی کہنا پڑا کہ "ایک وکیل، سیاست دان ایک مدبر اور ایک ایسے شخص کی حیثیت سے جو خود کو قوم پرست ہندوستان اور برطانوی حکومت کے درمیان ایک فیصلہ کن عنصر سمجھتا ہے، جناح کا نام نمایاں ہے۔"

جناح انتقال کر گئے تو 5 اکتوبر 1948ء کو وائسرائے لارڈ ویول Lord Wavell نے لکھا" جناح مجھے کبھی پسند نہیں تھا" لیکن اسے اعتراف کرنا پڑا "لیکن میرے دل میں جناح کے لئے ایک گریزاں سی ستائش ہمیشہ موجود رہی۔"

تاریخ بالعموم اور تخلیق پاکستان بالخصوص کس قدر مسٹر جناح کی مرہون منت ہے، ہوڈسن Hodson مسٹر جناح کا خیر خواہ نہیں تھا مگر اس نے کیسے مناسب و موزوں پیرائے میں اس کا اظہار کیا ہے "ہندوستان کی آزادی کے عظیم ڈرامے کے آخری ایکٹ میں محمد علی جناح کی شخصیت سب سے گنجلک اور سب سے زیادہ اہم ہے۔ مہاتما گاندھی کے سوا جوگا ہے بگاہے لیکن بے نتیجہ کردار ادا کرتے رہے ہم اس ڈرامے کے دوسرے نمایاں اداکاروں کے بارے میں کہہ سکتے ہیں کہ ان کے نعم البدل بھی ڈرامے کے انجام میں کوئی تبدیلی لائے بغیر وہی کردار ادا کر سکتے تھے مثلاً کانگریس کا کوئی اور لیڈر، کوئی اور (انگریز) سیکرٹری آف سٹیٹ، کسی اور طبقے کا کوئی اور نمائندہ حتیٰ کہ کوئی اور وائسرائے۔ لیکن اس بات کا تصور بھی محال ہے کہ جناح کے بغیر بھی حالات یہی رخ اختیار کرتے۔ کیا آزادی کی جدوجہد اسی طرح دو کے بجائے تین متوازن حریفوں کے درمیان ہوتی اور پاکستان کی آزاد مملکت بھی وجود میں آتی؟ ۔۔۔۔ جناح کے سیاسی حریفوں نے بھی ان پر کبھی بددیانتی یا مفاد پرستی کا الزام عائد نہیں کیا۔ انہیں کوئی بھی اور کسی بھی قیمت پر خرید نہیں سکتا تھا۔"

یہ وہ جناح تھے جنہوں نے طاقتور مسلمان جاگیرداروں اور زود بیان مسلم بنیاد پرستوں کی عملی مخالفت کے باوجود مسلمانوں کی قیادت کا کٹھن کام سنبھالا، بظاہر یہ ایک ناممکن ذمہ داری تھی لیکن اسے

نباہنے میں یہ مدبر کیسے کامیاب ہوا؟ اس بارے میں ہم آئندہ صفحات میں تجزیہ کریں گے مگر 1937ء سے 1947ء کے درمیانی عرصے میں مسٹر جناح نے جو حکمت عملی اپنائی' یہاں اس کا مختصر سا جائزہ ناگزیر ہے۔

مسٹر جناح نے شروع سے ہی مسلمان جاگیرداروں کو نظر انداز کرنے کی حکمت عملی اپنائی۔ مسلمان بنیاد پرستوں کے نظریات بھی انہیں متزلزل نہ کر سکے۔ وہ اپنی منزل سے آشنا تھے اور ان کی آنکھیں اسی پر گڑی تھیں۔

مسٹر جناح نے اپنی امیدیں وادی سندھ اور شمالی ہندوستان کے مسلم زرعی بورژوازی سے وابستہ کر لی تھیں۔ انہوں نے اس طبقے کے ذہنوں میں پنہاں خوف کو دور کیا اور انہیں ایک نیا اعتماد اور حوصلہ دیا۔ جب یہ لوگ جاگیردار کے خوف اور اس کے تعلق سے بے نیاز ہو کر جناح کے جھنڈے تلے جمع ہوئے اور عملی سیاست کا آغاز کیا تو مسلمانوں کی ایک ملک گیر عوامی تحریک وجود میں آئی۔ جناح نے جب اپنی عوامی قوت کا بھرپور مظاہرہ کیا تو جاگیردار بھی عین آخری وقت پر ان سے آملے۔ اس طرح 1946ء کے انتخابات سے پہلے ہی ڈرامے کے آخری ایکٹ کے لئے سٹیج تیار ہو چکا تھا۔

لیکن 1946ء کے انتخابی معرکے سے پہلے ابھی بہت سے چھوٹے چھوٹے مرحلے طے ہونا باقی تھے اس لئے ہم دوبارہ 1930ء کی دہائی میں واپس چلتے ہیں۔

زمیندار' بورژوازی اور 1935 کا ایکٹ

1930ء کی دہائی میں بڑے زمینداروں کو برطانوی راج سے فائدہ پہنچا تھا اور وہ بڑی شدت سے اس کی حمایت پر کمربستہ تھے۔ وہ ابھی مسٹر جناح کے پیچھے چلنے کو تیار نہیں تھے۔ پنجاب میں جاگیردار، پنجاب نیشنل یونینسٹ پارٹی کے روح رواں تھے۔ یہ پارٹی 1923ء میں سر فضل حسین نے قائم کی تھی اور پنجاب کے ہندو، مسلمان اور سکھ زمینداروں کے حقوق کی محافظ تھی۔

دوسری عالمی جنگ سے پہلے 'ایک بار پھر برطانوی حکومت کو پنجابی زمینداروں کی وفاداری کی ضرورت کا احساس ہوا کیونکہ ان کی وساطت ہی سے پنجابی جوانوں کو فوج میں بھرتی کر کے جرمن سامراج کے خلاف جنگ لڑی جا سکتی تھی۔ سکندر حیات وزارت (1947ء۔1942ء) نے پنجاب کے زمینداروں کے اہم مفادات کے تحفظ کے لئے چند دوررس قوانین منظور کئے تھے۔ ریسٹوریشن آف مورٹ گیجڈ لینڈز ایکٹ (Restoration of Mortgaged Lands Act, 1938 (جس کی رو سے مہاجنوں کے ہاتھوں زمینداروں کی زمینیں واگزار ہوئیں) رجسٹریشن آف منی لینڈرز ایکٹ -Reg

istration of Money Lenders Act مجریہ 1938ء (جس کے تحت مہاجنوں کی تجارت اور شرح سود پر کنٹرول کیا گیا) اور ریلیف آف انڈیبٹڈنس ایکٹ Relief of Indebtedness Act مجریہ 1940ء جیسے ضابطوں نے زمینداروں کو مہاجن کے چنگل سے بڑی حد تک آزاد کر دیا۔

ان اصلاحات کے محرکین کا تعلق کسی ایک مذہب سے نہیں تھا بلکہ مسلمان، ہندو اور سکھ سب ہی اس سوچ اور ان قوانین کے حامی تھے حالانکہ ان کا بنیادی مقصد اکثریتی مسلم زمیندار کی حمایت اور ہندو مہاجن کی مخالفت تھا۔ بہر حال اس عمومی حمایت کے باوجود یہ اصلاحات ایک شخص کی رہین منت تھیں اور وہی ان اصلاحات کا اہم محرک بھی تھا۔ سر چھوٹو رام پنجاب کابینہ میں وزیر مال تھا اور آج بھی زمیندار خاص طور پر پاکستان کا مسلمان زمیندار بھی اس ہندو وزیر کا نام بڑے احترام سے لیتا ہے۔

اسی دوران ہندوستان کے بورژوازی نے اپنی جدوجہد تیز کر دی۔ اس طبقے کی اکثریت ہندوؤں پر مشتمل تھی اور وہ منڈی کے حصول کے لئے کوشاں اور برطانوی صنعتکاروں کو حاصل ہونے والی مراعات پر شاکی تھا۔ گاندھی نے سالٹ ستیہ گرہ شروع کی اور ۱۹۳۱ء کے گاندھی ارون معاہدے Gandhi-Irwin Pact, 1931 کے تحت وائسرائے ارون Viceroy Irwin سے بہت سی مراعات حاصل کر لیں۔

ہندوستانی بورژوازی کی اس تحریک نے سامراجی حکومت کے اعتماد کو بھی قدرے کمزور کیا اور اس طبقے کے بڑھتے ہوئے اثر و نفوذ کا اندازہ کرتے ہوئے انگریزوں نے لندن میں گول میز کانفرنسوں کا سلسلہ شروع کیا۔

لندن کی گول میز کانفرنسوں میں برصغیر کے ہر سطح کے راہنماؤں سے صلاح مشورے کے بعد گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء Government of India Act, جاری کیا گیا۔ اس ایکٹ کی رو سے برائے نام سیلف گورنمنٹ (نام نہاد خود مختاری) اور معمولی سے اختیارات مقامی نمائندگان کو بھی تفویض کئے گئے۔ اس ایکٹ کے تحت لیکن مقررہ مدت کے بعد 1937ء میں صوبائی سطح پر انتخابات کرائے گئے۔

اور 1937ء کے یہی انتخابات ایک فیصلہ کن موڑ ثابت ہوئے جس کے بعد ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے راستے جدا جدا ہو گئے۔

33

جناح کے پاکستان کی طرف پیش قدمی

1937ء کے انتخابات

1935ء کا ایکٹ کسی صورت بھی ایک مکمل آئین نہیں تھا۔ اس میں کئی جھول تھے اور اس کی بہت سی شقیں باہم متصادم بھی تھیں۔ اگرچہ اس ایکٹ کے تحت صوبائی حکومتیں تشکیل پا گئیں لیکن وفاقی سطح پر اسے نافذ کیا جانا ممکن نہیں تھا۔ دراصل ریاستی شہزادگان اس کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ تھے۔

1935ء کے ایکٹ کے مطابق وفاقی سطح پر تبدیلیوں کے لئے شاہی ریاستوں کی کم از کم نصف تعداد کی طرف سے تائید ضروری تھی۔ برطانیہ کے ساتھ مختلف معاہدوں کے تحت یہ ریاستیں صرف چند مبہم سے حقوق کی دعویدار تھیں۔ یہاں انگریز نے اپنے روایتی شاطرانہ مزاج کا بھرپور مظاہرہ کیا تھا۔ پہلے تو ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں سے اعانتی معاہدوں کے تحت برطانوی راج کی وسیع تر وحدت کے نام پر تمام اختیارات چھین لئے گئے تھے اور اب اسی بڑی وحدت کو انہی اختیارات کی منتقلی کی راہ میں انگریز خود رکاوٹ بن گیا۔ برصغیر میں جب ایک وفاقی جمہوری حکومت کے قیام کا پہلا مرحلہ آیا تو حکومت برطانیہ نے چھوٹی ریاستوں سے چھینے گئے اختیارات انہی کو لوٹا دینے کا منصوبہ بنایا تاکہ اس مرحلے پر ایسے دقیانوسی اور قدامت پسند شہزادگان کو یہ اختیارات تفویض کر کے وفاقی سطح پر حکومت کے قیام کو روکا جا سکے۔ دوسری طرف "دہری حاکیت" Dyarchy کے اس منافقانہ اصول میں خاطر خواہ خود مختاری سرے سے شامل ہی نہیں تھی اور حکومت کے اشارے پر شہزادگان نے وفاقی سطح پر 1935ء کا ایکٹ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

اس ایکٹ کا ایک اور نمایاں تضاد Weightage یعنی نام نہاد "توازن" کے اصول کا اطلاق تھا جس کے نتائج ناقابل دفاع ناانصافیوں کی صورت میں ظاہر ہوئے۔ اس منافقانہ اصول کے تحت مسلم اکثریتی پنجاب میں مسلمانوں کی نمائندگی اقلیت میں بدل گئی۔ بنگال میں ایسی ہی تخفیف کے باعث مسلمانوں کے پاس برائے نام اکثریت رہ گئی اور وہ مخلوط حمایت کے محتاج ہو گئے۔ اس داخلی تضاد اور عدم توازن کی بناء پر 1935ء کا ایکٹ بڑھتی ہوئی طبقاتی اور ہندو مسلم تفریق کا تدارک نہ کر سکا۔

برطانوی قانون سازی کی ان واضح ناانصافیوں کی شدت کو کانگریس کے حد سے بڑھے ہوئے اعتماد اور ہٹ دھرمی نے دو چند کر دیا۔ کانگریس مسلم اکثریتی صوبوں میں بھی مسلم لیگ کی حکومت کو برداشت کرنے پر تیار نہ تھی اور اب مسلمان اور ان کی قیادت کے پاس اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہا کہ وہ اقبال کے 1930ء کے نظریئے پر ایمان لے آئیں۔

1937ء کے انتخابات میں کانگریس نے 11 میں سے 5 صوبوں میں اکثریت حاصل کی تھی۔ الحاق اور جوڑ توڑ کے ذریعے مزید 3 صوبوں میں اس نے حکومت بنالی۔ ان میں شمال مغربی سرحدی صوبہ بھی تھا جہاں کانگریس کو 50 میں سے صرف 19 نشستیں حاصل ہوئی تھیں۔ اس صوبے میں کانگریس کے حلیف خدائی خدمت گاروں نے سردار عبدالقیوم کی کابینہ کو ہٹا کر ڈاکٹر خان صاحب کو وزیراعلیٰ بنا دیا۔ مسلم اکثریتی صوبے پنجاب میں 'انگریز نواز یونینسٹ پارٹی کے زمیندار چھا گئے۔ ان کی وفاداریاں نہ کانگریس سے تھیں نہ مسلم لیگ کے ساتھ، اسی لئے 1942ء میں کانگریسی وزیروں کے مستعفی ہونے کے بعد بھی ان کی حکومت جاری رہی۔

پُر اعتماد کانگریس اور نہرو کی غلط فہمی

1937ء کے بعد' یہ واقعات اس وقت رونما ہوئے جب مسلم لیگ ابھی مفاہمت کی خواہاں تھی۔ معاشی و سیاسی اعتبار سے ابھی مسلم لیگ نے کسی نہ کسی صورت متحدہ برصغیر کو ہی برقرار رکھنے کی پالیسی ترک نہیں کی تھی اور نہ ہی مسلم بورژوازی یا مسلمان جاگیردار میں سے ابھی تک کسی نے حال یا مستقبل کے ممکنہ خدشات کے پیش نظر کسی تحفظ کی ضرورت محسوس کی تھی۔

1937ء کے انتخابات کے بعد مسلم لیگ تو اس شرط پر کانگریس کی کابینہ میں اپنے وزیر نامزد کرنے پر بھی تیار تھی کہ اسے برصغیر کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کیا جائے لیکن یہ مطالبہ تو کانگریس نے مسترد کر دیا۔ کانگریسی قیادت کے نزدیک مسلم اقلیت کی نمائندہ جماعت ہونے کا لیگی دعوی جھوٹ پر مبنی تھا اور ایسی غیر نمائندہ تنظیم کے مطالبات تسلیم نہیں کئے جا سکتے تھے' خاص طور پر

ایسی صورت حال میں جب 1937ء کے انتخابات میں مسلم اکثریتی صوبوں میں بھی لیگ کی کارکردگی مایوس کن رہی تھی۔ ایک ناتواں اور الگ تھلگ مسلم بورژوازی جس کی اپنی کوئی طاقت تھی اور نہ ہی اسے کسی پریشر گروپ کی حمایت حاصل تھی، اس کے بارے میں عام کانگریسی تاثر یہی تھا کہ اس کے مقدر میں ناکامی لکھی ہے اور کوئی دن جاتا ہے جب اس کے رہے سہے حمایتی بھی اس کا ساتھ چھوڑ جائیں گے۔

کانگریس کی قیادت اس حقیقت کا ادراک کرنے میں ناکام رہی کہ وہ مسلم بورژوا (غیر زمیندار قیادت) کی اہلیت کا اندازہ ایک ایسے وقت میں لگانے کی کوشش کر رہی تھی جب اسے مسلمان زمینداروں کی حمایت حاصل نہیں تھی۔ ان حالات میں تو مسلم بورژوازی ایک کمزور اور ناتواں طبقہ تھا۔ جب تک وادی سندھ کا زمیندار اس کا ساتھ دینے کو تیار نہیں ہوتا مسلم بورژوازی اپنا حق تسلیم نہیں کروا سکتا تھا۔ زرعی معاشرے میں زمینداری اس کو تحفظ دے سکتا تھا مگر وہ عوامی دباؤ کے بغیر ابھی مسٹر جناح کا ساتھ دینے کو تیار نہیں تھا۔ کانگریس اپنے وسیع تر تناظر میں ہندو بورژوازی کی نمائندہ جماعت تھی جس کا سب سے مقدم مفاد یہ تھا کہ وادی سندھ اور بنگال کے زرعی اور مسلم اکثریتی علاقوں کو زیر نگیں رکھتے ہوئے انہیں محض محکوم منڈیوں کے طور پر استعمال کیا جائے اور یہ خطے ترقی یافتہ صنعتی علاقوں کا زرعی لاحقہ بنے رہیں۔ اس تناظر میں اگر دیکھا جائے تو کانگریس کی برہمی بے وجہ نہیں تھی۔

جولائی 1937ء میں جواہر لعل نہرو نے کانگریس میں اپنے پیشرو صدر' راجندر پرشاد کو خط لکھتے ہوئے لیگ کے مستقبل کے بارے میں درج ذیل جائزہ پیش کیا۔

"جون کے آخر میں ورکنگ کمیٹی کے اجلاس سے ذرا پہلے، یوپی کے مسلم لیگی لیڈر خلیق الزماں اور نواب اسمٰعیل نے کانگریس سے رابطہ کیا۔ ظاہر ہے یہ مسلم لیگی وزیروں کی تقرری کے سلسلے میں تھا۔۔۔ جب مولانا ابوالکلام وارد ھا سے لکھنو پہنچے تو خلیق ان سے ملا اور بتایا کہ اگر لیگ کے دو اراکین یعنی خود اسے اور نواب اسمٰعیل کو کابینہ میں شامل کر لیا جائے تو وہ عملی طور پر کانگریس سے بھرپور تعاون کرنے کو تیار ہیں۔ مولانا نے اس پیشکش کو شبے کی نظر سے دیکھا لیکن اس کے ساتھ انہیں یہ امکان بھی پرکشش لگا کہ اس طرح مسلم لیگ اپنی علیحدہ شناخت کھو کر عملاً کانگریس میں مدغم ہو جائے گی۔۔۔۔ لیکن ہمیں کانگریسی اراکین سے بالعموم اور کانگریس کے مسلم اراکین کی طرف سے بالخصوص ناموافق رد عمل کا خدشہ تھا جنہیں اس بات پر یقیناً دکھ ہوتا کہ ان کے مقابلے میں کانگریس کے مخالفین کو ترجیح دی گئی ہے۔ کیا ہم ان مسلمانوں کو بھلا دیں جو گذشتہ کئی سال سے کانگریس کا ساتھ دیتے رہے

ہیں ؟ کیا ہم جمعیت کو نظر انداز کر دیں جو ہماری حلیف اور لیگ کی حریف رہی ہے ؟"

"یہ سب اور اس کے علاوہ بہت کچھ سوچتے ہوئے ہم تذبذب کا شکار تھے۔۔۔ کافی بحث و تمحیص کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ یو پی کی مسلم لیگ کے سامنے کڑی شرائط رکھی جائیں اور اگر وہ شرائط مان لیں تو ان کے دو افراد کو وزیر بنا دیا جائے۔۔۔۔۔۔ ان کے علاوہ ایک وزیر رفیع احمد بھی ہو گا۔۔۔۔۔ یہ شرطیں سخت تھیں اور اس کے عوض کانگریس جو کچھ دے رہی تھی یہ اس سے کہیں زیادہ تھا۔ لیکن ہم نے ان سے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ وہ لیگ سے اپنے تمام رابطے توڑ لیں کہ اس طرح ایک عجیب و غریب اور کسی حد تک دہری وفاداری کی صورت حال پیدا ہو جانے کا امکان تھا جو تادیر قائم نہ رہتی کیونکہ ہمیں توقع تھی کہ ہمارے مطالبے پر یو پی کی لیگ اپنی مرکزی قیادت سے ناطہ توڑ لے گی۔"

کیا نہرو نے یہ تاثر لیا تھا کہ مذاکراتی ٹیم ہی اپنی قیادت سے منحرف ہو جائے گی ؟ اگر یہ اندازہ غلط بھی تھا تو بھی یہ کانگریس کے اس زعم کا مظہر تھا جو نہرو کے باقیماندہ خط سے بھی جھلکتا ہے۔

"خلیق کے ساتھ (مزید) بات چیت ہوئی اور وہ' دو کے علاوہ سب شرائط مان گیا۔ پارلیمانی بورڈ کی تحلیل اور ضمنی انتخابات میں علیحدہ امیدوار کھڑے نہ کرنے کی شرطیں اس نے قبول نہیں کیں۔ خلیق کا کہنا تھا کہ اسے ذاتی طور پر کوئی تامل نہیں لیکن انہیں تسلیم کرنے کا اسے اختیار نہیں۔ البتہ اس نے یہ اشارہ دیا کہ ممکن ہے ایسا ہو بھی جائے۔۔۔۔۔"

"آج ۲۱ جولائی کو خلیق نے پھر رابطہ کیا اور اس نے عندیہ دیا کہ اگر ہم اس سلسلے میں فیصلہ چند دنوں کے لئے موخر کر دیں تو وہ ضمنی انتخاب والی شرط پر غور کرنے کے لئے ایگزیکٹو کا ہنگامی اجلاس بلا سکتا ہے۔ یہ بات چیت اس سے فون پر ہوئی۔ میں نے اس کی حوصلہ افزائی کئے بغیر اسے پنت جی (جی بی پنت' چیف منسٹر اتر پردیش) سے رابطہ کرنے کے لئے کہا۔"

روشن خیال جناح

اگر نہرو کا تجزیہ کانگرسی قیادت کی اجتماعی سوچ کا مظہر تھا تو ظاہر ہے کانگریس سے ایک بار پھر اندازے کی غلطی ہوئی تھی۔ ابھی تک یقیناً مسلم لیگ ایک کمزور جماعت رہی تھی۔ مسلم بورژوازی کا ایک حصہ (جس کی نمائندگی مولانا ابوالکلام آزاد کرتے تھے) اس سے دور رہا تھا۔ اور مسلم زمینداروں نے تو مکمل طور پر مسلم لیگ میں شمولیت سے اجتناب کیا تھا۔ لہذا کانگریس نے مسلم لیگ کو زیادہ اہمیت نہ دی۔ مگر حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ اب لیگ کے پاس جناح کی شکل میں ایک پر اعتماد، ہر دلعزیز اور سحر انگیز قیادت تھی اور اس جماعت کے مقاصد تیزی سے ابھرتے ہوئے مسلم بورژوازی

کے مقاصد سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہو رہے تھے۔

یورپ کی طرح برصغیر میں بھی بورژوازی کے فروغ کے ساتھ بنیاد پرست اور کٹر مذہبی رجحانات کی حوصلہ شکنی ہوئی۔ بورژوا طبقہ قدامت پسندانہ نظریات کے حوالے سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اس کا بنیادی ہتھیار ٹیکنالوجی ہے اور مارکیٹ میں موجود رہنے کے لئے اسے جدید اختراعات اور سائنس کے ساتھ قدم ملا کر چلنا پڑتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کی مصنوعات یا تو جدید معیار پر پورا نہیں اتریں گی یا پھر بہت مہنگی ہوں گی۔ یہی ناگزیر ضرورت ہے جو اسے اکثر مذاہب میں پائی جانے والی تنگ نظری اور انتہا پسندی سے دور رکھتی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ مذہب کا مخالف یا لادین ہوتا ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ ایک بورژوا مملکت میں راسخ العقیدہ مذہبی افراد کی اکثریت ہو لیکن بورژوا ریاست خود کوئی مذہب اختیار نہیں کرتی۔ اور اقبال کا اشارہ اسی قسم کی بورژوا ریاست کی جانب تھا جب انہوں نے کہا تھا کہ آزاد مسلم ریاست میں انتہا پسندوں کی حکومت نہیں ہوگی۔

جناح، برصغیر میں مسلم بورژوا ثقافت کا بہترین نمونہ تھے۔ وہ ایک راسخ العقیدہ مگر روشن خیال مسلمان تھے اور کٹر مذہبیت، قدامت پرستی اور مذہبی جماعتوں کی حکمرانی کے خلاف تھے۔ وہ پاکستان میں ملائیت نہیں چاہتے تھے۔ اسی بنا پر تاجر، دکاندار اور علی گڑھ کے طلباء سمیت ہر طبقے کا مسلم بورژوازی جناح کا پیروکار تھا۔ اسی لئے مُلّا' جناح کا مخالف تھا اور اسی لئے اس نے مسٹر جناح سے شکست کھائی۔

محمد علی جناح نے کئی بار روشن خیالی کے حق میں اور بنیاد پرستی کے خلاف دوٹوک اظہار خیال کیا۔ بہت سے حوالے اس حقیقت کا بین ثبوت ہیں کہ وہ سیاست اور مذہب کے تناظر میں ریاست اور مذہب کو الگ الگ خانوں میں رکھنے کے قائل تھے۔ اس مسئلے پر ان کی سوچ قطعی واضح تھی اور انہوں نے اس بارے میں اپنے نظریات کو دوسروں تک پہنچانے کا کوئی موقع' کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ 1920ء میں گاندھی کی جانب سے سیاست میں نمائشی مذہبی حکمت عملی پر ان کا ردعمل کیا تھا۔ ایک اور موقعے پر جب ان کے چند پرجوش معترفین نے انہیں "مولانا" جناح کہہ کر مخاطب کیا تو انہوں نے بڑی ترش روئی سے بات کاٹتے ہوئے کہا "میں مولانا نہیں صرف مسٹر جناح ہوں۔"

ایسی مختصر لیکن اہم مثالوں کے علاوہ اس موضوع پر دو اہم ترین تقریریں ان کی سوچ کی بڑی واضح عکاسی کرتی ہیں۔ پہلی تقریر 1929ء میں "چائلڈ میرج ریسٹرینٹ بل" Child Marriage Restraint Bill پیش ہونے پر اور دوسری تقریر آزادی سے تین روز قبل 11 اگست 1947ء کو آئین ساز اسمبلی میں کی گئی۔ ہمیں ان تقاریر پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے کیونکہ

یہ دونوں تقاریر کسی لگی لپٹی کے بغیر، ریاست اور مذہب کے باہمی تعلق پر مسٹر جناح کے نظریات کی ترجمان ہیں۔

چائلڈ میرج ریسٹرینٹ بل Child Marriage Restraint Bill 1927ء میں رائے ہری داس سردا نے قانون ساز اسمبلی میں پیش کیا اسی لئے اسے "سردا بل" Sarda Bill کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ اس بل سے ایسا تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا کہ یہ دو سال تک التواء کا شکار رہا۔ بل میں شادی کی کم از کم عمر اور کمسن بچوں کی شادی کرنے والے سرپرستوں کے لئے سزا تجویز کی گئی تھی۔

سردا بل نے ملک بھر کے بنیاد پرستوں کو بے حد مشتعل کر دیا۔ ہاؤس پٹیشن کمیٹی کو 707 عذر داریاں موصول ہوئیں جن پر 72725 افراد کے دستخط تھے۔ چوٹی کے 74 علماء نے اس کے خلاف فتوی بھی جاری کیا۔ بل کے حق میں صرف چار عرض داشتیں آئیں جن پر محض 10 افراد کے دستخط تھے۔ ایوان میں بل کی مخالفت کرنے والوں میں بہت سے دوسرے مسلم اراکین کے علاوہ صوبہ سرحد سے نواب سر صاحبزادہ عبدالقیوم، ڈھاکہ سے اے ایچ غزنوی، یوپی سے محمد یامین اور ترہٹ سے مولوی محمد شفیع داؤدی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مولانا شفیع نے بہت گھن گرج دکھائی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر بل منظور کیا گیا تو یہ مسلمانوں کے حقوق کی ظالمانہ پائمالی کے مترادف ہوگا۔ بل کے مخالفین نے واویلا کیا کہ مجوزہ بل کے باعث دین کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے، برصغیر کے طول و عرض میں فتاوی جاری ہوئے کہ اسلام خطرے میں ہے۔ نابالغ بچوں کی شادی کر دینا والدین کا قانونی و شرعی حق ہے۔ اس حق کو سلب کرنا خدا کے قانون سے جنگ ہے۔

محمد علی جناح اس مخالفت سے مرعوب نہیں ہوئے۔ ان کے الفاظ واضح اور ابہام سے پاک تھے اور یہ ضروری ہے کہ ان کی تقریر کے کچھ حصے لفظ بہ لفظ یہاں نقل کر دیئے جائیں۔

> "میں نہیں مانتا کہ ان مروجہ ظالمانہ رسوم کو آسمانی تائید حاصل ہے۔ ہمیں ایک لمحے کے لئے بھی ان فرسودہ رسومات کے تسلسل کی اجازت نہیں دینا چاہیے۔ ایسی ظالمانہ، خوفناک، شرمناک اور غیر انسانی رسم جو اس وقت ہندوستان میں رائج ہے، اسے بھلا کیونکر مذہبی تائید حاصل ہو سکتی ہے؟"

جناح اس امر سے بے خبر نہیں تھے کہ وہ کس کی مخالفت کر رہے ہیں اور نہ ہی وہ بنیاد پرستوں کی طرف سے اپنی مخالفت کے بارے میں لاعلم تھے۔ والٹیئر Voltaire کی طرح انہیں اس کی پرواہ نہیں تھی کہ وہ (مخالفین) اگر ہمیشہ اپنے احساسات اور اپنے اعتقادات پر قائم رہتے ہیں لیکن جناح ایک اصولی موقف کے معاملے میں کسی دباؤ کے سامنے جھکنے والے نہیں تھے۔ ان کا لہجہ بڑا سخت تھا جب انہوں نے

کہا:

"معاشرے کے اصلاح کار کو ہمیشہ سے ایسی بنیاد پرستی کا سامنا رہا ہے جس کے پس پردہ بھی عقائد، جذبات اور احساسات ہوتے ہیں جو قابل فہم بھی ہیں اور کسی حد تک جائز بھی۔ لیکن کیا اس طبقے کے ہاتھوں ہزیمت اٹھانا ضروری ہے جس کے لئے ہمارے دلوں میں تعظیم ہے، جس کے احساسات کی ہم قدر کرتے ہیں؟ کیا ہمیں (ان کے ہاتھوں) خوار ہونا اور ترقی کی راہ کو چھوڑنا ہوگا؟ انسانیت کے نام پر میں آپ سے سوال کرتا ہوں کہ جب مذہب کے نام پر ہمیں عوامی دباؤ کا سامنا ہو اور ہم یہ بھی جانتے ہوں کہ اس معاملے کا مذہب سے کوئی واسطہ نہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ پھر ہمارے اندر اتنی جرات ہونی چاہیے کہ بے باکی سے کہہ سکیں کہ ہمیں ان (باتوں) سے خوفزدہ نہیں کیا جاسکتا۔"

یہ مسٹر جناح کے اپنے الفاظ ہیں اور تاریخ کے ریکارڈ میں محفوظ ہیں۔ سرکاری مؤرخین کو ان الفاظ سے اجتناب کی ترغیب دی جاتی ہے۔ ان کا تذکرہ سرکاری میڈیا کے مباحثوں یا لیکچروں میں نہیں ملے گا اور نہ ہی ٹیلی ویژن کے "فرمودات قائد" میں۔

لہٰذا آج کا پاکستانی، جس کی نظر سے بانیٔ پاکستان کے صرف منتخب بیانات ہی گزرے ہیں' اسے یہ باور کرانا شاید مشکل ہو کہ یہ واقعی ان کے عظیم راہنما کے اپنے الفاظ ہیں کہ مملکت کے کچھ معاملات ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ان کی دوسری تقریر کا مرکزی خیال بھی یہی تھا مگر اس کا ذکر ہم بعد میں کریں گے۔ 11 اگست کی تقریر میں مسٹر جناح نے کہیں زیادہ شدت اور اصرار کے ساتھ تصور پاکستان کے اس بنیادی اصول کی وضاحت کی۔

کانگریس نے موقع خود فراہم کر دیا

اگرچہ نہرو نے 1937ء میں پیش گوئی کی تھی کہ مسلم اراکین اسمبلی مسلم لیگ کو چھوڑ جائیں گے لیکن اس کے باوجود کہ لیگ کو ابھی وسیع عوامی تائید حاصل نہیں ہوئی تھی اور اس کا اپنا ووٹ بنک بھی کوئی نہیں تھا لیکن اس کا ایک بھی رکن منحرف نہیں ہوا۔ اصل بات یہ تھی کہ مسلمان عوام اور سندھ واسی کو بتدریج اپنے معاشی و اقتصادی مسائل کا ادراک ہو رہا تھا اور اس کے پہلو بہ پہلو' ان کے ذہن و دل پر مسٹر جناح کی گرفت بتدریج مضبوط ہو رہی تھی۔

بلاشبہ 1937ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کو ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا تھا جس سے یہ بات عیاں ہو چکی تھی کہ لیگ کو ابھی عوام میں اپنا حلقہ اثر اور ووٹ بینک بڑھانے کی ضرورت ہے۔ مسلم اکثریتی

علاقوں میں بھی زمینداروں اور جاگیرداروں کی حمایت اسی صورت میں حاصل ہو سکتی تھی کہ لیگ پہلے اپنی وسیع تر عوامی تائید کا واضح ثبوت فراہم کرتی لیکن مسلم لیگ تمام مسلمانوں کو بظاہر ایک قومی اور غیر مذہبی جماعت کانگریس سے چھین کر اپنی صفوں میں کیسے شامل کر سکتی تھی؟

کانگریس نے خود ہی اس کا اہتمام بھی کر دیا۔ مسلم اکثریتی صوبوں میں جوڑ توڑ کے ذریعے مسلمانوں کی وزارتیں ختم کرانے کی کانگریسی حکمت عملی' لیگ کے لئے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی اور محمد علی جناح نے اس موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ کانگریس نے لیگ کو ایک حساس مسئلہ فراہم کر دیا تھا اور لیگی قیادت نے فوری رد عمل کا مظاہرہ کیا۔ اب یہ تاثر نہایت آسانی سے پھیلایا جا سکتا تھا کہ کانگریس ناقابل برداشت حد تک مسلم دشمن ہے اور یہ معاملہ کچھ اس طرح سامنے آیا کہ کانگریس کے ہندو میلانات کے مقابلے میں لیگ کا مسلم تشخص اجاگر ہوا۔

یہ تاثر جس کی ابتداء کانگریس کی طرف سے مسلم وزارتوں میں مداخلت سے ہوئی، دو طرح سے مسلم لیگ کے حق میں گیا۔ ایک تو یہ کہ اس کے باعث لیگ کی وسیع عوامی حمایت کا سلسلہ شروع ہوا اور دوسرے اس مہم کے حوالے سے لیگ کو عوامی سطح پر منظم کرنے کی بنیاد رکھی گئی۔ راجندر پرشاد نے ہندو بورژوازی کے دائیں بازو کے لیڈر ولبھائی پٹیل کو شکایتاً لکھا؛

"مسلمان ایک علیحدہ قوم کی حیثیت سے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ اس کے باوجود کہ کانگریسی وزارتیں ان کے ساتھ منصفانہ بلکہ فراخدلانہ برتاؤ کر رہی ہیں، مسلمانوں نے اس کانگریسی حسن سلوک کی ذرا بھی قدر نہیں کی بلکہ الٹا معاندانہ رویہ اختیار کیا۔۔۔۔ میرا خیال ہے کہ اگر ہم غیر کانگریسی صوبوں میں مسلم وزارتیں توڑنے یا کم از کم انہیں غیر موثر بنانے سے گریز کرتے تو حالات مختلف ہوتے۔ مسلم اکثریتی صوبوں میں کانگریس کے اس رویئے سے مسلم لیگ کے پراپیگنڈے کو بہت تقویت ملی۔"

اور محض لیگی وزارتوں کو ہی خطرات سے دوچار نہیں کیا گیا بلکہ کانگریس کی قیادت نے ہر محاذ پر تنگ نظری کا مظاہرہ کیا جس کی اسے بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔

آزاد کی تنقید

ابوالکلام آزاد، آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے صدر بھی رہے اور بھارت کے پہلے وزیر تعلیم بھی۔ 1958ء میں ان کی یادداشتوں پر مبنی کتاب "انڈیا ونز فریڈم" India Wins Freedom شائع ہوئی لیکن اس کتاب کے کچھ حصے ان کی خواہش کے مطابق 1958ء میں ان کے انتقال کے بعد 30 سال

تک شائع نہیں کئے گئے۔ 1988ء میں یہ کتاب 'رد کے گئے اضافی ابواب کے ساتھ دوبارہ شائع کی گئی۔ کتاب کے اس حصے میں خود مولانا آزاد کے اپنے الفاظ میں کانگریس کی عاجلانہ اور فاش غلطیوں کا ذکر ہے جن میں 1937ء کے انتخابات کے بعد صوبائی حکومتیں تشکیل دینے اور اسی حکمت عملی کے حوالے سے کانگریسی قیادت پر شدید نکتہ چینی کی گئی ہے۔ آزاد لکھتے ہیں:

"ان مباحث کے بعد آخر کانگریس نے حکومت بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ سب سے پہلے ان صوبوں میں کانگریسی حکومتیں تشکیل دی گئیں جہاں پارٹی کو پارلیمانی اکثریت حاصل تھی۔ پھر یہی عمل وہاں دہرایا گیا جہاں کانگریس، صوبائی ایوان کی واحد اکثریتی پارٹی تھی اور اس کے بعد تو جہاں بھی اور جیسے بھی ممکن ہوا، کانگریس نے حکومت بنا ڈالی۔۔۔۔۔ دو ایسے واقعات اہم ہیں جن کی بناء پر صوبائی کانگریس کمیٹیوں کے بارے میں بہت برا تاثر قائم ہوا۔ مجھے افسوس کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ بہار اور بمبئی، دونوں جگہ کانگریس قوم پرستی کی کسوٹی پر پوری نہیں اتری۔ کانگریس ایک قومی تنظیم کے طور پر ابھری تھی اور اس نے مختلف قومیتوں سے تعلق رکھنے والے افراد کو قیادت کے مواقع فراہم کئے تھے۔

بمبئی میں مسٹر نریمان مقامی کانگریس کے مسلمہ لیڈر تھے اور جب یہاں صوبائی حکومت تشکیل دینے کا مرحلہ آیا تو عام توقع یہی تھی کہ رتبے اور خدمات کے پیش نظر مسٹر نریمان کو قائد ایوان چن لیا جائے گا جس کا مطلب یہ ہوتا کہ بمبئی کا وزیراعلی ایک پارسی ہوتا جب کہ کانگریس پارلیانی پارٹی کی اکثریت ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ سردار پٹیل اور ان کے رفقاء کے لئے یہ صورت حال ناقابل قبول تھی ان کے نزدیک کانگریس کے ہندو حامیوں کو اس اعزاز سے محروم رکھنا، ناانصافی کے مترادف تھا لہذا مسٹر بی جے کھیر کو صوبہ بمبئی کی پارلیمانی پارٹی کا سربراہ منتخب کر لیا گیا۔"

"یہی تاریخ صوبہ بہار میں بھی دہرائی گئی۔ انتخابات ہوئے تو ڈاکٹر سید محمود صوبے کے سرکردہ لیڈر تھے مزید برآں وہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سیکرٹری جنرل بھی تھے گویا ایک ہی شخصیت صوبے میں اور قومی سطح دونوں جگہ اہمیت کی حامل تھی۔ جب کانگریس نے بہار میں قطعی اکثریت حاصل کر لی تو عام اندازہ یہی تھا کہ ڈاکٹر سید محمود کو صوبائی پارلیمانی پارٹی کا صدر منتخب کر لیا جائے گا اور صوبائی خودمختاری کے تحت تشکیل پانے والی بہار کی حکومت کے پہلے وزیراعلی وہی ہوں گے لیکن ایسا نہیں ہوا اور ان کے بجائے مرکزی

اسمبلی سے شری کرشن سنہا اور انوگرا ہانارائن سنہا کو واپس بہار بلا کر انہیں وزارت اعلی کے لئے تیار کیا جانے لگا۔ بہار میں ڈاکٹر راجندر پرشاد نے وہی کردار ادا کیا، جس کا مظاہرہ بمبئی میں سردار پٹیل نے کیا تھا۔ بمبئی اور بہار میں صرف اتنا فرق روا رکھا گیا کہ جب بہار میں شری کرشن سنہا نے حکومت تشکیل دی تو ڈاکٹر سید محمود بھی کابینہ میں شامل تھے۔"

"ان دونوں واقعات نے انتائی برا تاثر چھوڑا۔ میں آج بھی مڑ کر پیچھے دیکھتا ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ کانگریس اس حوالے سے اپنا متوقع مثالی کردار ادا کرنے میں بری طرح ناکام رہی۔ مجھے افسوس کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ کانگریس کی قوم پرستی ابھی اس سطح تک نہیں پہنچی تھی جہاں یہ فرقہ واریت سے بالاتر اور اقلیت واکثریت سے بے نیاز ہو کر محض اہلیت کی بنیاد پر اپنے لیڈروں کا انتخاب کر سکتی۔"

آزاد یہاں ایک اور عنصر بھی شامل کر سکتے تھے جس نے ہندو مسلم کشاکش کو مزید ہوا دی۔ بعض صوبائی اسمبلیوں کے ہندو اکثریتی اراکین بضد ہوئے کہ ایوان کی کارروائی کا آغاز بندے ماترم سے کیا جائے۔ 19 ویں صدی کا یہ ترانہ ہندو احیائے مذہب کا منظوم اظہار تھا۔ مسلم اراکین نے اس کی بھرپور مخالفت کی اور بندے ماترم تنازع مسلم ذہن پر اپنی انمٹ خراشیں چھوڑ گیا۔ کانگریس کے ایسے اقدامات نے ایک طویل عرصے سے جاری فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو نقصان پہنچایا اور اس طرح وہ ہندو مسلم تفریق مزید گہری ہوئی جسے غالباً مسلم قیادت نے ذہنی طور پر قبول کر لیا۔

اس تنگ دلی کا موازنہ ذرا مسٹر جناح کی کشادہ دلی اور وسیع النظری سے کریں جو ان کے اصولوں اور طرز عمل سے قدم قدم پر عیاں تھی۔ انہوں نے اپنے پہلے وزیر خارجہ کا انتخاب اہلیت کی بنیاد پر اس گروہ سے کیا جسے آج پاکستان میں آئینی طور پر ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیا جا چکا ہے۔ ان کا پہلا وزیر قانون ایک ہندو تھا۔ یہ بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کا اپنا انتخاب تھا اور تاریخ کا حصہ ہے مگر کیا آج کی بنیاد پرست تنظیمیں جو مختلف حکومتوں کو ہمیشہ دباؤ میں رکھنے کا باعث بنتی ہیں، آج کے دور میں ایسی کسی تقرری کو قبول کر سکتی ہیں؟

زندگی کے آخری لمحوں تک مسٹر جناح اپنے حامیوں کو، اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کی تلقین کرتے رہے کیونکہ وہ جس ریاست کا قیام چاہتے تھے، یہ اصول اس کی بنیاد تھا۔ قیام پاکستان کے موقعہ پر ان کی تقریر اسی سوچ سے عبارت تھی اور وہ زندگی بھر اسی روایت کے امین رہے۔

اہم ترین کھلاڑی

کانگریس کی سوچ اور عمل کے تضاد نے اقلیتوں کو بہت جلد اس سے متنفر کر دیا۔ مسلمان اب مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہونے لگے تھے۔ کانگریسی موقعہ پرستی کے مقابلے میں مسٹر جناح کی اصول پسندی بڑے نمایاں انداز میں واضح ہو کر سامنے آئی تھی۔ مسلم لیگیوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔ وہ اب چاہتے تھے کہ اپنے حامیوں کو مجتمع اور انہیں متحرک کر کے اپنی عوامی قوت کا بھرپور مظاہرہ کریں کہ اس عمل کی کامیابی سے ان کی تنظیم، مسلم لیگ کی ساکھ وابستہ تھی۔

دوسری جنگ عظیم کے آغاز پر کانگریس نے مسلم لیگ کو اپنی ساکھ کی بحالی کا ایک اور موقعہ فراہم کر دیا۔ برطانیہ کے جنگی مقاصد سے اختلاف کا اظہار کرتے ہوئے اکتوبر 1939ء میں کانگریس نے تمام صوبوں میں وزارتوں سے علیحدگی کا اعلان کیا۔ جناح کے ذہن رسا نے اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور فی الفور کانگریس حکومت سے "نجات کا دن" منانے کا اعلان کر دیا۔

22 دسمبر 1939ء کو برصغیر کے طول و عرض میں وسیع پیمانے پر یوم نجات منا کر نہ صرف مسلم لیگ کی ساکھ اور اہمیت میں بے پناہ اضافہ ہوا بلکہ مسلم اکثریتی علاقوں میں مسلم لیگ کو حاصل ہونے والی نئی حمایت کا واضح اظہار بھی ہو گیا۔

مسلم لیگ کے 23 مارچ 1940ء کے لاہور اجلاس میں جو قرارداد پاکستان منظور کی گئی، اگرچہ اس وقت یہ مطالبہ قدرے مبہم اور غیر واضح تھا لیکن بہر صورت' یہ پے در پے رونما ہونے والے واقعات کا منطقی نتیجہ تھا۔ اس قرارداد میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ جغرافیائی طور پر ملحقہ یونٹوں کی حد بندی اس طرح کی جائے کہ ناگزیر سرحدی ردوبدل کے ذریعے ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی خطوں کی طرح جہاں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں، انہیں آپس میں ملا کر ایسی آزاد ریاستیں تشکیل دی جائیں جن میں شامل یونٹ یا جغرافیائی اکائیاں خود مختار اور ہمہ مقتدر ہوں۔

اگرچہ جداگانہ سیاسی تشخص کی حامل اس اولین قرارداد میں تذبذب اور غیر یقینی کا عنصر نمایاں ہے لیکن مسلم لیگ کے مزاج میں اب جھجک اور تامل نام کو نہیں رہا تھا۔ وہ اپنے وسیع تر قومی مفادات کے حصول میں کسی بھی صورت حال سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہونے کے لئے پوری طرح سرگرم اور تیار تھی۔ اور مسلم لیگ کو یہ موقع بھی جلد ہی میسر آ گیا۔

دوسری جنگ عظیم (1945ء-1939ء) نے طول پکڑا تو برطانوی جنگی تیاریوں کے سلسلے میں وادی سندھ اور ہندوستان کی فیصلہ کن اہمیت بھی اجاگر ہوئی۔ انگریز سرکار دونوں میں سے کسی ایک کو بھی ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہتی تھی۔ برصغیر اتحادی فوجوں کے لئے دنیا بھر میں افرادی قوت، تیار مال،

خوراک اور دوسری اشیائے خورد و نوش مہیا کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ اور اس عظیم نوآبادی کے قائدین اپنی اس اہمیت سے پوری طرح آگاہ تھے۔ برطانیہ ان بیش بہا سہولتوں کے عوض اپنی نوآبادی کو رعائتیں دینے پر تیار نہیں تھا اور ظاہر ہے یہ صورت حال انتہائی غیر منصفانہ اور ناقابل قبول تھی۔

کانگریس نے 1942ء میں "انڈیا چھوڑ دو" قرارداد منظور کی۔ حکومت برطانیہ کو اس انتہائی مطالبے کے یوں عوامی سطح پر اٹھائے جانے کی قطعی توقع نہیں تھی۔

لیگ کی قیادت نے بھی راج سے آزادی کا مطالبہ کیا لیکن الگ شرائط پر 'یعنی'' پہلے تقسیم پھر چھوڑو'' ایک پراعتماد اور طاقتور مسلم لیگ نے برصغیر کی تقسیم اور مسلمانوں کی الگ ریاست کے قیام کا مطالبہ کر دیا تھا۔ محمد علی جناح کی مسلم لیگ پاکستان کے مطالبے کو برصغیر کے سیاسی افق پر لے آئی تھی۔

کانگریس کی قیادت احمد نگر قلعہ جیل میں بند کر دی گئی اور لیگ کے قائدین مسلم عوام کو اس مطالبے پر قائل کرنے کے لئے مسلم اکثریتی علاقوں کی طرف نکل کھڑے ہوئے۔

وادی سندھ کی جاگیردار اشرافیہ میں بھی لیگ کے مطالبہ پاکستان کو پذیرائی حاصل ہونے لگی۔ سندھ اسمبلی مکمل طور پر جاگیرداروڈیروں پر مشتمل تھی لیکن سب سے پہلے اسی اسمبلی نے 1940ء کی قرارداد پاکستان کی توثیق کی۔

پنجاب کے جاگیردار اپنے وزیراعظم سردار سکندر حیات کی قیادت میں یونینسٹ پارٹی کے ساتھ تھے اوور 1937ء کے انتخابات میں مسلم لیگ پنجاب کی 86 نشستوں میں سے صرف ایک نشست حاصل کر سکی تھی لیکن اب یونینسٹ پارٹی کو بھی اسمبلی سے باہر مسلم لیگ کے وجود اور اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کا احساس ہونے لگا۔ وہ لیگ کے عوامی دباؤ کا بالواسطہ شکار ہوتے دکھائی دے رہی تھی اور اکتوبر 1937ء کے جناح سکندر معاہدے نے یہ بات ثابت کر دی تھی کہ یونینسٹ پارٹی کو اپنے اقتدار کے دوام کے لئے اسمبلی سے باہر مسلم لیگ کو حاصل ہونے والی روز افزوں عوامی قبولیت کی تائید درکار ہے۔ جناح اور مسلم لیگ 'وادی سندھ (پاکستان) کے جاگیردار کے لئے ناگزیر ہوتے جا رہے تھے۔

تاریخ کے پہیئے نے اپنا چکر مکمل کر لیا تھا۔ بیمار اور ناتواں جناح کی اصول پرستی اور عزم صمیم' عوام کی سیاسی قوت میں ڈھل کر منزل کی طرف رواں دواں تھا۔

3 جون کی طرف گامزن

اور اس کے بعد تو حالات جیسے تیزی سے رونما ہوتے چلے گئے۔ سکندر کے جانشین خضر حیات نے پنجاب کے وزیراعظم کا عہدہ سنبھالتے ہی لیگ کی حکمت عملی سے لاتعلقی کا اظہار شروع کر دیا حالانکہ

"جناح سکندر معاہدے" میں اس حکمت عملی کے تسلسل کی ضمانت دی گئی تھی۔ لیکن یہ وقت اس گریز کے لئے مناسب نہیں تھا۔ کیونکہ اب وادی سندھ کے مسلمانوں کا عوامی اور متوسط طبقہ مکمل طور پر جناح کے ساتھ تھا۔ وہ اب اتنے طاقتور تھے کہ جاگیرداروں سے اپنی شرائط منوا سکتے تھے۔

مسٹر جناح نے خضر کو اس کی حیثیت کا احساس دلانے کے لئے وائسرائے کی نو تشکیل شدہ کونسل کے تحت منعقد ہونے والے شملہ مذاکرات میں خضر حیات کی شمولیت کو ویٹو کر دیا۔ یہ اقدام ان جاگیرداروں کے لئے ایک موثر وارننگ ثابت ہوا۔ جن کا تحفظ اور حمایت نہ صرف مسلمانوں کے متوسط طبقات بلکہ عوام الناس کو بھی درکار تھی۔ اب وہی جاگیردار زمیندار، عوام اور متوسط (بورژوازی) طبقے کی تقلید میں نکلے اور مسلم لیگ میں شامل ہونے لگے۔ انہیں نظر آ گیا تھا کہ ووٹ مسٹر جناح کے اثر میں ہیں۔ اس طرح جناب جناح برصغیر کی مسلم بورژوازی اور وادی سندھ کے مسلمان زمینداروں کے درمیان ایک فعال سیاسی اتحاد قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اور 1946ء کے انتخابی نتائج اس اتحاد کی طاقت کا بھرپور مظہر تھے۔

مرکزی اور صوبائی قانون ساز اسمبلیوں کے انتخابی نتائج کا اعلان 1946ء کے اوائل میں ہوا اور مسلم لیگ نے مسلمانوں کے لئے مخصوص نشستوں پر بھاری اکثریت میں کامیابی حاصل کی۔ پنجاب کی 86 مسلم نشستوں میں سے 75 پر مسلم لیگ کامیاب ہوئی، اگرچہ یہ کثرت بھی صوبے میں حکومت بنانے کے لئے ناکافی تھی۔ البتہ سندھ میں کانگریس کی 21 نشستوں کے مقابلے میں 27 نشستیں جیت کر مسلم لیگ نے اپنی حکومت بنالی۔ جبکہ شمال مغربی سرحدی صوبے میں کانگریس نے غیر مسلم سیٹوں کے علاوہ چند مسلم نشستیں بھی جیتیں اور کانگریس کے حامی پختون قوم پرست ڈاکٹر خان صاحب کی سرکردگی میں یہاں کانگریس حکومت قائم ہوئی۔ مرکزی اسمبلی میں تمام مسلم نشستیں مسلم لیگ نے نے حاصل کیں۔ مسلم بورژوازی، مسلمان عوام اور مسلمان جاگیرداروں کے اشتراک سے ایک فیصلہ کن اتحاد بنانے میں کامیاب رہا تھا۔

اسی دوران دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر برطانیہ میں ہونے والے عام انتخابات میں قدامت پسند پارٹی شکست سے دوچار ہوئی اور لیبر پارٹی کے نئے منتخب وزیراعظم کلیمنٹ ایٹلی Clement Attlee نے اقتدار سنبھالتے ہی اپنی پارٹی کی حکمت عملی کے تحت برطانوی نوآبادیوں کو آزاد کرنے کی پالیسی پر عملدرآمد کا آغاز کر دیا۔

دوسری طرف 1946ء میں جب بمبئی کے ساحلوں پر تعینات رائل انڈین نیوی کے ایک حصے میں بغاوت ہوئی تو یہ اندیشہ بھی دامن گیر ہوا کہ بغاوت کا یہ وائرس کہیں دوسری افواج تک نہ پھیل

جائے۔ برطانیہ ایک پریشان کن صورت حال سے دوچار تھا اور اب اس سے کسی بھی وقت اہم نوعیت کے فیصلوں کی توقع کی جاسکتی تھی۔

مارچ 1946ء میں لیبر حکومت نے اپنے وزراء پر مشتمل کیبنٹ مشن (Cabinet Mission) برصغیر روانہ کیا جس نے کانگریس اور مسلم لیگ کے ساتھ طویل مذاکرات کئے جو بے نتیجہ رہے اور بالآخر کیبنٹ مشن نے اس آئینی بحران کے حل کے لئے اپنے یکطرفہ فارمولے کا اعلان کر دیا۔

اگرچہ کیبنٹ مشن کے فارمولے میں مطالبہ پاکستان کو درخور اعتناء نہیں سمجھا گیا تھا لیکن اس کے باوجود مسلم لیگ نے اسے قبول کر لیا۔ کیونکہ اس میں تین مرحلوں پر مشتمل وفاق کے ساتھ ایک ایسی عبوری حکومت تشکیل دیئے جانے کی تجویز سامنے آئی تھی جس میں دو نیم خود مختار مسلم صوبوں کی شکل میں مسلمانوں کے لئے کچھ تحفظات بھی مہیا کئے گئے تھے اور وقت کے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے مسلم لیگ کے لئے یہ ایک بہترین امکانی راستہ تھا۔ البتہ کانگریس نے بڑے معنی خیز انداز میں کیبنٹ مشن کے فارمولے کو قبول کرنے میں لیت و لعل سے کام لیا۔ کانگریسی رویے کے پیش نظر' مشن نے مسلم لیگ کی قبولیت کو بھی نظر انداز کر دیا جس پر مسٹر جناح کو بہت دکھ ہوا۔ کانگریس کی حمایت میں انگریز کے تعصب کا یہ واضح اظہار تھا۔

اور یوں اس مسئلے کو خوش اسلوبی سے طے کرنے میں ناکامی کے باعث کانگریس نے ایک بار پھر وادی سندھ کی علیحدہ ریاست کے احیاء کو اپنی ہی تنگ نظری سے ممکن بنادیا اور یہی وقت تھا جب رو بہ ترقی مسلم لیگ کانگریس کی خوشنودی کے حصول کے لئے غیر معینہ مدت تک انتظار کرنے پر تیار نہ تھی۔

29 جولائی 1946ء کو مسلم لیگ نے کیبنٹ مشن پلان کے سلسلے میں اپنی پیشکش واپس لے لی اور "راست اقدام" Direct Action کا اعلان کر دیا جس کے لئے 16 اگست کا دن مقرر کیا گیا۔ اس روز کلکتہ میں خونریز ہندو مسلم فسادات ہوئے، کم و بیش تین ہزار افراد ہلاک ہوئے۔ ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمان زیادہ مارے گئے۔ اور مسٹر جناح کے ذہن میں یہ خیال اور بھی پختہ ہو گیا کہ "بلا تاخیر قیام پاکستان کے علاوہ اب کوئی راستہ باقی نہیں رہا۔۔۔۔۔ ہم ضمانت دیتے ہیں کہ پاکستان میں ہندو اور دوسری غیر مسلم اقلیتوں کو بھرپور تحفظ مہیا کیا جائے گا جن کی تعداد ڈھائی کروڑ کے لگ بھگ ہو گی۔ ہم ہر لحاظ سے ان کے مفادات کا خیال رکھیں گے۔ برصغیر کے عوام کی حقیقی آزادی، خوشحالی اور ان کی مسرت و شادمانی کا یہی ایک فوری راستہ ہے۔"

جناح اب میدان سیاست کے سب سے اہم کھلاڑی بن چکے تھے۔

1947ء کے اوائل میں بڑھتی ہوئی بدامنی اور معاشرتی بے چینی کے پس منظر میں برطانوی وزیراعظم اٹیلی نے اعلان کر دیا کہ مسلم لیگ اور کانگریس کے مابین اگر آزاد برصغیر کے لئے کسی آئینی ڈھانچے پر اتفاق رائے نہ بھی ہوا تو بھی جون 1948ء سے پہلے پہلے برطانیہ ہندوستان چھوڑ دینے کا فیصلہ کر چکا ہے۔

مارچ 1947ء میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ہندوستان کا گورنر جنرل اور وائسرائے مقرر کیا گیا۔ ماؤنٹ بیٹن نے آتے ہی برصغیر کی آزادی کے سلسلے میں اپنے منصوبے کا اعلان کر دیا جسے "جون تھرڈ پلان" کہا گیا۔ اس منصوبے میں تجویز کیا گیا تھا کہ برصغیر کو ہندوستان اور پاکستان میں تقسیم کر دیا جائے۔ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے اسے قبول کر لیا۔

اور یہ محض اس لئے ممکن ہوا کہ علیحدگی کے لئے وادی سندھ کی خواہش، فطری اور قدیم تھی۔ اس خواہش کی بنیادیں زمانہ قبل از تاریخ میں پیوست تھیں اور یوں تاریخ نے اپنے محور کے گرد ایک اور چکر مکمل کر لیا تھا۔ وادی سندھ اپنے اصل کی طرف لوٹ رہی تھی۔

جناح سے قائداعظم

ابتدا میں جناح کو صرف مسلمان بورژوازی کی محدود اور نحیف حمائت حاصل تھی لیکن 1946ء کے انتخابات تک یہ حمائت وسعت اختیار کر کے وادی سندھ کے زمیندار طبقے کو بھی اپنے حلقہ اثر میں لے آئی۔ اب مسلمان زمیندار اور بورژوازی کا مؤثر اتحاد وجود میں آ چکا تھا۔

مسلم لیگ کو جاگیردار کی حمائت ابھی حال ہی میں حاصل ہوئی تھی لیکن سیاسی حکمت عملی کے ضمن میں وہ بورژوازی سے زیادہ موثر ثابت ہوئے کیونکہ وادی سندھ کے مسلم اکثریتی علاقوں میں انہیں کئی نسلوں سے معاشی برتری حاصل تھی اور اس طرح جناح کی معجزاتی قیادت میں '' مسلم جاگیردار بورژوازی اتحاد '' دیہی اور شہری علاقوں میں زبردست تحریک بپا کرنے میں کامیاب رہا۔ اور یوں پاکستان کا قیام ناگزیر ہو گیا۔ محمد علی جناح کو "قائداعظم" یعنی سب سے بڑے راہنما کے لقب سے نوازا گیا۔ 14 اگست 1947ء کا یوم آزادی اب محض ایک پُرشوق قدم کے فاصلے پر تھا۔

آزادی کے موقع پر قائداعظم نے پاکستان کی پہلی قانون ساز اسمبلی سے خطاب کیا۔ ان کی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر ان بنیادی اصولوں کا بھرپور احاطہ کرتی ہے جو پاکستان کی تخلیق کا محرک بنے اور اس تقریر کے لئے ایک ایسے اہم ادارے کا انتخاب کیا گیا جسے نو تخلیق ریاست کی بنیادی دستاویز یعنی

آئین کی تدوین کرنا تھی۔

عین تخلیق پاکستان کے موقع پر ایسا خطاب یقیناً بر محل تھا۔ ایک نئی مملکت وجود میں آ رہی تھی اور اس انتہائی باوقار اور موزوں ترین لمحات میں مملکت کی سب سے اہل اور مجاز شخصیت کا یہ خطاب دراصل ریاست کے اہم اور اساسی نظریات کی وضاحت کے لئے تھا۔ جسے جدوجہد آزادی کا نچوڑ بھی قرار دیا جا سکتا ہے اور ان مقاصد کی نشاندہی بھی' جن کا حصول قوم کی دسترس میں تھا۔ نو تخلیق ریاست کے منطقی جواز کے حوالے سے قائداعظم کی 11 اگست 1947ء کی تقریر سے بڑھ کر اور کونسی شہادت معتبر ہو سکتی ہے۔

اپنی تقریر کے آغاز میں قائد نے زور دے کر کہا "آپ یقیناً مجھ سے اتفاق کریں گے کہ حکومت کا اولین فرض قانون اور امن کی بحالی ہے تاکہ شہریوں کے جان و مال اور ان کے مذہبی عقائد کا مکمل تحفظ کیا جا سکے۔" اس تقریر میں آگے چل کر انہوں نے رشوت، بددیانتی، اقرباپروری، عہدے کے ناجائز استعمال اور برصغیر کی سابقہ حکومتوں میں سرایت کر جانے والی ایسی دیگر برائیوں کی پرزور مذمت کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں ماضی کے اس ترکے سے ہر حال میں پیچھا چھڑانا اور تحمل و برداشت کو اپنی زندگی کا اصول بنانا ہوگا۔

"اگر ہم پاکستان کی اس عظیم ریاست کو خوشحال و شادمان دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں دل و جان سے عوام اور بالخصوص غریبوں کی بھلائی کے لئے کوشاں رہنا ہوگا۔ اگر آپ ماضی کو بھلا کر اور اپنے اختلافات کو نظر انداز کر کے سب مل جل کر محنت کریں تو کامیابی یقیناً آپ کے قدم چومے گی۔ اگر آپ ماضی کے رویوں کو بدل ڈالیں اور اس جذبے اور سوچ کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں کہ آپ میں سے ہر شخص خواہ اس کا تعلق کسی بھی فرقے سے ہے، خواہ ماضی میں آپ کے ساتھ اس کا جو بھی رویہ تھا، اور اس کا رنگ، ذات اور نسل کچھ بھی سہی۔۔۔۔ وہ مساوی حقوق، مراعات اور ذمہ داریوں سمیت اول و آخر اس ریاست کا شہری ہے۔ اگر آپ نے اس سوچ کو اپنا لیا تو پھر آپ بے پناہ ترقی کریں گے۔ میں اس پہلو پر اس سے زیادہ زور نہیں دے سکتا۔ ہمیں فوری طور پر اس جذبے سے کام شروع کر دینا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اکثریت اور اقلیت، ہندو اور مسلم بلکہ مسلمانوں میں پٹھان، پنجابی، شیعہ، سنی اور ہندوؤں میں برہمن، ویش، کشتری اور پھر بنگالی اور مدراسی کے درمیان تفاوت مٹ جائے گا۔ اگر آپ مجھ سے پوچھیں تو درحقیقت ہندوستان کی آزادی اور خود مختاری کے حصول کی راہ میں سب سے بڑی

رکاوٹ بھی یہی تھی۔ اگر یہ اختلافات حائل نہ ہوتے تو ہم بہت پہلے آزادی حاصل کر چکے ہوتے۔ کوئی بھی طاقت کسی دوسری قوم کو اور وہ بھی 40 کروڑ نفوس کو محکوم نہیں بنا سکتی اور نہ ہی اپنی حاکمیت کو طول دے سکتی ہے جب تک کہ ہم خود اندرونی طور پر منقسم نہ ہوں۔

لہذا ہمیں اس (اپنی محکومیت) سے سبق سیکھنا چاہیے۔ آپ آزاد ہیں۔ آپ اس مملکت پاکستان میں اپنے مندروں، اپنی مسجدوں اور اپنی عبادت گاہوں میں جانے کے لئے آزاد ہیں۔ ریاست کو اس امر سے کوئی غرض نہیں کہ آپ کا تعلق کس مذہب، ذات اور نسل سے ہے۔

آپ تو جانتے ہیں اور تاریخ اس کی گواہ ہے کہ کبھی انگلستان کے حالات آج کے ہندوستان سے کہیں زیادہ خراب تھے۔ رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ایک دوسرے پر ظلم ڈھاتے رہے۔ آج بھی وہاں کچھ علاقے ایسے ہیں جہاں مذہبی امتیاز روا رکھا جاتا ہے اور مخصوص طبقات پر مختلف پابندیاں عائد کی جاتی ہیں۔ خدا کا شکر ہے ہم ایسے زمانوں میں اپنے سفر کا آغاز نہیں کر رہے۔ ہمارے سفر کی ابتدا ایک ایسے ماحول سے ہو رہی ہے جہاں تفرقہ نہیں، نہ تو برادریوں کے درمیان اور نہ ہی مختلف ذات اور نسلوں کے درمیان۔ ہم نے اس بنیادی اصول کے ساتھ اپنا سفر آغاز کیا ہے کہ ہم سب ایک ہی قوم کے فرد ہیں۔ ایک ہی مملکت میں مساوی حقوق رکھنے والے شہری۔ وقت گزرنے کے ساتھ انگلستان کے شہریوں کو اگر تلخ حقائق کا سامنا کرنا پڑا تو وہ مملکت کی طرف سے عائد فرائض اور ذمہ داریوں سے بھی خوش اسلوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہوتے چلے گئے۔ وہ اس (فرقہ پرستی) کی آگ سے بڑی احتیاط کے ساتھ قدم سنبھال کر گزرنے میں کامیاب رہے اور آج ہم یہ کہنے میں حق جانب ہیں کہ برطانیہ میں رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کا وجود کوئی معنی نہیں رکھتا۔ حقیقت ہے تو صرف اتنی کہ ہر شخص برطانیہ عظمیٰ کا شہری ہے اور وہ سب ایک ہی قوم کے فرد ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں بھی اسی نصب العین کو اپنا مطمع نظر بنانا چاہیے اور پھر آپ دیکھ ہی لیں گے کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب ہندو 'ہندو' نہیں رہے گا اور مسلمان 'مسلمان' نہیں ہو گا، مذہبی حوالے سے نہیں کیونکہ یہ تو ہر فرد کے ذاتی اعتقادات کا معاملہ ہے بلکہ صرف سیاسی اعتبار سے اور وہ بھی بطور ایک ہی ریاست کے شہریوں کی حیثیت سے۔"

قیام پاکستان کے موقع پر عظیم قائد نے جو بیان دیا ذرا اس کے اہم نکات پر ایک بار پھر غور فرمائیں کہ ------ "آپ کا تعلق کسی بھی مذہب، ذات یا نسل سے ہو، ریاستی امور کی انجام دہی کا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔" اور یہ کہ ---- "آج ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ریاست کے لئے رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کوئی وجود نہیں رکھتے۔ حقیقت ہے تو صرف اتنی کہ ہر شخص برطانیہ عظمیٰ کا شہری ہے اور وہ سب ایک ہی قوم کے فرد ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا مطمع نظر بھی صرف یہی ہونا چاہیے۔" جاہلیت پسندی کے اس ماحول میں یہ الفاظ کسی مغرب زدہ وکیل کے خیالات قرار دے کر مسترد کئے جا سکتے تھے لیکن یہ تو بانیٔ پاکستان کے اپنے الفاظ ہیں جو اس وقت ادا کئے گئے جب بانیٔ پاکستان کا مقصد نئی مملکت کے آئیڈیل کی نشاندہی کرنا تھا۔ آگے بڑھ کر ایک بار پھر ذرا ان الفاظ کو بہ نظر غائر دیکھ لیں کہ ------ "مذہبی نقطہ نظر سے نہیں کیونکہ یہ تو ہر فرد کے ذاتی اعتقادات کا معاملہ ہے بلکہ محض سیاسی اعتبار سے، ایک ہی مملکت کے شہری کی حیثیت سے۔"

سوچ کی اسی بالیدگی کے باعث جو وادی سندھ کی مسلمہ تحمل مزاجی سے یقینی طور پر ہم آہنگ تھی اور اپنی والہانہ اصول پرستی کی بناء پر عوام نے جناح کو قائداعظم کے لقب سے نوازا۔ فکر و عمل کا یہ پیکر وادی سندھ کا کھویا ہوا تشخص حال کر کے ایک نئی ریاست کے قیام میں کامیاب رہا تھا اور اس طرح ایک نئی "انڈس ریاست" یعنی پاکستان کی شکل میں سندھ واسی کو اپنی میراث اور اپنی شناخت واپس مل گئی تھی۔ اگرچہ آج بھی قائداعظم کے کروڑوں پیروکاران کے ساتھ جذباتی وابستگی رکھتے ہیں لیکن ان کے فلسفے کی سچائی کو ہم نے ریاست کی پروردہ تنگ نظری میں کہیں گم کر دیا ہے۔

لیکن اب وقت آگیا ہے کہ ہم پاکستانی اسی راست گو، اصول پرست اور کھرے "مسٹر جناح" کے فکر و عمل کی طرف لوٹ جائیں کہ 'جو ہر اعتبار سے سندھ واسی کی مکمل تجسیم تھا۔

34

سندھ واسی

تو پھر سندھ واسی کیا ہے ؟

یہ ہے وہ سوال جو میں نے اس کتاب کے دیباچے اور تعارف میں اٹھایا تھا اور "سندھ ساگر" لکھتے ہوئے مسلسل اس کے جواب کی تلاش میں سرگرداں رہا ہوں۔ کتاب کے مختلف ابواب میں سندھ واسی کی بہت سی خصوصیات کا ذکر ہو چکا ہے۔ اور اب ان آخری صفحات میں ایک بار پھر اسے موضوع سخن بنا کر بھی شاید اس سے بھرپور انصاف ممکن نہ ہو سکے لیکن قارئین یقیناً اس حقیقت سے اتفاق کریں گے کہ یہ اختتامیہ دراصل اس کتاب میں بیان کئے گئے دلائل و شواہد کی بازگشت ہے۔

ایک روشن خیال فرد خاندان

یہ سندھ واسی کی قدیم جبلت ہے جس نے ہمیشہ اسے گھریلو فرد بنائے رکھا۔ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ زمانہ قبل از تاریخ سے دور جدید تک وادی سندھ کے مکین گزر اوقات کے لئے عام طور پر زراعت ہی سے وابستہ رہے اور بنیادی طور پر اسی طرز حیات نے خاندان کو جنم دیا۔

اس وادی میں زراعت دریائے سندھ اور اس کے پر شکوہ معاون دریاؤں کی رہین منت رہی۔ یہ دریا ہر سال زرخیز مٹی کی ایک نئی تہہ بچھا کر اس سرزمین کو نئی شادابی عطا کرتے۔ زراعت نے دراصل خانہ بدوش، قبائلی نظام اور پدر سرانہ طرز زندگی کے برعکس افراد کو زمین کے مخصوص اور متعین قطعات سے وابستہ کر دیا۔ یوں قبائل ٹکڑوں میں بٹتے چلے گئے جس کے نتیجے میں خاندان کے بنیادی سماجی

اکائی کے طور پر ابھرنے کا عمل تیز تر ہوا اور قبائلی نظام، خانہ بدوشی، پدر سرانہ طرز حیات محض وادی سندھ کے بنجر اور پسماندہ علاقوں تک محدود ہو کر رہ گیا۔

خاندان کے نظام نے سندھ واسی کی شخصیت کو ایک مخصوص اور مہذب نرم روی عطا کی۔ ایک ہی خاندان کے درمیان روابط مضبوط تر ہوئے۔ ڈھلتی عمر کی طرف رواں اپنے ماں باپ بلکہ ان کے بھی ضعیف والدین کی خدمت و نگہداشت سندھ واسی کا شعار ٹھہری۔ اس ابھرتی ہوئی بنیادی سماجی اکائی یعنی خاندان نے سخت ترین معاشی بدحالی اور تنگ دستی میں بھی اپنے بزرگوں کو بے سہارا چھوڑنے کی ریت نہ اپنائی۔

خاندان کے اس نظام کی بدولت سندھ واسی نے ایسی تمام تہذیبوں سے بہت کم اثر قبول کیا جو بنیادی طور پر قبائلی، خانہ بدوش یا پدر سرانہ طرز حیات کی نمائندہ تھیں یا اپنے ماضی قریب میں ان کا تعلق ایسی تہذیبوں سے رہا تھا۔ یہاں تک کہ شریعت کی توضیح یا اس پر عمل پیرائی کے حوالے سے بھی وادی سندھ کے باسی عام طور پر صوفیاء کرام کے فکر و عمل اور ان کی نرم تر اور خلیقانہ اسلامی توضیحات کی طرف مائل رہے۔

خاندان یا کنبے کی قدیم روایات کی امین وادی سندھ کی عورت بھی ذہین، بہادر، خود اعتماد اور پیش قدمی کے جذبے سے سرشار رہی۔ ماضی کے تنگ نظر پروہتوں کے منتر جنتر اس کے کردار کی ان خوبیوں کو گھٹا نہیں سکے۔ حتیٰ کہ جب اسے پردے کا پابند کر دیا جاتا تو بھی وہ ایک بھرپور سماجی قوت کی حیثیت سے اپنے شوہر اور اپنے بیٹے کے لئے ایک موثر محرک اور سمت نمان کر سامنے آتی۔ اسے تعلیم اور روزگار کے مواقع سے اکثر محروم رکھا گیا اور اس لحاظ سے وہ وادیٔ سندھ اور آج کے پاکستان کا سب سے عظیم مگر پوشیدہ دفینہ ہے۔

یہ وادیٔ سندھ کی روایات سے آنکھ چرانے کا شاخسانہ ہے کہ تنگ نظر بنیاد پرست یہاں ہمیشہ اپنی شکست کی آواز بنے۔ سندھ واسیوں نے انہیں یکسر اور مسلسل مسترد کیا۔ جس کا واضح ثبوت 1937، 1946، 1951، 1962، 1964، 1970، 1977، 1985، 1988، 1990، 1993 اور 1997 کے عام انتخابات اور 1979، 1983، 1987، 1991 اور 1998 کے بلدیاتی انتخابات سمیت ہر انتخاب میں بنیاد پرست مذہبی جماعتیں شکست فاش سے دوچار ہوئیں۔ وادی سندھ نے ہمیشہ اور بلا تامل اسے مسترد کیا جس نے اس وادی کی رواداری، تحمل اور انسانی مساوات پر مبنی روایات سے صرف نظر کیا۔ بنیاد پرستوں کی طرف سے وادی سندھ کی ترقی پسندانہ ثقافتی روایات کی نفی کبھی ان روایات کو بدلنے کا موجب نہیں بن سکتی خواہ اس کے لئے وہ کوئی بھی تردد کر دیکھیں اور خواہ اپنے پند و نصائح پر کان نہ

دھرنے والوں کے لئے وہ بے شک خوفناک عذابوں کی پیش گوئیاں بھی کرتے رہیں۔

وادی سندھ کی جانب سے بنیاد پرستی اور انتہا پسندی کے استرداد کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ سندھ واسی مذہب سے بیگانہ ہے۔ اپنے صوفیاء کے مزاروں پر عقیدت مندوں کے بے پناہ ہجوم' در حقیقت دل کی گہرائیوں سے اس کے مذہبی ہونے کا ثبوت ہیں۔ وہ بڑی آسانی سے اپنا آپ ایک روشن ضمیر صوفی یا قائد کے حوالے تو کر دیتا ہے لیکن ایک کٹر' تنگ نظر اور بے لچک مولوی کے لئے اس کا رویہ مزاحمتی ہے۔ عدم برداشت کے فرسودہ نظریات سے بیزاری ماضی قدیم ہی سے اس کی روح میں جاگزیں ہے۔ اپنی سوچ کے حوالے سے بے تعصب اور روشن خیال سندھ واسی قدامت پرستوں کی سیاسی قیادت کبھی قبول نہیں کر سکتا۔ اسلام سے اپنی گہری وابستگی کے باوجود ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ وہ روشن خیال اور جدت پسندوں کو اپنا راہنما تسلیم کرتا ہے۔

بنیاد پرستوں کو مسترد کر کے سندھ واسی دراصل یہ واضح کر دیتا ہے کہ وہ فطرتاً تحمل مزاج اور وسیع النظر ہے۔ دس سالہ ریاستی سرپرستی کے باوجود بنیاد پرستی اور فرقہ واریت اپنی موجودہ تشدد آمیز عدم برداشت کے حوالے سے وادی سندھ کی صرف بیرونی فصیلوں تک ہی محدود ہے۔ سندھ واسی فرقہ وارانہ تشدد کی ان تحریکوں سے ہمیشہ الگ تھلگ ہی رہا ہے۔ وہ خود کبھی اس میں ملوث نہیں ہوتا بلکہ ایسی تحریکوں میں تشدد اور تصادم کے امکانات ور جحانات اسے تشویش میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ البتہ وہ ابھی اس سطح تک نہیں پہنچ سکا جہاں وہ عملی طور پر ایسی امن پسند تحریکوں کو منظم اور متحرک کر سکے جو پاکستان میں موجود مختلف عقیدوں اور فرقوں کے مابین تحمل اور پر امن بقائے باہمی کو فروغ دے سکیں۔

نظریات قائد کے برعکس عدم برداشت اور مذہبی جنونیت

پاکستان 14 اگست 1947ء کو وجود میں آیا' اور قائداعظم محمد علی جناح 11 ستمبر 1948ء کو وفات پا گئے۔

1953ء میں پاکستان کے اہم ترین شہر لاہور میں فسادات پھوٹ پڑے۔ بلوائی ایک اقلیتی فرقے کو یہ حق نہیں دینا چاہتے تھے کہ وہ خود کو مسلمان کہلوائے۔ مظاہرین کی عدم برداشت کا عالم یہ تھا کہ لاہور میں مارشل لاء نافذ کرنا پڑا۔ پنجاب کی صوبائی حکومت نے فسادات کی وجوہ کی نشاندہی کے لئے ایک اعلیٰ اختیاراتی تحقیقاتی کمیشن قائم کیا۔ معاملے کی تحقیق کے دوران ہائی کورٹ کے جسٹس محمد منیر اور جسٹس ایم آر کیانی کو پاکستان کے پہلے یوم آزادی کے حوالے سے کی گئی قائداعظم کی 11 اگست 1947ء کی تقریر کے تفصیلی تجزیئے کا موقعہ نصیب ہوا۔ ان جج حضرات کی رائے تھی کہ۔۔۔۔۔

"قائداعظم پاکستان کے بانی ہیں اور جس موقع پر انہوں نے یہ تقریر کی وہ پاکستان کی تاریخ کا پہلا سنگ میل تھا۔ اس تقریر میں وہ نہ صرف اپنے عوام سے مخاطب تھے بلکہ غیر مسلم اور باقی دنیا بھی ان کے پیش نظر تھی۔ اس خطاب کا مقصد اس آئیڈیل کو پوری صراحت کے ساتھ بیان کرنا تھا جس کے حصول کی خاطر اس نئی ریاست کو اپنی تمام تر توانائیاں وقف کر دینا تھیں۔ قائد کی تقریر میں ماضی کی تلخیوں کے حوالے سے گزرے وقت کو یکسر نظر انداز کرنے، اسے بھلا دینے اور پرانی رنجشوں کو دفن کر دینے کی اپیل تھی اور ریاست کے ہر شہری کو رنگ و نسل اور ذات برادری کی تفریق کے بغیر مساوی حقوق و مراعات اور ذمہ داریوں کی نوید دی گئی تھی۔ اس خطاب میں ایک سے زیادہ بار لفظ قوم استعمال ہوا اور مذہب کو کاروبار مملکت سے الگ اور محض فرد کا ذاتی عقیدہ قرار دیا گیا۔"

فسادات کی تحقیق و تفتیش کے دوران ٹربیونل نے علماء سے بھی راہنمائی کے لئے رابطہ کیا اور مذہب کا علم رکھنے والے کم و بیش تمام جید علماء کے بیانات قلمبند کئے۔ ہر عالم کا بیان لینے سے پہلے ججوں نے قائداعظم کی 11 اگست کی تقریر پڑھ کر سنائی اور اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں قلمبند کیا؛

"ہم نے علماء سے پوچھا کہ ریاست کا یہ تصور ان کے لئے قابل قبول ہے تو ان میں سے ہر ایک نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے نفی میں جواب دیا۔ ان میں احرار بھی شامل تھے اور سابق کانگریسی بھی جنہیں تقسیم سے پہلے بھی یہی تصور کسی پختہ عقیدے کی طرح محترم تھا۔ اگر مولانا امین احسن اصلاحی کی شہادت جماعت اسلامی کے نظریئے کی درست ترجمانی کرتی ہے تو اس کے مطابق ایک ایسی حکومت جو ایسے (۱۱ اگست کی تقریر میں بیان کئے گئے) نظریئے پر قائم ہو، شیطان کی تخلیق ہے۔ اور اس بیان (مولانا اصلاحی کے بیان) کی تصدیق جماعت اسلامی کے بانی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی مختلف تحریروں سے بھی ہوتی ہے۔ علماء میں سے کوئی بھی (پاکستانی) قومیت کی بنیاد پر قائم ریاست اور اس کے مضمرات کو برداشت کرنے پر تیار نہیں۔ ان کے نزدیک ملت اور اس سے متعلقہ لوازمات ہی کو صرف کاروبار مملکت میں فیصلہ کن اہمیت حاصل ہے۔"

یہ ان دو محترم ججوں کے اپنے الفاظ ہیں جو دونوں بعد میں چیف جسٹس بنے۔ لیکن ججوں کی تشویش محض اس مسئلے تک محدود نہیں تھی۔ اس الجھن سے قطع نظر کہ معاشرے کے ایک اہم طبقے کے نظریات قائد کی سوچ سے براہ راست متصادم تھے۔ ججوں کو خصوصی ٹربیونل کی تشکیل کے ذریعے

اختیارات تفویض کئے گئے تھے اس کے تحت ان کے لئے کچھ اور بنیادی مسائل کا جائزہ لینا بھی ضروری تھا۔ اسی حوالے سے وہ رقم طراز ہیں کہ :

''لہٰذا فوری طور پر یہ سوال ابھرتا ہے کہ اسلام کیا ہے اور کون مومن یا مسلمان ہے؟ ہم نے علماء کے سامنے یہ سوال رکھا اور ان کے جوابات کا ہم ابھی آگے چل کر ذکر کرتے ہیں لیکن ہم یہ کہے بناء نہیں رہ سکتے کہ یہ صورت حال ہمارے لئے انتہائی افسوسناک تھی حالانکہ علماء کا یہ فرض اولین تھا کہ وہ اس اہم معاملے میں اب تک کوئی متفقہ اور حتمی رائے قائم کر چکے ہوتے لیکن وہ آج بھی مایوس کن حد تک اختلافات کا شکار ہیں۔''

اور یہ امر قطعی حیران کن نہیں کہ جج صاحبان کے سامنے جب علماء کی طرف سے مسلمان کے بارے میں بہت سی مختلف ہی نہیں بلکہ متضاد تعریفیں سامنے آئیں تو وہ مایوسی کے عالم میں یہ لکھنے پر مجبور ہو گئے کہ :

''علماء کی جانب سے 'مسلمان' کی بہت سی تعریفیں سامنے آنے کے بعد بھی کیا اس امر کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ کوئی بھی دو عالم اس بنیادی مسئلے پر متفق نہیں ہیں۔ فاضل علماء کی طرح اگر ہم بھی مسلمان کی تعریف کرنے کی کوشش کریں اور اگر وہ ان کی طرف سے دی گئی تعریف سے مختلف ہو تو ہم بھی متفقہ طور پر دائرہ اسلام سے خارج قرار پائیں گے۔ اگر ہم ان میں سے کسی ایک عالم کی طرف سے سامنے آنے والی تعریف قبول کر لیتے ہیں تو ہم اس عالم کی نظر میں تو مسلمان کہلانے کے مستحق ہیں جب کہ باقی تمام علماء ہمیں فوری طور پر کافر قرار دے ڈالیں گے۔۔۔۔۔ اس صورت حال سے تو یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ شیعہ، سنی، اہل حدیث، دیوبندی یا بریلوی مسلک رکھنے والوں میں سے کوئی بھی مسلمان نہیں کہلا سکے گا۔ اب اگر حکومت ایسی (مذہبی) جماعت کے پاس ہو جو کسی بھی دوسری جماعت کو کافر قرار دیتی ہو تو اسلامی ریاست میں ایک نظریہ ترک کر کے دوسرا اختیار کرنے کی سزا موت ہوتی ہے۔''

اس رپورٹ کے مندرجات سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ بنیاد پرستوں کا موقف اگرچہ انتہائی بے لچک تھا اور وہ کسی حد تک شورش پھیلانے میں کامیاب بھی رہے لیکن عوام کی اکثریت ان کے انداز فکر سے لاتعلق اور ریاست کے بارے میں قائداعظم کے نظریات سے متفق رہی۔ قائداعظم کے نظریات ایک جدید اور روشن خیال مسلمان کے نظریات تھے اور آزادی کے پہلے بیس سال کے دوران

کم وبیش پوری قوم انہی نظریات سے منسلک رہی۔ جنرل یحییٰ کے مارشل لاء (71-1969ء) میں پہلی بار قائداعظم کے روشن خیال اور تحمل وبرداشت پر مبنی نظریات سے ہٹ کر ایک مخصوص سوچ کے مظہر "نظریہ پاکستان" کا مسئلہ اٹھایا گیا۔ اسے انتخاب کنندگان کی محض ایک محدود اقلیت کی حمایت حاصل تھی اور امید یہ کی جارہی تھی کہ حکومت کے یہی بنیاد پرست اتحادی بالآخر یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے کہ اسلام کے بارے میں تنگ نظری پر مبنی ان کی توضیحات مملکت پاکستان کے بنیادی نظریئے کے طور پر' عوام کے لئے قابل قبول ہیں لیکن اس نظریئے کے حامیوں نے دسمبر 1971ء کے عام انتخابات میں بری طرح شکست کھائی۔ 70 کی دہائی کے اواخر میں مملکت پاکستان ایک بار پھر اپنے بانیوں کی سوچ اور نظریات سے واضح طور پر دور ہوتی چلی گئی۔ جنرل محمد ضیاء الحق نے کسی قانونی اور آئینی اختیار کے بغیر ایک ماورائے آئین فوجی سازش کے ذریعے حکومت پر قبضہ کر لیا تھا اور اب چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور صدر جنرل ضیاء اپنی حکومت کو قانونی جواز فراہم کرنے کی کوشش میں اسلام کی بنیاد پرستانہ توضیحات کا سہارا تلاش کرنے پر مجبور تھے۔ یہاں تک کہ علماء کی وہ چند توضیحات بھی جنہیں مسٹر جناح، ان کے رفقاء اور بعد میں جسٹس منیر اور جسٹس کیانی کی حمائت بھی حاصل نہیں ہو سکی تھی، ضیاء کے طویل دور حکومت (1988ء۔ 1977ء) میں قانون وقت کا درجہ حاصل کر گئیں۔

چونکہ کتاب کے اس اختتامئے کا دائرہ کار یہ نہیں کہ کسی حکومت کے عہد اقتدار کے رجعت پسندانہ اقدامات کا تفصیلی جائزہ لیا جائے اس لئے یہی کہنے پر اکتفا کیا جاتا ہے کہ اگر 1970ء کی دہائی کے مناقشات اور 80 کی دہائی کی بنیاد پرستی، دونوں کی ریاستی سطح پر سرپرستی نہ کی جاتی تو وہ معاملات جو 40ء اور 50ء کی دہائیوں میں طے پا چکے تھے دوبارہ سر نہ اٹھا سکتے اور یوں سندھ واسی کے تشخص اور اس کی ترجیحات کے بارے میں نئے سرے سے بحث و تمحیص اور تشریح کا آغاز نہ ہوتا۔

مسرفانہ طرز زندگی' لاٹری کلچر اور شہری شعور کا فقدان

سندھ واسی میں بعض خامیاں بھی ہیں، انتہائی ضرر رساں خامیاں۔

تین صدیوں کی طوائف الملوکی کے نتیجے میں وہ نہ تو اپنے حکمرانوں سے بڑی توقعات وابستہ کرتا ہے اور نہ ہی ایسی توقعات کا کھل کر اظہار کرتا ہے۔ یوں حکمرانوں کو کھلی چھٹی مل جاتی ہے۔ آمر کسی قابل ذکر مزاحمت کے بغیر طویل عرصے تک اقتدار پر براجمان رہتے ہیں۔ ان کے پاس اختیار بھی ہوتا ہے اور طاقت بھی کہ وہ یونانی اساطیری کہانیوں کے پرومیتھس Prometheus کا کردار ادا کرنے

والے کسی بھی ایسے شخص کو عبرت کا نشان بنا دیں جو اشرافیہ کی مراعات کا ذرا سا حصہ بھی کسی حیلے بہانے سے حاصل کر کے انہیں وادی سندھ کے پسماندہ عوام تک پہنچانے کی جرأت کرے۔ نہ ہی یہاں کے حکمران کسی ایسے شخص کو معاف کرتے ہیں جو عوام کی توقعات بڑھائے یا ان کی آگہی کی سطح بلند کرنے کا حوصلہ کرے۔

مسلسل چار صدیوں تک سندھ واسی نے بے پناہ بربریت اور موت دیکھی ہے۔ اگرچہ وہ شہید کا مداح ہے لیکن غصے میں بھر کر وہ ان شہادتوں کو روکنے پر کمربستہ نہیں ہوتا۔ مظلوم کے ساتھ بے انتہا جذباتی وابستگی رکھنے کے باوجود وہ چپ چاپ کھڑا تماشا دیکھتا رہتا ہے۔ دور حاضر کے ایک مقبول وزیر اعظم کی سزائے موت کی صورت میں ہم اس کا واضح مشاہدہ کر چکے ہیں۔

انہی وجوہات کی بناء پر سندھ واسی موقعہ پرستی کو اجتماعی طور پر مسترد یا اس کی مذمت کرتا دکھائی نہیں دیتا۔ بہت ہوا تو وہ کسی ناکام موقع پرست پر نفرین بھیج دے گا۔ وہ کامیابی کی اخلاقیات کے گر پہچانتا اور انہیں اختیار بھی کرتا ہے۔ اگر کوئی منحرف ہو کر اپنے گروہ یا اپنی جماعت کا ساتھ چھوڑتا اور اس کے بدلے میں کوئی بڑا عہدہ حاصل کر لیتا ہے، جیسا کہ ماضی میں یہاں کے گورنروں کا وطیرہ رہا ہے تو عین ممکن ہے کہ وادی سندھ میں اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جانے لگے۔

صدیوں سے آتی جاتی اور لوٹ مار کرتی فوجوں نے سندھ واسی کو خرچیلا بنا دیا ہے۔ وہ پس انداز یعنی بچت کرنے میں یقین نہیں رکھتا۔ زندگی کی طرف اس کا رویہ بڑا کھلنڈرانہ ہے۔ وہ غریبی کو تقدیر کا لکھا جان کر زندگی گزار دیتا ہے اور اگر کبھی دولت اس کے ہاتھ لگ جائے تو بچت کی خواہش سے یکسر عاری یہ سندھ واسی انتہائی عاجلانہ انداز میں اسے بے جا نمود و نمائش پر لٹا دیتا ہے۔

سندھ واسی کی فضول خرچی اور عاجلانہ فطرت کو نسل در نسل اور پے در پے نکلنے والی "لاٹریوں" سے مزید تقویت ملی۔ انگریزوں نے آب پاشی کے بڑے بڑے منصوبے مکمل کرنے کے بعد زمینوں کی بندربانٹ کے ذریعے جب وادی سندھ میں نئی بستیوں کی بنیاد رکھی تو اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے؟ ان گنت بے زمین لوگ زمیندار بن گئے۔ اور چونکہ دولت اور رتبہ دونوں بڑی آسانی کے ساتھ جیسے ''راتوں رات'' ہاتھ آئے تھے لہذا لوگوں کو یہ باور کرانا ضروری تھا کہ اک نیا ''شیر'' رن میں آن پہنچا ہے۔ کسمپرسی سے دولتمندی تک پہنچنے کے اس بارہا دہرائے گئے کھیل نے سندھ واسی کو نمود و نمائش کا عادی بنانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔

آزادی کے پہلے دس سالوں میں یہاں ایک اور ''لاٹری'' نکلی۔ جائیداد کے جھوٹے دعویداروں نے پاکستان چھوڑ جانے والے ہندوؤں اور سکھوں کی املاک پر قبضہ جمایا۔ الاٹمنٹ کے زعم میں اکثر

اوقات استحقاق کا قطعی کوئی خیال نہ رکھا گیا اور یوں قلاش اور نکھٹو' متروکہ صنعتی املاک، عالیشان گھروں، باموقع دکانوں، مارکیٹوں، سینماؤں اور زرعی رقبوں کے حصول میں کامیاب رہے جبکہ ایسے ہزاروں مستحق افراد جو ہندوستان میں زمینیں، مکان اور جائیداد چھوڑ چھاڑ کر پاکستان چلے آئے تھے' اپنا حق حاصل کرنے میں بھی ناکام رہے۔ محکمہ حالیات کے افسروں کی عنایات تو ان کی متلون مزاجی اور آمرانہ رویے کے تابع تھیں۔ جب اور جس پر وہ مہربان ہوئے گویا اس کی قسمت کھل گئی اور "راتوں رات" اس کا شمار دولت مندوں میں ہونے لگا اور پھر وہ اپنے نودریافت سماجی رتبے کی دھاک بٹھانے کے لئے اندھادھند اور بے دریغ دولت خرچ کرنے میں جُت گیا۔

1960ء کی دہائی اپنے جلو میں امیر بننے کا ایک نیا نسخہ یا لاٹری کے ذریعے خوش بختی کا ایک نیا انداز لے کر آئی۔ یہ فیلڈ مارشل ایوب خان کی دہائی تھی جو اپنے لئے ایک مخصوص حلقہ نیابت کی تخلیق کا خواہاں تھا۔ "بنیادی جمہوریت" کے نام سے ایک نیا سیاسی ڈھانچہ تشکیل دیا گیا جس کے نتیجے میں بلدیاتی سطح پر ایک نیا طبقہ شرفاء وجود میں آیا۔ بلدیاتی اداروں کی تشکیل ایک اچھا قدم تھا مگر ان منتخب افراد کو ضرورت سے زیادہ پذیرائی حاصل ہوگئی۔ بلدیاتی اداروں کے یہ منتخب اراکین قوم کے انتہائی طاقتور انتخاب کنندگان بن کر ابھرے۔ جب وہ پہلے پہل منتخب ہوئے تو انہیں کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہوئی لیکن محض ایک صدارتی فرمان سے وہ معاشرے کے اہم ترین افراد میں شمار کئے جانے لگے۔ انہیں "راتوں رات" اتنی زیادہ سیاسی اور سماجی اہمیت حاصل ہوگئی اس سے پہلے جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی اور جلد ہی وہ اپنے نودریافت سیاسی اثرورسوخ کو اپنی معاشی خوشحالی کے لئے استعمال کرنے لگے۔

اسی دہائی میں حکمرانوں کے من پسند افراد کو قومی خزانے کی لوٹ مار میں شریک کرنے کا ایک نیا طریقہ "پرمٹ سسٹم" متعارف کرایا گیا۔ کسی بھی نوعیت کی صنعت یا کاروبار کے آغاز کو حکومت کی تحریری اجازت "Permit" سے مشروط کر دیا گیا۔ مثال کے طور پر جو لوگ خوراک کی ترسیل کا پرمٹ حاصل کرنے میں کامیاب رہے وہ ڈپو ہولڈر بن گئے۔ کپڑے یا اسی طرح کی دیگر صنعتیں قائم کرنے کے لئے بھی پرمٹ کا حصول ناگزیر تھا۔ ایسے اجازت ناموں کی قدر و قیمت بھی زیادہ تھی اور انہیں عام طور پر فروخت کر دیا جاتا تھا۔ ایک گورنر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے منظور نظر اعلیٰ افسر کو ٹیکسٹائل مل لگانے کے لئے ایک کی بجائے دو پرمٹ دیئے۔ ایک تو مل لگانے کے لئے اور دوسرا فروخت کر کے سرمایہ حاصل کرنے کے لئے تاکہ زمین اور مشینری خریدی جا سکے۔ یہ افسر تو "راتوں رات" کروڑ پتی ہوگیا جبکہ اس نئے سرمایہ دار کا بھائی بدستور نچلے متوسط طبقے تک محدود رہا۔ خوش قسمتی بھی گورنر کی خواہشات کی تابع تھی۔ سندھ واسی خوبی جانتا تھا کہ ایک بھائی کی خوشحالی اور

دوسرے کی تنگ دستی میں استحقاق کا کہیں گزر نہیں۔

بلاشبہ حکومتی عنایات کی بارش کا رخ (مغربی) پاکستان کی جانب تھا۔ صنعتوں کے لئے پرمٹوں کا اجراء اسی طرف زیادہ ہوا۔ ابتدائی طور پر مشرقی پاکستان میں صنعتیں قائم کرنے والوں نے بھی اپنے منافع سے مزید سرمایہ کاری مغربی پاکستان میں کی۔ گھر کراچی اور اسلام آباد میں بنائے اور تمام رواں اثاثے کراچی میں رکھے۔ مشرقی پاکستان میں کمائے گئے منافع سے پنجاب او سندھ میں زرعی رقبے خریدے گئے۔ انہی سرمایہ دار اور تاجروں کو بینکوں سے قرضے ملے، درآمدی اور برآمدی ڈیوٹیوں پر چھوٹ حاصل ہوئی اور انہی نے تیار مال کی درآمد پر پابندیاں لگوا کر مقابلے کے رجحان سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔ یہ صنعتی گھرانے حکومتی مراعات کے حصار میں خوب پروان چڑھے۔ وادی سندھ کے صنعتکار کی ترقی بھی یہاں کے جاگیردار کی طرح مصنوعی تھی۔

اور یہ غالب رجحان اتنا قوی تھا کہ آگے چل کر، پہلے مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان تناؤ اور بعد ازاں بنگلہ دیش کے قیام کی بنیاد بنا۔ بنگال اپنے بورژوائی پیداواری رشتوں کے سبب ہمیشہ سے جنائی ہندوستان کی بحری تجارت اور بیوپار سے منسلک رہا تھا۔ یہاں کا بورژوازی زیادہ بالغ نظر اور حساس تھا۔ اس نے وادی سندھ کے بورژوازی کے غیر ملکی انداز تجارت کو فوراً بھانپ لیا۔ بنگالی بورژوازی ویسے بھی شمالی مغربی خطے کے 'جاگیردار سے سرمایہ دار بننے والے 'بورژوازی سے واضح طور پر مختلف تھا لہٰذا اشتراک مذہب بھی 1971ء کی علیحدگی کو روکنے میں ناکام رہا۔ دونوں سماجوں کی سیاست اور معاشرت کا ثقافتی تفاوت کہیں زیادہ طاقتور اور ناقابل تسخیر ثابت ہوا اور جب ثقافت کا یہ فطری اختلاف مذہب کے اشتراک پر حاوی رہا تو بہت سے لوگوں کے لئے یہ صورت حال انتہائی پریشان کن تھی کیونکہ انہیں "دو قومی نظریہ" جس کی بنیاد صرف ہندو مسلم مذہبی تفریق پر تھی، باطل ہوتا نظر آیا۔

1970ء کی دہائی 'سیال سونے کی دہائی تھی۔ چھ روزہ عرب اسرائیل جنگ کے بعد عرب 'تیل کو بطور ہتھیار ستعمال کرنے لگے اور تاریخ میں پہلی بار (اور شاید ایک مختصر عرصے کے لئے) تیل صحیح معنوں میں عربوں کا اثاثہ ثابت ہوا۔ اس کے ساتھ ترقی آئی تو شہر، شاہراہیں، تیل صاف کرنے کے کارخانے، بندرگاہیں اور ہوائی اڈے تعمیر کرنے کی ضرورت بھی پیش آئی۔ ان منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے افرادی قوت کی ضرورت تھی یوں لاکھوں پاکستانیوں پر خلیجی ریاستوں میں ملازمتوں کے در 'وا ہوئے۔ اب ایک نئی تفریق نے جنم لیا جسے "دوبئی سنڈروم" Dubai Syndrome یا "آزارِ دوبئی" کا نام دیا گیا حالانکہ اسے "لاٹری سنڈروم" کہنا زیادہ مناسب ہے۔ یہاں بھی استحقاق اور مہارت کا دخل زیادہ نہیں تھا۔ جو بھائی دوبئی چلا گیا دولتمند ہو گیا جو نہ جا سکا

غریب کا غریب رہا۔ معاشی قوت کے ذریعے ایک بار پھر ''راتوں رات'' ایک نیا طبقہ وجود میں آگیا تھا۔ یہ بات قطعی غیر اہم تھی کہ بیرون ملک کوئی کیا کام کرتا ہے، صرف اس کی کمائی ہوئی دولت' اس کے سماجی رتبے کی ضامن تھی۔

جنرل ضیاء کا دور حکومت ہیروئن کی لعنت ساتھ لایا۔ افغانستان کی جنگ کے دوران ہتھیاروں اور منشیات کے کاروبار پروان چڑھے۔ جو بھی ہیروئن کا" پھیرا" لگانے میں کامیاب رہا، اندھی دولت نے ''راتوں رات'' اس کے قدم چومے۔ اس نے مہنگے علاقوں میں شاندار دفاتر اور پلازے مالئے۔ اس کے بچے بہترین سکولوں میں تعلیم حاصل کرنے لگے۔ جو ہچکچایا اور ارادے کی کمزوری کی شکار ہوا، پیچھے رہ گیا۔ یہ ایسا وقت تھا کہ اتنا پوچھنے والا بھی کوئی نہیں تھا کہ اس کے نئے ہمسایوں کے پاس اچانک اتنی دولت کہاں سے آئی ؟ اور دیانتدار شخص کے ساتھ تو کوئی اظہار ہمدردی پر بھی تیار نہیں تھا۔ اقدار کی اس پامالی میں کرپشن Corruption ایک جائز معاشرتی رویہ قرار پائی۔

1990ء کی دہائی میں اعلی عہدوں پر فائز افراد نے قومیائے گئے بینکوں اور کوآپریٹو سوسائٹیوں کے ذریعے دولت لوٹی اور اپنے اثاثوں کو ''راتوں رات'' دگنا چوگنا کر لیا۔ لاٹری کلچر اور راتوں رات امیر بن جانے کی خواہش کو دوام ملا۔

یورپ اور بھارت کے برعکس وادی سندھ کے معاشی طور پر غالب طبقے نے تاریخی جدوجہد، کوشش، ثابت قدمی، ضبط، دانش، بچت، حوصلے یا دانشمندانہ سرمایہ کاری کے ذریعے ترقی اور بالادستی کا "حق" حاصل نہیں کیا۔ وادی سندھ کی اشرافیہ طویل جدوجہد سے گزر کر اور نسل در نسل پائی پائی جوڑ کر بتدریج متمول نہیں ہوئی تھی۔

انیسویں اور بیسویں صدی کی ''معاشی لاٹریوں'' نے سندھ واسی کے ذہن پر ''راتوں رات'' امیر بن جانے کی خواہش نقش کر دی ہے۔ اس کے نزدیک اصول اور استحقاق کی اہمیت ذرا بھی نہیں۔ اس نے تو کئی نسلوں سے اپنے اردگرد کے افراد کو اچانک معاشی اور سماجی بلندیوں کی انتہا پر پہنچتے اور مقدر کے پانسوں کو منٹوں میں پلٹتے دیکھا ہے۔ لہذا جب استحقاق یا میرٹ Merit کی حیثیت ہی کوئی نہیں تو پھر کیوں نہ وہ خود بھی قسمت آزمائی کرے اور دولت کی لذتوں سے لطف اندوز ہو!!

بہادر سپاہی مگر ناکام منتظم

سندھ واسی ایک اچھا سپاہی ہے۔ تاریخ نے ان گنت جنگوں میں اس کی شجاعت کا ہنر آزمایا ہے۔ وہ قدیم زمانوں سے انتہائی وحشی اور جابر فوجوں کا مقابلہ کرتا آیا ہے۔ اس کا مسکن ان حملہ آوروں کے

راستے میں پڑتا تھا جو آتے تو اس کی فصلوں اور اس کے دیہات کو خاکستر بنا دیتے۔ شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ سندھ واسی نے اپنے گھر بار کے تحفظ کے لئے مردانہ وار مقابلہ نہ کیا ہو۔ جب کبھی اسے پسپائی اختیار کرنا پڑتی تو یہ دراصل ایک اور جنگ کی تیاری کا آغاز ہوتا۔ وہ انتھک آریا تھے یا وحشی ہن، فاتح عالم سکندر کی افواج قاہرہ تھیں یا افغانستان کے جفاکش اور مستقل مزاج حملہ آور' تیمور کی شکل میں زمینوں کو تسخیر کرنے والے تھے یا جنگی حکمت عملی کے ماہر مغلوں کے بعد نادر شاہ جیسے سفاک نے ادھر کا رخ کیا۔ اٹل حقیقت یہی ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو وادی سندھ میں ہمیشہ اور شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ پورا خطہ ایک وسیع و عریض اور مستقل میدان جنگ تھا۔ انگریز بھی اپنی بے پناہ تکنیکی برتری کے باوجود کئی شدید اور خونی معرکوں کے بعد کہیں جا کر اپنی انڈین سلطنت کا دائرہ وادی سندھ تک بڑھانے میں کامیاب ہو سکے۔

بلاشبہ اس وادی میں بے شمار جنگیں لڑی گئیں، حملہ آور بھی پسپا ہوتے رہے لیکن فاتح کی کامیابی میں اکثر تقدیر کی کرشمہ سازی کا اتنا زیادہ دخل ہوتا کہ سندھ واسی کا اس امر پر یقین پختہ ہوتا چلا گیا کہ جنگ میں جیت محض سائنس اور ٹیکنالوجی میں برتری کی رہین منت نہیں ہوتی۔ وادی سندھ میں آج بھی یہ عقیدہ عام ہے کہ جنگ میں جیت ہمیشہ ان کی ہوتی ہے جو حق پر ہوتے ہیں نہ کہ ان کی جو ٹیکنالوجی کے اعتبار سے برتر ہوں۔ اور حق پر وہ ہوتے ہیں جن کا ایمان پختہ ہوتا ہے خواہ وہ تنظیم، ٹیکنالوجی اور موثر سائنسی حکمت عملی سے عاری ہی کیوں نہ ہو۔ ایک صدی تک یورپ کا محکوم رہنے کے باوجود سندھ واسی نے زندگی کے بارے میں سائنسی رویہ نہیں اپنایا۔ وہ تجزیے اور حقائق کو بنیاد بنائے بغیر نتائج اخذ کر لیتا ہے۔ اس کا آئیڈیل گھوڑے پر سوار وہ شہزور ہے جو اپنی تلوار لہراتا ہوا دشمن پر ٹوٹ پڑتا ہے اور تن تنہا سینکڑوں مسلح دشمنوں کو ہلاک کر ڈالتا ہے۔

اپنی عمومی افتادِ طبع کے باوجود فوجی مشق اور نظم و ضبط کی تربیت سے گزرنے کے بعد سندھ واسی کا شمار دنیا کے بہترین فوجی افسروں میں ہوتا ہے۔ ایک سپاہی کے طور پر وہ شجاعت اور بہادری کے عظیم کارنامے سرانجام دے سکتا ہے۔ برٹش انڈین آرمی میں سو سالہ خدمات اور دنیا کے دشوار ترین اور نامانوس خطوں میں اپنی جان پر کھیل کر متعدد فیصلہ کن اور کامیاب فوجی معرکہ آرائیوں کے تجربات نے وادی سندھ کے سپاہی میں کئی عمدہ خصوصیات پیدا کر دی ہیں۔ تربیت اچھی ملے تو وہ بہت جلد نظم و ضبط اور ہم آہنگی کی قدر و قیمت سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ امن ہو یا جنگ، اپنے اعلیٰ افسران کی فرماں برداری میں فائدہ بہت ہے۔ وادی سندھ کے یہی فوجی تھے جو عالمی سلطنت پر حکمرانی میں برطانیہ کے بہت کام آئے اور سندھ واسی اگر ایک موثر انتظامی ڈھانچے کے تحت خدمات سرانجام دے رہا ہو تو

فرمانبرداری کی شخصی خوبی اسے ایک محنتی اور انتھک کارکن میں بدل دیتی ہے۔

لیکن جب انتظامیہ کا بار خود اس کے کندھوں پر ہو تو سندھ واسی کا رنگ ڈھنگ ہی اور ہوتا ہے۔ صدیوں تک بدامنی اور افراتفری کا شکار رہنے کی بناء پر قوانین کی پابندی میں سندھ واسی کی دلچسپی کچھ ایسی زیادہ نہیں رہی۔ جب وہ منتظم بنتا ہے تو اپنے عہدے کی اہمیت سے جی بھر کے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے۔ وہ قواعد و ضوابط سے بے نیاز ہو کر زیادہ سے زیادہ اختیارات کے حصول اور ان کے من مانے استعمال کے لئے کوشاں رہتا ہے۔ اب قاعدہ قانون اس کے لئے بے معنی الفاظ ہیں۔ اس کے نزدیک اپنے اختیار سے تجاوز اور اس اختیار سے ذاتی مفادات کے حصول کی صلاحیت ہی دراصل وسعت اختیار کی دلیل ہے۔ ایک ایسا افسر جو کسی دوست یا سائل کے مفاد کی خاطر ضابطوں کو پس پشت ڈالنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، اسے عام طور پر عزت و احترام کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ قواعد و ضوابط کے بارے میں یہ رویہ ہمارے اندر اس طرح رچ بس گیا ہے کہ ایسے فوجی افسر، قانون کا احترام زندگی بھر جن کا اوڑھنا بچھونا رہتا ہے، جب غیر عسکری ذمہ داریاں سنبھالتے ہیں تو ماضی کی تربیت بھلانے میں ذرا دیر نہیں لگاتے۔

ناقص منتظم ہونے کے ناطے وادی سندھ کی اشرافیہ نہ تو خود قواعد و ضوابط کی پابندی کرتی ہے اور نہ کسی دوسرے کے دل میں اس کا احترام پیدا ہونے دیتی ہے۔ انیسویں صدی کے آخر تک جاری رہنے والی بدامنی نے سندھ واسی کو اجتماعی معاشرتی ذمہ داریوں سے یکسر بیگانہ کر دیا۔ دفتر میں ہو یا سڑک پر، وہ ہر طرح کی ذمہ داری سے یکسر عاری نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک معمولی سرکاری اہلکار بھی درخواست گزاروں کے ہجوم کو قطعی غیر ضروری طور پر دفتر کے باہر پہروں کھڑا کئے رکھتا ہے خواہ خود اندر بیٹھا وہ چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے فون پر بے تکان گپیں ہانک رہا ہو اور سڑک پر جہاں مشکل دو رویہ ٹریفک گزرنے کی گنجائش ہوتی ہے، سندھ واسی ریلوے پھاٹک کے دونوں جانب گاڑیوں کی پانچ پانچ قطاریں بنا کر بڑے موثر انداز میں ٹریفک جام کر دینے کی اہلیت رکھتا ہے۔ بستی میں ہر طرف گندگی اور کوڑا کرکٹ کے ڈھیر لگا کر وہ خود اپنے گزرنے کا راستہ بند کر دیتا ہے۔ معاشرتی ذمہ داریوں کے حوالے سے ابھی اس نے سیکھنے کی ابتدا بھی نہیں کی۔

اختتامیہ

قوموں کو تاریخ اور بالخصوص اپنی تاریخ سے سبق سیکھنا چاہیے لیکن صحیح سبق تو اسی صورت میں سیکھا جا سکتا ہے جب تاریخ سچائی کے ساتھ بیان کی گئی ہو۔

بظاہر یہ بات کہہ دینا تو آسان ہے لیکن اس پر عملدر آمد ناممکن نہیں تو بے انتہا کٹھن ضرور ہے۔ صرف ایک غیر جانبدار اور بے تعصب شخص جو عہد عتیق سے عہد جدید تک، پورے تاریخی عمل، ہر واقعے اور واردات کا چشم دید گواہ رہا ہو، صرف وہی ایسی تاریخ مرتب کر سکتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ ایسے کسی شخص کا وجود ممکن نہیں لہذا مورخین اور تاریخ نویسوں کو ماضی میں بیان کئے گئے واقعات اور شہادتوں پر اعتبار کرنا پڑتا ہے لیکن ہر گواہی اور واقعاتی شہادت کی سچائی اور سیاق و سباق کو پرکھنے کا انحصار ان کی ذاتی اہلیت و صلاحیت پر ہے۔ ایسی شہادتیں اور ثبوت عام طور پر اپنے اصل سے کئی مدارج پرے اور صدیوں پرانے ہوتے ہیں اور یہ گمراہ کن بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ وہ مورخین جو اپنے ذہن میں پہلے سے کوئی رائے تشکیل دے کر تحقیق کا آغاز کرتے ہیں، آسانی سے دھوکا کھا جاتے ہیں۔

لہذا مورخ کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ کھلے ذہن کے ساتھ پیش نظر مواد کے تجزیئے کی سعی کرے۔ اگر وہ اپنے تجزیئے کو پہلے سے قائم نظریات سے آلودہ ہونے کی اجازت دیتا ہے تو غلط اور طے شدہ نتائج اخذ کرنے کا امکان بھی بڑھ جاتا ہے۔ ایسی "تحقیق" بے معنی ہے جس میں تحقیق سے پہلے ہی نتیجہ اور سوال سے قبل ہی جواب حاصل کر لیا گیا ہو۔

وادی سندھ اور ہندوستان کے مابین بنیادی تفریق تہذیبی اور ثقافتی ہے۔ یہ اختلافات بہت گہرے، قدیم اور بے شمار ہیں۔ انہیں صرف عقائد تک محدود کر دینا، مسئلے کو سمجھنے سے انکار کے مترادف ہے جب کہ سرحد کے دونوں طرف کے بنیاد پرست یہی کچھ کر رہے ہیں اور ان کا یہ طرز عمل تلخی اور کشیدگی میں اضافے کا باعث ہے۔

اختلافات کی اس طویل فہرست میں مذہب ایک اہم پہلو ہے اور جیسا کہ اقبال اور جناح نے واضح بھی کیا کہ صرف یہی اختلافات' تفریق کی بنیاد نہیں بلکہ بہت سے اختلافات اور بھی ہیں۔ اگر اس حقیقت کا ادراک کر لیا گیا ہوتا (جیسا کہ ان صفحات میں عرض کرنے کی کوشش کی گئی ہے) تو شاید پاک و ہند کے مابین تصادم کے اسباب کم اور پر امن بقائے باہمی کے امکانات زیادہ روشن ہوتے' پاکستانیوں کی خود اعتمادی میں اضافہ ہوتا اور شاید بھارتی بھی اس ناقابل تسخیر مرکز گریز قوت کو بہتر طور پر سمجھ سکتے جو آج کشمیر میں سرگرم عمل ہے۔ کشمیر تاریخ کے ہر دور میں وادی سندھ کا اٹوٹ انگ رہا ہے۔ اس علیحدگی اور امتیاز کا ادراک اگر کر لیا جائے تو پر امن بقائے باہمی کے امکانات روشن ہو سکتے ہیں۔ اگر یہ دونوں اکٹھے مل بیٹھ نہیں سکتے تو انہیں ایسا کرنے پر مجبور نہیں کیا جانا چاہیئے لیکن وہ جیو اور جینے دو کی حکمت عملی تو اپنا سکتے ہیں۔

آخر اتنے طویل اور تباہ کن تصادم اور کئی ہولناک جنگوں کے باوجود برطانیہ، فرانس اور جرمنی

بھی تو ایک دوسرے کو برداشت کئے ہوئے ہیں۔

آج سندھ واسی جو کچھ بھی ہے اس کے پس پردہ' وہی حالات و واقعات اور وہی تاریخی حقائق کار فرما ہے جن سے ماضی قریب یا بعید میں چار و ناچار وادی سندھ کو گزرنا پڑا۔ تاریخ کو مسخ کرنے کی حالیہ کوششوں نے اس آزار میں اضافہ ہی کیا ہے۔ اس کھینچا تانی میں نہ صرف سندھ واسی نے اپنے ہیرو کھلا دیئے بلکہ اپنا تشخص بھی گنوایا اور صلے میں اس کے ہاتھ بھی کچھ نہ آیا۔ یہ سندھ واسی اگر ایک طرف اپنے کنبے کی محبت سے سرشار، روشن خیال، غیر بنیاد پرست اور بہادر سپاہی ہے تو دوسری طرف نمود و نمائش کار سیا، فضول خرچ، ناقص منتظم اور سماجی احساس ذمہ داری سے عاری فرد ہے۔

ہم نے اس امر کا جائزہ لینے کی مقدور بھر سعی کی ہے کہ دریائے سندھ اور اسکے معاون دریاؤں، قدیم مادر سرانہ طرز حیات، لوہے کی دریافت اور زراعت کی پرداخت، قبیلے کے خاتمے اور خاندان کے نظام میں ڈھلنے، صوفیاء کرام کے ارشادات اور چار صدیوں پر محیط طوائف الملوکی کے بعد ایک سو سالہ غیر ملکی سامراجی حکومت اور اس کے عزائم نے سندھ واسی کی شخصیت سازی میں کیا کردار ادا کیا اور ان واقعات و محرکات سے اس نے کیا اثرات قبول کئے۔ اس کے موجودہ تشخص اور رجحانات کی خامیاں دور کرنے کے لئے یہ ناگزیر ہے کہ ہمیں اس کے کرداری نقائص کے محرکات سے مکمل آگہی ہو۔ سندھ واسی کے کردار کی خوبیاں اجاگر کر کے ہم اس سے بہتر کارکردگی کی توقع اور ان خوبیوں کے فروغ کی حوصلہ افزائی کر سکتے ہیں اور یہی اس کتاب کا مقصد بھی ہے۔

صرف میرے ہم وطن اور مستقبل کے مورخین ہی یہ فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتے ہیں کہ میں اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب رہا ہوں۔ اگر یہ کاوش ہند اور سندھ' دونوں جانب کے تجزیہ نگاروں کو ایسے افسانوی " حقائق" کا از سر نو جائزہ لینے پر آمادہ کر سکے جنہیں پرکھنے کی ہم نے کبھی جرات ہی نہیں کی بلکہ کمال خوش فہمی سے انہی ''افسانوں'' کو حقیقت تسلیم کر بیٹھے تو میں سمجھوں گا کہ میری یہ محنت رائگاں نہیں گئی۔ ایسے معروضی جائزے وادی سندھ اور ہندوستان کے مابین عوامی سطح پر باہمی احترام اور دیرپا مفاہمت کی بنیاد بن سکتے ہیں۔ اس خطے میں دائمی امن کی کلید بھی یہی ہے اور دونوں کے خوشحال مستقبل کی ضمانت بھی یہی۔

آخر کبھی تو ہم اپنے کروڑوں بھوکے' ننگے اور بے سرو ساماں عوام کو امن' اور امن سے منسلک خوشحالی کی امید دلا سکیں۔ ان کی اندھیری آنکھوں کو روشنی دکھا سکیں کہ ہند اور سندھ کی سرزمینوں پر کچھ حق توان افتادگان خاک کا بھی ہے۔ ■ ■

O P I N I O N

INDUS MAN'S RESISTANCE

The question of Pakistani identity is fraught with paradoxes and ambiguities. Unlike its nearest neighbours (most notably India, Iran and China (it has no grand narrative of cultural heritage; created to serve a historical and political need, it has continuously to invent, and reinvent, its own story. Is Pakistan a religious state, or an ideological construct? Does it, in spite of their much-articulated difference of religious identities (which have come to be seen as ethnicities), owe its cultural heritage entirely to India, of which it is often considered an amputated limb? Or, in the rising tide of fanaticism that threatens to engulf some of its Muslim neighbours, is it fulfilling a long-neglected agenda of returning to spiritual roots in the Arab or Middle Eastern world?

These questions are addressed, with a dense and often bewildering proliferation of detail, by Aitzaz Ahsan in The Indus Saga and the Making of Pakistan. Ahsan is a lawyer, which makes the breadth of his historical, sociological and cultural research all the more impressive.

THE LONDON TIMES' Literary Supplement, London
August 8, 1997

•••

THE DISCOVERY OF PAKISTAN

Mr. Ahsan was deeply pondering the subject while he was in prison. He has come out with a new vision of the history of Pakistan (a vision that may be termed as the "Discovery of Pakistan". This deserves due consideration on the part of the historians in Pakistan as well as outside.

I am glad to note that Mr. Ahsan has come forward boldly on a theme which the Pakistani historians have so far hesitated to elaborate (a theme which has been my life's dream) if we have created Pakistan (a land which has deep roots in history) there must be the history of the land and of the people who have lived and laboured here. The future generations deserve to have a history of the country. I congratulate Mr. Aitzaz Ahsan on showing a way to the historians. While he has succeeded, I have stumbled and miserably failed to convey my opinion and persuade the bureaucrats to understand historical Pakistan in the manner in which Mr. Ahsan has so ably done in the present book.

Professor Emeritus Ahmad Hasan Dani

The DAWN
September 6, 1996

THE INDUS SAGA AND THE MAKING OF PAKISTAN

Queslions and rejects many of the widely-accepted myths of subcontinental history; highlights the dichotomy between the Indus region and India; and shows the almost unbroken continuity of a distinct social and political order.

Susan K Hausman

Journal of South Asian and Middle Eastern Studies
Summer 1997

•••

Ahsan's own 'journey' through the contemplation made possible by imprisonment would continue, he notes, in the jails of Sahiwal, Faisalabad, and Mianwali. He writes of the vision that unfolded to him "of myself as part of a magnificent continuum," something destined as an inheritance. He began to explore this vision through history and myth, writing the entire study during his jail terms. Disarmingly, he makes no claim as an historian, but presents his conclusions as the results of a journey of self-discovery Although the primary importance of the parallel with Nehru is symbolic, The Discovery of India has been clearly on Ahsan's mind, and he quotes directly and indirectly from the book on more than one occasion.

Professor Carl W. Ernst.

Journal of Comparative Studies of South Asia Africa and the Middle East
Vol. XVI No.1 1996

•••

INDUS CREED

Ahsan has formidable credentials. He is a product of Cambridge University and a leading lawyer. He was for some years minister of the federal government in the Bhutto regime. He is today a senator and writes regularly for Pakistani journals. When it comes to history, he is a romantic. One has to make allowances for people in love with their subject. But he is bold, innovative, provocative and highly readable.

Khushwant Singh

THE TELEGRAPH, Calcutta
September 23, 1996

•••

BOOK REVIEW

The strength of Aitzaz Ahsan's work is also in the style of his writing. His prose is easy and the text flows with rapidity, taking the reader briskly through several engaging episodes of history. Aitzaz's is a remarkable style of narrating history. He laces his narrative, wherever relevant, with instances of high drama, of chivalry and romance, of the idiosyncrasies of the kings and princes, and with tales of valour and opportunism.

Each instance is described with the facility of a graphic and gripping story-teller. What, in the hands of many historians would have been a dull and boring chronological account of bland events and lifeless dates, erupts into full and larger-than-life drama when narrated by Aitzaz.

THE STAR, Karachi
August 15, 1996

•••

TRACING THE ORIGIN OF THE INDUS CITIZEN

There is something refreshingly original and sincere about Aitzaz's writing. Seeing books like this one being published in Pakistan gives one hope that in the next five, seven, ten years, we will see a truly evolving and emerging Indus personality of at least the intelligentsia of Pakistan.

S. K. Singh

THE OBSERVER, New Delhi
September 22, 1996

•••

THE MAKING OF PAKISTAN

In a sense, his book is also a challenge. It is an academic challenge to archaic opinions, a searching cross-examination of indefensible half-truths. It is at the same time an informed and informative refutation of obsolete perceptions, in effect the quest for a newer truth.

F.S. Aijazuddin

THE NATION, Lahore
August 20, 1996

•••

AITZAZ REWRITES PAKISTANI HISTORY

The fact that the Indus region has existed as a separate geographical, cultural and civilisational entity for the last many centuries has been highlighted before by historians of the West and the East. This is also one of the theses of our archaeologist and historian Dr. Ahmad Hasan Dani. Aitzaz's book, however, is the first most comprehensive and rational account of this. Every line and paragraph of the book is full of substance, authored with recourse of reason and not to the whims of passion. Thus, for any impartial reader, The Indus Saga hardly leaves any room for criticism.

Ishtiaq Ahmad

THE NATION, Lahore
August 18, 1996

•••

What Aitzaz has done in The Indus Saga is what Pakistani historians ought to have done many decades ago. And he has done so with industry and perception, in a style that is engaging and easy to read, with logic that is corroborated by all the elements that go to make the culture of a nation: history, language, poetry, legends, ballads, rituals, customs, technological advances, political and economic movements, means of warfare, methods of production, class formations, religious precepts and the evolution of social norms and habits. The book is laced with colourful episodes, tales of valour and romance, tragedies and triumphs. At no time does the narrative lose the thread of the well-known series of political events which we currently call 'history' The Indus Saga is a major contribution to our literature and a significant reinterpretation of our history.

Mansoor Ali Khan

The HERALD, Karachi
December 1996

•••

اشاریہ

ا

ب

ت

ڈ

ذ

ر

ز

س

گ

ن

و

ی



"پاکستان کا ہمیشہ سے ایک وجود تھا اور اس کا ہمیشہ سے ایک تشخص ہے لیکن یہ تشخص غیر منطقی توضیحات، علم دشمن منافقت اور دوغلے پن کی دھند میں کھویا رہا۔ یہ تشخص آج فرقہ واریت، لسانیت اور علاقائیت کی عدم برداشت اور برادر کشی کی چیرہ دستیوں سے چھلنی، کرپشن اور ظاہری نمود و نمائش کے زہر سے گھائل اور حکمرانوں کی موقعہ پرستی اور بے اصولی کے ہاتھوں یرغمال ہے۔ لیکن ہمارا تشخص ایک ایسا رنگا رنگ اور جھلملاتا کپڑا ہے جس میں بہت سے مختلف اور نیارے دھاگوں سے بنت ہوئی ہے اور جو ہمیشہ امن و آشتی کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ و ہم وجود رہے ہیں کہ ہر ایک تار، بنت کی مضبوطی اور قدر میں اضافے کا باعث ہے۔

وقت آگیا ہے کہ فرقہ واریت، لسانیت اور علاقائیت کے نشار، موقعہ پرستی اور نمود و نمائش کی پھیلائی گئی زہریلی دھول کو اس جھلملاتے کپڑے پر سے جھٹک دیا جائے تا کہ اس کی اصل تابندگی قوم کے بیٹوں اور بیٹیوں پہ آشکار ہو سکے اور اپنی قوم کی باطنی قوت پر ان کا اعتماد بحال ہو۔

یہ وقت ہے اس روح اور اس سے منسلک خواب کو پھر سے دریافت کرنے اور اصل شکل میں بحال کرنے کا۔ یہ وقت ہے پاکستان کو ایک روادار، ترقی پسند اور جدید مسلم ریاست کے طور پر کھوج نکالنے اور اقوام عالم میں اس کا جائز مقام دلوانے کا، کہ پاکستان کی گم گشتہ روح کی تلاش کا یہی مقصد ہے۔"

ISBN : 969-496-101-7